قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف)

مجدّدِ اعظم

حصّہ سوم

یعنی

حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مجدد صدی چہاردہم

رحمۃ اللہ علیہ کی خدماتِ دینیہ پر ایک نظر

مؤلفہ

جناب ڈاکٹر بشارت احمد صاحب مرحوم و مغفور

جسے

بماہ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ مطابق مارچ ۱۹۴۴ء

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے شائع کیا

تعداد اشاعت دو ہزار | بار اوّل | قیمت مجلد چار روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

فہرست مضامین مجدد اعظم حصہ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید

مصنف مجدد اعظم حضرت ڈاکٹر بشارت احمد صاحب مرحوم و مغفور مجدد اعظم کی تیسری جلد کا مسودہ ختم کر کے چاہتے تھے کہ اس کی طباعت کا فوراً انتظام ہو جائے مگر جنگ کی وجہ سے کاغذ وقت پر نہ مل سکا اور اس کی طباعت ملتوی رہی۔ اسی اثنا میں آپ جنوری ۱۹۴۳ء کو اپنے صاحبزادہ میاں نصیر احمد فاروقی آئی سی ایس کلکٹر تھانہ (حال کلکٹر بمبئی) کے پاس تشریف لے گئے تاکہ ان فرصت کے ایام میں اس سعید نوجوان کے دل کو علم قرآن سے منور کریں۔ مگر ابھی بہت دن نہ گزرے تھے کہ آپ کی بیماری جس میں وہ فی الحقیقت ایک عرصہ سے مبتلا چلے آتے تھے مگر اس کی برداشت میں صبر ایوبی سے کام لے رہے تھے ایک خطرناک صورت اختیار کر گئی اور بالآخر ۱۹۔ اپریل ۱۹۴۳ء کو دوپہر کے وقت بمبئی میں ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسی دن آپ کی نعش فرنٹیئر میل سے بمبئی سے لائی گئی اور ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۳ء بعد از نماز جمعہ آپ لاہور میں قبرستان واقع میانی صاحب میں مدفون ہوئے۔ اللّٰھم اغفرہٗ وارحمہ وعافہٖ واعف عنہ۔ اللّٰھم اکرم نزلہٗ ووسع مدخلہٗ وارفع درجتہٗ فی الجنۃ

آپ ایک لمبی سرکاری ملازمت کے بعد ۱۹۳۱ء کے آخر میں پنشن پر آ گئے۔ غالباً ۱۹۳۱ء میں کسی وقت ایک ریاست سے ملازمت کی آفر آئی آپ نے اس بارے میں مجھ سے خط کے ذریعہ سے مشورہ کیا تو میں نے جواباً حضرت مجددؑ کا ایک شعر عرض کیا ؎ عمر بگذشت و نماند است جز ایامے چند ٭ بہ کہ در یاد کسے صبح کنی شامے چند

دل تو پہلے ہی خدا کے ساتھ تھا۔ دنیا کو رخصت کر کے اسی وقت سے دین کی خدمت کا تہیہ کر لیا اور اسی شعر کو ایک قطعہ کی صورت میں لکھوا کر اپنے سامنے آویزاں کر لیا۔ اور شب و روز علمی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ پیغام صلح میں آپ کے مضامین کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا اب وہ اور بھی وسیع ہو گیا اور اخبار کے پڑھنے والوں کیلئے آپ کے مضامین روح کی غذا کا کام دیتے تھے۔ پیغام صلح کے پڑھنے والے سب سے پہلے آپ کے مضمون کو تلاش کرتے۔ انہی ایام میں چند چھوٹی چھوٹی کتابیں۔ الروح، تناسخ، مسئلہ تقدیر، قرآن کریم کا عالمگیر پیغام حریت، ولادت مسیح وغیرہ لکھیں۔ ۱۹۳۴ء میں انوار القرآن کے نام سے قرآن کریم کے تیسویں پارے کی تفسیر لکھی۔ تفسیر کیا تھی۔ ایمانیات کو مشاہدات میں تبدیل کر دیا۔ جو شخص پڑھتا خدا تعالیٰ کی ہستی اور جزا و سزا پر ایمان میں ایک نئی زندگی محسوس کرتا۔ کچھ عرصہ کے بعد انوار القرآن کا دوسرا حصہ جس میں ستائیسویں پارہ کی تفسیر ہے شائع کیا۔ قرآن کریم سے آپ کو ایسا عشق تھا کہ اثنائے ملازمت میں جہاں جہاں تبدیل ہو کر گئے وہیں اپنے درس قرآن سے لوگوں کو اس کتاب پاک کا شیدا بنا دیا۔ ان کا آخری درس قرآن جو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر انہوں نے دیا اسقدر حقائق سے بھرا ہوا اور ایمان کو زندہ کرنے والا تھا کہ اسی جلسہ میں میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش "بیان القرآن" کے لکھنے والے آپ ہوتے۔

مگر عشق قرآن کشاں کشاں ایک اور خدمت کی طرف لے جا رہا تھا۔ آپ کے دل میں ایک دکھ تھا کہ اس عاشق قرآن

کی جس سے آپنے خود عشق وفہم قرآن حاصل کیا تھا اگر دشمنوں نے بیقدری کی اور آپ کی صحیح تصویر کو تعصب اور عناد کی ظلمتوں میں پنہاں کر دیا تو غالی دوستوں نے بھی غلو کے گرد وغبار میں اس کو چھپا دیا۔ اس حق پرست انسان کا دل اس غم اور رنج سے خون ہوجاتا۔ مگر آخری عمرہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا۔ اتنے بڑے کام کا تہیہ کرنا کہ حضرت مجدد صد چہاردہم کی مبسوط سوانح عمری لکھ کران تمام ظلمتوں اور گرد وغبار کو دُور کیا جائے ایک پہاڑ نظر آتا تھا بالآخر خدا کا نام لیکر بسم اللہ مجریھا ومرسٰھا کہتے ہوئے ۱۹۳۶ء میں اس عظیم الشان کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ بیماریاں بھی بار بار حملہ آور ہوتی تھیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس صادق کی آستین میں دستِ حق نہاں ہوکر اپنا کام کر رہا ہے بیماری کے ایسے ایسے خطرناک حملے ہوئے کہ مہینوں صاحب فراش رہے مگر دستِ قدرت پھر اٹھا کر کھڑا کر دیتا تھا کہ ابھی کام باقی ہے جس کے لئے اس صاحب استقامت کی ضرورت ہے۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے ان کی محنت شاقہ کا مشاہدہ کیا ہے۔ مَیں اور وہ ان آخری ایام میں سارا سال اسقدر قریب رہتے تھے کہ دن رات میں کئی کئی دفعہ ملنا ہوتا تھا۔ مَیں خود بھی پچیس سال کی عمر سے تصنیف کے کام میں لگا چلا آتا ہوں اور ہزاروں صفحات لکھ ڈالے مگر مصنف مجدد اعظم کی محنت شاقہ کو دیکھ کر مَیں حیرت میں رہ جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طالب علم ہے جو امتحان کے کمرے میں بیٹھا ہوا گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے کہ اس کا وقت پورا ہو رہا ہے اور اس نے اپنے پرچے کو پورا کرنا ہے۔ بالآخر وہ پرچہ پورا ہوگیا اور امتحان لینے والا بھی اس قدر خوش ہوا کہ کام ختم ہوتے ہی اپنے محب کو اجرِ عظیم کے لئے اپنے حضور بلوا لیا۔

مجدد اعظم کا پہلا حصہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں اور دوسرا حصہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوگیا۔ ان دونوں حصوں کی جو چودہ سو صفحات پر مشتمل تھے طباعت کے اہتمام کاپیوں اور پروفوں کے پڑھنے کی محنت نے صحت پر اور بھی اثر ڈالا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال کرتے تھے کہ تیسرے حصہ کا بہت سا مواد پہلے دو حصوں میں آچکا ہے مگر تیسری جلد کا اعلان پہلے ہی سے کر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام بھی آپ کے ہاتھ سے کرا دیا۔ اگر کاغذ دستیاب ہوجاتا تو غالباً دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہی یہ حصہ نکل جاتا۔ اس حصہ کے لئے پروفوں اور کاپیوں کے پڑھنے کا وہ اہتمام نہیں ہوسکا جو آپ خود کرتے تھے۔ مولوی دوست محمد صاحب نے جن کے سپرد انجمن نے یہ کام کیا بڑی محنت سے اس کام کو کیا ہے جزاہ اللہ خیرا۔ مگر مصنف خود جو کچھ کرسکتا ہے وہ دوسرا نہیں کرسکتا۔ قارئین کرام اگر کوئی غلطی یا نقص پائیں تو آئندہ اصلاح کے لئے اس کی طرف راقم الحروف کو توجہ دلا کر عنداللہ ماجور ہوں۔

۱۰ر جنوری ۱۹۴۴ء

محمد علی

امیر جماعت احمدیہ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

ایکہ خواندی حکمتِ یونانیاں
حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں (مولانا روم)

حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدماتِ دینیہ پر ایک نظر

اہل دنیا جنہیں انصاف اور تحقیق کی نظر سے دیکھنے کی عادت نہ ہو جب کسی خدا کے نبی و رسول یا مامور و مجدد کو پرکھنے کے لئے اُٹھتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنی رائے اور خواہش نفس کو سامنے رکھ کر یہی آواز اُٹھایا کرتا ہے کہ اس شخص نے یہ نہیں کیا اور وہ نہیں کیا۔ اور کبھی اس بات پر نظر نہیں ڈالتا کہ اس شخص نے کیا کیا۔ اور جو کچھ کیا آیا وہ اس معیار پر صحیح اُترتا ہے جو خدا کے ماموروں اور فرستادوں کی خدمات دینیہ کے متعلق قرآن کریم یا تاریخ عالم میں ہمیں نظر آتا ہے۔ ورنہ اس طرح تو کسی صحیح فیصلہ پر انسان پہنچ نہیں سکتا۔ ہر ایک انسان کی خواہش نفس جدا ہوتی ہے۔ اگر خدا کی طرف سے آنیوالا ایک شخص کی خواہش نفس کے مطابق کام کرے گا تو دوسرے کی خواہش نفس کے وہ خلاف ٹھیریگا۔ اور اعتراض وہیں کا وہیں قائم رہے گا۔ پس حقیقت امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو کسی عظیم الشان منصب اصلاح و تجدید پر کھڑا کرتا ہے تو اس کے لئے لائحہ عمل اور اس کے کام کا نصب العین بھی وہ خود تجویز کرتا ہے۔ خواہ وہ لوگوں کے خواہشاتِ نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے افکلما جاءکم رسولٌ بما لا تھویٰ انفسکم استکبرتم ج ففریقاً کذبتم و فریقاً تقتلون ہ (البقرہ) جب جب تمہارے پاس کوئی خدا کا بھیجا ہوا تمہاری خواہشات کے خلاف باتیں لیکر آیا تو تم نے تکبر کیا۔ پھر بعض کی تم نے تکذیب کی اور بعض کو قتل کرنے لگے یعنی انسان کا تکبر اسے اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ اگرچہ آنے والا خدا کی طرف سے ہی مامور کیوں نہ ہو لیکن

اس کا کام اور نصب العین تجویز کرنے والا متکبر انسان اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ وہ خدا کا حق چھین کر خود لیتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ اس کا انکار کرے گا۔ اُسے جھٹلائے گا۔ اُسے قتل کرنے کے درپے ہو جائیگا۔ ہمیشہ سے اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ اور یہ تشابہ کچھ اس طرح بڑھا ہوا ہے کہ جناب الٰہی قرآن کریم میں ان مکذبوں کی نسبت فرماتے ہیں اتواصوا بہٖ کیا یہ ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے آتے ہیں۔ یہ ایک لطیف طرز بیان ہے۔ ہر زمانہ میں مکذبین کا ایک ہی طریق سے جھٹلانا ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا یہ ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے آئے ہیں کہ بس جھٹلانے کا یہی ایک طریق ہے تو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی رحمۃ اللہ علیہ کے منصب مجددیت پر خدا کی طرف سے کھڑے ہونے پر ان کو جھٹلانے کا طریق دوسرا کیسے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تاریخ نے وہی سب باتیں دُہرا دیں جو سدا سے ہوتی چلی آئی تھیں۔ جو مخالف اُٹھا اُس نے یہی کہا کہ مرزا صاحب نے یہ نہیں کیا وہ نہیں کیا۔ اس لئے آج میرا دل چاہا کہ اس بات پر نظر ڈالوں کہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے کیا کیا اور جو کچھ کیا آیا وہ وہی ہے جو اس زمانہ میں کسی مجدد و مامور کو کرنا چاہیئے تھا؟

حضرت مرزا صاحب کی دعوت و تبلیغ سے قبل مسلمانوں کی حالت

قبل اس کے کہ میں حضرت مرزا صاحب کی خدمات دینیہ پر نظر ڈالوں میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آپ کی دعوت و تبلیغ کے زمانہ سے قبل مسلمانوں کی کیا حالت تھی۔

مسلمانوں کی سیاست کا انتہائی تنزّل

حضرت مرزا صاحب کی بعثت سے قبل مسلمانوں کی سیاسی حالت انتہائی تنزّل پر جا پہنچی تھی۔ ان کی سلطنتیں یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں اور نکل رہی تھیں۔ ادھر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اُدھر مصر انگریزوں کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔ سوڈان پر مہدی سوڈانی کو شہید کر کے انگریز مسلّط ہو چکے تھے فرانس نے شمالی افریقہ کا اکثر حصّہ یعنی ٹیونس الجیریا اور مراکش کا کچھ حصّہ اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ مراکش پر اسپین نے اور طرابلس پر اٹلی نے قبضہ کر لیا تھا۔ زنجبار کی ساری اسلامی مملکت انگریزوں اور جرمنوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ترکستان کو روس نگلی نگل چکا تھا اور ایران اس کے ہاتھوں میں ایک مغلوب شکار کی طرح دم توڑ رہا تھا۔ افغانستان کی حیثیت ایک ریاست کی بن کرہ گئی تھی جو انگریزوں کے بکلی زیر اثر تھی۔ عرب میں کوئی جان باقی نہ تھی۔ مسلمانوں کی مایۂ ناز ٹرکی کی سلطنت جسے

خادم الحرمین الشریفین ہونے کا فخر حاصل تھا ایک "مرد بیمار" کی طرح سسک رہی تھی اور روس کے آئے دن کے حملوں اور یورپ کی سیاسی چالبازیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ماہرین سیاست کا یہ فتویٰ لگ چکا تھا کہ یہ مرد بیمار اب چند روز کا مہمان ہے میسور کی اسلامی سلطنت کا ٹیپو سلطان کے شہید ہوجانے پر خاتمہ ہوچکا تھا۔ الغرض یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی سیاسی حالت انتہائی تنزل کو پہنچ گئی تھی اور تمام عالم اسلام پر ایک یاس کی حالت طاری تھی۔ مسلمانوں کا بدقسمتی سے یہ خیال ہوگیا تھا کہ مذہب کے قیام کے لئے مادی طاقت اولین چیز ہے۔ اگر آج مادی طاقت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے تو اب کوئی صورت نہیں کہ اسلام دوبارہ دنیا میں غالب آسکے۔ اُسوقت کے مسلمان علماء اور لیڈروں کے خطبات کو پڑھئے۔ کتابوں کو دیکھئے۔ نثر و نظم کو ملاحظہ فرمایئے ہر جگہ آپ کو مایوسی ہی مایوسی نظر آئے گی۔ اسلامی دنیا نے یہی سمجھا کہ اسلام نے آخری کوشش ٹیپو سلطان کی شکل میں کی تھی لیکن وہ کوشش بھی بارور نہ ہوئی تو اب کوئی صورت ہمارے بقا کے لئے باقی نہ رہی۔ مسلمانوں کی اسی یاس انگیز حالت سے متاثر ہوکر مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے وہ مرثیۂ قوم لکھا جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے جس میں مسلمانوں کے زوال کا ایسا دردناک نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھ کر آنکھیں آنسوؤں سے تر اور قلوب غم و الم اور حسرت و یاس سے بھر جاتے ہیں۔ اس میں سے فقط دو ۲ بند میں بطور نمونہ یہاں عرض کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

امیروں کی تم سُن چکے داستاں سب — چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہی تم پہ عیاں سب — بگڑنے کو تیار بیٹھے ہیں یاں سب

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کہ گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل سے ہٹ چکا ہے

یہ جو کچھ ہوا ایک شمّہ ہے اُس کا — کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانہ نے اُونچے سے جس کو گرایا — وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

غرضیکہ مسلمانوں کو نظر آیا کہ وہ اب یہود کی طرح ہمیشہ کے لئے ایک مغلوب اور مخذول قوم بن گئے اور وہ یہ دیکھ کر کہ نہ صرف دنیا ہی اُن کی مخالف ہے بلکہ آسمان سے بھی ان کی مدد کے لئے کوئی نازل نہیں ہوتا۔ مذہب سے بھی بدظن ہونے لگے اور یہ مایوسی جو عالم اسلام پر اس دور میں چھائی تھی

اُس کی نظیر نہ بنو اُمیہ کی تباہی میں نظر آتی ہے نہ عباسیہ کی بربادی میں اور نہ ہی اسپین میں اسلامی شوکت کے زوال کے وقت۔ یہ مایوسی کی لہر ایک عالمگیر حیثیت رکھتی تھی اور جیسا کہ ہر ایک دانا جانتا ہے اس قسم کی مایوسی ایک خطرناک چیز ہے کہ جب یہ کسی فرد یا قوم کے قلوب پر تسلط جما لیتی ہے تو پھر دل بجھ جاتے ہیں اور انسان کے اندر سے قوتِ عمل زائل ہو جاتی ہے اور جدّوجہد کی امنگ جاتی رہتی ہے اور ترقی وسعی کا مادہ سلب ہو جاتا ہے اور ایسے شخص یا قوم کو کسی چیز کا انتظار باقی نہیں رہتا سوائے اپنی موت کے!

مسلمانوں کا مذہبی تنزل مسلمانوں کے سیاسی تنزل کے ساتھ ساتھ مسیحیت کا سیاسی عروج بڑھتا گیا اور یورپ اور امریکہ کے پادریوں نے اپنی سیاست کو ترقی دینے کے لئے ضروری سمجھا کہ مسیحی مذہب کو دنیا میں فروغ دیا جائے۔ مذہبی حیثیت سے ان کے اپنے گھر میں تو کچھ نہ تھا اس لئے ان کو کامیابی اسی میں نظر آئی کہ دوسری قوموں کے مذاہب پر جائز و ناجائز ہر قسم کی نکتہ چینیاں اور اعتراض کرکے ان کے پیروؤں کو اپنے مذہب سے بدظن کیا جائے اور اس طرح جگہ خالی کرکے دوسری طرف دنیا کی طمع و لالچ سے مسیحی مذہب کا جوا انکی گردن میں ڈال دیا جائے۔ انہیں اپنا مدمقابل دنیا میں اور کوئی مذہب سوائے اسلام کے نظر نہیں آیا۔ اس لئے ان کے حملوں کا رُخ تمام تر اسلام کی طرف ہو گیا۔ اسلام کی معقولیت اور عالمگیر اصولوں کا ان کو خطرہ تھا کہ تمام دنیا میں نہ پھیل جائیں۔ اور اس طرح مسیحی سلطنتوں کی سیاست کو نقصان نہ پہنچے۔ اس وجہ سے اسلام کے متعلق جس قدر افترا پردازیاں ممکن تھیں اور جس قدر ناجائز اعتراضات وہ کر سکتے تھے انہوں نے اس میں کمی نہیں کی۔

مسیحی حملے عیسائی پادریوں نے اسلام کے خلاف جو اس زمانہ میں صلیبی جنگیں شروع کیں وہ قدیم صلیبی جنگوں کی طرح تلوار کی نہ تھیں بلکہ قلم کی تھیں۔ انہوں نے چار طریقہ سے اسلام پر حملے جاری رکھے:۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ کہ مسلمانوں میں ان کے بعض علماء اور مفسّرین کی غلطیوں سے حضرت عیسیٰ کو بہت سی فضیلتیں اور خصوصیتیں ایسی مل چکی تھیں جن سے وہ نہ صرف حضرت محمد رسول اللہ صلعم سے بہت افضل نظر آتے ہیں بلکہ صاف صفات الوہیت ان میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً مسیح کا خالق طیور ہونا شافی امراض ہونا، مردوں کا زندہ کرنا، عالم الغیب ہونا، آج تک برابر آسمان پر الآن کما کان کی شان کے ساتھ بجسدہ العنصری زندہ موجود ہونا اور آخری زمانہ میں اُمت محمدیہ کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کا اُنہوں نے ہی پار لگانا وغیرہ وغیرہ۔ عیسائیوں نے ان خصوصیات سے فائدہ اُٹھایا اور صدہا مسلمانوں کو اُن کے مسلّمات کے رُو سے پکڑ کر اُنہیں راہ راست سے بھٹکایا اور عیسائی بنایا۔

(۲) دوسرے مولویوں کی بہت ہی اختراع کردہ باتوں یا متشابہ آیتوں کی غلط تفسیروں یا ضعیف روایتوں

پر ہزار ہا اعتراضات کا انبار جمع کیا اور صد ہا باتیں از خود افترا کر کے مسلمانوں کو اپنے مذہب اسلام کی طرف سے بدظن کیا۔ اور انہیں چارہ نہ رہا کہ اپنے مذہب کو ترک کر کے مسیحیت کو اختیار کریں؟

(۳) تیسرے صد ہا ٹریکٹوں اور کتابوں اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ دہریوں اور مادہ پرستوں کے اعتراضات جو وہ مذہب پر کرتے ہیں مسلمان نوجوانوں کے سامنے لا ڈالے۔ کچھ شک نہیں کہ ان اعتراضات سے خود مسیحیت کی جڑ پہلے کٹتی تھی مگر اس کی انہیں کچھ پروا نہ تھی۔ وہ پرائی بدشگونی کے لئے اپنی ناک کٹوانے کو تیار تھے۔ ان کا اس سے مقصد فقط یہ تھا کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں۔ دہریہ اور لامذہب بن جائیں۔ لامذہب بن کر دنیا کی حکومت اور سلطنت میں حصہ لینے کا لالچ خود بخود ان کو مسیحی حلقہ میں لے آئے گا۔ جب مذہب کی کوئی حیثیت انکی نگاہوں میں نہ رہے گی تو لازمی طور پر وہ اس سوسائٹی کو قبول کرنا غنیمت سمجھیں گے جو اس زمانہ میں برسرحکومت اور صاحب اقتدار ہے۔ چنانچہ دہریت اور لامذہبی کی تعلیم کو خوب عام کیا گیا اور اسلام کی ایک ایک بات کو اس کے معیار پر رکھ کر مسلمان نوجوانوں کو اسلام سے بدظن کیا گیا۔

(۴) اسلام پر ان ناپاک حملوں کے باوجود پادریوں کو ڈر تھا کہ اگر اسلام کے پُرحکمت اور حق پرستانہ اصولوں کا علم یورپ کی مسیحی اقوام کو ہو گیا تو حق خود بخود غلبہ پا جائے گا۔ اسلئے انہوں نے بڑے اہتمام سے صد ہا کتابیں ایسی تصنیف کیں جن میں اسلام کا غلط سے غلط نقشہ اور طرح طرح کی افترا پردازیاں کر کے بانیٔ اسلام کی سیاہ سے سیاہ تصویر جو ممکن ہو سکتی تھی کھینچکر رکھ دی۔ یہاں تک کہ یورپ میں آنحضرت صلعم کی تصویریں اس طرح کھینچی گئیں کہ مسلمان آنحضرت صلعم کو سجدہ کر رہے ہیں اور آپ نعوذ باللہ سورج کی پرستش کر رہے ہیں۔ اور ایسی تصاویر تو بکثرت شائع کی گئیں جن میں آنحضرت صلعم کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے اور ارد گرد خوبصورت عورتیں بیٹھی ہیں۔ مطلب یہ کہ نعوذ باللہ آپ نے تلوار کے زور سے اسلام پھیلایا اور عورتوں کی سوسائٹی میں عیش کرتے رہتے تھے۔ سید المعصومین اور امام المتقین کی شان میں اس ناپاک گستاخی کی سزا میں جو لعنت خدا کی طرف سے یورپ اور امریکہ پر پڑی وہ یہ تھی کہ یہ ساری مسیحی اقوام عورتوں کی سوسائٹی میں ہر قسم کی عیاشی شرابخوری اور بدچلنیوں میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ اور آج اپنے اصولوں کو دوسروں سے منوانے کے لئے نہ صرف تلوار بلکہ توپ اور بندوق ٹینک اور ہوائی جہازوں کے ساتھ حملہ آور ہیں۔ غرضنکہ اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق جو غلط سے غلط پروپیگنڈا

ممکن تھا وہ تمام یورپ اور بلاد مغرب میں ان عیسائیوں پادریوں اور مصنفین کی طرف سے کیا گیا۔

آریہ سماج کے حملے اسلام کے خلاف عیسائیوں کے اس پروپاگنڈے کو ان کے سیاسی اقتدار نے بہت فائدہ پہنچایا۔ ان کی حکومت تمام دنیا میں پھیل رہی تھی ان کا پروپاگنڈا بھی پھیلتا چلا گیا۔ ان کے دیکھا دیکھی دوسری اقوام کو بھی جرأت ہو گئی کہ اسلام پر حملے کریں جن میں ہمیں آریہ قوم پیش پیش نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عیسائیوں کی طرح ہندوؤں کو بھی اسلام سے خطرہ نظر آیا۔ ہندو دھرم میں سوائے بت پرستی اور ذات پات کے اور کچھ نہ تھا۔ ہندو تعلیم یافتہ ہو کر یا تو عیسائی بن جاتے یا مسلمان۔ عیسائیت تو ایک اجنبی حکومت کا مذہب تھا اور اس لئے ہندو اس کو اجنبیت کی نظر سے ہی دیکھتا تھا۔ لیکن مسلمان ہندو کے ساتھ ایک ہی ملک اور ایک ہی وطن میں بستا تھا اور اس کے عقیدۂ توحید اور اخوت و مساوات نسل انسانی بہت دلکش اور جاذب نظر تھے۔ ڈر تھا کہ رفتہ رفتہ ہندو اسلام میں جذب ہو جائیں گے۔ دیانند سرسوتی نے اس خطرہ کو محسوس کیا۔ وہاں بھی گھر میں کچھ نہ تھا جس کی دلکشی کو ہندو کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اس لئے مفر اسی میں نظر آیا کہ اسلام پر دل کھول کر حملے کئے جائیں اور جس قدر ممکن ہو اس کی شکل بھیانک بنا کر دکھائی جائے۔ عیسائیوں کے گھروں میں مصالحہ موجود تھا۔ وہاں سے اعتراضات اور مفتریات مستعار لیکر انہوں نے بھی اپنا گھر سجا لیا۔ اور ہندوؤں کو جس قدر ممکن تھا اسلام سے بدظن اور مسلمانوں کا دشمن بنا دیا۔

مغربی علوم کا حملہ ان کے دیکھا دیکھی بہت سے ناگفتہ مذاہب نے بھی اسلام کے منہ آنا شروع کیا۔ لیکن سب سے بڑھ کر جس چیز نے مذہبی دنیا پر بالعموم اور اسلامی دنیا پر بالخصوص اثر ڈالا وہ مغربی علوم میں مادی فلسفہ اور دہریت کی تعلیم تھی جسے عیسائی یورپ نے اسلامی دنیا میں رواج دیکر مسلمانوں کو اپنے مذہب سے متنفر کر دینے کا سب سے بڑا حربہ قرار دے رکھا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم بھی اپنے رسالہ علم الکلام حصہ اول میں لکھتے ہیں:-

"عباسیوں کے زمانہ میں اسلام کو جس خطرہ کا سامنا ہوا تھا آج اس سے کچھ بڑھ کر اندیشہ ہے۔ مغربی علوم گھر گھر پھیل گئے اور آزادی کا یہ عالم ہے کہ پہلے زمانہ میں حق کہنا اس قدر سہل نہ تھا جتنا آج ناحق کہنا آسان ہے۔ مذہبی خیالات میں عموماً بھونچال سا آ گیا ہے۔ نئے تعلیم یافتہ بالکل مرعوب ہو گئے ہیں۔ قدیم علما عزلت کے دریچہ سے کبھی سر نکال کر دیکھتے ہیں

تو مذہب کا افق غبار آلود نظر آتا ہے۔ ہر طرف سے صدائیں آرہی ہیں کہ پھر ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے اس ضرورت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اصول کی نسبت اختلاف ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتا ہے کہ نیا علم کلام بالکل نئے اصول پر قائم کرنا ہوگا۔ کیونکہ پہلے زمانہ میں جس قسم کے اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے آج ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانہ میں یونان کے فلسفہ کا مقابلہ تھا جو محض قیاسات اور مظنونات پر قائم تھا۔ آج بدیہیات اور تجربہ کا سامنا ہے۔ اس لئے اس کے مقابلہ میں محض قیاسات عقلی اور احتمال آفرینیوں سے کام نہیں چل سکتا۔" (صفحہ ۳ و ۴)

لیکن اس نئے علم کلام کے لئے کیا سعی کی گئی۔ سو گذارش ہے کہ ہمارے علماء کرام نے ہمیشہ اپنی پرانی لکیر پیٹی اور مغربی فلسفہ کے مقابلہ کے لئے جو ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے حملہ آور تھا یونانی فلسفہ کے پرانے تیر اور برچھے ہی استعمال کئے جو نہایت درجہ ناکام اور بیکار ثابت ہوئے آج سائنس کی دنیا ہر بات میں مشاہدہ اور تجربہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ یونانی فلسفہ کے قیاسات اور مظنونات اور لفظی اصطلاحات اور مقدمات کے پیچ آج کام نہیں دے سکتے تھے مگر ہمارے علماء کے پاس سوائے اس کے اور تھا کیا! وہ خود تو انگریزی زبان اور انگریزی علوم اور مغربی فلسفہ سے ناآشنا محض تھے۔ ادھر اُدھر سے جب کوئی اعتراض سنتے تھے تو معترض کو کافر بنانے کے درپے ہو جاتے تھے۔ بڑی ہمت کی اور جواب دینے بیٹھے تو یونانی فلسفہ کی اصطلاحات اور مقدمات سے جواب دیا جس سے معترض کی تسلی کیا خاک ہوتی تھی۔ اس نے مغربی فلسفہ کے ذریعہ اگر ان کے منطقی دلائل کو توڑ کر رکھ دیا تو بس بگڑ گئے اور اُسے کافر اور مردود قرار دیکر اسلام سے خارج کر دیا۔ مَیں نے خود اس قسم کے واقعات دیکھے ہیں کہ کوئی نوجوان کسی قسم کا اعتراض لیکر گیا ہے۔ مولوی صاحب نے آئیں بائیں شائیں کوئی جواب دیا۔ معترض نے اس پر پھر اعتراض کر دیا۔ بس پھر کیا تھا کہہ دیا کہ "دُور ہو مردود۔ تیرے جیسے آدمی اگر اسلام سے نکل جائیں گے تو اسلام کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تو ہی دوزخ کا کُندہ بنے گا۔" حالی مرحوم نے کیا صحیح نقشہ کھینچا ہے فرماتے ہیں:۔

وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی   وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی
یقین جس کو ٹھہرا چکا ہے نکمّی   عمل نے جسے کر دیا آکے ردّی

اُسے وحی سے سمجھے ہیں ہم زیادہ
کوئی بات اُس میں نہیں کم زیادہ

زبور اور توریت و انجیل و قرآں بالاجماع ہیں قابلِ نسخ و نسیاں
مگر لکھ گئے جو اصول اہلِ یُوناں نہیں نسخ و تبدیل کا ان میں امکاں
نہیں مٹتے جب تک کہ آثارِ دنیا
مٹے گا کبھی کوئی شوشہ نہ اُن کا

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
جمی ہیں دلوں میں ارسطو کی رائیں
جو اَب وحی اُترے تو ایماں نہ لائیں

اب اس فلسفہ پر ہیں جو مرنے والے شفا اور مجسطی کا دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے فلاطون کی اقتدا کرنے والے
وہ بس تیلی کے بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

وہ جب کر چکے ختم تحصیلِ حکمت بندھی سر پہ دستارِ علم و فضیلت
اگر رکھتے ہیں کچھ طبیعت میں جودت تو ہے سب سے انکی بڑی یہ لیاقت
کہ گر دن کو وہ رات کہہ دیں زباں سے
تو منوا کے چھوڑیں اسے اک جہاں سے

سوا اس کے جو آئے اُس کو پڑھا دیں اُنہیں جو کچھ آتا ہے اس کو بتا دیں
وہ سیکھے ہیں جو بولیاں سب سکھا دیں میاں مٹھو اپنا سا اُس کو بنا دیں
یہ لے دے کے ہے علم کا انکے حاصل
اسی پر ہے فخر اُن کو بین الاماثل

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل نہ بازار میں بوجھ اُٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

جو پوچھو کہ حضرت نے جو کچھ پڑھا ہے مراد آپ کی اسکے پڑھنے سے کیا ہے

مفاد اس میں دنیا کا یا دین کا ہے نتیجہ کوئی یا کہ اس کے سوا ہے
تو مجذوب کی طرح سب کچھ بکیں گے
جواب اس کا لیکن نہ کچھ دے سکیں گے

نہ حجت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ نہ اسلام حق کا جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآن کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ نہ حق کی حقیقت بتا سکتے ہیں وہ
دلیلیں ہیں سب آج بیکار ان کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی جگر جس سے شق ہوں وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

کوئی مسئلہ پوچھنے اُن سے جائے تو گردن پہ بار گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے تو قطعی خطاب اہل دوزخ کا پائے
اگر اعتراض اس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے

کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھلاتے کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں مُنہ پہ لاتے
کبھی تُھوک اور سگ ہیں اسکو بناتے کبھی مارنے کو عصا ہیں اُٹھاتے
ستوں چشم بد دُور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلق رسول امیں کے

جو چاہے کہ خوش ان سے مل کر ہو انساں تو ہے شرط وہ قوم کا ہو مسلماں
نشاں سجدہ کا ہو جبیں پر نمایاں تشرع میں اسکے نہ ہو کوئی نقصاں
لبیں بڑھ رہی ہوں نہ داڑھی چڑھی ہو
ازار اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

عقائد میں حضرت کا ہمداستاں ہو ہر ایک اصل میں فرع میں ہم زباں ہو
حریفوں سے انکے بہت بدگماں ہو مریدوں کا ان کے بڑا مدح خواں ہو

گر ایسا نہیں ہے تو مردودِ دیں ہے
بزرگوں سے ملنے کے قابل نہیں ہے

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو اُلفت — نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت — مقلد کرے نامقلد پہ لعنت

رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دینِ خدا پہ ہنسے سارا عالم

کرے کوئی اصلاح کا گر ارادہ — تو شیطان سے اس کو سمجھو زیادہ
جسے ایسے مفسد سے ہو استفادہ — رہِ حق سے ہے برطرف اس کا جادہ

شریعت کو کرتے ہیں برباد دونو
ہیں مردود شاگرد اُستاد دونو

جیسا کہ مولانا حالی مرحوم نے نقشہ کھینچا ہے ہمارے علما کو علم کلام کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ ان کیلئے تو اہل قبلہ مسلمانوں کو باہم لڑانے اور انہیں کافر بنانے کا مشغلہ اس قدر دلچسپ تھا کہ اس چیز سے فرصت ہی نہ تھی۔ دن رات مقلد اور غیر مقلد حنفی اور وہابی کی باہم معرکہ آرائیاں ہُوا کرتی تھیں۔ شیعہ سُنی میں لٹھ چلتے تھے حنفی اور وہابی مسجد میں ایک دوسرے کو مارتے پیٹتے رہتے تھے۔ آمین بالجہر اور دوالّین اور زوالّین (ضالین) پر باہمی سر پھٹول اور مقدمہ بازیاں مشہور خلائق تھیں مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم فرماتے تھے کہ "ایک مرتبہ دوالّین (ضالین) اور زوالین (ضالین) پر بلوہ ہوگیا۔ بلوائی میری عدالت میں پیش ہوئے۔ مَیں نے ایک فریق سے پوچھا تم کون ہو کہنے لگے دوالین (ضالین) دوسرے فریق سے پوچھا تم کون ہو کہنے لگے زوالین (ضالین) میں ہنس پڑا کہ دونو ہی گمراہ ہیں"۔ غرضکہ ان باتوں سے فرصت کہاں تھی جنہیں ادھر سے ذرا فرصت ہوئی تو کوّا حلال ہے یا حرام یا ہیچو قسم مسائل پر طبع آزمائیاں ہونے لگیں۔ بہت تیر مارا تو امکان کذب باری تعالیٰ اور رسول اللہ صلعم کے غیب دان ہونے پر بحث شروع کردی۔ اور کئی کئی دن محض اس بات کے فیصلہ پر گزر گئے کہ جواب کون دے اور جواب الجواب کا کس کو حق ہے۔ اور اس پر پرانی پرانی کتابیں نکال کر حوالے دیئے گئے۔ دیگیں چڑھی ہیں پلاؤ پک رہا ہے۔ آخر پلاؤ کی گرمی سے اسی تمہیدی بحث میں ہی باہم دست و گریبان ہوگئے۔ پولیس آگئی۔ مباحثہ بند کردیا گیا۔ دنیا میں امن آگیا۔ مناظرہ میں دلائل دینے کے بجائے کوشش یہ

ہؤا کرتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے کہ پبلک کے جذبات کو اُبھار کر انہیں اشتعال دلایا جائے اور اس طرح اپنے دلائل کی کمزوری کی پردہ پوشی کی جائے۔ اور آخر کار فریق مخالف کو کافر بنا کر اسلام سے خارج کیا جائے۔ اس تکفیر بازی پر اس قدر زور بلکہ ناز ہے کہ بقول مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم اگر علما کے تمام کفر کے فتووں کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو دنیا میں کوئی مسلمان باقی نہیں رہتا۔ شیعہ سُنی کو کافر کہہ رہے ہیں۔ سُنی شیعہ کو۔ حنفی وہابی کو کافر بنا رہے ہیں تو وہابی حنفی کو مشرک اور بدعتی اور کافر بنا رہے ہیں۔ جب ایک کے نزدیک دوسرا کافر ہے تو مسلمان کہاں باقی رہ گئے۔ غرضکہ چاروں طرف تکفیر کا بازار گرم ہے۔ ایک دفعہ جمعیۃ العلماء کے صدر مولوی کفایت اللہ صاحب کو مولانا صدرالدین صاحب نے کہا کہ آپ علماء کی ایک بڑی جماعت کے صدر ہیں اس تکفیر بازی کا انسداد کیجئے تو مولانا کفایۃ اللہ صاحب فرمانے لگے کہ انسداد کیوں کروں؟ ہمارے ہاتھ میں یہی ایک تو حربہ مسلمانوں کے درست کرنے کا رہ گیا ہے۔ اسی کو چھوڑ دیا تو اسلام کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ گویا اسلام اگر باقی رہ سکتا ہے تو تکفیر بازی سے۔ اشاعت اسلام، حفاظت اسلام، تمکین اسلام کا اگر ذریعہ ہے تو یہی تکفیر بازی ہے۔ اسلام کی حمایت میں جب کوئی دلیل نہیں دے سکتے کسی کافر کو مسلمان نہیں بنا سکتے تو مسلمان کو کافر تو بنا سکتے ہیں۔ خواجہ کمال الدین مرحوم مشہور مسلم مشنری انگلستان کے ہاتھ پر جب بہت سے انگریز مشرف بہ اسلام ہوئے اور خواجہ صاحب خود بوجہ احمدی ہونے کے کافر مشہور تھے تو مولانا شبلی مرحوم نے ایک نظم لکھی اس میں اس تکفیر بازی کی مصیبت اور علماء کی ذہنیت کا کیسا خوبصورتی سے نقشہ کھینچا ہے ؎

ایک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ
کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں

آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں
ہر چند ابھی مائل اظہار نہیں ہیں

جو نام سے اسلام کے ہو جاتے تھے برہم
ان میں بھی تعصب کے اب آثار نہیں ہیں

افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا
یا ہیں تو بقول آپ کے دیندار نہیں ہیں

کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد
کیا آپ بھی اس کیلئے تیار نہیں ہیں

جھلا کے کہا یہ کہ یہ کیا سوءِ ادب ہے
کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

غرضکہ علماء کو مسلمانوں سے ہم لڑانے اور انہیں کافر جاننے سے فرصت کہاں تھی جو وہ عیسائیوں

اور آریوں اور دہریوں کے اعتراضات کی طرف توجہ کرتے۔ اور توجہ کس طرح کرتے جب انہیں ان کے مقابلہ کی تاب ہی نہ تھی تو مفر اسی میں تھا اور ان کی علمی پردہ دری کی ستر پوشی اسی میں تھی کہ اس طرف توجہ ہی نہ کی جائے۔ اور اگر کوئی مسلمان ان اعتراضات میں سے کسی اعتراض کو سامنے لے آئے تو بجائے جواب دینے کے اسے کافر اور مردود اور بیدین بنا کر رکھ دیا جائے۔

متکلمین کا ظہور اس کا ردعمل یوں ہوا کہ سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے ہمنوا احباب کا وجود ظہور میں آیا بالکل اسی طرح جس طرح عباسیہ کے زمانہ میں جب یونانی فلسفہ کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اور افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ اور مذہبی آزادی نے طرح طرح کے ملاحدہ اور زندیقوں کے وجود کو پیدا کر دیا جنہوں نے یونانی فلسفہ کے ماتحت اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے شروع کئے۔ تو معتزلہ کا وجود ظہور میں آیا۔ اس سے قبل مسلمان بغیر کسی اینچ پینچ کے اسلامی عقائد پر پختہ ایمان اور سیدھا سادہ مذہب رکھتے تھے۔ قیل وقال میں پڑنے کے بجائے عمل کی طرف ان کی توجہ زیادہ ہوا کرتی تھی۔ زمانۂ نبوت سے بُعد ہونے پر ایمان اور اعمال میں تو آئی کمزوری۔ اور قیل وقال بڑھ گئی زیادہ۔ یونانی فلسفہ کے رواج نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ لوگوں نے طرح طرح کے اعتراضات کرنے شروع کر دیئے۔ اس زمانہ کے علماء اور محدثین تو ایسے اعتراضات سننا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اور ان معترضین اپنی مجلسوں میں آنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ لیکن آخر تابکے۔ لوگوں کی اس شورش پر اہل علم طبقہ کو اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ بعض علماء نے یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر مذہب کو اسی رنگ میں ڈھالنا چاہا۔ کچھ شک نہیں کہ ان میں نہایت معقولیت سے استدلال کرنیوالے بزرگ بھی تھے اور انہوں نے اسلام کی خدمت بھی کی لیکن وہ یونانی فلسفہ سے کچھ اس درجہ مرعوب تھے کہ اُنہوں نے مذہب کو یونانی فلسفہ کے تابع کر دیا۔ جہاں مذہب اور یونانی فلسفہ کا تضاد نظر آیا وہاں مذہب کی تاویل کر کے اُسے اس فلسفہ میں تطبیق دینی چاہی اور اس کے لئے طرح طرح کی تاویلوں سے کام لینے لگے۔ گویا ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کو صداقت کا معیار قرار دیدیا گیا۔ اس حساب سے جب تک قرآن کا کوئی اصول اسی فلسفہ کے معیار پر درست نہ آتے وہ کیسے سچا ٹھیر سکتا تھا۔ ابن رشد مشہور فلسفیٔ اسلام کا سارا فلسفہ اسی ایک محور پر گھومتا ہے۔ ان بزرگوں کی نیت نیک تھی وہ اسلام کو سچّا ثابت کرنا چاہتے تھے لیکن یونانی فلسفہ کا رعب اس قدر قلب پر تھا کہ ان کے نزدیک قرآن کی صداقت اسی طرح ثابت ہو سکتی تھی کہ وہ افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کی کسوٹی پر ٹھیک اُترے یہ لوگ معتزلہ کہلائے۔ ان کے بالمقابل وہ پرانے

سیدھے سادے علما، محدثین تھے جو کسی طرح کی تاویل کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے انہیں حنابلہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے بہت بڑے امام احمد بن حنبل تھے۔ خدا کے لئے جو ید (ہاتھ) اور سمیع و بصیر (سننے والا اور دیکھنے والا) کے الفاظ قرآن کریم میں آئے ہیں وہ ان میں بھی کوئی تاویل نہ کرتے تھے بلکہ سائل کو اتنا کہہ کر چپ کرا دیتے تھے الکیف مجھولٌ والسؤال بدعۃٌ یعنی اس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں اور سوال کرنا بدعت ہے حنابلہ کے اندر بعض متشددین خدا کو جسمانی بھی مانتے تھے۔ جنہیں ظاہریہ و مشبہّ کہا جاتا تھا۔ مگر مجھے یہاں زیادہ تفصیلی بحث کرنا منظور نہیں۔ موٹی تقسیم دو ہی تھی ایک حنابلہ اور دوسرے معتزلہ۔ اس کے بعد اہل سنت والجماعت میں اکابر علما، کو یہ احساس ہؤا کہ یہ ہر دو امور افراط و تفریط ہیں تو ان کے بین بین ایک ادوریہ علم کلام کا پیدا ہؤا جس کے اصول امام ابوالحسن اشعری نے تجویز کئے اور جو اس لحاظ سے اشاعرہ کہلاتے ہیں تفصیل دیکھنی ہو تو مولانا شبلی مرحوم کی کتاب علم الکلام پڑھ لو۔ طوالت کے ڈر سے میں تفصیل نظر انداز کرتا ہوں۔ اکثر شافعی علما، اشاعرہ گزرے ہیں۔ اشاعرہ کے بعض اصولوں میں جب امام ابو منصور ماتریدی نے زیادہ توجہ سے کام لیکر اصلاح کی تو وہ ماتریدیہ کہلائے حنفی علما زیادہ تر ماتریدی ہوئے ہیں۔ اشاعرہ میں سب سے بڑا درجہ امام غزالی اور امام رازی کا ہے حضرت امام غزالی اشاعرہ میں سے تھے لیکن وہ ان کے اصولوں کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے امام غزالی پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے بڑی جرأت سے ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کی غلطیوں کو طشت از بام کیا۔ اور ان کے مسلمات سے فائدہ اٹھا کر یونانی فلسفہ سے دین کی خدمت لی۔ اور علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش کر کے اسے معقولیت کا رنگ دیا۔ انہوں نے عقائد اسلامی کی معقولیت ثابت کرنے کے لئے یونانی فلسفہ سے کام ضرور لیا۔ مگر فلسفہ کو مذہب کے تابع رکھا۔ جہاں مذہب اور فلسفہ کی چپقلش ہوئی وہاں مذہب کی سچائی اور فلسفہ کی غلطی کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے یہ الگ بحث ہے۔ مگر ان کا اصول یہی تھا۔ اور یہ معتزلہ کے خلاف تھا۔ اس چپقلش میں جب وہ مذہب کی تائید میں یونانی فلسفہ کو رد کرنے لگتے ہیں تو ہمارے مولانا شبلی خفا ہو کر فرماتے ہیں کہ یہاں امام غزالی "اشاعرہ کی بولی بولنے لگ گئے" لیکن یہ مولانا کی غلطی ہے۔ امام صاحب کا اصول یہی تھا۔ وہ مذہب کے پابند تھے فلسفہ کے پابند نہ تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے یعنی پانچویں صدی ہجری کے مجدّد تھے اور ایک مجدّد کا یہی کام ہؤا کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے فلسفہ پر اگر وہ اسلام کے مسلّمہ عقیدہ کے خلاف ہوگا تو مذہب کو غالب کر کے

دکھانے کی کوشش کرے گا۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ مولانا شبلی جہاں امام صاحب پر خفا ہوئے ہیں ان میں سے ایک قدامت مادہ کا بھی عقیدہ ہے۔ اسلام قدامت مادہ کا قائل نہیں۔ وہ خدا کے سوا کسی چیز کو ازلی ابدی نہیں مانتا۔ لیکن یونانی فلسفہ قدامت مادہ کا قائل تھا۔ معتزلہ اس فلسفہ سے مرعوب ہو کر قدامت مادہ کے قائل ہو گئے اور یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ یہ کوئی مذہبی عقیدہ نہیں لیکن یہ جھوٹی تسلی تھی۔ جیسا کہ مَیں آگے چل کر انشاء اللہ دکھاؤں گا۔ امام غزالی نے جب اس عقیدہ کو لیا تو انہوں نے مادہ کے حادث ہونے پر جو یونانی فلسفہ کے اعتراضات تھے انہیں اسی فلسفہ کے مسلمات سے توڑ دیا۔ لیکن مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ یہ لفظوں کا پیچ تھا جس میں امام صاحب کامیاب ہو گئے۔ ورنہ آجکل کے مغربی فلسفہ کو سامنے رکھو تو امام صاحب کے دلائل خس کی طرح اُڑ جاتے ہیں۔ آج سائنس کا تجربہ شاہد ہے کہ لکڑی کو جلاؤ تو وہ خاکستر بن جائے گی مگر معدوم نہیں ہو گی۔ اور نہ ہم نے نیست سے ہست ہوتے کبھی دیکھا ہے۔ اس لئے امام صاحب کے دلائل بے سود ہیں۔ مَیں مولانا شبلی کے اس اعتراض کا جواب تو آگے چل کر انشاء اللہ تعالیٰ دوں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ مولانا شبلی نے امام صاحب کے ساتھ یہ بے انصافی کی ہے۔ وجہ یہ کہ جو فلسفہ اُن کے سامنے تھا اُسی کے مسلمات سے جواب دینا تھا۔ ان کے سامنے موجودہ زمانہ کا فلسفہ نہ تھا۔ کہ اُس کے تجربات پر غور کرتے۔ جس سکّہ میں اعتراضات کئے گئے تھے اُسی سکّہ میں جواب دیا گیا اور جواب بھی ایسا مُسکت تھا کہ خود علامہ شبلی کو امام صاحب کے جواب کو رد کرنے کے لئے آجکل کے مغربی فلسفہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ یونانی فلسفہ سے مقصد براری نہ ہوئی۔ اگر امام صاحب کے جواب پر علامہ شبلی لفظوں کے پیچ کا الزام لگاتے ہیں تو اعتراضات بھی تو انہی لفظی پیچوں پر مشتمل تھے۔ سارا یونانی فلسفہ ہی لفظی پیچوں کی بھول بھلیاں ہے۔ پھر شکایت کیوں ہے۔

امام رازی نے جو کچھ اس سلسلہ میں کیا وہ امام غزالی کی تقلید ہے۔ انہی بنیادوں پر عمارت اٹھائی ہے۔ گو اپنے جوش میں وہ فلسفہ کی بعض صحیح باتوں کو بھی رد کر جاتے ہیں مگر اصول وہی ہیں ہم سے قریب زمانہ میں اس تعمیر کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اور بلند کیا۔ انہوں نے نہ صرف عقائد کو اور زیادہ مدلل رنگ میں اور تفصیل کے ساتھ فلسفہ سے ثابت کیا بلکہ شریعت کے مختلف احکام کا فلسفہ اور حکمت بھی بیان کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ بڑی خدمت ہے لیکن زمانہ نے ایک ایسا پلٹا کھایا کہ نہ وہ یونانی فلسفہ باقی رہا نہ اس کے طرز استدلال کی کوئی قدر و قیمت رہی۔ اور اس کا سبب موجودہ زمانہ کا مغربی یا یورپی فلسفہ اور تجربات سائنس تھے

یورپ سے جو اس مادہ پرستی کی آندھی چلی تو وہ تمام مشرقی ممالک پر چھاگئی۔ اور اس نے مذہب کے مطلع کو تیرہ و تار کر دیا اور روحانیت مادیت کے نیچے بالکل دب کر رہ گئی۔

مغربی فلسفہ کے مقابلہ کیلئے نئے علم کلام کی ضرورت

اب لفظی پیچوں کا وقت گزر چکا تھا۔ نیا مغربی فلسفہ ہر چیز کا ثبوت کامن سنس یعنی سیدھے سادے مسلّمات عقلی اور تجربات و مشاہدات سے مانگتا تھا۔ وہ یونانی فلسفہ کے منطقی پیچوں پر حقارت سے ہنستا تھا۔ اس فلسفہ کی پکار پر سرسید احمد خاں اور ان کے ہمنوا بزرگوں کا وجود ظہور میں آیا۔ ان بزرگوں نے مذہب کو معقولیت کے رنگ میں رنگنا چاہا۔ لیکن وہی ٹھوکر کھائی جو معتزلہ نے یونانی فلسفہ کے زمانہ میں کھائی تھی۔ یعنی مذہب کو مغربی فلسفہ کے تابع کر دیا۔ جہاں مذہب کو مغربی فلسفہ سے چپقلش کرتے دیکھا وہیں مذہبی عقائد کی تاویلیں کر کے اسے مغربی فلسفہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔ یہ اس زمانہ کے معتزلی تھے۔ اس مغربی فلسفہ میں مادیت کا عنصر بہت غالب تھا بلکہ سچ پوچھو تو یہ سرتاپا مادیت تھا اور سرے سے روحانیت کا منکر تھا اسلئے نیا علم کلام جو سرسید احمد خاں کے ذریعہ ظہور میں آیا اس نے مذہب کی روحانیت کو مادیت سے بدل دیا۔ مادہ ازلی ابدی سمجھ لیا گیا۔ خدا علت العلل کے رنگ میں ایک بے فیض ہستی بن کر رہ گیا۔ دعا کا انکار ہو گیا۔ نبوّت محض ایک فطری ملکہ بن کر رہ گئی۔ اور وحی نبوت شاعر کی شاعری کی طرح دل سے ہی نکل کر دل پر ہی پڑنے والا تخیل قرار پا گئی۔ ملائکہ مادی قوتوں کا دوسرا نام ٹھیر گیا۔ معجزات کو اسباب مادی کے اندر گم کر کے رکھ دیا گیا۔ جنت و دوزخ بھی محض لفظوں کا گورکھ دھندا بن گیا جس کے اندر حقیقت کوئی نہ رہی محض دل کی کیفیت کا دوسرا نام سمجھ لیا گیا۔ ہمارے علما کے پاس کفر کے فتووں کے سوا اور تھا کیا۔ وہ سرسید احمد خاں اور ان کی پارٹی کو نیچری کا خطاب دیکر اور ان پر کفر کے فتوے لگا کر بیٹھ رہے ان حالات میں وقت کی پکار یہ تھی کہ خدا کی طرف سے کوئی مصلح ربانی آوے جو روحانیت کا علمبردار ہو جو اسلام اور مغربی فلسفہ کے اس جنگ میں اسلام کو غالب کر کے دکھاوے۔ بلکہ اس فلسفہ سے مذہب کی خدمت لے۔ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک حوالہ بھی اگر پیش کر دوں تو مناسب ہوگا۔ مولانا گزشتہ مجددین کے زمانہ کی تاریکیوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

"یہ حکائتیں (گزشتہ مجددین کے زمانہ کی تاریکیاں) اُن عہدوں کی تھیں جو موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں گویا عہدِ اقبال تھے۔ موجودہ وقت اور اس کی تاریکیوں کو دیکھو اور پھر ہر طرف روشنی اور روشنی دکھلانے والوں کی نایابی پر ماتم کرو۔ خدمتگذاروں کی پکار اور ہر طرف

مزدوری کی ڈھونڈھ ہے۔ (یعنی خدمت دین کے لئے۔ ناقل) مگر مزدور کہیں نہیں ملتے۔
آج ایک مٹی کے ٹوکرے اور گری ہوئی دیوار پر ایک اینٹ رکھ دینے کے معاوضہ میں اشرفیوں اور ہیروں کی قیمت مل رہی ہے۔ کیونکہ کام کرنیوالے جتنے کم ہوں گے اُتنی ہی کام کی مزدوری بھی بڑھ جائے گی۔ خزانۂ سعادت لٹنے کے لئے کھل چکا اور شرف و مراتب کا دروازہ ہر رہرو کے لئے باز۔ کون ہے جو اس کے خزانوں کو لوٹتا اور اس دولت و کامرانی سے مالا مال ہوتا ہے جس کے لئے نہیں معلوم اچھے وقتوں میں کیسے کیسے ارباب طلب بیقراریوں کے آنسو بہا چکے ہیں۔ اور آرزوؤں سے بھری ہوئی دعائیں مانگ چکے ہیں۔"
(تذکرہ صفحہ ۲۵۰-۲۵۱)

گویا موجودہ زمانہ تمام مجدّدین کے زمانہ کی ضلالتوں سے اپنے فتنوں اور تاریکیوں میں بہت زیادہ بڑھا چڑھا ہُوا ہے۔ اور کسی مجدّد و مصلح ربّانی کی ضرورت کو پکار پکار کر بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ اسی تذکرہ کے صفحہ ۲۵۰ پر مولانا موصوف لکھتے ہیں:-

"مقام عزیمت و دعوت" اور "احیاء و تجدید امت" کی نسبت جو کچھ بلا قصد زبان قلم پر آگیا تو اگرچہ اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہ تھا لیکن زیادہ تر یہ خیال باعث ہُوا کہ شاید ان حالات و وقائع کا مطالعہ اصحاب اصلاح و استخراد کے لئے کچھ سودمند عمل ہو ...... کسی کے قلب بصیرت و دیدۂ اعتبار کو ان مجدّدین ملت اور مصلحین حق کے اتباع و تشبّہ کی توفیق ملے۔ شاید کوئی مردِ کار اور صاحب عزم وقت کی پکار پر لبیک کہے اور زمانہ کی طلب و جستجو کا سراغ بنے۔ آج اگر کام ہے تو یہی کام ہے۔ اور ڈھونڈھ ہے تو صرف اسی کی۔"

مجدّد وقت کی آمد مسلمانوں کے اس سیاسی اور مذہبی تنزل کے انتہائی مرحلہ پر آخر خدا نے اپنے وعدہ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحٰفظون (ہم نے ہی اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) کو یاد فرمایا اور حدیث ان اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علیٰ راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا کے ماتحت (اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر ایک شخص کو مبعوث کرتا رہے گا جو تجدید دین کریگا) حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو چودھویں صدی کے سر پر تجدید دین کے لئے کھڑا کیا چنانچہ مسلمانوں کی اس عالمگیر یاس کے زمانہ میں اور اشد مذہبی ضرورت کے وقت قادیان کے ایک گمنام گاؤں سے یہ آواز اُٹھی کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اور ادیان باطلہ کے حملوں سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اس کا خدا ایک زندہ خدا ہے وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے

جس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے بلکہ ہمیشہ سے موجود تھا۔ اور وہ وہی خدا ہے جس نے قرآن نازل فرمایا تھا اور اسلام کو اپنا ابدی دین قرار دیا تھا۔ اسی خدا نے مجھے بحیثیت ایک مجدّد اور خلیفۂ محمدی کے بھیجا ہے تا میں لیظھرہ علی الدّین کلّہ کے خدائی وعدہ کے ماتحت اس دین کو کل ادیان عالم پر اور اس فلسفۂ مادیت پر غالب کر کے دکھاؤں۔ اگرچہ اسلام کا ظاہری سیاسی غلبہ اس وقت مٹ چکا ہے مگر اسلام کے رُوحانی غلبہ کا وقت آگیا ہے اور لیظھرہ علے الدّین کلّہ کا خدائی وعدہ اپنی مکمل شان میں پُورا ہونے کا یہی وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو تمام دیگر ادیان پر غلبہ دیگا۔ خواہ وہ ادیان یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں اور آریوں اور سکھوں اور بدھوں وغیرہ کے مذاہب ہوں اور خواہ وہ مادہ پرستی اور بالشوازم، فیسی ازم، نازی ازم وغیرہ کی شکل میں دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والے ادلے ہوں۔ ذرا یہ ایمان افروز تحریر حضرت اقدس مرزا صاحب کی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :-

"یقیناً سمجھو کہ اس لڑائی میں اسلام کو مغلوب اور عاجز دشمن کی طرح صلح جوئی کی حاجت نہیں بلکہ زمانہ اب اسلام کی روحانی تلوار کا ہے جیسا کہ کسی وقت وہ اپنی طاقت دکھا چکا ہے یہ پیشگوئی یاد رکھو کہ عنقریب اس لڑائی میں دشمن ذلت کے ساتھ پسپا ہوگا اور اسلام فتح پائے گا۔ حال کے علوم جدیدہ کیسے ہی زور آور حملے کریں۔ کیسے ہی نئے ہتھیاروں کے ساتھ چڑھ چڑھ کر آئیں مگر انجام کار ان کیلئے ہزیمت ہے۔ میں شکر نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ اسلام کی اعلیٰ طاقتوں کا مجھے علم دیا گیا ہے جس علم کے رُو سے میں کہتا ہوں کہ اسلام نہ صرف فلسفۂ جدیدہ کے حملہ سے اپنے تئیں بچائے گا بلکہ حال کے علوم مخالفہ کی جہالتیں ثابت کرے گا۔...... اس کشتی کا ناخدا خداوند تعالیٰ ہے ..... وہ ہمیشہ اسکو طوفان اور بادِ مخالف سے بچاتا رہے گا جیسا کہ فرماتا ہے انّا نحن نزّلنا الذّکر و انّا لہ لحافظون"

(آئینہ کمالات اسلام)

حضرت مرزا صاحب اس عالمگیر یاس کے زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جو امید اور ایمان کی رُوح پھونکنا چاہتے تھے اس کی کسی قدر جھلک مندرجہ ذیل واقعہ سے نظر آتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا نورالدین نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ "حضور تو اسلام کی اشاعت یورپ اور امریکہ میں کرنا چاہتے ہیں اور وہاں کے لوگ مذہب کے نام سے متنفر ہو رہے ہیں۔" فرمایا "اچھا ہے۔ تختی صاف ہو رہی ہے۔ نقش اچھا جمیگا۔

مریم کے بیٹے مسیح کی خدائی کا بت قلوب سے مٹنے دو تا اسلام کے لئے جگہ خالی ہو" پھر فرمایا۔

"مولوی صاحب! پہلی رات کا چاند صرف تیز نظر انسان دیکھتا ہے ہر ایک نظر نہیں آتا۔ جب چودھویں رات کا چاند بن کر چمکتا ہے تو ایک عالم دیکھتا ہے۔ اسی طرح میری آنکھوں نے اسلام کے روحانی غلبہ کا ہلال دیکھ لیا ہے انشاء اللہ تعالیٰ وقت آئے گا کہ یہ بدر بن کر چمکے گا تب سارا عالم دیکھے گا"

دعوے کو عمل سے ثابت کیا

حضرت مرزا صاحب نے زبان سے محض دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ اُسے عملی جامہ بھی پہنایا۔ ویسے مذاہب باطلہ کی تردید میں تو ہوش سنبھالتے ہی آپ لگ گئے تھے۔ لیکن سب سے پہلے آپ کے علم کلام کی جدّت اور زور کا منظاہرہ جس سے مسلم و غیر مسلم حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے۔ آپ کی مشہور و معروف تصنیف براہین احمدیہ کے ذریعہ ہوئی جس کو پڑھ کر دوست دشمن سب کو اعتراف کرنا پڑا کہ اسلام کی اس شان کی مدافعت وحفاظت ۱۳۰۰ سال میں نہیں ہوئی۔ چنانچہ مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب نے جو پنجاب کے اہل حدیث علماء کے سرتاج اور بڑے چوٹی کے عالم تھے اس پر جو ریویو لکھا وہ حسب ذیل ہے۔ لکھتے ہیں:-

"یہ کتاب اس زمانہ میں موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں شائع نہیں ہوئی اور آئندہ کی خبر نہیں لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی و جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر مسلمانوں میں بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ ہمارے ان الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم سے کم ایک ایسی کتاب بتادے جس میں جملہ فرقہائے مخالفین اسلام خصوصاً آریہ و برہمو سماج سے اس زور شور سے مقابلہ پایا جاتا ہو۔ اور دوچار ایسے اشخاص انصار اسلام کی نشان دہی کرے جنہوں نے اسلام کی نصرت مالی و جانی و قلمی و لسانی کے علاوہ حالی نصرت کا بھی بیڑا اٹھایا ہو۔ اور مخالفین اسلام اور منکرین الہام کے مقابلہ میں مردانہ تحدّی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو کہ جس کو وجود الہام کا شک ہو وہ ہمارے پاس آکر اس کا تجربہ و مشاہدہ کرلے۔ اور اس تجربہ و مشاہدہ کا اقوام غیر کو مزہ بھی چکھا دیا ہو" (اشاعۃ السنۃ جلد نمبر ۶)

حضرت مرزا صاحب کے علم کلام کی بنیاد

حضرت مرزا صاحب کے تصنیف کردہ لٹریچر اور کتب پر نظر ڈالنے سے صاف نظر آتا ہے کہ آپ کا علم کلام حنابلہ اور معتزلہ کے افراط و تفریط سے بالکل

بالکل مختلف اور اشاعرہ یا ماتریدیہ کی طرح اعتدال پر مبنی ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کا پابند نہیں ہے۔ حضرت امام غزالی کی طرح وہ اس مغربی فلسفہ سے دین کی خدمت لینا چاہتے ہیں۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی طرح وہ ہر پہلو سے کوشاں ہیں کہ اسلام کی صداقت ثابت ہو لیکن اس معاملہ میں حضرت مرزا صاحب کی طرز سب سے نرالی ہے۔ حضرت امام غزالی نے اگرچہ یونانی فلسفہ سے دین کی خدمت لی لیکن آپ کے استدلال کی بنیاد اسی یونانی فلسفہ پر کھڑی نظر آتی ہے۔ اسی طرح اسلام کے سارے متکلمین کا طریق یہی ہے کہ ان کے علم کلام کی بنیادیں اپنے زمانہ کے مسلمہ فلسفہ پر ہی قائم ہیں۔ لیکن حضرت مرزا صاحب کی معرفت صحیحہ نے یہ بھانپ لیا کہ دنیوی فلسفوں پر جس علم کلام کی بنیاد ہے وہ علیٰ شفا جرفٍ ھارٍ کا مصداق ہے یعنی کھوکھلے ریتلے کناروں پر اس کی بنیادیں ہیں جو اگر آج نہیں گریں تو کل گر جائیں گی۔ کیونکہ زمانہ کے حالات اور لوگوں کے خیالات بدلنے پر فلسفہ بھی بدل جاتا ہے۔ جو بات کل بڑی معقول سمجھی جاتی تھی وہ آج بچوں کا کھیل نظر آتی ہے اسی یونانی فلسفہ کو دیکھ لو کہ کل تک اس کی ہر ایک بات وحی اور الہام سے بھی بڑھ کر مستحکم سمجھی جاتی تھی مگر آج اسے طفلانہ باتیں اور لفظوں کا طلسم باطل سمجھا جاتا ہے۔ اسی مغربی فلسفہ کو دیکھ لو۔ آج سے چالیس پچاس برس قبل جو فلسفہ پتھر کی لکیر سے بھی زیادہ پختہ سمجھا جاتا تھا وہ آج خس و خاشاک کی طرح اُڑ گیا۔ یورپ کے مادہ پرستوں نے جب مادہ کے ازلی ابدی ہونے پر مہر تصدیق لگا دی تو سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی جیسے مسلمانوں کے رہنماؤں اور علماؤں نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ ان کے احساس کمتری نے ان میں یہ جرأت نہ پیدا کی کہ اس کا مقابلہ کرتے۔ وہ اس مغربی فلسفہ سے مرعوب تھے۔ لیکن آج وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ انہی مادہ پرستوں پر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مادہ ازلی نہیں۔ یہ تو بجلی کے مفردات (الکٹرونز) سے پیدا ہوا ہے۔ اور وہ بجلی خود نیبولا سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور نیبولا ایتھر کی تاریک شعاعوں کی پیداوار ہے۔ آگے ایتھر کی شعاعوں کا تجزیہ ہوا تو ان کا عدم وجود برابر ہو گیا کیونکہ ان کی ہستی محض علم حساب کے رُو سے تو بنتی ہے۔ ورنہ دراصل کچھ بھی نہیں۔ فقط انرجی یعنی قوت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ گویا کسی ذی قوت کی قوت یا قدرت کا سارا مظاہرہ ہے۔ ورنہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں کسی قدرت نے محض اپنی قوت سے نیستی کو ہستی کی شکل دیدی جسے انرجی (Energy) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی انرجی یعنی قوت کی عظمت کا اندازہ اس ایک نکتہ سے ہو جاتا ہے کہ جو انرجی ایک قطرہ پانی کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہے اُسے حاصل کرنے پر اگر ہم کسی طرح قادر ہو جائیں تو ایک قطرہ

پانی کی ازجی سے ایک بڑا جہاز ساری دنیا کے گرد آٹھ دفعہ چکر لگا سکتا ہے لیکن ابھی تک ہم اس پر قادر نہیں اور نہ اُمید ہے کہ اس خدائی قوت پر انسان قادر ہو سکے۔ علامہ شبلی نے معتزلہ کی تائید کرتے ہوئے اور امام غزالی صاحب کے حدوث مادہ کے دلائل کو توڑتے ہوئے بڑے فخر سے لکھا ہے کہ ہم کسی ہستی کو نیست ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے" لیکن آج وہ ریڈیم کی شعاعوں کی نیستی کو ملاحظہ فرماتے تو انہیں اپنی یہ دلیل واپس لینی پڑتی۔ معتزلہ کی اس دلیل کے متعلق میں ایک بات عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ معتزلہ حنابلہ یا مشبّہ ظاہریہ پر تو ہنستے ہیں کہ یہ خدا کے ہاتھ اور آنکھ اور کان کے قائل ہیں۔ گویا خدا کو اپنے جیسا انسان سمجھتے ہیں حالانکہ وہ بیچارے یہ کہتے ہیں کہ یہ اپنی بساط کے مطابق ہمارا قیاس ہے اس کی کیفیت ہمیں کما حقہٗ معلوم نہیں۔ لیکن معتزلہ کے نزدیک یہ خیال مضحکہ انگیز ہے کہ خدا کو انسان کی ہستی پر قیاس کیا جائے۔ لیکن جب خدا کے علم اور قدرت کا معاملہ آتا ہے تو وہاں یہی ہنسنے والے معتزلہ خدا کو ٹھیک انسان کے علم اور قدرت کے پیمانہ سے ناپنے لگتے ہیں۔ یعنی چونکہ ہم انسان نیست سے ہست نہیں کر سکتے اور مادہ کی ہستی کو نیستی سے نہیں بدل سکتے اس لئے خدا بھی نہ نیست سے ہست کر سکتا ہے نہ ہست سے نیست کر سکتا ہے کیا یہ وہی مشبّہ ظاہریہ والا طریق نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کو انسان پر قیاس کر کے اسے ہاتھ اور کان اور آنکھ جس کی کیفیت مجہول الکنہ ہے مانیں تو وہ احمق ٹھیریں کہ اس طرح خدا کیلئے جسم ماننا پڑتا ہے اور جسم سے پھر حد بندی لازم آئے گی حالانکہ وہ بیچارے اس کی کیفیت کو حوالہ بخدا کرتے ہیں اور اس کے کان اور آنکھ کے حواس اور قوتوں کو لامحدود سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ہنسنے والے معتزلہ صریح خدا کی قدرت اور علم کو انسان کی قدرت اور علم کی طرح محدود ٹھیراتے ہیں کیونکہ اس کے علم اور قدرت کو انسان کے علم اور قدرت کے پیمانہ سے ناپتے اور اسی پر قیاس کرتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو عقلمند اور حکیم بھی سمجھتے ہیں۔ انسان نیست سے ہست اور ہست سے نیست نہیں کر سکتا۔ اس لئے خدا بھی نیست سے ہست اور ہست سے نیست نہیں کر سکتا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خدا انسان سے بڑھ کر نہ طاقت رکھتا ہے نہ علم۔ اور اسی لئے ان میں سے بعض معتزلی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کو مخلوق کا تفصیلی اور جزئی علم نہیں۔ گویا اس طرح صریح طور پر خدا کو ایک محدود ہستی اور اس کو اس کی خدائی سے جواب دیدیتے ہیں۔ اور بجائے اپنی عقل پر ہنسنے کے حنابلہ غریبوں پر ہنستے ہیں۔ معتزلیوں کی اس قسم کی بے انصافیوں کی مثالیں کئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ خلیفہ مامون رشید کے زمانہ میں معتزلیوں نے قرآن کے مخلوق ہونے پر سب سے بڑی دلیل یہ دی تھی کہ قرآن کریم میں خدا نے اپنے آپ کو خالق کلّ شیءٍ فرمایا ہے۔

کہ وہ ہر ایک شے کا پیدا کرنے والا ہے تو پھر قرآن اس سے باہر کیسے رہ سکتا ہے۔ حالانکہ قرآن بحیثیت خدا کے کلام کے غیر مخلوق ہونا چاہئے کیونکہ غیر مخلوق کا کلام ہے۔ لیکن میں یہاں اس مسئلہ پر بحث نہیں کر رہا۔ میں اس بات کو دکھلانا چاہتا ہوں کہ جب معتزلہ خالق کل شیٔ کے ماتحت قرآن کو مخلوق ماننے کے لئے مجبور تھے تو مادہ کو مخلوق ماننے کے لئے انہیں یہ خالق کل شیٔ کی آیت کیوں بھول گئی۔ اس لئے کہ وہاں مدمقابل کوئی غریب مولوی نہیں ارسطو اور افلاطون ہیں جن کے سامنے گھگھی بندھ جاتی ہے۔ اور جن کے فلسفہ سے قلوب مرعوب ہیں۔ اگر مادہ کوئی شے ہے تو خالق کل شیٔ کے مطابق خدا اس کا خالق کیوں نہیں۔ یہاں معقولیت کے ان نمائندوں نے دو طفل تسلیاں دی ہیں:۔

(۱) ایک تو یہ کہ مادہ کی قدامت یا اس کا حدوث اسلامی مسئلہ نہیں مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اگر مادہ غیر مخلوق ہے اور خدا کی طرح ازلی ابدی ہے تو وہ دوسرا خدا ہے اور یہ توحید کے خلاف ہے بلکہ دہریت ہے۔ کیونکہ اگر مادہ قدیم ہے تو اس کے خواص بھی قدیم ماننے پڑیں گے پس مادہ کی محض شکل کو بدلنے کے لئے کسی خدا کی ضرورت نہیں باقی رہتی۔ اور اگر ہو بھی تو اس کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دو قدیم چیزوں میں ایک کو دوسری پر زبردستی کی حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ یایّھا النّاس اعبدوا ربکم الّذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون ہ (البقرہ) اے لوگو تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بنو یعنی انسان اپنے رب کی عبادت کا اس لئے مکلف ہے کہ وہ اس کا خالق ہے۔ اگر وہ خالق نہیں اور نہ اس سے ہمیں نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان تو یہ زبردستی کی حکومت کیسی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مادہ پرستی اور دہریت اسی قدامت مادہ کے نظریہ سے ہی پیدا ہوئی ہے اور اسی بات نے دنیا کو روحانیت اور معرفت الٰہی سے محروم کر رکھا ہے۔

(۲) دوسرا امر جو یہ لوگ بطور طفل تسلی پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ خدا اور مادہ ازلی ابدی ہیں مگر ایک علت ہے اور دوسرا معلول۔ چنانچہ ان کی آپس کی نسبت ایسی ہے جیسے کنجی کے گھومنے سے تالے کا کھلنا۔ کنجی کا گھومنا اور تالے کا کھلنا ایک ہی وقت میں ہوتا ہے۔ لیکن ایک علت ہے دوسرا معلول۔ یہ فلسفہ کی دھوکا بازیوں کی کیسی عمدہ مثال ہے۔ ذرا لفظوں کے پیچ سے باہر نکل کر اس مسئلہ کو حل کرو۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا خدا مادہ کا خالق ہے؟ یعنی اس نے نیست سے فوراً یا بتدریج مادہ کو پیدا کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں پیدا کیا اس لئے کہ وہ نیست سے ہست نہیں کر سکتا۔ تو پھر اس مثال کے کیا معنے۔ ہم یہ تو نہیں بحث کر رہے کہ خدا کے فعل میں اور اس کے نتیجہ میں کوئی وقفہ بھی

ہوتا ہے یا نہیں۔ یا فعل کے ظہور کے ساتھ ساتھ نتیجہ بھی وجود میں آنے لگتا تب تو تالے اور کنجی کی مثال ٹھیک بھی بیٹھتی۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ نیست سے ہست کر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کر سکتا اور وہ اس کائنات کو بنانے کے لئے مادہ یا روح کا محتاج ہے تو پھر یہ تالے اور کنجی کی مثال کیسی۔ محض لفظی گورکھ دھندا۔

قصّہ مختصر یہ کہ سائنس کی ترقی فلسفہ میں اسقدر تبدیلیاں پیدا کرتی چلی جارہی ہے کہ اس فلسفہ کی بنیاد پر مذہبی علم کلام کی بنیاد رکھنی غلطی تھی اور ہے۔ جن دنوں حضرت مرزا صاحب زندہ تھے ان دنوں مادی فلسفہ نہ صرف مادہ کو ہی ازلی ابدی قرار دیتا تھا۔ بلکہ زمان (Time) اور مکان (Space) کو بھی ازلی ابدی قرار دیتا تھا۔ مگر آج جس طرح مادہ کی ازلیت کا انکار ہوگیا۔ اسی طرح زمان اور مکان کے وجود کا ہی انکار ہوگیا۔ مشہور ڈاکٹر آئینسٹائن کا نظریہ جس نے سائنس کی دنیا میں آج قبولیت عامہ کی سند حاصل کی ہے یہ ہے کہ زمان اور مکان (Time & Space) کوئی چیز نہیں۔ نہ وہ کوئی مادہ ہے۔ نہ کوئی قوت بلکہ محدود چیزوں کی ایک حد بندی ہے۔ جس طرح ہر محدود جسم کے لئے طولؔ اور عرضؔ اور عمقؔ کی تین حد بندیاں سب کو مسلم ہیں۔ اسی طرح ہر جسم کی چوتھی حد بندی $\frac{\text{Time}}{\text{Space}}$ (زمان/مکان) ہے پس زمان و مکان اجسام کی حد بندی کا نام ہے۔ اس کا وجود کوئی نہیں۔ دیانند سرسوتی نے اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کھینچ کھانچ کر مادہ اور روح اور مکان اور زمان کے ازلی ابدی ہونے پر رکھی تھی۔ لیکن آج ان کے غلط ہو جانے سے وہ بنیاد گر کر ملیا میٹ ہوگئی۔ اب مکڑی کے جالے کی طرح اندر سے کوئی اور تار نکال کر اس بیت عنکبوت کو آریہ صاحبان قائم کریں۔ ورنہ پرانے تار تو سب ٹوٹ گئے۔ پس خدا کا دین بیت عنکبوت کے تاروں پر نہیں قائم رہ سکتا حضرت مرزا صاحب تو انگریزی پڑھے ہوئے نہ تھے نہ موجودہ زمانہ کے فلسفہ اور سائنس کی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ آپ تو آبادی سے دُور ایک گمنام گاؤں میں زاہد خلوت نشین کی طرح زندگی بسر کرتے تھے لیکن خدا کی طرف سے جو علیم و حکیم ہے آپ کو یہ علم بخشا گیا کہ فلسفہ و سائنس کے اوپر مذہبی علم کلام کی بنیاد رکھنا ہی غلطی ہے۔ آپ نے بہانگ دہل یہ اعلان کیا کہ قرآن ایک کامل کتاب ہے۔ وہ جو دعویٰ کرتا ہے اس کے دلائل بھی خود ہی دیتا ہے۔ کامل کتاب کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ جس بات کا دعویٰ کرے اس کے دلائل کے لئے اپنے ماننے والوں کا مُنہ تکے۔ قرآن کریم خود فرماتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرہ) رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ جو تمام دنیا جہان کے لوگوں کیلئے

ہدایت ہے اور ہدایت پر دلائل اور نشانات رکھتا ہے اور حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ قرآن کریم تمام دنیا جہان کے لئے عالمگیر ہدایات پیش کرتا ہے بلکہ ان پر دلائل و براہین بھی خود دیتا ہے۔ اور اتنا ہی نہیں کہ اپنی صداقتوں پر خود ہی دلیل بھی دیتا ہے بلکہ جو ادیان ان ہدایات کے خلاف تعلیم پیش کرتے ہیں ان کو باطل ثابت کرکے حق و باطل میں امتیاز بھی قائم کرتا ہے۔ غرضیکہ قرآن کریم زید یا بکر کے علم کلام کا محتاج نہیں بلکہ وہ خود اپنا علم کلام اپنے اندر رکھتا ہے پس حضرت مرزا صاحب نے اعلان کیا کہ جس علم کلام کو میں لیکر آیا ہوں وہ وہی علم کلام ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ جو فلسفہ قرآن کے اپنے فلسفہ سے مطابق ہے وہ سچا ہے جو اس کے مخالف ہے وہ غلط ہے خواہ وہ فلسفہ افلاطون و ارسطو کا ہے خواہ یورپ اور امریکہ کا ہے۔ آپ نے نہ صرف یہ دعویٰ کیا بلکہ آپ کا عمل ہمیشہ اسی اصول پر رہا۔ جب کبھی کسی اہم مسئلہ پر لکھنے بیٹھتے تو اس مضمون کو ذہن میں رکھ کر قرآن شریف کو شروع سے آخر تک پڑھ جاتے کہ قرآن شریف اس مسئلہ پر کیا فرماتا ہے اور کیا دلائل پیش کرتا ہے۔ جو آیتیں اس کے متعلق ملتیں انہیں نوٹ کرتے جاتے۔ اس کے بعد وہ مضمون لکھتے۔ چنانچہ آپ کی تصنیفات میں یہی رنگ نظر آتا ہے۔ آپ کی سب سے پہلی اور معرکۃ الآرا تصنیف براہین احمدیہ میں یہی فلسفۂ قرآن ہمیں نظر آتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں جب امرتسر میں ڈپٹی عبداللہ آتھم سے اسلام اور مسیحیت پر مشہور و معروف مباحثہ ہوا جو جنگ مقدس کے نام سے کتاب کی شکل میں شائع شدہ موجود ہے۔ اس مباحثہ میں آپ نے فریق ثانی کو اسی امر میں چیلنج کیا یعنی آپ نے فرمایا کہ ایک کامل کتاب کا فرض ہے کہ جو مذہب اور اصول وہ پیش کرے اس کے دلائل بھی خود دے۔ نہ کہ دعویٰ تو خود کرے اور دلائل کیلئے اپنے ماننے والوں کا منہ تکے۔ اور اس دعویٰ کے خلاف کوئی دوسرا مذہب جو دعویٰ کرتا ہے اس کو باطل بھی وہ خود کرے۔ چنانچہ ہم قرآن کریم کے متعلق اس امر کا التزام کریں گے کہ اسلام کے سچے عقائد کی تائید اور مسیحیت کے غلط عقائد کی تردید قرآن کریم سے ہی پیش کریں گے اور اس کے دلائل بھی قرآن کریم سے ہی دیں گے۔ پس انجیل اگر ایک کامل کتاب ہے تو مسیحی عقائد خصوصی کی تائید اور اسلام کے خصوصی عقائد کی تردید انجیل سے نکال کر دکھاؤ اور دلائل بھی انجیل میں سے ہی دو۔ کتاب جنگ مقدس آج بھی چھپی ہوئی موجود ہے جس کا دل چاہے پڑھ لے۔ حضرت مرزا صاحب نے تمام مباحثہ میں اس امر کا التزام کیا ہے۔ مگر ڈپٹی عبداللہ آتھم ایک قدم بھی اس رستہ پر چل نہ سکا۔ پس قرآن کی یہ بڑی فتح تھی جس کی نظیر نہیں۔ دسمبر سنہ ۱۸۹۶ء میں جب لاہور میں جلسۂ اعظم تحقیق مذاہب بڑی شان سے منعقد ہوا جس میں اس زمانہ کے تمام مذاہب نے بڑے اہتمام سے حصہ لیا۔

اور یہ پانچ سوال پیش کئے گئے جن کے اندر مذہب کا سارا فلسفہ آجاتا ہے۔ وھوہذا:۔

(۱) انسان کی جسمانی اخلاقی اور روحانی حالتیں۔

(۲) انسان کی زندگی کے بعد کے حالات۔

(۳) دنیا میں انسان کی ہستی کی اصل غرض کیا ہے اور وہ کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔

(۴) کرم یعنی اعمال کا اثر دُنیا اور عاقبت میں کیا ہوتا ہے۔

(۵) علم یعنی گیان و معرفت کے ذرائع کیا کیا ہیں۔

مطالبہ یہ تھا کہ ہر ایک مذہب والا اپنی اپنی مذہبی کتب کے رُو سے اُن کا جواب دے لیکن سوائے حضرت مرزا صاحب کے کوئی بھی اس کی پابندی نہ کر سکا۔ ہر مذہب والے نے جیسا ہو سکا اُلٹے سیدھے ان سوالات کے جواب دیئے۔ لیکن ایک تو جوابات نہایت نامکمل اور غیر تسلی بخش، دوسرے اپنی اپنی مذہبی کتب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ جو کچھ تھا اپنے اپنے دماغ کا تخیل تھا۔ لیکن حضرت مرزا صاحب نے جو جواب بھی دیا سب قرآن سے دیا۔ اور جو دلیل بھی دی قرآن کریم سے ہی دی اور جوابات اس قدر مکمل اور تشفی بخش تھے کہ مسلم و غیر مسلم دوست و دشمن سب کے دل بول اُٹھے اور زبانیں پکار اُٹھیں کہ اس سارے جلسہ کا ماحصل اگر تھا تو یہی ایک مضمون تھا۔ انگریزی اخباروں نے بھی یہی اعتراف کیا۔ غرضکہ حضرت مرزا صاحب کا آخر تک یہی طرز علم کلام تھا اور اپنے شاگردوں کو یہی تعلیم تھی۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے علم کلام کی خصوصیات کو مجملاً بیان کر دوں:

آپ کا علم کلام قرآن کریم کے پیش کردہ دلائل پر مبنی تھا

(۱) آپ کا علم کلام قرآن کریم کے پیش کردہ اصول اور دلائل پر مبنی تھا۔ آپ کے نزدیک انسانی فلسفہ خواہ وہ یونانی ہو یا موجودہ یورپین فلسفہ ہو اسی وقت صحیح قرار دیا جا سکتا ہے جب وہ قرآن کریم کے مطابق ہو اگر مطابق نہ ہوگا تو وہ غلط ہے۔ اور ایک محقق کو قرآن کریم کی آیات میں تاویل کرنے کے بجائے اس فلسفہ کی غلطی کی تلاش میں لگ جانا چاہیئے اور ضرور ہے کہ وہ اس تلاش میں کامیاب ہو کیونکہ قرآن جو خدا کا علم ہے غلط نہیں ہو سکتا۔ فلسفہ جو انسان کا علم ہے غلط ہو سکتا ہے۔ اس معاملہ میں حضرت مرزا صاحب کا قدم منہاج نبوت پر تھا۔ کیونکہ یہ امر تمام حکمائے اسلام کو مسلّم ہے کہ فلاسفر ظاہر سے باطن کی طرف استدلال کرتا ہے اور نبی باطن سے ظاہر کی طرف استدلال کرتا ہے۔ مثلاً ایک فلاسفر کائنات اور قوانین قدرت پر غور کر کے خدا کی ہستی پر دلیل قائم کرتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کوئی خدا ہونا چاہیئے۔ لیکن ایک نبی خدا سے براہ راست تعلق پکڑ کر اور اسے اپنے قلبی حواس سے محسوس کر کے یقین اور معرفت کے

عالی مقام پر پہنچکر دنیا کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ خدا ہے اب اگر وہ خدا کی ہستی پر دلائل دے گا تو علیٰ وجہ البصیرت دیگا۔ اور اس کے دلائل کا نتیجہ غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ خدا کو دیکھ کر یا محسوس کر کے اس کی ہستی پر دلیل دیتا ہے اور ایک فلسفی اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول اور دلائل کی تلاش کرتا ہے۔ ممکن ہے اس کو راہ تلاش میں صحیح دلائل پر اس کی رسائی ہو یا نہ ہو اور وہ صحیح نتیجہ پر پہنچے یا نہ پہنچے۔ اسی لئے قرآن کریم نے فلسفی اور نبی کا فرق ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ھل یستوی الاعمیٰ والبصیر کہ کہیں اندھا اور سوجا کھا برابر ہو سکتا ہے۔ ایک شخص ہاتھی کو دیکھ رہا ہے اور وہ دیکھ کر کہتا ہے یہ ہاتھی ہے۔ اگر اندھوں کے سامنے وہ اس کے ہاتھی ہونے پر دلائل دیگا تو علیٰ وجہ البصیرت دیگا۔ لیکن اگر چند اندھے ہاتھی کو ٹٹول کر معلوم کرنے لگیں تو اس کی ٹانگوں پر ہاتھ مار کر اسے ستون اور اس کی دم پر ہاتھ مار کر اسے رسّہ سمجھ لیں تو عجب نہیں پس فلسفی اور نبی میں اندھے اور سوجا کھے کا فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو ارشاد فرمایا کہ قل ھٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی (یوسف) کہ کہدے یہ میرا رستہ ہے کہ اللہ کی طرف بلاتا ہوں علیٰ وجہ البصیرت یعنی دیکھ بھال کر میں بھی اور جو میری اتباع کامل کرے گا وہ بھی علیٰ وجہ البصیرت ہو کر دعوت الی اللہ کرے گا۔ چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے متبعین کامل جو اہل حال میں سے ہوئے ہیں وہ خدا اور روحانیات میں صاحب مشاہدہ اور تجربہ ہو کر دعوت الی اللہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہمارے زمانہ سے قبل ان چیزوں کو اخفا میں رکھا گیا اور معرفت اور رُوحانیات کے

تجربات کو عوام الناس میں پیش کرنے سے احتراز کیا گیا۔ چنانچہ امام غزالی اگرچہ دبی زبان سے فرماتے ہیں کہ میں نے تصوّف اور ریاضت کے ذریعہ ان چیزوں کا مزہ چکھا ہے۔ لیکن کھول کر بیان نہیں کرتے فقط اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے زمانہ میں جب مادہ پرستی اور دہریت اپنے پورے عروج پر پہنچی اور اہل معرفت و روحانیات سے وہ نہایت حقارت کے ساتھ اپنے مشاہدات و تجربات کو پیش کرنے کا مطالبہ کرتی تھی۔ اور مادہ پرستوں کا صاف صاف اعلان تھا کہ جب تک مشاہدہ اور تجربہ ساتھ نہ ہو محض زبانی باتیں اور فلسفی دلائل قطعاً تسلی نہیں کر سکتے کیونکہ دونو فریق اپنی اپنی جگہ دلائل رکھتے ہیں اس وقت حضرت مرزا صاحب نے بڑی دلیری کے ساتھ بانگ دہل اعلان کیا کہ میں نے قرآن اور سنت کی اتباع سے ان تمام امور معرفت و روحانیات کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔

جن کا انبیا اور اولیا کاملین کو دعویٰ رہا ہے۔ پس مَیں جو کچھ پیش کرتا ہوں علیٰ وجہ البصیرۃ پیش کرتا ہوں میں قرآنی فلسفہ کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ قرآن نے جو مذہب پیش کیا ہے وہ فلسفہ کی حدود میں محدود نہیں بلکہ وہ باقاعدہ ایک سائنس ہے جو حقیقت پر مبنی ہے اور اپنے ماننے والوں اور متبعین کو ان تمام مدارج ترقیات و کمالات روحانی سے متمتع کرتا ہے جن کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ کس تحدّی سے فرماتے ہیں:۔

"ہم نے اسلام کو خود تجربہ کرکے دیکھا | نور ہے نور اٹھو دیکھو سنایا ہم نے
تھک گئے ہم تو انہی باتوں کو کہتے کہتے | ہر طرف دعوتوں کا تیر چلایا ہم نے
آزمائش کیلئے کوئی نہ آیا ہر چند | ہر مخالف کو مقابل یہ بلایا ہم نے
آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے | لو تمہیں طورِ تسلّی کا بتایا ہم نے
آج اُن نوروں کا اک زور ہے اس عاجز میں | دل کو اُن نوروں کا ہر رنگ دلایا ہم نے
مصطفےٰ پر ترا بیحد ہو سلام اور رحمت | اُس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے"

(۲) حضرت مرزا صاحب جب قرآن کریم سے استدلال کرتے ہیں تو آپ باریک سے باریک مسائل کو نہایت سہل اور آسان الفاظ میں اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ ایک فلسفی اور ایک عامی آدمی دونو یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ دلائل ایسے معقول اور کامن سنس (Common Sence) اور مسلمات عقلی کے مطابق اور اس قدر سادہ اور سریع الفہم ہوتے ہیں کہ دل میں اُتر جاتے ہیں۔ جیسا کہ غالب کا ایک شعر ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا | مَیں نے یہ جانا کہ یہ بھی بات میرے دل میں ہے

یونانی فلسفہ کے مقدمات اور مصطلحات کی بھول بھلیوں اور مغالطوں سے آپ کا استدلال بالکل پاک ہوتا ہے۔ آپ قرآن کریم کی آیات سے وہ دلائل اس طرح نکال کر سامنے رکھ دیتے ہیں کہ عقل انسانی متحیّر رہ جاتی ہے کہ یہ الفاظ قرآنی تو ہمارے سامنے بھی تھے مگر اس طرف ذہن کبھی منتقل نہیں ہوا۔ اور وہ تشریح و تفسیر ایسی بدیہیات پر مبنی ہوتی ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ تفسیر ہماری یا ہم سے پہلے لوگوں کی آنکھوں سے اب تک کیوں اوجھل رہی۔ یکدفعہ ہی جیسے کسی نے پردہ اُٹھا دیا اور وہ دلائل عریاں ہو کر سامنے نظر آنے لگے۔ یہ وہ علم لدنی ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے ثم انّ علینا بیانہ کے مطابق روح القدس کی تائید سے ملتا ہے انسانی دماغ کی جولانی نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں آپ کی طرزِ تحریر اور اسلوب بیان اتنا سادہ اور سلیس اور موزون الفاظ سے پُر ہوتا ہے کہ اسکے سمجھنے میں دماغ کو ذرا بھی تکلیف نہیں کرنی پڑتی۔ آپ بعض ادیبوں کی طرح موٹے موٹے ثقیل عربی الفاظ سے پڑھنے والے کے دل پر اپنے علم و فضل کا رعب ڈالنا نہیں چاہتے۔ یا موقعہ بے موقعہ مختلف شعرا کے کلام سے اپنی عبارت کو رنگین نہیں بنانا چاہتے بلکہ نہایت سلیس اُردو اور نہایت موزوں اور فصیح و بلیغ الفاظ میں اپنا اظہار مطلب کرتے ہیں اور ایسے مؤثر اور دلنشین انداز میں کرتے ہیں کہ مضمون شربت کے گھونٹ کی طرح کانوں کے ذریعہ قلوب میں اُترتا چلا جاتا ہے اور ایک ایسا خارق عادت اثر اور نور اس میں ہوتا ہے کہ روح وجد کر اُٹھتی ہے اور دماغ آپ کے استدلال کے پیچھے پیچھے ایسی آسانی سے چلا چلتا ہے کہ اُسے خود کوئی تکلیف نہیں کرنی پڑتی۔ اور نہایت آسانی سے اپنے آپ کو مسئلہ زیر بحث میں منزل مقصود پر پہنچا ہوا پاتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب مسئلہ زیر بحث کے ہر پہلو پر ہر ایک وسوسہ اور اعتراض کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اس مسئلہ میں قلوب انسانی میں پیدا ہو سکتا ہے ایسی تفصیل سے روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں کہ انسان خود بخود قبل اس کے کہ اسے کوئی زحمت اُٹھانی پڑے اپنے آپ کو ہر ایک ظلمت سے باہر اور اس مسئلہ کے ہر ایک پہلو کو حل شدہ پاتا ہے۔

(۱۴) حضرت مرزا صاحب قرآن کریم میں کسی تاویل کے قائل نہ تھے۔ یہاں تاویل سے میری مراد متکلمین کی اصطلاح کو مدنظر رکھتے ہوئے معنی کو ظاہر سے پھیرنے کے ہیں۔ تاویل کے معنے قرآن کریم میں تو اصل حقیقت یا انجام کے آئے ہیں لیکن متکلمین نے اصطلاحی طور پر تاویل سے مراد لی ہے کہ جب کوئی معنے مسلمات عقلی کے مطابق ٹھیک نہ بیٹھتے ہوں تو اُسے ظاہر سے پھیر کر باطن یا استعارہ و مجاز کے رنگ میں لے لئے جائیں۔ حضرت مرزا صاحب قرآن کریم میں کسی تاویل کے قائل نہ تھے کیونکہ قرآن کریم میں کوئی امر مسلمات عقلی کے خلاف نہیں۔ کسی لفظ کی تفسیر اگر خود قرآن کریم ہی دوسری جگہ صریح طور پر کرے تو اُسے تاویل نہیں کہا جا سکتا۔ اُسے تفسیر القرآن بالقرآن کہا جائے گا۔ ایک لفظ کے کئی کئی معنے ہوتے ہیں اور کسی جگہ کسی لفظ کو متکلم نے کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اگر اُسے متکلم دوسری جگہ خود بتلا دے تو کوئی عقلمند اُسے تاویل نہیں کہیگا۔ وہ تو تفسیر کہلائے گی۔ چنانچہ اسی امر کو قرآن کریم نے خود ہی صاف فرما دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ هو الذی انزل علیك الکتٰب منه اٰیٰتٌ محکمٰتٌ هنّ امّ الکتاب واُخر متشابهات ۔ فامّا الذین فی قلوبهم زیغٌ فیتبعون

مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (آل عمران) وہی خدا ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب نازل فرمائی جس میں سے کچھ تو آیات محکمات (یعنی پکی اور صاف وصریح) ہیں کہ وہی اصل کتاب ہیں۔ اور کچھ اور آیات متشابہات ہیں (یعنی ان کے معنوں میں کئی پہلو نکل سکتے ہیں) تو جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ قرآن کی ان متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور اس کے اصل مطلب کی ٹوہ (اپنی رائے کے مطابق لگاتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے سوا (جو اصل متکلم ہے) اس کا اصل مطلب دوسرا نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پائگاہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتے مگر وہی جو عقل رکھتے ہیں یعنی اہل علم و ارباب عقل متشابہات آیات کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب یہ خدا کی طرف سے ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس کے وہ معنے کرے جو محکمات آیات کے خلاف ہوں کیونکہ خدا تو اختلاف بیانی سے پاک ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا کہ اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں کثرت سے اختلاف ہوتا۔ پس متشابہ آیات کی اصل حقیقت معلوم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم خود متکلم کے اپنے کلام کی طرف رجوع کریں یعنی قرآن کریم کی محکمات آیات سے اس کا حل تلاش کریں۔ چنانچہ حضرت مرزا صاحب کا طریق یہی تھا کہ تفسیر القرآن بالقرآن میں متشابہات کو محکمات آیات کے تابع کیا کرتے تھے۔ اور اس طرح کسی آیت میں مختلف المعانی لفظ کے معنے کی تعین کرتے تھے۔ مثلاً حضرت مسیح کے احیاء موتیٰ کی تفسیر کیلئے آپ نے جب محکمات کی طرف رجوع کیا تو ایک تو یہ آیت نظر آئی کہ حَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (الانبیاء) کہ جس بستی پر ہم موت وارد کردیں وہ اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں پھر یہ آیت موجود پائی کہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى (الزمر) کہ اللہ تعالیٰ قبض روح فرماتا ہے۔ موت کے وقت اور جسے موت نہیں آئی نیند کے وقت پس جس پر موت وارد کرتا ہے اس کو اپنے پاس روک رکھتا ہے اور دوسرے کو یعنی نیند والے کی روح کو وقت مقرر تک کیلئے دنیا میں واپس بھیجتا ہے۔ یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نفس پر موت وارد ہو جائے

وہ دنیا میں واپس نہیں آتا۔ اسی طرح سورۃ المومنون میں ومن ورائهم برزخٌ الی یوم یبعثون کا ارشاد موجود ہے کہ انسان کو مرنیکے بعد لوٹا یا نہیں جائے گا بلکہ وہ برزخ میں رہینگے۔ قیامت کے دن تک جس دن بعثت ہو گی پس اگر کسی نبی کے متعلّق یہ کہا جائے گا کہ وہ مرُدے زندہ کرتا تھا تو اسکے معنے یہ تو نہیں ہو سکتے کہ وہ حقیقی مرُدے زندہ کر کے واپس اس دنیا میں لے آتا تھا بلکہ یہی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ مردہ دلوں کو رُوحانی زندگی بخشتا تھا جیسا کہ خود نبی کریم صلعم کی نسبت قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ یاایھا الذین استجیبوا للہ وللرّسول اذا دعاکم لما یحییکم (الانفال) کہ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو جب رسول تمہیں بلاوے تاکہ وہ تمہیں زندہ کرے۔ اب یہاں احیاء کے معنے صریح طور پر رُوحانی زندگی بخشتا ہے۔ پس جیسا کہ قرآن کریم خود موتیٰ کی تشریح کر دیتا ہے تو اسے ہم احیاء موتیٰ کی تاویل نہیں کہہ سکتے بلکہ تفسیر القرآن بالقرآن کہیں گے جب قرآن خود ایک معنے کا انکار اور دوسرے کا تعین کرتے تو وہ تاویل نہیں کہلا سکتا وہ تفسیر ہے۔

(۴) حضرت مرزا صاحب نے قرآن کریم سے استدلال کرنے میں ایک اور اصول کو نمایاں کیا اور وہ یہ تھا کہ آپ کے نزدیک قرآن کریم میں نہ کوئی آیت منسوخ ہے اور نہ کوئی ناسخ۔ بدقسمتی سے مفسرین نے اپنی سمجھ کے مطابق جہاں دو آیتوں کو آپس میں متضاد پایا تو ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیدیا۔ حالانکہ آنحضرت صلعم سے ایسی کوئی حدیث صحیح مروی نہیں جس سے معلوم ہو کہ کوئی آیت قرآنی منسوخ ہے اور کوئی ناسخ۔ قرآن کریم کی آیت ماننسخ من ایۃٍ او ننسھا نأت بخیرٍ منھا او مثلھا (البقرہ) میں قرآن کریم کی کسی آیت کی منسوخی کا ذکر نہیں بلکہ شرائع سابقہ کی منسوخی کا ذکر ہے۔ اہل کتاب قرآن کریم میں ایسے احکام دیکھ کر بگڑتے تھے جو ان کی کتب میں موجود نہ تھے یا ان کے خلاف تھے۔ سو یہاں اس کی وجہ بیان فرما دی کہ بعض اعلیٰ درجہ کے احکام جو پرانی کتب سے مٹ چکے تھے اور لوگ انہیں بھول چکے تھے وہ ہم نے قرآن میں پھر از سرِ نو نازل فرما دیئے۔ اور بعض احکام جو مختص بالقوم یا مختص بالزمان تھے انہیں بدل کر ان سے بہتر احکام نازل فرما دیئے جو تمام قوموں اور تمام زمانوں کے لئے واجب العمل قرار دیئے جا سکیں۔ غرضکہ اس آیت میں جن احکام کی منسوخی کا ذکر ہے وہ شرائع سابقہ کے احکام کی منسوخی ہے نہ کہ قرآنی احکام کی۔ ورنہ نأت ..... مثلھا بالکل بے معنی ہو جائے گا۔ جب مثل ہی آنا تھا تو منسوخ کرنا بے معنی ہو گیا۔ حضرت مرزا صاحب نے

اسے بطور عقیدہ ہی نہیں پیش کیا بلکہ آپ نے اور آپ کے شاگردوں نے آپ کی ہدایت کے ماتحت جملہ آیات کو جو منسوخ اور ناسخ کے ذیل میں تھیں باہم تطبیق دیکر اس غلطی کی اصلاح کی تکمیل کردی اور اس بات کو اظہر من الشمس کر دیا کہ قرآن کریم میں نہ تو کوئی آیت منسوخ ہے اور نہ کوئی قرآنی حکم قرآن سے باہر ہے جو واجب التعمیل ہے مگر منسوخ التلاوت ہے جیسا کہ بعض مولویوں کا خیال ہے اور جو نہایت غلط خیال ہے۔

(۵) حضرت مرزا صاحب نے قرآن سے استدلال کرنے میں ایک اور اصول قائم کیا اور وہ ہے "خلاف عقل" اور "بالاتر از عقل" کا فرق۔ حضرت مرزا صاحب نے اس اصول کو سب سے پہلے اپنی تصنیف سرمۂ چشم آریہ میں پیش کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز کو جو عقل میں نہ آئے خلاف عقل قرار دیکر رد کر دینا یہ عقلمندی نہیں۔ خلاف عقل اور چیز ہے اور بالاتر از عقل اور چیز ہے۔ خلاف عقل تو وہ امر ہوتا ہے جو اصول متعارفہ اور مسلّمات عقل کے خلاف ہو۔ مثلاً دو اور دو چار ہوتے ہیں اگر کوئی کہے کہ پانچ ہوتے ہیں تو وہ خلاف عقل ہے جو رد کر دینے کے قابل ہے۔ لیکن جو امر اصول متعارفہ اور مسلّمات عقل کے خلاف نہیں بلکہ وہ ایسا امر ہے جسے ہم روزمرہ زندگی میں نہیں پاتے یا وہ ہماری سمجھ اور علم سے باہر ہے اسے محض اس لئے رد کر دینا کہ ہماری عقل اس کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتی پرلے درجہ کی نادانی ہے۔ اول تو انسانی عقل محدود ہے۔ دوم مختلف لوگوں کا دائرہ علم و عقل مختلف ہے۔ جو بات ایک کی عقل میں نہیں آتی وہ دوسرے کی عقل میں آجاتی ہے۔ دوم دن رات کی علمی تحقیقات و ترقیات کی وجہ سے صدہا باتیں جو کل تک سمجھ میں نہیں آتی تھیں آج وہ سائنس کا جزو بنی ہوئی ہیں۔ مثلاً بے تار کی تار برقی جب ایجاد ہوئی تو موجد کو دیوانہ سمجھا گیا۔ اہل سائنس نے اُسے خلاف عقل سمجھ کر اس کی ہنسی اڑائی۔ لیکن آج وہی چیز سائنس کی ایک بڑی ایجاد سمجھی جاتی ہے۔ پس بے تار کی تار برقی خلاف عقل نہ تھی بلکہ اس زمانہ میں جب وہ ایجاد ہوئی ہے بالاتر از عقل تھی۔ آخر علمی انکشافات کی وجہ سے عقل کی وہاں تک رسائی ہو گئی۔ اسی طرح سینکڑوں امور روحانیات کے ہیں جو بالاتر از عقل ضرور ہیں مگر وہ خلاف عقل نہیں۔ روحانی تجربات اور علمی انکشافات کے ذریعہ آخر عقل انسانی کی وہاں تک رسائی ہو جاتی ہے اور جسے عقل انسانی پہلے سمجھنے سے قاصر تھی اس کے سامنے عقل انسانی کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ پس جلدی سے ہر ایک رُوحانی امر اور خارق عادت معجزوں کو خلاف عقل گردان کر مادہ پرستی کے رنگ میں

ان کی تاویلیں کرتے چلے جانا سخت غلطی ہے۔

(۶) قرآن کریم میں سنۃ اللہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ اور بڑے زور سے فرمایا ہے کہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کہ تو اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پائے گا۔ پرانے معتزلہ اور ہمارے زمانہ کے معتزلہ یعنی نیچریوں نے اس سے مراد وہ قوانین قدرت لے لئے جسے فلسفہ یا سائنس اپنے محدود تجربات و مشاہدات سے دریافت کرتی رہتی ہے۔ اور اس لئے ان لوگوں نے ہر ایک امر کی جسے قرآن کریم میں مادی فلسفہ کے دریافت کردہ قوانین کے خلاف پایا تاویلیں کرنی شروع کردیں اور قرآن کریم کی آیات کو مروڑ کر مادی فلسفہ اور سائنس کے تابع کرنے کی کوشش کی یہ سخت غلطی تھی۔ انسان کی محدود نظر کا خدا کے تمام قوانین قدرت پر حاوی ہونا ناممکن ہے۔ جو قوانین ہمیں معلوم ہیں وہ کل کسی اور رنگ میں نظر آنے لگتے ہیں۔ اُن کے اندر صدہا باریکیاں ایسی پنہاں ہوتی ہیں کہ سالہا سال میں بھی اُن پر انسان کا علم حاوی نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ کچھ اور قوانین ہوتے ہیں جن پر ایک وقت نظر نہیں پڑتی مگر دوسرے وقت وہ نظر آنے لگتے ہیں غرضیکہ انسان کے دریافت کردہ قوانین قدرت کو سنت اللہ کہنا بڑی جرأت اور سخت غلطی ہے۔ ممکن ہے وہی خدا کا قانون ہو مگر یقین سے ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس قانون کے ہر پہلو پر انسان کی نظر حاوی ہو چکی ہے۔ پس قرآن کریم میں جس سنت اللہ کا ذکر ہے وہ ہرگز وہ قوانین نہیں جن کو انسان کی محدود عقل اب تک دریافت کر چکی ہے۔ بلکہ وہ قوانین ہیں جن کو خدا نے قرآن میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل سے اپنی جو سنت اور عادت قرآن میں بیان فرمائی ہے اس کی نسبت یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سنت اللہ ہے کیونکہ خدا کے علم میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔ مثلاً قرآن میں خدا نے اپنی سنت یہ بیان فرمائی کہ فیمسک التی قضی علیھا الموت کہ جس پر موت وارد ہو جائے اُسے خدا واپس دنیا میں نہیں بھیجا کرتا۔ تو اس کا نام اب سنت اللہ ہوگا۔ چونکہ سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی اس لئے ہم مجبور ہیں کہ جن آیات میں مردے زندہ ہونے کا ذکر ہو وہاں حقیقی مردے مراد نہ لیں۔ پس حضرت مرزا صاحب نے سنت اللہ کا صحیح مفہوم بتا کر ناحق کی تاویلوں کا دروازہ بند کر دیا۔ اور قرآن کی تفسیر کو مادی قوانین کی غلامی سے آزاد کر دیا۔

(۷) حضرت مرزا صاحب نے یہ اصول پیش کیا تھا کہ قرآن کریم کا اپنا پیش کردہ فلسفہ اصل ہے باقی جس قدر انسانی فلسفے ہیں خواہ وہ یونانی ہوں یا یورپین سب اس کے تابع ہیں۔ جہاں

انسانی فلسفہ قرآنی فلسفہ سے مطابق نظر آئے وہاں تو اُسے مانو۔ جہاں تطبیق نظر نہ آئے وہاں انسانی فلسفہ کو رد کر دو اور اس کی غلطی کو عیاں کرنے کی کوشش میں لگ جاؤ۔ مگر عقل انسانی کا تکبر اس بات کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنے پیمانہ سے قرآنی فلسفہ کو ناپنے کی کوشش کرتی تھی اور اگر تطبیق نہ ہو سکے تو قرآنی فلسفہ کو غلط قرار دینے پر آمادہ تھی۔ اسلئے ضروری تھا کہ مختلف طریقوں سے قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایسے دلائل اور نشانات قائم کئے جائیں کہ اس کی صداقت پر دن چڑھ جائے اور انسان کے قلب میں قرآن پر ایک زندہ اور کامل ایمان پیدا ہو جائے کہ جس کی وجہ سے اس کے ہر ایک اصول اور عقیدہ کو بلا چون و چرا مان لینے کے لئے قلوب تیار ہو جائیں۔ کیونکہ انسان کے دل میں اگر قرآن کی صداقت پر پورا پورا ایمان پیدا ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ پھر کسی فلسفہ کو قرآنی فلسفہ پر انسان بہتری نہیں دے سکتا کیونکہ خدا کے علم کے سامنے انسان کا علم کوئی وقعت نہیں رکھتا درا صل یہ انسان کے ایمان کی کمزوری ہوتی ہے جو مختلف فلاسفروں کے اعتراضات پر دل میں طرح طرح کے وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ ایک پکّے مومن اور عارف کو ان چیزوں سے قطعاً ہراس نہیں ہوتا۔ حضرت مرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کی جس آیت پر مخالف اعتراض کرتا ہے وہاں معارف و حقائق کا خزانہ مخفی ہوتا ہے جو اس کی نظروں سے پنہاں ہوتا ہے۔ اعتراض سے ایک عارف انسان کی توجہ اس طرف منعطف ہوتی ہے اور وہ فکر و تدبر سے اس مخفی خزانہ کو پالیتا ہے۔ گویا اعتراض ایک کدال کی طرح اس دفینہ پر پڑتا ہے جس سے دبے ہوئے مخفی خزانے باہر نکل پڑتے ہیں۔ پس یہ ایمان جب تک نہ ہو قرآن کریم کو انسانی فلسفوں پر فضیلت اور برتری دینے کے لئے انسان تیار نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان میں وہ ایمان اور عرفان پیدا کیا جائے جو یقین کا مرتبہ رکھتا ہے۔

حضرت اقدس مرزا صاحب ازالہ اوہام میں فرماتے ہیں:-

"عزیزو! اس دنیا کی مجرد منطق ایک شیطان ہے۔ اور اس دنیا کا فانی فلسفہ ایک ابلیس ہے جو ایمانی نور کو نہایت درجہ گھٹا دیتا ہے۔ اور بے باکیاں پیدا کرتا ہے اور قریب قریب دہریت کے پہنچاتا ہے۔ سو تم اس سے اپنے تئیں بچاؤ اور ایسا دل پیدا کرو جو غریب اور مسکین ہو اور بغیر چون و چرا کے حکموں کو ماننے والے ہو جاؤ۔ جیسا کہ بچہ اپنی والدہ کی باتوں کو مانتا ہے۔"

اس قسم کا زندہ ایمان پیدا کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں (۱) ایک تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر ایسے تسلی بخش دلائل اور براہین پیش کئے جائیں جن کے آگے قلوب جھک جائیں۔

(۲) دوم خارق عادت نشانات آسمانی کے ذریعہ قرآن کریم کو منجانب اللہ ثابت کیا جائے اور یہ نشانات دو اقسام میں منقسم ہیں جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ سنریھم ایاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انه الحق (الشوریٰ) ہم ان لوگوں کو نشانات دکھائیں گے آفاق میں اور ان کے نفسوں میں یہاں تک کہ ان پر حق واضح ہو جائے۔ آفاق میں اس طرح کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کے منجانب اللہ ہونے پر ہر زمانہ میں سینکڑوں نشانات آسمانی اللہ تعالیٰ دکھاتا رہا ہے۔ اور نفسوں میں اس طرح کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی اتباع سے ہزارہا انسان ان تمام کمالات روحانی کے وارث ہوئے جن کا قرآن میں وعدہ تھا اور وہ تمام رُوحانی امور جو ظاہر نظر سے اَنہونی معلوم ہوتے تھے بطور حال متبعین کامل پر وارد ہو گئے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت مرزا صاحب کا بڑا زور اس امر پر تھا کہ قرآن کریم کا منجانب اللہ ہونا دنیا پر ثابت کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی سب سے پہلی معرکۃ الآرا تصنیف اسی امر پر شائع ہوئی اس کا نام ہی ہے براھین احمدیہ علے حقیت القراٰن والنبوۃ المحمدیہ۔ اس معرکۃ الارا تصنیف میں آپ نے قرآن کریم اور نبوت محمدیہ کے منجانب اللہ ہونے پر تین سو دلائل پیش کئے ہیں اور ان میں سے ایک بھی دلیل کے توڑنیوالے کو دس ہزار روپے کا انعام دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کتاب میں آپ نے دلائل کے علاوہ وہ نشانات آسمانی بھی پیش کئے ہیں جو قرآن کریم اور نبوّت محمدیہ کی تائید میں خدا کی طرف سے وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ اور وہ نشانات آفاقی اور انفسی دونو قسم کے ہیں۔ نشانات انفسی میں اپنی پیشگوئیوں اور روحانی مشاہدوں اور تجربوں کو پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی اتباع سے مَیں نے یہ تمام کمالات رُوحانی حاصل کئے اور اگر تعلق باللہ مذہب کی اصل غرض وغایت ہے تو مَیں نے قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی اتباع سے اس غرض وغایت کو حاصل کیا۔ اور دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں کہ اس مقام تک انسان کو پہنچا سکے پس اس زمانہ میں فقط اسلام ہی اکیلا زندہ اور سچا مذہب ہے جس کی اتباع سے خدا ملتا ہے۔

چنانچہ کس زور سے یہ اعلان فرماتے ہیں :-

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے
کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے
کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلاوے
یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے

ہم نے اسلام کو خود تجربہ کر کے دیکھا
نور ہے نور اٹھو دیکھو سنایا ہم نے
اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نُور نہ تھا
کوئی دکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے
تھک گئے ہم تو انہی باتوں کو کہتے کہتے
ہر طرف دعوتوں کا تیر چلایا ہم نے
آزمائش کیلئے کوئی نہ آیا ہر چند
ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے
آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے
لو تمہیں طورِ تسلی کا بتایا ہم نے

حضرت مرزا صاحب نے فقط یہی نہیں کیا کہ اسلام کے سچے اور زندہ مذہب ہونے پر اپنا مشاہدہ اور حالی تجربہ پیش کیا بلکہ تمام مخالفین اسلام کو چیلنج دیا کہ وہ آپ کے پاس آئیں اور آپ کی صحبت میں رہ کر اسلام کی صداقت کے تازہ بتازہ نشانات آسمانی دیکھیں اور آپ کے تجربات روحانی کو خود آکر مشاہدہ کریں۔ اور اگر کچھ نظر نہ آوے تو آپ اس کے بدلہ میں سزا کے طور پر اپنے گلے میں پھانسی کا رسہ ڈلوانے اور طالب حق کا وقت ضائع کرنے کے بدلہ میں اُسے روپے بطور تلافی نقصان دینے کو تیار تھے۔ کس زور سے فرماتے ہیں :-

اے مزوّر گر بیائی سوئے ما
وز وفا رخت افگنی در کوئے ما
در سرِ صدق و ثبات و غم خوری
روزگارے در حضور ما بری
عالمے بینی ز ربانی نشان
سوئے رحمان خلق و عالم را کشاں
گر خلافِ واقعہ گفتم سخن
راضیم گر تو سرم ببری ز تن
راضیم گر خلق بردارم کشند
از سر کیں با صد آزارم کشند
راضیم گر باشدم ایں کیفرے
خوں رواں بر خاک افتادہ سرے
راضیم گر مال و جان و تن رود
و آنچہ از قہم بلا بر من رود
لیک گر تو زیں سخن پیچی سرے
بر تو ہم نفرین ربّ اکبرے

زیں سخن ہا ھر کہ روگرداں بود
آں نہ مردے رہزنِ مرداں بود

یہ بڑا عظیم الشان چیلنج تھا جو سوائے ایک مجدد کامل اور عظیم الشان معرفت و روحانیت کے صاحب کے اور کوئی دے نہ سکتا تھا۔ اور یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے بڑے اربابِ عقل و بینش اور فلسفی اور دہریہ جو نام کے مسلمان تھے آپ کی صحبت میں آکر صاحب علم و معرفت بن گئے جن میں سے ایک خواجہ کمال الدین مرحوم بھی تھے۔ دہریہ تھے اور دنیوی مقاصد کے لئے عیسائی ہونے

کو تیار تھے جو براہین احمدیہ ان کی نظر سے گزری۔ یک مرتبہ ہی خیالات نے پلٹا کھایا۔ حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے فیضِ صحبت سے وہ معرفت اور ایمان حاصل ہوا کہ سینکڑوں روپے کی چلتی ہوئی وکالت چھوڑ کر انگلستان میں جا بیٹھے اور ووکنگ مشن قائم کر کے سینکڑوں انگریزوں کی ہدایت کا موجب ہو گئے۔ اور ایک خواجہ صاحب پر کیا منحصر ہے سینکڑوں فلسفی اور دہریئے اس مادہ پرستی اور دنیا طلبی کے زمانہ میں صاحب ایمان و معرفت بن گئے اور دین کے لیے اپنے تمام دنیوی مفاد قربان کر دیئے اور وہ خدمات دینیہ کر گزرے جن کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان میں سے ایک مولانا محمد علی صاحب بھی ہیں جو تحقیق مذاہب اور خدمات دینیہ کے سلسلہ میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ کون ہے جو حضرت مرزا صاحب کی صحبت میں کچھ عرصہ تک بیٹھا اور پھر اس نے اپنی استعداد اور مجاہدہ کے مطابق ان رُوحانی تجربات کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اور زندہ ایمان سے حصّہ نہیں لیا۔ یہی وہ ایمان تھا جو ثریا پر اٹھ گیا تھا اور ابنائے فارس میں سے ایک یعنی حضرت مرزا صاحب کے ذریعہ پھر دنیا میں واپس لایا گیا۔ الغرض حضرت مرزا صاحب کا بڑا زور اس بات پر تھا کہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر دلائل اور نشانات سے طالبانِ حق کے دلوں میں ایسا یقین پیدا کر دیا جائے کہ وہ انشراحِ صدر کے ساتھ قرآن کریم کے فلسفہ کو ہر ایک دنیوی فلسفہ پر ترجیح دینے لگ جائیں اور جہاں کہیں ان میں تضاد نظر پڑے وہاں ہراساں ہو کر قرآن کو اُس کے ماتحت نہ کریں بلکہ اس فلسفہ کو قرآن کے ماتحت کریں اور بڑے زور سے علمی تحقیقات میں لگ کر اس دنیوی فلسفہ کی غلطی کو طشت از بام کر کے خود اس کی اصلاح کریں۔ اس طرح نہ صرف ایمان اور معرفت و علم دینی میں ترقی ہو گی بلکہ دنیوی فلسفوں کی غلطیاں دُور ہو کر مادہ پرستوں کا رُخ بھی مذہب کی طرف عموماً اور اسلام کی طرف خصوصاً پھر جائے گا۔ اور اس طرح دین اور دنیا دونوں میں ترقی کا موجب ہو گا۔

حضرت مرزا صاحب کے جدید علم کلام کے نتائج

حضرت اقدس مرزا صاحب نے خدمتِ اسلام کے لئے جو نیا علم کلام پیدا کیا اُسے دو ہی حصّوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ایک تو حفاظت اسلام۔ (۲) دوسرے اشاعت اسلام

حفاظت اسلام کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں:-

(۱) ایک تو بیرونی دشمنوں کے حملوں سے اس کی حفاظت

(۲) دوسرے اندرونی مفاسد سے اس کی حفاظت

اشاعت اسلام کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک تو اسلام کے مسائل کی اپنے اصلی رنگ میں نہایت معقول طریق پر تعلیم دینا جس سے کسی عقلمند کو انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور یہ معقول رنگ کی تعلیم قرآن وحدیث سے بغیر کسی تاویل و تحریف معنوی کے پیش کی جاوے۔

(۲) وہ وسائل اختیار کئے جائیں جس سے اسلام کی اشاعت ہو۔

حفاظت اسلام

بیرونی دشمنوں سے اسلام کی حفاظت

(۱) سب سے پہلا اور سب سے بڑا دشمن اسلام کا بلکہ مذہب کا دہریت اور مادہ پرستی ہے۔ ہندوستان کے برہمو سماج اور دیو سماج اور یورپ کے مادہ پرستوں کے تمام نئے مذاہب نازی ازم، فیسی ازم، بالشوازم اسی ایک ذیل کے اندر آجاتے ہیں۔

(۲) دوسرا دشمن عیسائی مذہب ہے جس نے اس دہریت اور مادہ پرستی کی پرورش کی۔

(۳) تیسرا دشمن ہندو مذہب ہے۔ اس کے اپنے اندر تو سوائے بت پرستی اور توہمات کے کچھ نہیں اس کی انہی کمزوریوں کی اصلاح کے لئے دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ چونکہ اس مذہب کے اپنے اندر کوئی خوبی اور کمال باقی نہ رہا تھا اس لئے آریہ سماج نے اپنی زندگی اسی میں دیکھی کہ عیسائیت کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے دوسرے مذاہب بالخصوص اسلام پر حملے کرکے اپنے ماننے والوں کو ان سے متنفر کر دیا جائے۔ تاکہ اس طرح وہ اپنے آبائی مذہب کو ہی غنیمت سمجھ کر اس کے جوئے سے باہر نہ نکلیں۔

(۴) چوتھا دشمن سکھ مذہب تھا جو در اصل ہندو مذہب پر اسلام کے تاثرات کا نتیجہ تھا۔ یہ کوئی خاص مذہب نہیں۔ کیونکہ اس کے اپنے اندر کوئی قانون شریعت نہیں۔ یہ فقط تصوّف کی ایک شکل تھی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں اس نے ایک قومیت کا رنگ اختیار کرکے سیاسی رنگ میں مسلمانوں کو زیر کرنے کے لئے اسلام کی دشمنی اختیار کی۔

(۵) پانچواں دشمن بُدھ مذہب ہے۔ اس نے براہ راست تو اسلام پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ خود اس کے اندر سوائے بت پرستی کے اب کچھ باقی نہیں۔ البتہ فلسفیوں میں اس کے نروان کا فلسفہ

کسی حد تک مقبول سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے اصولی رنگ میں اس کی زد اسلام پر پڑتی ہے۔

(۶) چھٹا دشمن بہائی مذہب ہے جو دراصل اسلام کے شیعہ فرقہ سے پیدا ہوا ہے۔ مگر وہ اب اسلام سے علیحدہ ہو کر اسلام کو ایک بے ثمر مذہب بتاتا اور اس کی شریعت اور رسالت محمدیہ کو منسوخ قرار دیتا ہے۔

ان مذاہب کے علاوہ یہودی اور مجوسی مذاہب بھی ہیں۔ ایک تو وہ ہندو مذہب کی طرح ایک خاص قوم کے اندر محدود ہیں۔ کوئی تبلیغی مذہب نہیں اس لئے اسلام سے ٹکر نہیں کھاتے۔ دوسرے امتداد زمانہ سے اُن کی شکل بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ خود ان کے پیرو اپنے مذہب سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ پھر سیاسی رنگ میں ان کی پیرو قومیں اپنی ہستی کھو چکی ہیں۔ اس لئے گو یہودی اور مجوسی کتنے بھی مالدار کیوں نہ ہوں مگر اُن کے مذاہب کا دنیا میں عدم وجود برابر ہو گیا ہے۔ اس لئے ان سے خاص طور پر حفاظت کی ضرورت نہ رہی۔ دوسرے اصولی رنگ کی بحثوں میں اسلام کے مقابلہ میں یہ خود بخود شکست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ملک ہو یا مذہب اس کی حفاظت کیلئے دو طریق اختیار کئے جاتے ہیں۔ ایک تو مدافعانہ کارروائی۔ اور دوسرے جارحانہ کارروائی۔ جب تک یہ دو طریق اختیار نہ کئے جائیں مذہب کی حفاظت مکمل طریق پر نہیں ہوتی یعنی ایک تو غیروں کے اعتراضات کا جواب دیکر اپنی سچائی کو ثابت کیا جائے۔ اور دوسرے ان مذاہب پر حملہ کر کے ان کے بطلان کو ثابت کر دیا جائے۔ حضرت مرزا صاحب نے حفاظت اسلام کے معاملہ میں ہر دو طریق نہایت خوبی کے ساتھ استعمال فرمائے۔

اسلام کی حفاظت مدافعانہ

اسلام کی مدافعانہ حفاظت حضرت مرزا صاحب نے اس شان سے کی کہ جہاں بھی کسی نے اعتراض کی انگلی رکھی وہیں سے حضرت مرزا صاحب نے ایک علم و حکمت کا خزانہ نکال کر دکھا دیا۔ اور جو چیز اعتراض کی شکل میں نظر آتی تھی وہ یا تو خس و خاشاک کی طرح اُڑ گئی یا علم و حکمت کا دفینہ ثابت ہوئی جس کو معترض کی کوتاہ نظری اعتراض کی شکل میں دکھا رہی تھی۔ حضرت مرزا صاحب ہر اعتراض کا جواب تحقیقی اور الزامی دونوں رنگ میں دیا کرتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ محض الزامی جواب دینا کوئی خوبی نہیں۔ کیونکہ اس کے تو یہ معنے ہوئے کہ اگر کسی نے ہمیں کانا کہا تو بالمقابل ہم نے بھی اسے کہہ دیا کہ تم بھی تو کانے ہو تو پھر یہ تو ایک رنگ میں اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے فریق مقابل میں اسی کمزوری کو دکھا کر اس کے

منہ کو بند کر دینے کی کوشش ہوئی۔ مگر اس سے وہ اعتراض تو دُور نہ ہُوا۔ اگر وہ واقعی کوئی قابلِ اعتراض بات ہے تو وہ تو ویں کی وہیں قائم ہے۔ اتنا کہہ دینے سے کہ تم میں بھی تو یہی عیب ہے وہ عیب تو دُور نہ ہُوا۔ پس الزامی جواب دینا اس وقت مستحسن ہوتا ہے کہ جب پہلے تحقیقی جواب دیا جائے یعنی پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ یا تو وہ اعتراض ہی غلط اور محض افترا ہے۔ اور یا اگر کوئی امرِ واقعی اسلام میں ایسا موجود ہے جس پر یہ شخص معترض ہے تو ثابت کر دیا جائے کہ اس شخص کا اعتراض کرنا ہی غلطی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر صحیح نہیں بلکہ جو مسئلہ جس طرح اسلام میں ہے وہی بجائے خود مستحسن اور معقول ہے۔ اور جو کچھ اس کے خلاف کہا جاتا ہے وہ مذموم اور غیر معقول ہے۔ اس کے بعد اگر الزامی جواب کی ضرورت ہے تو دینے میں لطف ہے کیونکہ پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کمزوری اور عیب تم ہمارے متعلق پیش کرتے تھے وہ ہم میں تو موجود نہیں البتہ تم میں ضرور موجود ہے۔ حضرت مرزا صاحب کی تمام تصنیفات پڑھ جاؤ اس میں یہی رنگ پاؤ گے۔ دشمن کے حملوں کے جواب میں پہلے تو اس اعتراض کو تحقیقی رنگ میں لیتے کہ آیا ایسا کوئی مسئلہ اسلام میں ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اسے نہایت دلیری کے ساتھ آپ لیتے اور اسقدر زبردست تنقید اور تحقیق کے ساتھ بحث کرتے کہ اس پر دن چڑھا دیتے جس کی صداقت کے آگے ہر ایک عقلمند کو سر جھکانا پڑ جاتا۔ اور بحث ایسی سادہ اور منطقی پیچوں سے پاک الفاظ میں ہوتی کہ فلسفی اور عامی دونو قسم کے انسان یکساں مستفیض ہوتے۔ اس کے بالمقابل اگر معترض کے مذہب میں اس کے خلاف کچھ ہوتا تو اس کی لغویت کو آپ طشت از بام کر کے چھوڑتے۔ ایک دفعہ عیسائیوں کے اعتراضات کو جو اُنہوں نے اسلام پر کئے تھے جمع کئے تو وہ کئی ہزار تک پہنچ گئے۔ ان کو پڑھ کر کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی گھبراہٹ آپ کے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ آپ نہایت یقین اور طمانیت قلبی کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو اپنی مختلف تصانیف میں وقتاً فوقتاً اس خوبصورتی سے حل کر گئے ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کر اُٹھتا ہے۔ اور جیسا کہ مَیں پہلے عرض کر چکا ہوں آپ اپنے علم کلام کے ابتدا سے آخر تک پابند رہے کہ اعتراضات کے جوابات کی بنیاد ہمیشہ قرآن کریم کے دلائل پر ہُوا کرتی تھی۔ جس مسئلہ کو لیتے اسے زیرِ نظر رکھ کر سارا قرآن شروع سے آخر تک پڑھ جاتے اور اس مسئلہ کے متعلق آیات کو نوٹ کرتے جاتے۔ پھر ان آیات پر آپ کے مضمون کی بنا ہُوا کرتی تھی اس لئے اعتراض کا تحقیقی جواب بھی قرآن کی روشنی میں ہُوا کرتا تھا۔ اور اس مسئلہ میں معترض کے عقائدِ باطلہ کی تردید بھی قرآن کریم کی روشنی میں ہی ہُوا کرتی تھی جیسا کہ خود قرآن کریم کا اپنی نسبت دعویٰ ہے کہ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ (البقرہ)

کہ یہ قرآن تمام دنیا جہان کے لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔ اور اس میں ہدایت پر دلائل اور نشانات بھی ہیں اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا معیار بھی ہے۔ یعنی قرآن میں فقط یہی نہیں کہ اس میں تمام دنیا اور تمام زمانوں کے لوگوں کے لئے ہدایت کے عالمگیر قوانین اور اصولوں کو بیان کر دیا گیا ہے بلکہ جو ہدایت بھی دی گئی ہے اس پر دلائل اور نشانات بھی موجود ہیں۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ جو ہدایت دی ہے اسے دلائل سے مزین اور مبرہن کیا ہے بلکہ سچی ہدایت کا معیار قائم کر کے قرآنی ہدایات کے خلاف جو امر بھی کسی مذہب میں ہے اس کا بطلان ثابت کر کے حق و باطل میں تمیز کر کے بھی دکھا دیا ہے۔ غرضکہ قرآن ایک ایسی کامل و مکمل کتاب ہے کہ نہ صرف ہدایت دیتا ہے بلکہ ہدایت پر دلیل بھی خود ہی دیتا ہے اور اس ہدایت کے خلاف جو امر ہو اس کا بطلان بھی خود ہی کر دیتا ہے۔ اس کے لئے کسی اپنے ماننے والے کا منہ نہیں تکتا۔ قرآن کریم کے اس کمال کی طرف جس کی طرف سے تیرہ سو سال میں متکلمین اسلام کو ذہول رہا سب سے پہلے حضرت مرزا صاحب نے توجہ دلائی ہے۔ اور حضرت مرزا صاحب کے پیش کردہ علم کلام کی ہمیشہ کے واسطے کامیابی کا راز یہی ایک امر ہے کہ اس کی بنیاد یں قرآن کریم کے اٹل اور مستحکم دلائل پر قائم ہیں جن کو کوئی انسانی فلسفہ توڑ نہیں سکتا۔ فلسفے بدلتے رہتے ہیں اور مشاہدوں اور تجربوں کا غلط ہونا ممکن ہے لیکن خدا کے علم و حکمت اور اس کے پیش کردہ فلسفہ کا باطل ہونا ناممکن۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ کہ قرآن پر نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے۔ نہ ظاہری طور پر اور نہ باطنی طور پر نہ اب اور نہ آئندہ باطل کی زد پڑ سکتی ہے۔ یہ حق ہے جس پر باطل اگر آ کر پڑے گا تو اپنا سر تڑوائیگا۔ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق کہ جب حق اور باطل آپس میں ٹکراتے ہیں تو باطل کا سر ٹوٹ کر اس کا بھیجا نکل جاتا ہے اور وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ پس وہ علم کلام جس کی بنیادیں قرآنی فلسفہ پر استوار کی گئی ہیں قیامت تک نہیں ٹوٹ سکتا۔ اور اس خدمت دینی اور علم کلام کا دامن قیامت تک دراز ہے۔ اور اس لحاظ سے اگر کہہ دیا جائے کہ خلافت محمدیہ کے سلسلہ میں حضرت مرزا صاحب خاتم الخلفا تھے کہ آپ پر خلافت محمدیہ ختم ہو گئی ہے۔ اب ایسا کوئی خلیفہ محمدی نہیں آئے گا جو اس علم کلام کو بدل دے تو بالکل بجا ہے۔ اور یہ جو احادیث میں پیشگوئی تھی کہ آخری زمانہ میں مہدی کی جنگ شیطان سے ہوگی اور وہ ہلاک ہو جائیگا تو اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ بدی کی تحریک کرنیوالی ہستیاں ہی دنیا سے مٹ جائیں گی بلکہ اس کا مقصد یہی ہے کہ شیطان کے جو حملے اسلام پر ہیں ان کیلئے علم کلام کا وہ حربہ وجود میں آجائے گا جو شیطان کے حملوں کا ہمیشہ کیلئے علاج ثابت ہوگا۔

اسلام کی جارحانہ حفاظت

اسلام کی حفاظت نامکمل رہ جاتی اگر اس کے ساتھ جارحانہ رنگ نہ ہو یعنی حملہ کرنیوالوں پر خود حملہ کرکے ان کو میدان سے نہ بھگا دیا جائے۔ اور اسلام کی عظمت و شوکت صداقت اور غلبہ کے سامنے ان کی گردنیں نہ جھکا دی جائیں۔ اس لئے حضرت مرزا صاحب نے ان تمام طریقوں اور مذاہب پر جو اسلام پر حملہ کر رہے تھے خود حملہ کرکے ان کو نہ صرف میدان سے بھگا دیا بلکہ ہمیشہ کیلئے ان کا سر کچل دیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا ھو زاھق کہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں پھر وہ اس کا دماغ کچل دیتا ہے پھر باطل میدان سے بھاگ جاتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ یہاں ہؤا۔ میں نمبروار ان دشمنان اسلام مذاہب و طرق کو لیتا ہوں:۔

(۱) دہریت کا رد

دہریت کی بیخ کنی

(۱) دہریت اور مادہ پرستی کے حملوں کی حفاظت بہت سے مجددین و متکلمین اسلام کرتے آئے ہیں لیکن منطقی دلائل سے بڑھ کر اور کچھ نہیں پیش کر سکے۔ اور منطقی دلائل کی کیفیت اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف کے دلائل سنو تو وہ درست معلوم ہوتے ہیں۔ دوسری طرف کے دلائل سنو تو دل میں شبہ گزرنے لگتا ہے کہ شاید یہی صحیح نہ ہوں۔ پھر ہر زمانہ میں جیسے لوگوں کے فیشن اور لباس و ظاہری تمدّن میں تبدیلی آجاتی ہے اسی طرح خیالات اور مذاق بھی بدل جاتے ہیں۔ فلسفہ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ علم کلام بدل جاتا ہے۔ دلائل کی طرز بدل جاتی ہے۔ جو دلائل آج سے دو سو برس قبل بڑے مسکت اور معقول گنے جاتے تھے آج وہ بچّوں کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر مجدد بھیجتا رہا تا ہر زمانہ کے مذاق اور فلسفہ کے مطابق اسلام کی صداقت کو ثابت کرتا رہے۔ لیکن دہریت وہ چیز ہے کہ اگرچہ اس کے مقابلہ میں خدا کی ہستی پر دلائل نہایت معقول نظر آتے ہیں کائنات عالم پر نظر ڈالنے سے دل بول اُٹھتا ہے عقل تقاضہ کرتی ہے کہ اس کا کوئی خالق اور رب ہونا چاہیئے۔ لیکن جب تک مشاہدہ اور تجربہ یہ گواہی نہ دے کہ واقعی خدا جو اس ساری کائنات کا خالق اور رب ہے موجود ہے دل کو کما حقہٗ یقین اور اطمینان کلی نصیب نہیں ہوتا فلسفہ کی دوڑ فقط یہاں تک ہے کہ وہ کہدے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہونا چاہیئے لیکن وہ ہے بھی" اور اس کا تعلق بندہ کے ساتھ ہو بھی سکتا ہے۔ اس کا یقین سوائے

اہل حال کے مشاہدہ اور تجربہ کی شہادت کے اور کہیں سے نصیب نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مذہب اور خدا پرستی کی تلقین کے لئے ہمیشہ انبیا اور اولیا جیسے صاحب حال لوگوں کو منتخب کیا جنھوں نے اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے دنیا کے آگے گواہی دی کہ واقعی خدا ہے اور ہم نے اسے پا لیا ہے اور وہ ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ فلسفیوں سے کبھی خدا پرستی نہیں پھیلی۔ محض فلسفہ وہ یقین اور طمانیت انسانی قلب میں پیدا نہیں کر سکتا جو اہل حال کا مشاہدہ اور تجربہ پیدا کرتا ہے پس موجودہ زمانہ میں جبکہ دہریت اپنے پورے عروج و کمال پر ہے کیا ضروری نہ تھا کہ خدا کسی صاحب حال کو کھڑا کرتا جو دنیا کے سامنے اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے اعلان کرتا کہ خدا ہے اور میں نے خدا کو پا لیا ہے۔ اور وہ مجھ سے بولتا ہے اور اس طرح وہ خدا کی ہستی پر یقین اور ایمان کو دلوں میں مستحکم کر دیتا کیا یہ سچ نہیں کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے مذہب کی گرفت انسانی قلوب پر ایسی زبردست تھی کہ انسان مذہب کے جوئے کو اگر اتار پھینکنے کی کوشش بھی کرتا تو کر نہ سکتا تھا۔ خدا کی ہستی کا یقین اس کی فطرت میں رچا ہوا تھا لیکن آج یورپ کی مادہ پرستی کی چمک دمک اور ترقی و عروج نے دہریت کو ایک فیشن اور دانائی کا نشان قرار دے کر اس طرح اہل عالم کے سامنے پیش کیا ہے کہ کثیر تعداد میں تعلیم یافتہ طبقہ اس دجالیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس دجالیت نے جیسے جیسے انسانی قلوب اور ذہنیت کو مسخ کیا اور تصنع اور آرٹ سے فطرت انسانی کو دبایا۔ فطرت کی آواز بھی دبتی چلی گئی۔ لہذا مذہب کی گرفت اور خدا کی ہستی پر یقین بھی انسانی قلوب میں کمزور پڑتا چلا گیا اور بہت سے مادی تہذیب کے دلدادہ لوگ اس کی طرف سے آنکھیں اور کان بند کر کے دہریہ اور لامذہب بن کر رہ گئے اور جو دہریہ اور لامذہب نہ بنے ان کے قلوب میں بھی خدا پر ایمان کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مذاہب میں بھی بے عملی اور نفس پرستی اور دنیا طلبی کا دور دورہ ہو گیا۔ اس دنیا پرستی اور لامذہبی دہریت اور مادہ پرستی کو مٹانے کے لئے آج محض فلسفہ کافی نہ تھا۔ آج سائنس کا زمانہ ہے۔ سب سے زیادہ آج ہر شخص مشاہدہ اور تجربہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ آج جب دہریت کا زور ہے اور خدا کا انکار ہے تو اگر کوئی خدا ہے تو وہ کیوں اپنے آپ کو ظاہر کر کے دنیا کی ہدایت کا موجب نہیں بنتا۔ آج اس کی صفت ھادی کہاں چلی گئی۔ اگر اس کی مقدس ذات دنیا پرستوں کے قلوب سے تعلق نہیں پکڑ سکتی تو کیوں کسی ولی اور متقی انسان کے قلب پر تجلی نہیں فرماتا۔ پس اگر وہ اپنے آپ کو کسی طرح بھی نہیں ظاہر فرماتا تو کیوں نہ مان لیا جائے کہ یہ گزشتہ زمانہ کے مذہبی مقتداؤں کے حالات اور ان کے خدا سے تعلقات اور ان کے قلوب پر خدا کی تجلیاں محض ایک افسانہ ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔

اگر کوئی اصل ہے تو آج خدا کی وہ عادت کیوں بدل گئی۔ مانا کہ مذہب اسلام کی شکل میں اپنے کمال کو پہنچ گیا اور نبوت کی ضرورت ختم ہو گئی۔ لیکن کامل و مکمل مذہب کو قائم اور زندہ رکھنے کے لئے بھی تو ضروری ہے کہ خدا ہر زمانہ میں اپنے کسی بندہ کے قلب پر تجلّی فرماتا رہے۔ اور اپنے وجود کو آسمانی نشانوں سے ثابت کرتا ہے ورنہ مذہب ایک افسانہ کا رنگ پکڑ کے دنیا سے اور انسانی قلوب سے مٹ جائیگا۔ بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ تمام عالم میں دہریت اور لامذہبی کی ہوا چل رہی ہے۔ اور جب تک کوئی مذہبی فلسفہ سائنس کے رنگ میں مشاہدہ اور تجربہ کی شہادت اپنے ساتھ نہ رکھتا ہو قابل قبول نہیں رہا۔ عین اس وقت میں حضرت مرزا غلام احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ آواز کس قدر برمحل اور حسب ضرورت زمانہ تھی کہ خدا نے میرے قلب پر تجلّی فرمائی ہے اور وہ مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور مجھے مامور فرمایا ہے کہ میں دنیا کے سامنے اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر یہ اعلان کروں کہ خدا ہے اور وہ زندہ خدا ہے۔ وہ آج بھی اپنے آپ کو اپنے بندوں پر ظاہر فرماتا ہے اور اُن کی دعائیں سنتا اور اُن سے ہمکلام ہوتا ہے جس طرح گزشتہ زمانہ میں وہ اپنے بندوں سے ہمکلام ہوتا رہا۔ پس میں صاحب تجربہ اور صاحب حال ہوں۔ جو کچھ کہتا ہوں محض فلسفیوں کی قیل و قال سے نہیں کہتا بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کے رنگ میں خدا کی ہستی کو محسوس کرکے دنیا کے سامنے یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ میں نے اس زندہ خدا کو پا لیا ہے اور وہ اسلام کی اتباع سے ملتا ہے۔ جس کا دل چاہے میرے پاس آئے۔ اور حالی و قالی رنگ میں اپنی تسلی کرے۔ میں ایک دو حوالے پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں :-

> "میری ہمدردی کے جوش کا اصل محرک یہ ہے کہ میں نے ایک سونے کی کان نکالی ہے اور مجھے جواہرات کے معدن پر اطلاع ہوئی ہے اور مجھے خوش قسمتی سے ایک چمکتا ہُوا اور بے بہا ہیرا اس کان سے ملا ہے اور اس کی اس قدر قیمت ہے کہ میں اپنے ان تمام بنی نوع بھائیوں میں وہ تقسیم کروں تو سب کے سب اس شخص سے زیادہ دولتمند ہو جائیں گے جس کے پاس آج سب سے بڑھ کر سونا اور چاندی ہے۔ وہ ہیرا کیا ہے ؟ سچا خدا۔ اور اس کو حاصل کرنا یہ ہے کہ اس کو پہچاننا۔ اور سچا ایمان اس پر لانا اور سچی محبّت کے ساتھ اس سے تعلق پیدا کرنا۔ اور سچّی برکات اس سے پانا۔ پس اسقدر دولت پا کر سخت ظلم ہے کہ میں بنی نوع کو اس سے محروم رکھوں۔" (اربعین ۱)

پھر فرماتے ہیں :-

> "کیا بدبخت وہ انسان ہے جس کو اب تک پتہ نہیں کہ اس کا ایک خدا ہے جو ہر ایک چیز پر

قادر ہے۔ ہمارا بہشت ہمارا خدا ہے۔ ہماری اعلیٰ لذات ہمارے خدا میں ہیں۔ کیونکہ ہم نے اس کو دیکھا اور ہر ایک خوبصورتی اس میں پائی۔ یہ دولت لینے کے لائق ہے اگرچہ جان دینے سے ملے۔ اور یہ لعل خریدنے کے لائق ہے اگرچہ تمام وجود کھونے سے ملے۔ اے محرومو! اس چشمہ کی طرف دوڑو کہ وہ تمہیں سیراب کرے گا۔ یہ زندگی کا چشمہ ہے جو تمہیں بچا ئیگا۔ مَیں کیا کروں اور کس طرح اس خوشخبری کو دلوں میں بٹھادوں کس دف سے مَیں بازاروں میں منادی کروں کہ تمہارا یہ خدا ہے تا لوگ سن لیں۔ اور کس دوا سے مَیں علاج کروں تا سننے کے لئے لوگوں کے کان کھلیں۔" (کشتی نوح)

پس آج اس مادہ پرستی کے زمانہ میں جب مشاہدہ اور تجربہ پر تمام علوم کا مدار ہے اور محض علماء اور مشائخ کے قال اور فلسفیوں کے دلائل دلوں میں یقین اور تسلی نہیں پیدا کر سکتے۔ جب تک کہ کوئی صاحب مشاہدہ وتجربہ اہل حال اُٹھ کر یہ اعلان نہ کرے کہ مَیں نے ان راہوں پر عمل کر کے جو مذہب اسلام نے مجھے سکھائی ہیں اُس زندہ خدا کو پا لیا ہے جو اس تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اور جس کسی کا دل چاہے آئے اور میرے پاس رہ کر اپنی تسلی کرلے۔ سینکڑوں بار آپ نے اس دعوت کو پبلک میں مشتہر کیا۔ ایک مرتبہ نظم میں ارشاد فرمایا کہ ؎

اے مزوّر گر بیائی سوئے ما ... وز وفا رخت افگنی در کوئے ما
وز سرِ صدق وثبات و غم خوری ... روزگارے در حضورِ ما بری
عالمے بینی زربانی نشاں ... سوئے رحماں خلق و عالم راکشاں
گر خلافِ واقعہ گفتم سخن ... راضیم گر تو بسرم بُری زتن
راضیم گر خلق بردارم کشند ... از سرِ کیں با صد آزارم کشند
راضیم گر باشدم ایں کیفرے ... خوں رواں بر خاک اُفتادہ سرے
راضیم گر مال وجان وتن رُود ... وآنچہ از قسمِ بلا بر من رَوَد
لیک گر تو زیں سخن پیچی سرے ... بر تو ہم نفرینِ ربِّ اکبرے
زیں سخن ہا ہر کہ رُو گرداں بود ... آں نہ مردے رہزنِ مرداں بود

یہی وہ باتیں تھیں جس نے ہر ایک مذہب کی جو خدا کی طرف سے تھا بنیادیں مضبوط کر دیں۔ کیونکہ مذہب کی بنیاد جس چیز پر قائم ہے وہ خدا پر زندہ ایمان ہے۔ اگر خدا اور اس کی وحی پر ایمان نہ ہو۔ تو مذہب کی عمارت زمین پر دھڑام سے آگرتی ہے۔ حضرت مرزا صاحب کا یہ احسان تمام الہامی

مذاہب پر ہے کہ آپ نے اس زمانہ میں زندہ خدا کو پانے کا اور اس کی طرف سے وحی والہام کا دعوے کرکے اور اسی امر کو طرح طرح کے دلائل اور نشانات آسمانی سے ثابت کرکے ہر ایک الہامی مذہب کی صداقت پر مہر لگادی کہ ابتداءً ہر ایک مذہب جس کی بنا الہام پر ہے راستی اور حقیقت پر مبنی تھا۔ افترا نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی شکل امتداد زمانہ کی وجہ سے اس وقت مسخ ہو چکی ہو۔ لیکن جب وہ دنیا میں آیا تھا تو اس کا لانیوالا وحی والہام کا مدعی مفتری نہ تھا بلکہ راستباز تھا۔ آپ کا یہ وہ کارنامہ تھا جس سے معقول پسند اور محقق دہریوں کی گردنیں آپ کے آگے جھک گئیں اور خدا کا چہرہ اُنہیں نظر آگیا۔ اور آپ کی صحبت کے اثر سے اُن میں وہ خدا کی توحید اور معرفت پیدا ہوگئی کہ اپنے تمام دنیوی مقاصد قربان کرکے وہ خدا کے دین کی خدمت میں لگ گئے۔ اور سینکڑوں گم گشتگان بادیۂ ضلالت کی ہدایت کا موجب بن گئے۔ اُنہی میں سے ایک خواجہ کمال الدین مرحوم مسلم مشنری ووکنگ۔ (انگلستان) جن کی یورپ میں مشنری خدمات تمام عالم میں مسلّم ہیں۔ حضرت اقدس مرزا صاحب کی تعریف میں ایک نظم لکھتے ہوئے ایک شعر کیسے پتہ کا لکھتے ہیں:۔ اگر خواہی نشان بے نشانے + بیا کن مجلس باآں یگانے

برہمو سماج اور دیوسماج کا قلع قمع

غرضکہ اس طرح آپ نے دہریت اور مادہ پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور دیوسماج کی بنیادوں پر تبر رکھ دیا جو ہندو مذہب کے اندر دہریت اور انسان پرستی کی ایک شاخ ہے اور برہمو سماج کی غلط روش کا بھی قلع قمع کر دیا جو وحی والہام کا قائل نہیں ہے۔ آپ نے اپنے الہامات کو پیش کرکے بار بار برہمو سماج کو مخاطب کیا اور انہیں چیلنج دیا کہ جس کا دل چاہے میرے پاس آکر وحی و الہام کے متعلق تسلی کرے۔ میں اُسے حالی طور پر اس کا مزہ چکھانے کو تیار ہوں۔

مذہب کی لامذہبی پر فتح

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آپ نے فقط حالی طور پر ہی دہریت اور اس کی مختلف شاخوں کا رد کر دیا۔ بلکہ موجودہ زمانہ کے فلسفہ کے مطابق صدہا براہین و دلائل خدا کی ہستی، صداقت قرآن کریم و رسالت محمدیہ کے بارے میں دیئے جن کو سخت سے سخت نکتہ چین فلسفی کو بھی ماننے کے سوا چارہ نہیں۔ اور ان دلائل و براہین کے محکم اور زبردست ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے براہین احمدیہ میں ان دلائل کو دیتے ہوئے اشتہار دیا کہ جو ان دلائل میں سے کسی ایک دلیل کو بھی توڑ کر دکھا دے اس کو میں دس ہزار روپیہ کا انعام دینے کو تیار ہوں۔ اور یہ خدا کا فضل تھا کہ کوئی دہریہ یا مخالف اسلام ان دلائل کو توڑ نہ سکا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آخری حربہ دہریت کی جڑ پر جس کے بعد وہ سر نہیں اٹھا سکتی ان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ تھا کہ میں نے خدا کو پایا اور وہ مجھ سے بولتا ہے اس میں مذہب کی فتح لامذہبی اور دہریت پر تھی۔

اسلام کی فتح تمام دیگر ادیان پر لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور اعلان تھا جس میں اسلام کی فتح تمام دیگر ادیان عالم پر تھی وہ یہ کہ آپ نے ساتھ ہی یہ اعلان فرمایا کہ آج اس زندہ خدا کو جو تمام کائنات کا خالق و مالک ہے پانے کی راہ صرف اسلام میں ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلعم ہی وہ زندہ رسول ہیں جن کی خدا کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت قرآن کریم کی اتباع اور جن کے فیضان روحانیت کے ذریعہ انسان کو خدا ملتا ہے اور اس دروازے کے سوا باقی سب دروازے بند ہیں۔ آپ نے بڑا زور اس امر پر دیا اور فرمایا کہ میں نے اسلام کو خود تجربہ کر کے دیکھا ہے اور قرآن وسنت رسول اللہ کی پیروی سے اس خدا کو پا لیا ہے جو اس تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ پس میں علی وجہ البصیرت لوگوں کو اسلام کے زندہ خدا کی طرف بلاتا ہوں جس کا دل چاہے میرے پاس آئے اور تجربہ کر کے اپنی تسلی کرے۔ آج اسلام کے سوا کوئی مذہب ایسا نہیں جس کی پیروی سے خدا مل سکے۔ اگر کوئی مدعی ہے تو میرے مقابل پر آوے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کے سامنے کوئی ایسا مدعی نہ آیا۔ دور بیٹھے باتیں بناتے رہے مگر اس خدا کے شیر کے سامنے آنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ حضرت مرزا صاحب کی تحریروں کو پڑھو اس قسم کے اعلانات سے بھری پڑی ہیں۔ میں فقط یہاں بطور نمونہ آپ کی ایک نظم کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ۔ فرماتے ہیں ؎

ہم نے اسلام کو خود تجربہ کر کے دیکھا — نور ہے نور اٹھو دیکھو سنایا ہم نے
تھک گئے ہم تو انہی باتوں کو کہتے کہتے — ہر طرف دعوتوں کا تیر چلایا ہم نے
آزمائش کے لئے کوئی نہ آیا ہر چند — ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے
آؤ لوگو کہ یہیں نور خدا پاؤ گے — لو تمہیں طور تسلی کا بتایا ہم نے
آج ان نوروں کا اک زور ہے اس عاجز میں — دل کو ان نوروں کا ہر رنگ دلایا ہم نے
مصطفےٰ پر ترا بیحد ہو سلام اور رحمت — اس سے یہ نور لیا بار خدایا ہم نے
اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا — کوئی دکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے
کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے — یہ ثمر باغ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے

یہ وہ باتیں تھیں جنہوں نے تمام ادیان کے پیروؤں پر حجت تمام کر دی۔ زبانی دعوے خدا رسی کے ہر ایک مذہب کا پیرو کرتا ہے۔ لیکن اس طرح مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر صاحب حال بن کر دنیا کو للکارنا اور انہیں خدا اور رسولؐ کی طرف دعوت دینا یہ انہی لوگوں کا کام ہوتا ہے جو خدا کے ہاتھ سے پاک و صاف کئے جاتے اور اس کے دین کی خدمت کیلئے خدا کی طرف سے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ یہ کسی

مولوی مُلّا پیر فقیر کا کام نہیں۔ بلکہ یہ اُسی شخص کا کام ہے جو خدا سے تعلق رکھتا اور یقین و معرفت کے تمام مراتب طے کر کے خدا کی طرف سے اعلائے کلمۃ اللہ اور خدمت دین کیلئے کھڑا ہوتا ہے۔

اسلام کی فتح پر معترض خود مسلمان ہوئے!

یہاں مجھے اس بات کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مذہب کی یہ فتح اور پھر مذہبوں میں اسلام کی یہ فتح اگر خوشخبری تھی تو سب سے بڑھکر مسلمانوں کیلئے تھی لیکن افسوس ہے کہ سب سے زیادہ مسلمانوں کی طرف سے ہی اس پر اعتراض اور چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دہریت اور مادہ پرستی کا اثر طبائع پر اسقدر زبردست تھا کہ حضرت مرزا صاحب کا الہام کا دعویٰ عام طور پر مسلمانوں میں حقارت کی نظر سے دیکھا گیا اور صاف طور پر کہا گیا کہ مرزا صاحب نے وحی والہام کا جھگڑا کیوں ناحق درمیان کھڑا کر دیا۔ حالانکہ سچ پوچھو تو مذہب کی رُوح کو دوبارہ زندہ کرنے کیلئے وحی الٰہی پر ایمان کو زندہ کرنا از بس ضروری تھا۔ آج اس مادہ پرستی کے زمانہ میں مذہب سے انکار کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وحی الٰہی سے جو مذہب کے لئے بطور بنیاد کے ہے بکلی انکار ہے۔ موجودہ زمانہ کے جن فلاسفروں نے وحی کا اقرار کیا خواہ وہ مسلم تھے مثلاً سر سید احمد خاں مرحوم وغیرہ۔ یا غیر مسلم مثلاً مہاتما گاندھی وغیرہ اُنہوں نے بھی اُسے ایک اندرونی آواز سے بڑھ کر حیثیت نہیں دی یعنی یہ کہ وہ دل سے ہی اُٹھتی ہے اور دل پر پڑتی ہے۔ اس لئے حضرت مرزا صاحب کا جو اس صدی میں منصب مجددیت پر خدا کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے پہلا فرض تھا کہ وہ مذہب کی اس بنیاد کو مستحکم کرتے اور اس حقیقت کو واضح اور ثابت کر کے دکھاتے کہ سلسلۂ نبوت اور وحی والہام سچّا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا رہا ہے۔ اور چونکہ اس کی صفات دائمی ہیں اس لئے وہ آج بھی اپنے برگزیدہ بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نبوت ختم ہو گئی اور دین کامل ہو چکا لہٰذا وحی نبوّت بند ہو گئی کیونکہ اس کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن وحی ولایت باقی ہے یعنی مبشرات کے رنگ میں خدا کا انسان سے مکالمہ و مخاطبہ اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے تھا تا کہ سلسلۂ نبوت پر وہ ایک دلیل ہو۔ اور بندوں کی معرفت اور یقین اپنے کمال کو پہنچے۔ چنانچہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بڑا زور اس بات پر دیا کہ اور اس مادہ پرستی اور لامذہبی کے زمانہ میں بڑے زور سے یہ اعلان کیا کہ آج بھی وہ خدا بولتا ہے جیسا وہ پہلے زمانہ میں اپنے برگزیدوں سے بولا کرتا تھا۔ اور کھول کر سنایا کہ مَیں اس معاملہ میں صاحب تجربہ اور اہل حال ہوں اور ساتھ ہی اپنی رویا و کشوف اور الہامات کو پیش کیا جن میں آئندہ امور کی اطلاع دی گئی تھی اور ان کے سچا ثابت ہونے پر شہادتیں مہیا کیں اور تمام دہریہ اور مادہ پرستوں کو چیلنج کیا کہ وہ میرے پاس آویں اور

الہامات الٰہیہ کے سچا ہونے پر اپنی تسلی کرلیں اور ساتھ ہی اس بات کا بھی اعلان کیا کہ وحی الٰہی دل کی کسی اندرونی آواز کا نام نہیں بلکہ وہ خارج سے الفاظ میں آتی ہے اور انسان کے قلب پر نازل ہوتی ہے۔ ہاں وہ آواز اسی طرح خارج سے آتی ہے جس طرح ایک ٹیلیفون کی آواز خارج سے آتی سنائی دیتی ہے۔ البتہ وہ ایک روحانی ٹیلیفون ہے جسے قلب کا کان سنتا ہے۔ اسی طرح جیسے قلب کی آنکھ کشف کی حالت میں عین بیداری میں بعض دفعہ آنیوالے واقعات کو اور بعض دفعہ عالم باطن کے دوسرے نظاروں کو دیکھتی ہے۔ اور اس وحی والہام کے ذریعہ ایسے علوم غیبیہ پر اطلاع دی جاتی ہے جس کو جاننا انسان کی بساط سے باہر ہوتا ہے۔ اور بعض دفعہ الہام ہی میں سوال وجواب کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو بندہ اور اس کے رب کے درمیان جاری رہتا ہے۔ پھر خدا کے اس کلام کے ساتھ ایک عجیب شوکت اور نور ہوتا ہے اور ایسا یقین ہوتا ہے جو فولادی میخ کی طرح قلب میں گڑ جاتا ہے اور خدا کا فعل اسکی تائید کرتا ہے۔ یعنی جس طرح قبل از وقت کوئی امر بتایا جاتا ہے اُسی طرح ظہور پذیر ہوتا ہے اور اگر رستہ میں موانعات اور مشکلات حائل ہوں تو خدا تعالیٰ اپنی قدرت سے اُنہیں دور کرکے اپنے کلام کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے تب انسان کے اندر خدا کے کلام پر اور اس کی ہستی پر وہ زندہ ایمان پیدا ہوتا ہے جو تمام اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی جڑ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت اپنے کمال کو پہنچ کر انسان کو ان تمام انعامات اور ترقیات کا وارث بنا دیتی ہے جس کے لئے جناب الٰہی نے اسے پیدا کیا ہے۔ پس خدا کا مکالمہ ومخاطبہ ہی وہ شہادت حقہ ہے جس سے مذہب کی سچائی اور سلسلۂ نبوت پر دلیل قائم ہوتی ہے ورنہ جو بات بطور حال مشاہدہ اور تجربہ میں نہ آئے وہ افسانہ کے رنگ میں ہو جاتی ہے۔ اور انسان کو کسی یقین تک نہیں پہنچا سکتی۔

نازی ازم۔ فیسی ازم بالشوازم کا رد

پس حضرت مرزا صاحب نے مشاہدہ اور تجربہ سے وحی والہام کو ایک حقیقت ثابت کرکے دکھا دیا۔ اور یہ امر واضح کر دیا کہ مذہب کی بنیاد وحی والہام کے سوا دوسری نہیں ہو سکتی۔ جب خدا نے ہر ایک چیز کو پیدا کرکے اس کو اپنے مقصدِ تخلیق کے حاصل کرنے کے لئے ہدایت بھی دی۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ انسان کو پیدا کرکے اسے ہدایت نہ دیتا۔ چونکہ انسان صاحب عقل وتمیز ہے اور شعور اور ارادہ سے ہر ایک کام کو سمجھ کر کرنے اور نیکی وبدی میں تمیز کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ اس لئے خدا نے وہ ہدایت جس کے ذریعہ انسان اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کرکے خلیفۃ اللہ بن سکتا ہے (Instinct) کے رنگ میں اسے نہیں دی بلکہ بطور علم کے اُسے دی اور وحی والہام کے ذریعہ وہ علم اسے دیا گیا اور اُسے اس کے مقصد پیدائش سے باخبر کرکے اسے وہ تمام راہیں

بتا دیں جو رضائے الٰہی کا موجب اور خود اس کی تکمیل کا باعث ہیں اور اُسے دنیا میں چھوڑ دیا گیا تا وہ اپنی سمجھ اور سعی سے اس نصب العین کو حاصل کرے۔ اسی طرح حضرت مرزا صاحب نے یہ بھی ثابت کر کے دکھایا کہ آج وہ مقصد اور نصب العین اور ترقی و کمال انسانی فقط اسلام کے ذریعہ ہی نوع انسان کو مل سکتی ہے کیونکہ وہی ایک سچا اور کامل اور زندہ مذہب اس زمانہ میں موجود ہے تو پھر نازی ازم، فیسی ازم، بالشوازم وغیرہ جو الہام سے نہیں بلکہ محض دماغ کی جولانی سے معرض وجود میں آئے تھے خود بخود باطل ہو گئے۔ خود ان کا باہمی اختلاف ہی بتلاتا ہے کہ صحیح رستہ منزل مقصود کا اس اختلاف کے اندر ہی گم ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس قسم کا ماحول اور جیسی تعلیم ہوتی ہے اسی رنگ میں انسان کی ذہنیتیں ڈھلتی چلی جاتی ہیں اور انہی مقاصد کو جو اس قوم کے پیش نظر ہوتے ہیں حاصل کرنے کے لئے انسانی دماغ اپنے لئے ایک خاص طریق کار پسند کر لیتا ہے۔ پس اس قسم کے لوگ جو اپنے لئے خود قواعد بنا کر اُن پر عامل ہو جاتے ہیں ان کا نام مذہب رکھنا جائز نہیں ہو سکتا۔ مذہب تو خدا کی ہدایات کا نام ہے جو بذریعہ وحی والہام کے کسی نبی پر نازل ہوتی ہیں۔ انسان کے اپنے دماغی تخیل کا نام نہیں ہو سکتا۔ نازی ازم اور فیسی ازم اور بالشوازم وغیرہ انسانی دماغ کی اختراع ہیں۔ جب ان کے بالمقابل کوئی مذہب اور اصول ہوں جن کو کوئی خدا کا بندہ اُٹھ کر ثابت کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں اور ان کو دلائل عقلی اور نشانات آسمانی سے روشن اور مبرہن کر دے اور ثابت کر دے کہ انہی پر عمل کرنے سے دنیا کی نجات وابستہ ہے تو یہ انسانی اختراعات خود بخود باطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور آج تو خدا کے فضل نے نازی ازم اور فیسی ازم اور بالشوازم وغیرہ کی پیدا کردہ تہذیب اور اخلاق کا پردہ فاش کر دیا۔ اور موجودہ جنگ نے ان کے اصولوں کی بربریت اور غلطیوں کو طشت از بام کر دیا۔ اور یہ اس مرد خدا کی دعاؤں کا نتیجہ ہے جسے اس کام کے لئے خدا نے کھڑا کیا تھا۔ اس دعا کے نمونہ کے لئے حضرت اقدس مرزا صاحب کے چند اشعار میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ ؎

اے سر و جان و دل و ہر ذرّہ ام قربانِ تو
بر دلم بکشا ز رحمت ہر درِ عرفانِ تو

یک نظر فرما کہ تا کوتہ شود جنگ و جدال
خلق محتاج است سوئے جذبۂ برہانِ تو

یک نشاں بنما کہ تا نورت درخشد در جہاں
تا شود ہر منکرِ ملت محامد خوانِ تو

گر زمیں زیر و زبر گردد ندارم ہیچ غم
غم ہمیں دارم کہ گم گردد رہِ رخشانِ تو

گفتگو و بحث در دیں درد سر بسیار ہست
قصہ کوتاہ کن بہ آیاتِ عظیم الشانِ تو

از زلازل جنبشے دہ خطرتِ اغیار را
تا مگر آیند ترساں سوئے آں ایوانِ تو

چشمۂ رحمت رواں کن در لباس زلزلہ　　تابکے سوز و غم ایں بندۂ گریانِ تو

اللہ تعالیٰ سے جس زلزلہ عظیم کو یہاں طلب کیا ہے وہ یورپ کی پہلی اور اس دوسری جنگ کی شکل میں ایسا نمودار ہوا ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں۔ عربی زبان میں زلزلہ ہر ایک ایسی مصیبت کو کہتے ہیں جس سے ایک ہلاچلی مچ جائے اور انقلاب عظیم رُونما ہو جائے۔ چنانچہ اسی آفت کے متعلق حضرت اقدس مرزا صاحب اپنی ایک تحریر میں اس طرح ارشاد فرماتے ہیں :۔

"اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۵۶)

کیا موجودہ جنگ میں یہ الفاظ حرف بحرف پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ ایک اور نظم میں اس طرح آپ ارشاد فرماتے ہیں:

ہاتھ سے جاتا ہے دل دیں کی مصیبت دیکھ کر　　پر خدا کا ہاتھ اب اس دل کو ٹھیرانے کو ہے
اس لئے اب غیرت اسکی کچھ تمہیں دکھلائیگی　　ہر طرف یہ آفتِ جاں ہاتھ پھیلانے کو ہے
موت کی رہ سے ملیگی اب تو دیں کو کچھ مدد　　ورنہ دیں اے دوستو اک روز مر جانے کو ہے

پھر خدا کی غیرت نے جو "موت کا نشان" اس جنگ کی صورت میں دکھایا ہے جس سے نہ یورپ بچا اور نہ ایشیا۔ نہ بحرالکاہل کے جزائر کے رہنے والے۔ اور ابھی خدا جانے یہ "آفتِ جاں" کہاں تک ہاتھ پھیلائے گی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اس سے مادہ پرستی، دہریت، نازیت، فسطائیت، بالشویزم وغیرہ کی تمام تہذیب اور کلچر کی غلطیاں اور گمراہیاں واضح ہو گئیں اور آخر برنارڈ شا جیسا مبصر زمانہ چیخ اُٹھا کہ "اس زمانہ میں فساد اور اختلال دُور کرنے اور امن اور صلح پیدا کرنے کے لئے محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ڈکٹیٹر شپ کی ضرورت ہے"۔ اور وِدر اسلام (Wither Islam) کے فاضل مصنف کو کہنا پڑ گیا:۔ "کہ ہماری موجودہ تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اسلام کی رُوحانیت اس میں شامل نہ ہو"۔ آخر یہ کس کی فتح ہے۔ اسلام کی! اور کس کی دعاؤں کا نتیجہ ہے اُسی مرزا کی جس نے کہا تھا:۔ ؎

گفتگو و بحث در دیں دردِ سر بسیار ہست　　قصہ کوتہ کن بہ آیاتِ عظیم الشّانِ تو
از زلازل جنبشے دہ فطرتِ اغیار را　　تا مگر آیند ترساں سوئے آں ایوانِ تو

پھر دیکھیو۔ کس طرح ان زلازل سے متاثر ہو کر ان "اغیار" کی فطرت جنبش کھا رہی اور اسلام کی طرف آ رہی ہے۔ اور ابھی آئندہ کیا ہوگا یہ خدا کو علم ہے۔ مگر خدا سے خبر پا کر مرزا کہہ گیا ہے :۔

میرے دل کی آگ نے آخر دکھایا کچھ اثر
آ گئے ہیں اس زمیں پر آگ بھڑکانیکے دن

دوستو اُس یار نے دیں کی مصیبت دیکھ لی
آئیں گے اس باغ کے اب جلد لہرانیکے دن

اک بڑی مدت سے دیں کو کفر تھا کھاتا رہا
اب یقیں سمجھو کہ آئے کفر کو کھانیکے دن

دن بہت ہیں سخت اور خوف و خطر در پیش ہے
پر یہی ہیں دوستو اس یار کو پانیکے دن

دیں کی نصرت کیلئے اک آسماں پر شور ہے
اب گیا وقتِ خزاں آئے ہیں پھل لانیکے دن

(۲) عیسائیت کا رد

عیسائیت کا رد دوسرا نہایت زبردست دشمن اسلام کا عیسائیت ہے۔ عیسائی یہ خوب جانتے تھے کہ یہودیت اور مجوسیت ہندوازم اور بُدھ ازم سب قومی مذاہب ہیں جو اپنی اپنی قوموں میں اس طرح محدود ہیں کہ دنیا میں ان کی اشاعت اور غلبہ ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ کچھ تو ان مذاہب کی اصل شکل مسخ ہو کر ان میں جان نہیں رہی اور کچھ جن قوموں کے یہ مذاہب ہیں وہ سیاسی رنگ میں مغلوب ہو کر ان کی اہمیت مٹ گئی۔ عیسائی مذہب بھی اگرچہ قومی مذہب ہی تھا کیونکہ دراصل وہ بھی بنی اسرائیل کا ایک قومی مذہب بن کر دنیا میں آیا تھا۔ لیکن بنی اسرائیلی قوم نے اسے قبول نہ کیا پس اس کے حاملین نے اس کی زندگی اسی میں دیکھی کہ یورپ کی مشرک اور آفتاب پرست قوموں میں اسے پھیلائیں۔ اس لئے انہوں نے آفتاب پرستوں کے عقائد کے رنگ میں مسیحی مذہب کو ڈھال کر یورپ کے آفتاب پرستوں میں اُسے ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی۔ فقط اپالو جو سورج کا اوتار تھا اس کی جگہ مسیح کو رکھ دیا اور تمام اصول و عقائد وہی رہنے دیئے جو آفتاب پرستوں کے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی مذہب یورپ میں پھیل گیا اور یورپ کی سیاسی طاقتوں نے اسے دنیا کا ایک زبردست مذہب بنا دیا۔ اپنی پچھلی کامیابیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عیسائی مذہب کے حاملین نے اسے پھر تمام دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی۔ اس تگ و دو میں انہیں اپنا سب سے بڑا اور واحد حریف مذہب اسلام نظر آیا جس نے اس مسیحیت کی جو دراصل آفتاب پرستی کی ایک نئی شکل تھی نہایت سختی سے تردید کی اور جہاں اُس کا قدم گیا مسیحیت مٹتی چلی گئی۔ اس لئے پادریوں نے اپنا سارا زور اسی مذہب اسلام کی مخالفت میں صرف کر دیا۔ دلائل تو انکے پاس کوئی تھے نہیں کیونکہ سوائے آفتاب پرستوں کے توہمات اور گمراہ کن عقائد کے ان کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ خدا کا بیٹا اور اس کا دنیا کے گناہوں کے کفارہ کے لئے مصلوب ہونا یہ سب آفتاب پرستوں کے عقائد تھے۔ اس لئے اسلام جیسے توحید اور معقولیت کے

مذہب کے سامنے عیسائیت دلائل و براہین سے تو عہدہ برآ ہو نہیں سکتی تھی۔ پس انہوں نے جہاں تو سیاسی رنگ میں بس چلا مسلمانوں کو تلوار کے زور سے مٹایا اور جبر سے اسلام کی آواز کو دبایا جیسے اسپین میں۔ اور جہاں بس نہ چلا وہاں اسلام کی نسبت طرح طرح کی افترا پردازیوں اور بانیٔ اسلام پر طرح طرح کی بہتان طرازیوں سے لوگوں کو بدظن کرنے کی کوشش کی۔ درپردہ خود ان کے ہاتھوں میں آفتاب پرستی کا مذہب تھا۔ مگر مسیحی ممالک میں یہ مشہور کیا کہ اسلام آفتاب پرستی کا مذہب ہے۔ خود تو مسیح کو خدا بنا کر پوجتے تھے۔ اور مشہور یہ کیا کہ مسلمان محمد صاحب (صلعم) کا بُت پوجتے ہیں۔ کہاں تک بیان کیا جائے نعوذ باللہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاہ سے سیاہ تصویر جو ممکن ہو سکتی ہے انہوں نے نہایت دلیرانہ کذب و بہتان کی قلم سے تیار کی اور اسلام کی تعلیم کی طرف جسقدر جھوٹ اور دجل ممکن تھا منسوب کیا اور تمام مسیحی دنیا کی آنکھوں پر سینکڑوں برس تک پردہ ڈالے رکھا۔ آخر وقت آگیا اور جناب الٰہی نے اس طرف توجہ فرمائی اور اس دجل کا سر کچلنے کے لئے اس زمانہ میں محمد رسول اللہ صلعم کے ایک غلام کو کھڑا کیا۔ جیسا کہ خود حضرت اقدس مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔ ؎

چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند — مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند

چونکہ اس قوم نے حضرت مسیح کو بڑھا کر خدا بنانے اور سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی توہین کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلعم کے ایک غلام کو اللہ تعالیٰ نے مسیح کا مثیل بنا کر کھڑا کر دیا جس نے بانگ دہل تمام مسیحی دنیا میں یہ اعلان کر کے ہل چل ڈال دی کہ ؎

چوں کافر از ستم بپرستند مسیح را — غیوریٔ خدا بسرش کرد ہمسرم

پھر آنحضرت صلعم کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔ ؎

چوں زمن آید ثنائے سرورِ عالی تبار — عاجز از مدحش زمین و آسمان و ہر دو دار
آں مقام قرب کو دارد بدلدار قدیم — کس نداند شان آں جز واصلانِ کردگار
صد ہزاراں یوسفے بینم دریں چاہِ ذقن — واں مسیح ناصری شد از دم او بیشمار

حضرت مرزا صاحب کا وار مذاہب کی جڑ پر ہوا کرتا تھا

مختلف مذاہب پر تنقید کرتے ہوئے یوں تو سینکڑوں مسائل سامنے آتے رہتے تھے جن پر حضرت مرزا صاحب کا قلم چلتا اور حق و باطل میں امتیاز ہوتا چلا جاتا۔ لیکن حضرت مرزا صاحب کا خاص حربہ یہ تھا کہ آپ جس مذہب باطل کو لیتے اس کی جڑ پر وار کرتے۔ قاعدہ ہے کہ جب جڑ کٹ جاتی ہے تو شاخیں خود بخود خشک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے آپ عام علما کی طرح محض فروعات کی بحثوں میں پڑ کر وقت کو ضائع نہیں کیا کرتے تھے۔ آپکا وار خاص

طو... جڑ پر ہوا کرتا تھا یہی طریق آپ نے مسیحیت کے بطلان کے لئے اختیار کیا۔ آپ نے مسیحی مذہب کی بنیاد دو باتوں پر قائم شدہ پائی۔ ایک تو مسیح کی خدائی۔ دوسرے کفارہ کی غلط تعلیم۔

(۱) مسیح کی خدائی کی تردید

مسیح کی خدائی کی تردید تین طریق پر ہی ہوسکتی تھی:۔ (۱) ایک تو مسیح کی سوانح زندگی پر تنقید (۲) اس کے آسمان پر بجسدہ العنصری صدہا سال سے بغیر کسی تغیر و تبدیلی کے زندہ چلے آنے کی تردید (۳) تیسرے نوع انسان میں اُس جیسے اور انسانوں کی موجودگی۔ مَیں یہاں وہ تمام بحثیں نقل کرنے کو تیار نہیں جو اس امر میں حضرت مرزا صاحب نے کیں۔ کیونکہ جو بحثیں حضرت مرزا صاحب کی تصنیفات میں صدہا صفحوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ ایک مختصر سے رسالہ میں کس طرح سما سکتی ہیں۔ اس کے لئے اصل تصنیفات کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پس مَیں صرف یہاں مختصر اشارات پر اکتفا کروں گا۔

(۱) حضرت مرزا صاحب نے حضرت مسیح کی اس سوانح زندگی پر جو کسی زید و بکر کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ عیسائیوں کے مسلمات کے مطابق اُن کی الہامی کتب انجیلوں میں درج ہے تنقید کی ہے اور اس تنقید میں مسیح کی خدائی کے وہ پرخچے اُڑائے ہیں کہ پادری تو پادری ہمارے مولوی چیخ اُٹھے کہ اس میں مسیح کی ہتک ہوتی ہے اس پر حضرت مرزا صاحب کو لکھنا پڑا کہ ہم حضرت عیسٰی کو خدا کا برگزیدہ اور سچا رسول مانتے ہیں۔ ہماری تنقید فقط اس انجیلی یسوع کی زندگی پر ہے جس کو بطور خدا کے عیسائی پادری پیش کرتے ہیں ہم کو فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ آخر جس شخصیت کو تم خدا بنا کر پیش کرتے ہو اس میں کونسی بات ہے جس سے اسکی خدائی ثابت ہوسکتی ہے۔ بلکہ تمہاری اس پیش کردہ زندگی پر نظر ڈالنے سے وہ ایک کامل انسان بھی ثابت نہیں ہوتا چہ جائیکہ خدا۔

(۲) دوسرے حضرت مرزا صاحب نے مسیح کو وفات یافتہ اور سرینگر میں مدفون ثابت کرکے ان کی خدائی پر ایسی زد ماری جس سے مسیحیت کی جڑ کٹ گئی۔ مسلمانوں میں بعض فلسفی مسیح کے وفات یافتہ ہونے کے قائل ضرور گزرے ہیں مگر جس شد و مد اور نمایاں طریق پر دلائل و براہین سے مزین کرکے حضرت مرزا صاحب نے اس مسئلہ کو پیش کیا ہے وہ آج تک کسی نے پیش نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ مسیح کے مرنے سے عیسائیت مرگئی۔ گو اس وار سے پادریوں کے ساتھ ہمارے مولوی بھی تڑپے مگر ان کی کچھ پیش نہ گئی اور ان کی مذبوحی حرکتوں سے کچھ نہ بنا یہاں تک کہ آخر وہ ٹھنڈے ہوکر رہ گئے۔ اور مسیح کی وفات دلوں میں ایسی مسلّم ہوکر رہ گئی کہ آج کوئی مولوی حیات مسیح کی تائید میں بات کرنے کی بھی جرأت نہیں کرتا۔ یہ وہ زد تھی جس سے مسیحیت پر موت طاری ہوگئی کیونکہ مسیح آسمان پر بجسدہ العنصری بغیر کسی تغیر و تبدل کے زندہ ہونا اسکی

خدائی پر سب سے بڑی اور اہم دلیل تھی۔ کیونکہ الآن کما کان اور حی وقیوم ہونا خدائی صفات ہیں جن سے مسیح کو متصف کر رکھا تھا۔ جب یہ صفات نہ رہیں تو خدائی بھی ختم ہوگئی۔

(۲۸) حضرت مرزا صاحب کے دعوئ مسیحیت کی بڑی وجہ بھی اسی مسیح کی خدائی کو توڑنا تھا۔ کیونکہ جب نوع انسان میں اور لوگ بھی مسیح کے ہم مرتبہ ہو سکتے ہیں تو پھر مسیح کی خدائی تو خود بخود ٹوٹ گئی۔ چنانچہ حضرت اقدس ایک شعر میں اس نکتہ کو حل فرما گئے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

چوں کافراز ستم بہ پرستد مسیح را　　　غیورئ خدا بسرش کرد ہمسرم

مسلمان ناحق خفا ہوتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب نے مجدّدیت کے ساتھ دعوئ مسیحیت کیوں کیا۔ حالانکہ مسیح تو فقط ایک لقب ہے اصل منصب تو مجددیّت کا ہی ہے۔ حدیث علماء امّتی کانبیاء بنی اسرائیل کے ماتحت حضرت نبی کریم صلعم کی اُمت کے علماء ربانی جب مثیل انبیاء بنی اسرائیل ہیں تو اس امت کے ایک مجدّد نے اگر عیسائیوں کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کر دیا تو کیا قیامت آگئی کہ تم کیا مسیح کی خدائی لئے پھرتے ہو۔ میرے سیّد مولیٰ آنحضرت صلعم کی اتباع کی طفیل آپ کے سینکڑوں اُمتی مسیح کے رتبہ پر پہنچ گئے جن میں سے ایک مَیں بھی ہوں۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم کی تعریف میں آپ فرماتے ہیں :۔ ؎

صد ہزاراں یوسفے بینم دریں چاہِ ذقن　　　واں مسیح ناصری شد از دمِ او بیشمار

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں۔ ؎

دمبدم روح القدس اندر معینی مے دمد　　　من نمی گویم مگر من عیسئ ثانی شدم

حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　　دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

جان کل با جانِ جزء آسیب کرد　　　عقل از وُ دُرّے ستد درجیب کرد
ہمچو مریم جاں ازاں آسیبِ جیب　　　حاملہ شد از مسیح دلفریب
آں مسیحے نے کہ برخشک و تراست　　　آں مسیحے کز مساحت برتراست
پس زجانِ جاں چو حامل گشت جاں　　　از چنیں جانے شود حامل جہاں
پس جہاں زائد جہانے دیگرے　　　ایں حشر را وانماید محشرے

یعنی خدا کے ساتھ جب بندہ کی جان کا تعلق ہو جاتا ہے تو بندہ مریم کی طرح حاملہ ہو جاتا ہے

اور اس سے ایسا مسیح پیدا ہوتا ہے جو مسیح اسرائیلی سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔ پھر ایسے مسیح کے فیض روحانی سے ایک جہان حاملہ ہوجاتا ہے اور اس سے دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ الغرض اُمت محمدیہ میں سینکڑوں بزرگ گزر چکے ہیں جن کو یہ مقام مسیحیت حاصل تھا۔ لیکن حدیثوں میں بطور پیشگوئی کے ایک مسیح کی آمد کی خاص طور پر پیشگوئی تھی جس کا کام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسیحیت کی تردید اور کسرِ صلیب فرمایا تھا۔ اس کے مدعی حضرت مجدد وقت مرزا صاحب تھے۔ ظاہر ہے کہ کسرِ صلیب اور تردید مسیحیت کے لئے اگر کوئی زمانہ موزون تھا تو یہی موجودہ زمانہ ہی ہو سکتا ہے جبکہ مسیحیت کے گمراہ کن عقاید اپنے پُورے عروج پر تھے۔ پس عین وقت پر وہ موعود مسیح محمدی آیا۔ اور زبردست دلائل کے ساتھ مسیحیت کو ہلاک اور صلیب کو توڑ گیا۔ اور حق بھی یہی ہے کہ کسی مذہب کی موت دلائل سے ہی ہُوا کرتی ہے۔ تلوار سے نہیں ہوتی۔ چنانچہ قرآن کریم بھی یہی فرماتا ہے کہ:۔ لیھلك من هلك عن بيّنة ويحيٰى من حىّ عن بيّنة (الانفال) کہ کسی مذہب کی موت دلائل سے ہی وقوع میں آتی ہے۔ اور کسی مذہب کی زندگی وصداقت دلائل ومعقولیت پر مبنی ہُوا کرتی ہے۔

(۲) کفارہ کی تردید کفارہ کی تعلیم یہ تھی کہ مسیح تمام گنہگاروں کے گناہوں کو اپنے سر پر اُٹھا کر مصلوب اور ملعون ہُوا۔ اور جو اس واقعہ پر ایمان لائے گا وہ گناہوں اور ان کی پاداش سے نجات پا جائیگا حضرت مرزا صاحب نے اُسے پانچ طریق سے توڑا۔

ا۔ ایک تو ان واقعات تاریخی سے جو انجیل میں اور دیگر کتب تاریخ میں مستند طور پر موجود ہیں یہ ثابت کرکے دکھا دیا کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔ بلکہ زندہ اُتار لیا گیا۔ چنانچہ بعد میں وہ بھیس بدل کر یروشلیم کے باہر علاقہ میں پھرتا اور اپنے شاگردوں سے ملتا اور کھاتا پیتا رہا۔ اور اس کے بعد وہاں سے ہجرت کرکے افغانستان اور کشمیر میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش کرتا اور ان میں تبلیغ کرتا ہُوا ۱۲۰ سال کی لمبی عمر پاکر اپنی طبعی موت سے فوت ہُوا پس جب صلیب پر نہیں مرا تو ملعون نہ ہُوا۔ اور جب ملعون نہ ہُوا تو کفارہ باطل ہوگیا۔

ب۔ دوسرے آپ نے **لعنت** کا صحیح مفہوم لغت سے یہ ثابت کیا کہ کسی شخص کا خدا سے بیزار اور اس کا دشمن ہوجانا اور خدا کا اس شخص سے بیزار اور اس کا دشمن ہوجانا اور اس کو راندۂ درگاہ کردینا پس اگر مسیح کی نسبت یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ صلیب پر مر کر ملعون ہُوا تو اس کے یہ معنے ہوئے کہ اس وقت مسیح خدا کا دشمن اور اس سے بیزار ہوگیا تھا۔ اور خدا مسیح کا

سخت دشمن اور اس سے بیزار ہوگیا تھا۔ اور اسے نعوذ باللہ راندۂ درگاہ قرار دیدیا تھا۔ فرمایئے اس سے بڑھ کر مسیح کی کیا توہین ہوسکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یادری لعنت کو کوئی طوق یا بوجھ سمجھتے ہیں کہ جب جی چاہا پہن لیا یا اٹھالیا۔ اور جب جی چاہا اُتار دیا۔ حالانکہ وہ ایک قلبی کیفیت اور ذہنیت کا نام ہے جو گناہوں کی وجہ سے کسی شخص میں پیدا ہو جاتی ہے پس مسیح کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا کہ ان کی ذہنیت کچھ عرصہ کیلئے ایسی ہوگئی تھی کہ وہ خدا سے بیزار اور اس کے دشمن ہوگئے تھے اور خدا بھی ان سے بیزار اور دشمن ہوگیا تھا نہایت ناپاک اور نامعقول اور غلط عقیدہ ہے۔ خدا اس سے پناہ میں رکھے۔ پس جب مسیح کا نعوذ باللہ ملعون ہونا ممتنع ہے تو کفارہ باطل ثابت ہوگیا۔

ج۔ تیسری بات یہ کہ کفارہ کا عقیدہ خدا کی صفت عدل اور رحم کے خلاف ہے۔ کسی گناہ کی ایک گنہگار کو سزا دینا عدل ہے۔ معاف کر دینا رحم ہے۔ مگر گناہ کی سزا بیگناہ کو دینا ظلم ہے کفارہ کے عقیدہ کے مطابق خدا نے نہ تو سزا گنہگار کو دی تا اسے عدل کہتے اور نہ اُسے معاف کیا تا اُسے رحم کہتے بلکہ اپنے بے گناہ بیٹے مسیح کو گنہگاروں کے بدلہ پھانسی پر چڑھا دیا۔ یہ صریح ظلم ہے۔ اگر کہو کہ وہ خود خدا تھا جو پھانسی پر اپنی مرضی سے چڑھ گیا تو کسی گنہگار کو سزا نہ دینا اور اس کے بدلہ خودکشی کرلینا کیا کوئی معقولیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ گنہگار کا گناہ تو اپنی جگہ بغیر سزا کے یا معافی کے رہ گیا اور خدا نے خودکشی کرکے ایک گناہ کا نعوذ باللہ اور اضافہ کردیا۔ خدا کی اس غیر معقول خودکشی سے گنہگار کو یا اس سوسائٹی کو کیا نفع ہوا جس کا وہ گنہگار ایک فرد تھا۔ مثلاً کوئی شخص اگر چوری کرے تو اس کی اصلاح اور سوسائٹی کے فائدہ کے لئے اسے سزا دینی چاہیئے۔ یا کسی وجہ سے وہ اگر معافی کے قابل ہو تو تنبیہ کرکے معاف کردینا چاہیئے۔ لیکن اگر بجائے ان امور کے جج اپنے آپ کو پستول مار کر خودکشی کرلے تو عقلمند دنیا اسے کیا سمجھے گی یہی کہ اس کا دماغ خراب تھا۔

د۔ چوتھی بات حضرت مرزا صاحب نے یہ فرمائی کہ بغیر کسی دلیل کے محض کفارہ کی خاطر عیسائیت نے انسانوں میں گناہ کو موروثی مانا ہے۔ اس کے نزدیک آدم اور حوا نے گناہ کیا جو بنی آدم میں ورثہ کے طور پر آیا۔ آدم اور اس کی اولاد کے لئے اس گناہ کی سزا جو بائیبل میں لکھی ہے وہ یہ ہے کہ مرد محنت اور ماتھے کے پسینہ سے روزی کمائے گا اور عورت دردِ زہ سے بچہ جنے گی۔ اگر کفارہ ایک سچا عقیدہ ہے تو ضروری تھا کہ مسیح کے مصلوب اور ملعون ہوجانے کے بعد

کفارہ پر ایمان رکھنے والے عیسائی مردوں کو محنت سے روزی نہ کمانی پڑتی اور عیسائی عورتیں دردِ زہ سے بچہ نہ جنتیں۔ لیکن جب گناہ کی سزا بدستور مسیحی مردوں اور عورتوں میں بھی موجود اور قائم ہے تو ظاہر ہے کہ کفارہ باطل ہے۔ جب گناہ کی سزا سے نجات ہی نہ ملی تو کفارہ پر ایمان رکھنے کا کیا فائدہ ہُوا۔ پس جس طرح یہ عقیدہ غلط ہے کہ گناہ ایک موروثی چیز ہے (کیونکہ گناہ خدا کی نافرمانی کا نام ہے جس کا ہر ایک شخص انفرادی طور پر بجائے خود ذمہ وار ہے کیونکہ ہر ایک انسان صاحب ارادہ وعقل وتمیز ہے) ویسے ہی یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ مسیح کے مصلوب اور ملعون ہونے پر ایمان لانے سے گناہ کی سزا سے نجات ہو جاتی ہے۔ یعنی کفارہ باطل ہے۔

۵۔ پانچویں بات حضرت مرزا صاحب نے یہ فرمائی کہ اگر یہ کہو کہ کفارہ سے انسان کو خود گناہ سے نجات مل جاتی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح نجات مل جاتی ہے۔ کیا گناہ کرنے کی قوت انسان کے اندر سے مفقود ہو جاتی ہے یا اس کا یہ مطلب ہے کہ گناہ کرتے جاؤ اور انکی سزا نہیں ملتی۔ اگر گناہ کرنے کی قوت انسان کے اندر سے مفقود ہو جاتی ہے تو عیسائیوں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ فسق وفجور اور گناہوں اور سیاہ کاریوں میں کیوں مبتلا ہیں۔ اور اگر مطلب یہ ہے کہ گناہوں کی سزا نہیں ملتی تو اس سے بڑھ کر گناہوں اور سیاہ کاریوں پر انسان کو دلیر کرنے والا اور کوئی عقیدہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کہہ دیا جائے کہ بیشک گناہ کرتے جاؤ فقط مسیح کے کفارہ پر ایمان لاؤ تو تم کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند ایسے گمراہ کن عقیدہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ لہٰذا کفارہ کی لغویت ظاہر ہے۔

جو کچھ عیسائیت کی تردید میں حضرت مرزا صاحب نے لکھا ہے وہ تو ایک دفتر ہے آپ نے طرح طرح سے مسیحیت کی جڑوں کو کاٹا ہے۔ میں نے تو یہاں مشتے نمونہ از خروارے موٹی موٹی چند باتوں کو مختصراً لکھ دیا ہے جس نے دیکھنا ہو آپ کی اصل کتابیں نور القرآن (ہر دو حصّہ) انجام آتھم، ضمیمہ انجام آتھم جنگ مقدس، اور سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب، چشمہ مسیحی وغیرہ ملاحظہ کرے۔

آپ کے ہاتھوں کسرِ صلیب کا وہ عظیم الشان کارنامہ ظہور میں آیا جس سے مسیحیت کی موت کی گھنٹی بج گئی۔ علاوہ دلائل کے آپ کی توجہ رُوحانی کا یہ اثر تھا کہ خود مسیحی ممالک میں لوگوں کے دلوں میں مسیحیت مر کر رہ گئی۔ اور تثلیث اور کفارہ سے قلوب بیزار ہو گئے۔

(۳) آریہ سماج کا رد

آریہ سماج کا خروج

آریہ سماج ہندو مذہب کی ہی دوسری شکل ہے جو دیانندجی نے موجودہ زمانہ کے مطابق پیدا کی۔ ہندو مذہب ایک حد درجہ کا شرک و بت پرستی، توہم پرستی اور ذات پات کے امتیاز سے بھرا ہوا مذہب ہے جس کو کوئی عقلمند اس زمانہ میں قبول نہیں کر سکتا۔ دیانند جی نے دیکھا کہ تھوڑے عرصہ میں ہندو یا تو مسلمان ہو جائیں گے یا عیسائی۔ اگر تو سلطنت اور سیاست میں دخیل ہونا چاہیں گے تو عیسائیت کو قبول کرنا مفید رہے گا اور اگر مذہبی تحقیقات کی طرف مائل ہوئے تو اسلام کی توحید اور اخوت و مساوات ان کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔ مذہبی حیثیت سے عیسائیت کا انہیں زیادہ ڈر نہ تھا۔ کیونکہ وہ خود شرک اور تثلیث اور بڑے اور چھوٹے کے امتیاز کے اندر گھرا ہوا تھا۔ انہیں سب سے زیادہ خطرہ مذہب اسلام سے ہوا۔ دیانند جی کے اپنے مذہب میں تو کچھ تھا نہیں جسے اسلام کے مقابلہ میں اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے اس لئے دیکھئے انہوں نے نجات اسی میں دیکھی کہ پادریوں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے اسلام پر طرح طرح سے ناپاک افترا پردازیاں کی جائیں اور اپنی کوشش اس امر پر صرف کر دی جائے کہ کسی طرح ہندو قوم اسلام سے متنفر ہو جائے۔ اُن کا نقطۂ نظریہ تھا کہ جب اسلام سے ہندو متنفر ہو جائیں گے پھر وہ کہیں باہر نہیں جا سکتے چاروناچار ہندو رہیں گے۔ اسلام کی بڑی نمایاں خصوصیت تھی توحید الٰہی اور مساوات و اخوت انسانی۔

دیانند جی کو مساوات و اخوت انسانی کا ڈر نہ تھا۔ کیونکہ ہزارہا سال سے ہندو مذہب ذات پات کی زنجیروں سے ایسا مقید تھا کہ ہندوؤں کے دماغ میں مساوات و اخوت انسانی جیسا پاکیزہ اور معقول عقیدہ گھس بھی نہیں سکتا تھا اس لئے دیانند جی نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا بلکہ اس کی تائید کی۔ البتہ توحید الٰہی ایسا عقیدہ تھا جو دلوں کو کھینچتا تھا اس کے لئے انہوں نے ترکیب یہ کی کہ پہلے تو ہندوؤں کے کل شاستروں کو سوائے چار وید کے مسترد کر دیا۔ پھر اس میں اگنی، وایو، جل، سورج، چاند وغیرہ کی پرستش کی مشرکانہ تعلیم کی طرح طرح سے تاویلیں کر کے توحید الٰہی کو قائم کرنا چاہا۔ مگر ساتھ ہی اس زمانہ کی مادہ پرستی سے متأثر ہو کر مادہ اور رُوح کو پرمیشر کی طرح ازلی ابدی غیر مخلوق مان کر بجائے ایک خدا کے تین خدا قائم کر دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رُوح کو بھی کوئی مادہ کی قسم ہی سمجھا۔ کیونکہ ایک مرتبہ تناسخ کا ذکر کرتے ہوئے

انہوں نے بتایا کہ روح جب کسی انسان کے جسم سے نکل جاتی ہے تو وہ اُوپر جا کر ٹھنڈی ہو کر شبنم کی طرح کسی سبزی ترکاری پر گرتی ہے اور وہ سبزی ترکاری کوئی عورت کھا لیتی ہے اور حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دیانند جی رُوحانیت سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کی نظر مادیات سے باہر نکل نہ سکی۔ روح کو ازلی ابدی اور مادہ سے الگ ایک ہستی مان تو لیا مگر جب اس پر کچھ لکھنے بیٹھے تو اسے مادہ کی ایک شکل بخارات آبی کی طرح بنا دیا جو ٹھنڈی ہو کر سبزی ترکاری پر گرتی ہے اور جسے عورت کھا لیتی ہے اور اس طرح وہ روح دوسرا جنم لے لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ روح کے متعلق یہ کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے۔ اگر بجائے عورت کے اس سبزی ترکاری کو کوئی مرد کھالے تو کیا بنے۔ روح کے متعلق ان کا یہ غلط علم تو ظاہر ہی ہے لیکن مادہ کے متعلق بھی ان کا علم کسی کتاب الٰہی پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ اس زمانہ کی مادی سائنس کا مقلد تھا۔ اس زمانہ میں سائنس دان لوگ (atoms ذرات مادی کو ازلی ابدی سمجھتے تھے۔ دیانند جی نے بھی انہی کا تتبع کیا۔ گو انہوں نے اس عقیدہ کو منسوب ویدوں کی طرف کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ویدوں میں اس کے متعلق کچھ بھی نہ تھا۔ ویدوں میں ایک پیپل کے درخت کا ذکر تھا جس پر دو پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک پرندہ اس پیپل کی پیلیاں کھا رہا تھا اور دوسرا اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ دیانند جی نے خدا جانے کس طرح اس سے یہ عقیدہ اخذ کر لیا کہ پیپل کا درخت تو مادہ ہے اور ایک پرندہ جو پیلیاں کھا رہا ہے روح ہے اور دوسرا جو منہ دیکھ رہا ہے ایشور جی مہاراج ہیں پس تینوں ازلی ابدی ہیں۔ دیانند جی نے یہ عقیدہ کس طرح اخذ کر لیا کچھ معلوم نہیں۔ ویدوں میں کہیں نہیں لکھا کہ اس سے یہ مراد ہے۔ پس ظاہر ہے کہ یہ زبردستی کی تاویل مادی سائنس کو سامنے رکھ کر دیانند جی نے کی تھی کہ تا مادہ پرست ہندو خوش ہو جائیں۔ لیکن اب مصیبت یہ پڑی کہ دیانند جی تو مر گئے۔ مادی سائنس والوں نے اپنی تھیوری بدل لی انہوں نے ذرات مادی کے ازلی ابدی ہونے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ یہ غلط اور غیر معقول عقیدہ آریہ سماج کی پیشانی پر داغ کی طرح باقی رہ گیا۔

آریہ سماج کا رد حضرت اقدس مرزا صاحب کے زمانہ میں دیانند جی زندہ تھے۔ انہوں نے جب اپنے ان نئے عقائد کا پرچار شروع کیا تو حضرت مرزا صاحب نے ان عقائد کی غلطیوں کو افشا کرنا شروع کر دیا۔ ان کو مقابلہ پر بھی بلایا مگر وہ طرح دے گئے۔ آریہ پنڈتوں سے مباحثے بھی ہوئے۔ اسلام پر ان کے اعتراضات کا حضرت اقدس نے نہایت معقول اور دندان شکن جواب بھی دیا۔ لیکن ابھی آریہ سماج پر جارحانہ حملہ باقی تھا اس کیلئے آپ نے اپنی عادت کے مطابق آریہ مذہب کی جڑ پر

ہاتھ ڈالا۔ ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد دو امور پر ہوتی ہے (۱) ایک تو حق اللہ یعنی خدا کی توحید اور صفات کا صحیح علم (۲) حق العباد یعنی انسان کے باہمی حقوق میں عدل و انصاف اور تقویٰ۔

حضرت مرزا صاحب نے آریہ سماج کو انہی دونو معیار پر رکھکر اسکی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں:۔

حق اللہ میں تو آپ نے خدا کی توحید اور صفات اور تناسخ کو لیا۔ اور حق العباد میں ذات پات کے امتیاز، اور عورت مرد کے باہمی تعلقات کو لیا۔

(۱) خدا کی توحید اور صفات میں آریہ سماج کی ٹھوکر

ظاہر ہے کہ جس مذہب کی تعلیم میں خدا کی توحید اپنی مکمل حالت میں نہ ہو اور اس کی صفات میں نقص لازم آتا ہو وہ مذہب خدا کی طرف سے تو نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً کسی انسان کے دماغ کا تخیل ہے۔ ہندو مذہب کی مشرکانہ تعلیم تو اظہر من الشمس ہے۔ ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے علاوہ عیسائیوں کی طرح خدا کو تین بڑے حصوں میں ہندو مذہب نے تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک تو برہما، دوسرے وشنو، تیسرے شو اس تثلیث کو جب دیانندجی توڑنے کھڑے ہوئے تو فقط اتنا کر سکے کہ ایک تثلیث کو توڑ کر دوسری تثلیث میں جا پھنسے۔ یعنی برہما، وشنو، شو کو تو ہندو شاستروں کے صریح الفاظ کے خلاف خدا کی تین صفات قرار دیکر ان سے مخلصی حاصل کی لیکن مادہ پرستوں کی فرضی تصویری کے سامنے جو بعد میں غلط ثابت ہوئی سر تسلیم خم کر دیا اور ایک اور تثلیث قائم کر دی۔ یعنی پرمیشر، مادہ، روح تین چیزوں کو ازلی ابدی غیر مخلوق مان لیا۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے یہیں سے پکڑا۔ انہوں نے فرمایا کہ جب یہ تینوں ہستیاں اپنی اپنی جگہ اپنے تمام گن اور خواص کے ساتھ غیر مخلوق اور ازلی ابدی اور اپنی ذات میں قائم ہیں تو پھر یہ تین خدا ہوئے کیونکہ خدا کی سب سے بڑی یہی صفت ہے کہ وہ غیر مخلوق ازلی ابدی قائم بالذات اور اپنی صفات کیلئے کسی دوسری ہستی کا محتاج نہیں۔ جب یہی صفات مادہ اور روح میں بھی ہیں تو وہ تینوں خدا ہوئے جو اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے علیحدہ اپنی اپنی ذات میں قائم اور اپنی اپنی صفات سے متصف اور ان کے لئے وہ کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک نابود ہو جائے تو اس کی وجہ سے دوسرے کو کوئی نقصان نہیں۔ مثلاً آج اگر پرمیشر نابود ہو جائے تو اس سے مادہ اور روح کی ہستیوں کو کوئی نقصان نہیں۔ اور یہ پرمیشر کی زبردستی ہے کہ مادہ اور روح پر ناحق قبضہ کر رکھا ہے اور ان سے اپنی پرستش کرواتا ہے ورنہ جب تینوں اپنی اپنی جگہ قائم بالذات غیر مخلوق اور ازلی ابدی ہیں اور اپنے خواص اور گن میں کسی اور ہستی کے محتاج نہیں تو پرمیشر کا حق کیا ہے کہ ان پر زبردستی قبضہ کرے۔ بلکہ آزادی کا تو تقاضا یہ ہے کہ ایسی ناحق اور زبردستی کی حکومت کو مادہ اور روح ملکر اتار پھینکیں۔ جب ان کے

خواص اور گُن اُن میں ازلی ابدی چلے آتے ہیں اور پرمیشر کے پیدا کردہ نہیں ہیں تو پرمیشر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مادہ اور رُوح کے فطرتی میلان اور خواص تو وہی مل جُل کر اس کائنات کی شکل کو پیدا کر سکتے ہیں تو پرمیشر کی ہستی فقط ایک زائد ہستی ہے جو خواہ مخواہ اپنی حکومت کا ڈنکا بجاتی اور ان بیچاروں سے جو اسی کی طرح دوسری ہستیاں ہیں اپنی پرستش کرواتی ہے۔ پس جب پرمیشر کی ہستی ایک زائد ہستی ہے تو اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھ آتی۔ جب مادہ اور رُوح اور اس کے کل خواص اور گُن جن سے یہ کائنات بن رہی اور چل رہی ہے غیر مخلوق اور ابدی ہیں تو پرمیشر کی ہستی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ دراصل یہ دہریوں کی تھیوری تھی۔ اور اس کا نتیجہ صاف طور پر دہریت ہے۔ اس عقیدہ سے خدا کی ضرورت قطعاً باقی نہیں رہتی اور نہ ہی اس کی ہستی پر کوئی دلیل باقی رہ جاتی ہے۔ پس دیانندجی نے آریہ سماج میں جو خدا کی توحید قائم کی وہ توحید کے بجائے تثلیث ہے اور ایسی تثلیث ہے جس سے کھلم کھلا دہریت پیدا ہوتی ہے۔

اور خدا کی صفات کا یہ حال ہے کہ اسے مادہ اور رُوح کا محتاج قرار دیکر لیے اس کی خدائی سے جواب دیدیا۔ خدا کی سب سے بڑی صفت اس کی صمد صفت ہے یعنی وہ کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔ اور سب اس کے محتاج ہیں۔ لیکن دیانندجی نے خدا کی صفت یہ بتلائی۔ کہ مادہ اور رُوح تو اپنی پیدائش اور خواص اور گُن کے لئے خدا کے محتاج نہیں۔ لیکن خدا ضرور محتاج ہے۔ مادہ اور رُوح کا۔ اگر مادہ اور رُوح نہ ہوں تو وہ ان کے بغیر کچھ بھی نہیں پیدا کر سکتا اور جب وہ کچھ بھی نہیں پیدا کر سکتا تو وہ خدا کاہے کا ہُوا۔ آج مادہ اور رُوح الگ ہو جائیں تو خدا صاحب کی خدائی ختم ہو جائے حضرت اقدس مرزا صاحب نے کیا خوب فرمایا کہ دیانندجی نے خدا کی صفات کو انسان پر قیاس کر لیا۔ جس طرح انسان جب تک کوئی مادہ نہ ہو کوئی چیز بنا نہیں سکتا۔ اسی طرح دیانندجی نے فرض کر لیا کہ جب تک مادہ اور رُوح نہ ہو خدا بھی کچھ نہیں بنا سکتا۔ لیکن انسان اپنے ہر ایک فعل کیلئے دو ذرائع کا محتاج ہوتا ہے ایک ذریعہ اس کے اندر درکار ہوتا ہے اور دوسرا اس سے خارج میں مثلاً انسان دیکھتا ہے تو اس کے لئے اس کے اندر آنکھ کی احتیاج ہے اور دوسرے خارج میں روشنی اگر ان دونوں ذرائع میں سے ایک نہ ہو تو وہ دیکھ نہیں سکتا۔ اسی طرح انسان سُنتا ہے تو اس کے لئے اس کے اندر ایک تو کان کی احتیاج ہے اور دوسرے خارج میں ہوا۔ ورنہ انسان سُن نہیں سکتا۔ اسی طرح انسان کوئی کام کرتا ہے تو اس کے لئے بھی دو ذرائع درکار ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کے جسم میں ہاتھ ہونا چاہیئے اور دوسرے خارج میں کوئی مادہ۔ غرضکہ اپنی ہر ایک صفت کو فعل میں

لانے کیلئے انسان ان دو قسم کے ذرائع کا محتاج ہے۔ تو دیانندجی نے انسان پر قیاس کرکے جب خدا کو مادہ کا محتاج بتایا تو پھر ضروری ہے کہ وہ ہاتھ کا بھی محتاج ہو۔ پس خدا کو جسم لازم آیا۔ اسی طرح خدا دیکھتا ہے، خدا سنتا ہے تو ان دو نو صفات کو معرض وقوع و فعل میں لانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہے کہ دیکھنے کے لئے بھی خدا کو اپنے اندر آنکھ اور خارج میں روشنی کی احتیاج ہے اور سننے کے لئے اپنے اندر کان اور خارج میں ہوا کی احتیاج ہے۔ ورنہ وہ نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ کیونکہ جب ہم نے خدا کی صفات میں دوسری چیزوں کی احتیاج کو تسلیم کر لیا تو خدا کی خدائی یعنی اُس کی بے احتیاجی تو اُڑ گئی۔ اگر اس کی کسی ایک صفت کو وقوع فعل میں لانے کے لئے انسان کی طرح کسی دوسری چیز کی احتیاج ہے تو پھر اس کی ہر ایک صفت پر سے امان اٹھ گیا۔ اور اس کی ہر ایک صفت کو فعل میں لانے کے لئے دوسری چیزوں کی احتیاج ثابت ہو گئی۔ پھر وہ خدا کاہے کا ہوا ایک عاجز اور محتاج انسان ہوا۔ اور درحقیقت اس کی وجہ یہ ہوئی کہ دیانندجی کو خدا کی صفات کا صحیح علم نہ تھا ورنہ اگر یہ دیانندجی کو بھی مسلم تھا کہ انسان کو دیکھنے کے لئے آنکھ اور روشنی کی اور سننے کے لئے کان اور ہوا کی احتیاج ہے اور خدا کو دیکھنے اور سننے کے لئے ان چیزوں کی احتیاج نہیں۔ تو پھر انسان کو اگر کسی چیز کے بنانے کے لئے ہاتھ اور مادہ کی احتیاج ہے تو خدا کو ان چیزوں کی احتیاج کیوں ہو؟ دیانندجی یہ تو مانتے ہیں کہ خدا کو ہاتھ کی تو احتیاج نہیں لیکن ساتھ ہی اپنے مسلمات کے خلاف یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کو مادہ کی احتیاج ہے۔ دراصل یہ مادہ پرستی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ان کا ماخذ علم کوئی خدا کی کتاب ہوتی تو وہ ایسی خطرناک ٹھوکر نہ کھاتے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا مادہ پرستوں کے نظریہ کو سامنے رکھ کر لکھا اس لئے خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کر دیں جن سے خدا کو خدائی سے جواب مل جاتا ہے۔

غرضیکہ خدا کی توحید اور صفات کی اس حقیقت کو طشت از بام کرکے حضرت مرزا صاحب نے آریہ سماج کی جڑھ کو کاٹ کر رکھ دیا۔

(۲) تناسخ کا رد تناسخ کے مسئلہ میں بھی حضرت اقدس مرزا صاحب نے ایک عجیب طرح روشنی ڈالی۔ انہوں نے فرمایا کہ آریوں کا عقیدہ یہ ہے کہ روحوں کی تعداد محدود ہے۔ پرمیشر نئی روح پیدا نہیں کر سکتا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے پرمیشر نے ہر ایک روح کو اس کے گناہوں کی پاداش میں آواگون کے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ اور چکر بھی اس غضب کا کہ ایک گناہ کے بدلہ میں ایک لاکھ چوراسی ہزار جون بھگتنی پڑتی ہے۔ جب تک یہ جونیں ختم ہوں ہزاروں اور گناہ اسے اسی چکر میں ڈالے رکھنے

کے لئے وجود میں آجاتے ہیں۔ غرضکہ یہ چکر ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اور یہ خطرناک چکر محض اس خاطر ہے کہ پرمیشر کی خدائی قائم رہے۔ ورنہ اگر یہ غریب روحیں کسی طرح مکتی حاصل کر کے ان چکروں سے نکل جائیں تو پھر اور روحیں کہاں سے آئیں جن سے خدا کی خدائی چلے۔ پس روحوں پر اس زبردستی قبضہ اور ان کو آواگون کے چکر میں پھنسائے رکھنے کا مقصد یہ نکلا کہ خدا کی خدائی چلتی رہے۔ کیا اسی کا نام انصاف ہے۔ اپنی خدائی کو چلانے کے لئے اس قسم کا ظلم کرنا کیا انصاف کہلائے گا۔ آریہ سماج کے عقائد میں خدا میں رحم کی صفت تو پہلے ہی نہیں مانی جاتی۔ ایک شخص گناہ کر کے خدا کے سامنے ہزار رونے دھوئے توبہ کرے اپنی اصلاح کرے لیکن خدا کو اس پر رحم نہیں آتا وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ اسے نہیں چھوڑیگا جب تک اُسے ایک لاکھ چوراسی ہزار جونوں میں نہ ڈال لے پس خدا میں رحم تو پہلے ہی نہیں مانا جاتا۔ اور انصاف کا یہ حال ہے کہ یہ فی گناہ ایک لاکھ چوراسی ہزار جونوں کا چکر چلا رکھا ہے تا پرمیشر کی خدائی قائم رہے تو یہ تناسخ کی تھیوری محض ظلم اور جبر کی داستان بن کر رہ گئی۔ نہ کہ عدل اور انصاف کی۔

دنیا میں اختلاف کیوں ہے لے دیکھئے تناسخ کی تائید میں یہ پیش کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اختلاف کیوں ہے اور اسے اعمال کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات کے ماتحت حضرت مرزا صاحب نے یہ بتایا کہ دنیا کا اختلاف اعمال کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس اختلاف کا نتیجہ اعمال ہیں۔ اگر دنیا میں اختلاف نہ ہوتا تو عمل کا وجود ہی نہ ہوتا۔ دیکھو تو۔ اختلاف کی ابتدا فطرت کائنات میں ہے نہ کہ نتیجۂ عمل۔ ابتدا کی طرف نظر ڈالو۔ تو سورج، چاند، زمین سب میں اختلاف ہے۔ ان کے دائرۂ گردش میں اختلاف ہے۔ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو وہ آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جاتے۔ پھر زمین پر نظر ڈالو۔ جمادات میں اختلاف ہے۔ نباتات میں اختلاف ہے۔ حیوانات میں اختلاف ہے۔ انسان میں مرد و عورت میں اختلاف ہے انسان کی طبائع اور ان کے رجحان و میلان میں اختلاف ہے۔ اگر یہ اختلاف نہ ہوتے تو قسم قسم کے اناج اور غلہ و اجناس اور پھل اور ترکاریاں کہاں سے آتیں۔ طرح طرح کے جانور جو انسان کیلئے ضروری ہیں کہاں سے آتے۔ مرد و عورت کا باہمی اختلاف نہ ہوتا تو بقائے نسل انسانی کہاں سے ہوتی۔ اگر انسانی طبائع میں اختلاف نہ ہوتا تو مختلف پیشے اور مختلف طریق کار جن پر تمدن انسانی کی بنا ہے کہاں سے آتے۔ الغرض اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو انسان کے لئے دائرہ عمل کہاں سے آتا۔ ان اختلافات کا ہی نتیجہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کے کام آتا اور اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ پس اختلاف پہلے ہے اور اعمال پیچھے ہیں دنیا کا اختلاف عارضی اور وقتی ہے۔ ہر ایک شخص کو الگ الگ

ماحول اور علیحدہ علیحدہ حالت میں رکھ کر اس کے لئے ایک دائرہ عمل تجویز کر دیا گیا ہے جس میں اس نے خدا کی رضا کے ماتحت چل کر اپنے مقصد تخلیق کو حاصل کرنا ہے۔ اس کی موجودہ حالت مقصد نہیں بلکہ مقصد عمل ہے۔ مثلاً اگر ایک جماعت کے بچوں کا امتحان اس امر میں لینا ہو کہ انہیں سو تک گننا آتا ہے یا نہیں۔ تو ان میں سے بعض بچوں کو تو ہیرے گننے کو دیدیئے جائیں اور بعض بچوں کو کنکر گننے کو دیئے جائیں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان بچوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ممتحن کا اصل مقصد گننا ہے۔ ہیرے اور کنکر ان بچوں کی ملکیت نہیں وہ محض گننے کو دیئے گئے ہیں ان کو بخش نہیں دیئے گئے۔ جب وہ گن لیں گے تو ان سے واپس لے لئے جائیں گے۔ اسی طرح خدا نے انسان کو عمل کیلئے مختلف اعضا اور قویٰ دیئے ہیں۔ جو کچھ دیا ہے تھوڑا یا بہت۔ گھٹیا یا بڑھیا۔ اس میں اصل مقصد عمل ہے کہ جسے پیدا کیا گیا اور جسے یہ اعضا اور قویٰ دی گئی ہیں وہ اپنے خالق اور مالک کی مرضی کے مطابق اپنے دائرہ کے اندر ٹھیک عمل کرتا ہے یا نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اس سے یہ چیزیں لے لی جائیں گی۔ اور وہ مر کر اس زندگی کو اختیار کرے گا جو اس کے عملوں کا نتیجہ ہوگی۔ اگلی زندگی کے لئے اس کے ساتھ عمل جائے گا۔ یہ دنیا کی چیزیں یہیں رہ جائیں گی۔ ممکن ہے ایک غریب اس عارضی زندگی میں اچھے عمل کر کے اگلے جہان میں ہمیشہ کیلئے اعلیٰ زندگی کا وارث ہو جائے اور ایک امیر اس عارضی زندگی میں بُرے عمل کر کے اگلے جہان میں دکھ کی زندگی میں مبتلا ہو جائے۔ پس یہ عالم دار العمل ہے اور اگلا عالم دار الجزا۔ اس عالم کا اختلاف عمل کیلئے ہے اور اسی لئے یہ عالم عارضی اور فانی ہے اور اگلے عالم کا اختلاف عمل کا نتیجہ ہوگا اور اسی لئے وہ عالم ابدی اور غیر فانی ہے۔

غرض کہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے طرح طرح سے قدامت روح و مادہ اور تناسخ کی دھجیاں اڑا دیں۔ اوپر کی عبارت تو محض ایک دو دلیلوں کا خلاصہ ہے۔ جس کا دل چاہے اصل کتب مثلاً سرمہ چشم آریہ۔ شحنۂ حق۔ نسیم دعوت۔ آریہ دھرم وغیرہ کا ملاحظہ کریں۔

(۳) ذات پات کا امتیاز ہندوؤں میں خواہ وہ سناتن دھرم ہوں یا آریہ ذات پات کا امتیاز اس قدر زبردست ہے کہ اسے ہندوؤں کا کوئی ریفارمر توڑ نہ سکا۔ سیاسی رنگ میں جنہوں نے اس کی کچھ پردہ پوشی کرنی چاہی بھی تو وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اسلام کی حریت و مساوات کو پیش کر کے اس ظلم و بے انصافی کے اصول کی لغویت کو خوب نمایاں کیا۔ آپ نے اسے عالمگیر رنگ میں پیش کیا جس سے ان مسلمانوں کی بھی اصلاح مدنظر تھی جن کے دماغ میں ہندوؤں کی تقلید سے اپنی ذات پات کی بڑائی سما گئی تھی۔ آپ نے قرآن کریم کی آیت کو پیش کیا کہ یا ایھا الناس

انا خلقنٰکم من ذکرٍ و انثیٰ وجعلنٰکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیمٌ خبیرٌ (الحجرات) "اے انسانو! بیشک ہم نے تم کو پیدا کیا مرد اور عورت سے اور ہم نے تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ تحقیق تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ بیشک اللہ کامل علم والا اور پوری طرح خبر رکھنے والا ہے" یہاں صاف بتا دیا کہ نوع انسان میں قبائل اور ذات پات محض ایک دوسرے کی شناخت کے لئے ہے۔ ورنہ سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ خدا کے نزدیک بڑائی اور عزت اور شرافت کا معیار انسان کا عمل ہے جو سب سے بڑھ کر متقی ہے خدا کے نزدیک وہی سب سے بڑھ کر معزز ہے۔ اور ہر ایک کے عمل اور تقویٰ کا پورا پورا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ وہاں چالاکی اور ظاہر داری سے کام نہیں چل سکتا یا خاندان کی دنیوی بڑائی کام نہیں دے سکتی۔ نہ کسی بڑے آدمی یا بزرگ کی اولاد ہونا کام آسکتا ہے۔ غرضیکہ حضرت مرزا صاحب نے اسلام کی حریت و مساوات دکھا کر آریہ سماج اور اہل ہنود کی ذات پات کے ظلم و بے انصافی کو خوب نمایاں کر کے ثابت کیا کہ جو مذہب اس قسم کی ذات پات کے امتیاز کو ضروری قرار دیتا ہے وہ مذہب انسان کے خالق و مالک عادل منصف خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔

(۴) نیوگ نوع انسان میں مرد و عورت کا باہمی جنسی تعلق بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک یہ تعلق پاکیزہ نہ ہو کوئی سوسائٹی پاکیزہ نہیں رہ سکتی اور اس کی انسانیت قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے اسلام نے اس تعلق کو جائز اور پاکیزہ طریق پر قائم رکھنے کے لئے بڑا زور دیا ہے۔ اور نکاح کے سوا کوئی صورت مرد و عورت کے باہمی تعلقات کیلئے جائز نہیں رکھی۔ اور یہ بھی ضروری سمجھا کہ نکاح کے وقت مرد اور عورت کا یہ منشا ہو کہ ہم عمر بھر کے لئے ایک دوسرے کے رفیق حیات بن کر زندگی بسر کریں گے۔ اور اسی لئے قرآن کریم نے ایک دوسرے کے باہمی حقوق قائم کر کے انہیں نباہنے اور ہونے والی اولاد کے حقوق کو ادا کرنے کے لئے احکام دیئے۔ اور بڑی زبردست تاکید کی۔ اور ان کی عدم تعمیل کی صورت میں زبردست وعید سنا دیا۔ اور زنا سے بچنے کے لئے یہاں تک تاکید کی کہ اگر مرد و عورت کی کوئی شادی ناکام ثابت ہو یعنی ان میں آپس میں محبت اور اخلاص پیدا نہ ہو بلکہ ایک دوسرے سے نفرت اور بیزاری ہو۔ چونکہ ان حالات میں دونو فریق کا زناکاری میں مبتلا ہو جانے کا بڑا سخت احتمال ہے تو ایسی صورت میں حکم دیا کہ ایک دوسرے سے تعلق منقطع کر دو (اسی کو طلاق کہتے ہیں) اور دونو فریق اپنی اپنی جگہ اپنی پسند سے نکاح کر لیں۔ ......

بہرحال نکاح کرلیں۔ کسی قسم کے بھی عارضی تعلق کو قرآن نے جائز نہیں رکھا کیونکہ وہ زناکاری ہے۔ اور نہ اس میں ایک کا دوسرے پر اور اولاد کا ماں باپ پر کوئی حق قائم ہوتا ہے۔ نیز فرمایا کہ اگر کسی کی بیوی یا شوہر مرجائے تو مرد ہو یا عورت عدت گزرنے کے بعد فوراً دوسرا نکاح کرلیں۔ ہندو مذہب میں بھی شادی کی رسم ہے مگر ان میں طرح طرح کے دوسرے طریق بھی ہیں جن کے ذریعہ مرد و عورت کا باہمی تعلق ہو سکتا ہے۔ دیانند جی نے ایک نیا طریق بتلایا اور وہ نیوگ تھا۔ ستیارتھ پرکاش میں سے حضرت اقدس مرزا صاحب نے اس طریق کو نکال کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور بتایا کہ یہ کس قدر ناپاک طریق ہے۔ اور وہ طریق یہ تھا کہ اگر کسی عورت کا شوہر مرجائے تو اس بیوہ کو نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ وہ اگر چاہے تو کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر اس سے بیرج لیلے اور اس طرح اولاد پیدا کرتی رہے اور اپنی شہوت فرو کرتی رہے۔ پھر اس حکم کو یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ایک شوہر والی عورت کو بھی اجازت دی کہ اگر اس کے شوہر سے اولاد نہ ہو تو وہ کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو کر اس سے بیرج یعنی نطفہ لیلے۔ اور اگر اس سے بھی حمل نہ ہو تو کسی دوسرے مرد سے ہم بستر ہو کر بیرج لیلے۔ اور اگر اس سے بھی حمل نہ ہو تو کسی تیسرے مرد سے بیرج لیلے۔ علیٰ ہذا القیاس دس مردوں سے وہ علیحدہ علیحدہ ہم بستر ہو کر نطفہ لے سکتی ہے۔ اور وہ دس مرد اپنا نطفہ دیکر الگ ہو جائیں گے۔ اور جو اولاد ان تعلقات سے پیدا ہوگی وہ اسی دیوث شوہر کی گنی جائیگی۔ اور اس کا پالنا اور پرورش کرنا اسی ناکردہ گناہ شوہر کے ذمہ ہوگی۔ پھر یہیں تک نہیں۔ اگر شوہر سفر پر گیا ہو یا بیمار ہو اور بیوی کو شہوت ہو تو وہ کسی غیر مرد سے نیوگ کرا کے اپنی ہوس پوری کرلے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے ایک کتاب آریہ دھرم لکھ کر اس نیوگ کی گندگی کو طشت از بام کردیا اور بتلایا کہ جو مذہب عورت اور مرد کے باہمی تعلقات میں پاکیزگی اور طہارت کو قائم نہیں رکھتا اور ان کے باہمی حقوق اور ان کی اولاد کے حقوق کی حفاظت کو مدنظر نہیں رکھتا وہ خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ آریہ سماج کی تردید میں جو لٹریچر حضرت مرزا صاحب نے پیدا کیا یہ اس میں سے مشتے نمونہ از خروارے ہے جس نے مفصل دیکھنا ہو وہ آپ کی کتب کو مطالعہ کرے۔

(۴) سکھ مذہب کا رد

گورو بابا نانک صاحب کو مسلمان ثابت کردیا

جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں سکھ مذہب کوئی خاص مذہب نہیں۔ کیونکہ اپنی کوئی الہامی کتب یا شریعت یا قانون نہیں رکھتا۔ اب جو چاہیں اس کے پیرو شکل اختیار کرلیں۔ لیکن ابتدا میں جناب بابا گورو نانک صاحب نے صوفیوں کی

طرح ایک پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا تھا گورو صاحب خود حضرت باوا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یافتہ تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے بیعت لیتے تھے۔ ہندوؤں سے فقط توحید کی بیعت لیتے تھے۔ خیال تھا کہ رفتہ رفتہ یہ اسلام کی طرف آجائیں گے۔ پہلے بت پرستی تو ترک کریں۔ بابا نانک صاحب کی وفات کے بعد مسلمان تو مسلمان ہی رہے۔ لیکن ہندوؤں کا یہ گروہ جو بت پرستی کو چھوڑ چکا تھا مسلمان تو نہ ہوا ایک علیحدہ فرقہ بن گیا۔ اور سکھ کے نام سے موسوم ہوا۔ بعد میں گورو گوبند سنگھ صاحب نے اسے ایک سیاسی فرقہ بنا دیا۔ اور آجکل اس زمانہ میں تو حکومت میں حصہ لینے کے لئے سکھوں نے اپنی علیحدہ قومیت کا بڑے زور سے پرچار شروع کیا ہوا ہے۔ گو اندر سے ہندوؤں میں مدغم ہو چکے ہوئے ہیں۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے چاہا کہ سکھوں کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے کہ ان کے بانی مذہب حضرت بابا گورو نانک صاحب مسلمان تھے۔ یہی ایک وار سکھ مذہب کی موجودہ شکل کو درست کر دینے کے لئے کافی تھا۔ بشرطیکہ سکھ صاحبان انصاف سے کان دھریں۔ اور معقولیت سے کام لیں۔ کیونکہ جب بانی مذہب مسلمان تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے پیرو بھی مسلمان نہ ہو جائیں۔ حضرت مرزا صاحب نے اپنی کتاب ست بچن میں تین طرح بابا نانک صاحب کو مسلمان ثابت کیا۔

(۱)۔ ایک تو بابا صاحب کے بعض اقوال سے جو گرنتھ صاحب اور مختلف جنم ساکھیوں میں مذکور ہیں جن میں صاف صاف اسلام کے اصولوں اور نماز اور قرآن کریم پر ایمان کا اقرار ہے اور گرنتھ صاحب میں آپ کا یہ قول کہ بغیر کلمہ پڑھے نجات بیدا نہیں منا وغیرہ وغیرہ یہ سب اقوال حضرت مرزا صاحب نے اپنی کتاب ست بچن میں نقل فرمائے ہیں۔

(۲)۔ دوسرے بابا صاحب کے حالات زندگی سے جو مختلف جنم ساکھیوں میں مذکور ہیں بابا نانک صاحب کا حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر ان سے مستفیض ہونا سفر میں بھی ان کے ساتھ ساتھ رہنا اور ہندوؤں کا ان دونوں بزرگوں سے یکساں چھوت چھات کا اظہار کرنا یہاں تک کہ جہاں وہ بیٹھ جاتے تھے اس جگہ کو ہندو گوبر سے لیپ کر پوتر کرتے تھے۔ بابا نانک صاحب کا مکہ شریف حج کو جانا۔ وہاں سے واپسی پر ملتان میں حضرت شاہ شمس صاحب کے مزار پر چالیس دن تک چلہ کشی کرنا اور وہاں ایک حجرہ میں رہنا اور آپ کے حجرہ کے نزدیک ہی ایک مسجد کا ہونا تا نماز پڑھنے میں آسانی رہے۔ اس مزار کے جنوبی طرف اپنے ہاتھ سے بابا نانک صاحب کا یا اللہ کا لفظ لکھنا جو اب تک موجود ہے۔ اسی طرح سرسہ

میں شاہ عبدالشکور صاحب کی خانقاہ میں چالیس دن تک چلہ کشی کرنا اور وہاں ان کا ایک خلوت خانہ رو بقبلہ موجود ہونا تا نماز پڑھنے میں آسانی رہے جو چلہ بابا نانک کہلاتا ہے۔ سلطان پور میں نواب دولت خاں اور وہاں کے قاضی صاحب کے ساتھ بابا نانک صاحب کا نماز پڑھنا۔ آپکے ہاتھ پر حنفی مسلمانوں کا مرید ہونا اور آپ کی وفات پر ان کا نماز جنازہ پڑھنا۔ جبکہ یہ بات مسلّم ہے کہ مسلمان کبھی کسی غیر مسلم کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے مرید نہیں ہوتے اور نہ کسی غیر مسلم کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے بہت سے حالات حضرت مرزا صاحب نے جمع کر کے ثابت کر دیا کہ گرو بابا نانک صاحب مسلمان تھے۔ کیونکہ یہ حالات ہی ایسے تھے جو مسلمان کے سوا کسی دوسرے کی زندگی میں نہیں ہو سکتے۔

(۳)۔ تیسرے بابا نانک صاحب کے تبرکات۔ جن میں سے ایک تو چولا صاحب ہے۔ (۱) حضرت مرزا صاحب نے انگد کی جنم ساکھی سے نکال کر دکھا دیا کہ وہ چولا صاحب جو آجکل ڈیرہ بابا نانک میں بالاصل موجود ہے وہ سکھوں کے مسلمات کے رو سے آسمان سے بابا نانک صاحب پر نازل ہوا تھا اور اس پر آسمانی کلمات لکھے ہوئے ہیں۔ اور اس چولا صاحب کے درشن کرنے اور اس سے برکت لینے کے لئے بڑے بڑے سکھ بزرگ وہاں حاضر ہوا کرتے تھے اور اس پر بڑا چڑھاوا چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ سینکڑوں بیش قیمت رومال اس پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اور سکھوں کو جب کوئی مشکل پیش آئی ہے اور اس چولے کو سر پر رکھ کر دعائیں کی ہیں تو خدا نے وہ مشکل حل کر دی ہے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب خاص طور پر اس چولہ صاحب کو دیکھنے بمعہ اپنے احباب کے ڈیرہ نانک تشریف لے گئے۔ کس طرح دیکھا اسکی تفصیل خود حضرت اقدس نے اپنی قلم سے ست بچن میں تحریر فرمائی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ آپ نے جب اس چولا صاحب کو دیکھا تو اس پر جا بجا آیات قرآنی لکھی ہوئی پائیں۔ اور ایک گوشہ پر نہایت جلی قلم سے بہت خوشخط لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا پایا۔ اور یہ آیت قرآنی بھی لکھی ہوئی پائی کہ ان الدین عند اللہ الاسلام کہ خدا کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے اور کوئی نہیں۔ کسی جگہ سورۃ فاتحہ، کسی جگہ سورہ اخلاص۔ اور کثرت سے لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین اس چولے پر لکھا ہوا پایا۔ اللہ تعالےٰ کے تمام اسماء حسنیٰ بھی اس پر لکھے ہوئے تھے۔ چولا صاحب کے دامن کے حاشیوں پر اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ بھی لکھا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا

کہ بابا نانک صاحب اسلام کے اس قدر عاشق زار تھے کہ اپنے چوغہ پر آپ تبرکاً یہ تمام آیات قرآنی اور کلمہ شہادت لکھوا کر پہنے پھرتے تھے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے نہایت عقلمندی سے اسی وقت اس چولا صاحب کا فوٹو لے لیا۔ اور اس کا نقشہ اپنی کتاب ست بچن میں شائع فرما دیا اور اس طرح سکھوں پر حجت تمام کر دی۔

(۴) دوسرا تبرک پوتھی صاحب ہے جس کی تحقیقات حضرت اقدس مرزا صاحب نے اپریل ۱۹۰۸ء میں اپنے چند احباب کو گورو ہر سہائے ضلع فیروزپور میں بھیج کر کی۔ یہ پوتھی صاحب گورو بابا نانک صاحب کا ایک تبرک ہے جو گورو رامداس صاحب کی اولاد کے قبضہ میں چلا آتا ہے گورو رامداس سکھوں کے چوتھے گورو ہیں اور انہی کے نام نامی پر امرت سر کا مشہور سنہری مندر دربار صاحب نامزد ہے۔ حضرت مرزا صاحب کے زمانہ میں اس گدی پر گورو بشن سنگھ صاحب تھے۔ اس پوتھی صاحب کی نسبت سکھوں میں یہ مسلّم ہے کہ گورو بابا نانک صاحب اسے نہایت عقیدت کے ساتھ ہر وقت گلے میں ڈالے پھرتے تھے اور اکثر اوقات اسی کو پڑھتے رہتے تھے۔ اور اس کے پڑھنے کو عبادت شمار کرتے تھے۔ بڑی بڑی دُور سے راسخ العقیدہ سکھ لوگ آ کر اس کے درشن کرتے اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے رہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کتاب رومالوں میں لپٹی ہوئی دکھا دی جاتی ہے اور سکھ لوگ اسے متھا ٹیک کر چلے جاتے ہیں۔ کھول کر بہت کم کسی کو دکھائی جاتی ہے۔ وجہ یہ کہ اسے کھول کر دیکھنے کے لئے ایک سوا ایک [۱۰۱] روپیہ نذرانہ گورو جی کی خدمت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہ ایک سو ایک دفعہ نہاتے ہیں تب اس قابل ہوتے ہیں کہ اس پوتر اور مقدس کتاب کو ہاتھ لگائیں۔ کوئی بہت ہی دولتمند اور شوقین سکھ بزرگ آتے ہیں تو وہ مقررہ نذرانہ پیش کر کے سارے رومال اُتروا کر اس کتاب کے درشن کرتے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب کے مریدوں کی جماعت جو تحقیق کو گئی تھی انہوں نے کس طرح اس کے درشن کئے یہ تمام واقعات حضرت اقدس کی کتاب چشمۂ معرفت میں درج ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ جب پوتھی صاحب کو کھول کر دیکھا گیا تو وہ ابتدا سے آخر تک قرآن شریف تھا۔ حمائل کا سائز تھا۔ قلمی لکھا ہوا تھا۔ اردگرد سنہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ گورو جی بولے کہ جو بانی (زبان) اس میں لکھی ہوئی ہے اُسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ یہ کوئی آسمانی بانی (زبان) ہے جسے بابا صاحب ہی سمجھتے تھے"۔ غرضکہ اس دوسرے تبرک نے تو گورو بابا نانک صاحب کے مسلمان ہونے پر یقینی طور پر مُہر لگا دی۔ اب سکھ صاحبان چاہے مانیں یا نہ مانیں یہ امر دیگر ہے۔ مگر کچھ شک نہیں

کہ اُن پر حجت تمام ہو چکی ۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے گورو بابا نانک صاحب کو مسلمان ثابت کر کے موجودہ سکھ مذہب کو ختم کر دیا۔

(۵) بُدھ مذہب کا رد

فلسفۂ نروان کو رد کر کے بُدھ مذہب کو ختم کر دیا

بدھ مذہب نے بظاہر نہ تو اسلام پر کوئی حملہ کیا۔ اور نہ اس کے اندر سوائے فلسفۂ نروان کے کوئی ایسی دلچسپی اور دلکشی باقی ہے جس کا مقابلہ اسلام سے کیا جانے کی ضرورت ہے۔ وہ اس وقت سرتاپا انسان پرستی اور بُت پرستی کا مذہب ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ نروان بعض فلسفیوں کو اپیل کرتا ہے۔ لوراسے وہ اسلام پر فضیلت دیتے ہیں اور اس طرح بالواسطہ اسلام پر زد پڑتی ہے۔ فلسفۂ نروان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات کو مٹائے اپنی تمام خواہشات لذت اور تمام تعلقات دنیوی کو ترک کر کے جیتے جی فنا ہو کر رہ جائے۔ یہ رہبانیت کی تعلیم نہ صرف بدھ مذہب کا اصل الاصول ہے بلکہ عیسائیوں کی رہبانیت اور ہندوؤں کا ترک دنیا کا فلسفہ اسی کی مختلف شکلیں ہیں۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اس فلسفہ کا بطلان کر کے بدھ مذہب اور اس کے ساتھ رہبانیت کے تمام مختلف طریقوں کو ختم کر دیا۔

آپ نے ثابت کیا کہ انسان کو پیدا کرنے والے نے جو جذبات انسان میں پیدا کئے ہیں اُن کو فنا کرنے کی کوشش کرنا خود خالق کی منشا کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اگر ان کو فنا کرنے میں ہی انسان کی نجات ہے تو خدا نے انہیں پیدا ہی کیوں کیا تھا۔ پس انسان کے اندر جو جذبات اور قویٰ اور استعدادیں خدا نے رکھی ہیں ان کو فنا کرنے کی تعلیم اس خدا کی تو نہیں ہو سکتی جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ یہ بعد میں انسان کے دماغ کی اُپج ہے۔ حضرت بُدھ اگر خدا کی طرف سے نبی تھے تو ان کی یہ تعلیم نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ انسان کے خالق کی منشا کے خلاف ہے۔ خدا نے انسان کو مختلف قویٰ اور جذبات عطا فرمائے ہیں جن کو صحیح طور پر استعمال کر کے انسان بڑی بڑی ترقیات حاصل کر سکتا ہے اور اپنے کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ آنکھ میں اگر دیکھنے کی قوت ہے تو خدا کا کبھی یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ انسان دیکھنا چھوڑ دے۔ اس کا منشا تو یہی ہو سکتا ہے کہ دیکھنے کی قوت کو صحیح طور پر استعمال کیا جاوے یعنی انسان ناجائز چیزوں کو نہ دیکھے اور جائز طریق پر آنکھوں کو استعمال کر کے اپنے آپ کو اور دوسروں کو نفع پہنچا دے۔ خدا نے انسان کو اگر قوائے شہوانی عطا فرمائے ہیں تو اس کا کبھی یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ ان قویٰ کو کبھی استعمال ہی نہ کیا جاوے اور برہمچریہ بن کر یا اپنے آپ کو خصی کر کے

نسل انسانی کی بقا کے خلاف خدا سے جنگ کرے۔ بلکہ خالق کی منشا تو یہ ہے کہ انسان اس قوت کو جائز طریق پر استعمال کر کے بیوی اور بچوں کے حقوق ادا کرے اور انسانی معاشرت اور تمدن کے تمام حقوق صحیح طور پر بجا لاوے اور اس طرح خالق کے منشا کو پورا کرے۔ غرضکہ انسان کے اندر جو بھی جذبات رکھے گئے ہیں اور جو بھی قوتیں اُسے عطا کی گئی ہیں ان کو مٹانا اور فنا کرنا کبھی خدا کا منشا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پھر اُن کا پیدا کرنا عبث بلکہ نقصان دہ ٹھہرتا ہے اور یہ خدا کی سچائیت کے خلاف ہے بلکہ ان کو خدا کی منشا اور اس کے احکام کے ماتحت صحیح طور پر استعمال کرنا ہی خدا کی منشا کو پورا کرتا ہے۔ پس جو مذہب ان جذبات کو فنا کرنے کی تعلیم دیتا ہے وہ کبھی اس خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس کی طرف سے وہی مذہب کامل اور سچا ہو سکتا ہے جو تمام انسانی جذبات اور قویٰ کو صحیح طور پر استعمال کرنے اور اس کے ہر ایک خلق کی نشو و نما کے لئے تعلیم اور ہدایت دے۔ اور وہ دنیا میں صرف ایک ہی مذہب اسلام ہے۔ بدھ مذہب کا فلسفۂ نروان اور ترک دنیا کے تمام مسیحی اور رہبانہ طریقے اور برہمچریہ آشرم وغیرہ سب اس ایک حربہ سے جو اس غلط فلسفہ کی جڑ پر تبر کی طرح پڑتا ہے ختم ہو گئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

(۶) بہائیت کا رد

مَیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بہائیت دراصل شیعہ مذہب کے فرقہ شیخیہ کی ایک شاخ ہے جو غلو جب اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو یہ فرقہ اسلام کی حدود سے خود ہی باہر نکل کر اسلام کا دشمن بن گیا۔ اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت کا زمانہ ختم ہو چکا اور آپ کی شریعت منسوخ ہو چکی۔ چنانچہ بہاء اللہ نے جو خود مظہر الوہیت ہونے کا مدعی ہے اپنی کتاب اقدس میں ایک نئی شریعت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کی جس کی اتباع میں دنیا کی نجات بتلائی۔ اُس نے صاف طور پر اعلان کیا کہ محمد رسول اللہ صلعم کا پیغام اس دنیا کے لئے اب موزون و مناسب حال نہیں رہا۔ اسے اب دنیا قبول نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس کی طرف سے ناامید اور مایوس ہو جانا چاہیئے۔ اور جو مَیں پیغام لایا ہوں بلکہ خود دیتا ہوں کیونکہ مَیں خود مظہر خدا ہوں اسی کو قبول کر کے دنیا نجات حاصل کر سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بہاء اللہ کا پیغام اسلام کے لئے یاس و ناامیدی کا پیغام اور اس کی موت کی گھنٹی کی آواز تھا۔ حضرت اقدس نے اس آواز کے بعد اور اس ناامیدی و یاس کی آواز کے بالمقابل یہ آواز اٹھائی جو اسلام کے لئے امید اور خوشخبری کا پیغام تھا کہ مجھے خدا نے

بھیجا ہے اور مامور کیا ہے تا میں دنیا میں اعلان کروں کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اس کی شریعت کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ابدی صداقتیں ہیں جنہیں کبھی زوال نہیں۔ اسلام کا خدا زندہ خدا ہے۔ اسلام کا رسول حضرت محمد رسول اللہ صلعم زندہ رسول ہے جن کی رسالت کا دامن قیامت تک دراز اور جن کا فیضان نبوت ہمیشہ جاری ہے۔ اسلام کی کتاب قرآن مجید ایک زندہ کتاب اور اس کی لائی ہوئی شریعت ایک ابدی صداقت ہے۔ اور میں اس کے لئے زندہ گواہ ہوں۔ کیونکہ میں نے اسی کتاب اور اسی رسول کی اتباع سے اس زندہ خدا کو پایا جو تمام عالموں کا خدا ہے اور اس دین کے سوا کوئی دین نہیں جس کی اتباع سے خدا مل سکے۔ اگر کوئی ہے تو میرے سامنے آئے اور یا تو مجھ سے اسلام کے زندہ مذہب ہونے کے ثبوت میں براہین نیرہ اور دلائل قطعیہ سے اور نشانات سماوی اور نصرت الٰہی کے نمونے دیکھے اور یا پھر خود سنائے اور دکھائے لیکن جہاں کسی مذہب کا بھی پیرو آپ کے سامنے نہ آیا وہاں بہائیت کا بھی کوئی پیرو مقابل پر نہ آیا۔ حضرت اقدس مرزا صاحب کا دعوائے مجددیت اور بعد میں دعوائے مسیحیت بہاء اللہ کی زندگی میں ہی وقوع میں آیا۔ مگر وہ مدعیٔ مظہر الوہیت قطعاً مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ کر سکا اور نہ اس کا کوئی جانشین جو بجائے خود مظہر الوہیت ہوتا ہے یا کم سے کم مظہر الوہیت کی گدی پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے مقابلہ پر آیا۔ پھر کس قدر افسوس ہے کہ بعض بہائی کہہ دیتے ہیں کہ مرزا صاحب نے بہاء اللہ کا کیوں مقابلہ نہ کیا۔ حالانکہ ہر ایک عقلمند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مرزا صاحب کا دعویٰ مجددیت و مسیحیت ہی بہاء اللہ کے دعوے اور اس کے پیغام کا بیخ کن تھا۔ بہاء اللہ پہلے اعلان کر چکا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت منسوخ اور آپ کا دین اب مر چکا ہے۔ اس کے بعد حضرت اقدس مرزا صاحب کی آواز بلند ہوتی ہے جس کی گونج چار دانگ عالم میں بذریعہ اشتہارات و لٹریچر پہنچائی گئی کہ محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت قطعاً منسوخ نہیں اور آپ کا دین زندہ ہے۔ وہ جھوٹا ہے جو اسے مردہ کہتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلعم کے دین کے زندہ ہونے کا نشان میں خود ہوں کہ میں نے اسی دین کی اتباع سے زندہ خدا کو پایا اور وہ تمام مراحل سلوک طے کر کے اس روحانیت و انسانیت کے کمال کو حاصل کر لیا جو مقصد تخلیق انسانی ہے۔ قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی اتباع کے سوا اور کوئی راستہ نہیں جس سے خدا مل سکے اور جو اس صراط مستقیم سے علیحدہ ہو کر چلتا ہے وہ گمراہ اور ہلاک ہونیوالا ہے۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو جس کا دل چاہے میرے سامنے آئے اور براہین نیرہ اور دلائل قطعیہ سے ایک طرف اور نشانات سماویہ سے دوسری طرف میرا مقابلہ کرے۔

پس کیا یہ اللہ کا فرض نہ تھا کہ وہ اس آواز کو سن کر جو اس کے تمام دعاوی کی جڑ پر تبر چلاتی اور اپنے اندر زبردست چیلنج رکھتی تھی حضرت مرزا صاحب کے مقابلہ پر آتا۔ مگر جھوٹ حق کے مقابلہ پر آنے کی کس طرح جرأت کر سکتا ہے اس پر اور اس کے دعاوی پر موت طاری ہو گئی اور حق کے مقابلہ میں جھوٹ بھاگ گیا۔ جاء الحق وزھق الباطل۔ یہ حضرت مرزا صاحب کا خاص شیوہ تھا کہ وہ مذاہب باطلہ کی جڑ پر تبر چلاتے تھے جس سے اس کا تنہ اور اس کی شاخیں خود بخود خشک ہو کر اس پر موت طاری ہو جاتی یہی طریق یہاں اختیار کیا۔ آپ کا دعویٰ ہی بہائیت کیلئے موت کا پیغام تھا۔

اسلام کی صداقت کو ثابت کرنے کیلئے حضرت مرزا صاحب نے ہر مذہب والے کو روحانی مقابلہ کیلئے چیلنج کیا

حضرت مرزا صاحب نے فقط اتنا ہی نہیں کیا کہ اسلام کے مخالف مذاہب کو دلائل و براہین سے توڑ دیا بلکہ انہیں روحانی مقابلہ کے لئے بھی چیلنج کیا کہ تمہارے مذہب میں اگر کوئی صداقت اور زندگی باقی ہے تو میرے مقابلہ پر آؤ اور اپنے مذہب کی سچائی اور زندگی کو ثابت کرو۔ میں نے اسلام کو خود تجربہ کر کے دیکھا اور اس کی صداقت کو مشاہدہ اور تجربہ سے پرکھا اسے ایک زندہ مذہب پایا کہ اس کی اتباع سے زندہ خدا مجھے مل گیا۔ آج وہ میری دعاؤں کو سنتا مجھ سے ہم کلام ہوتا اور میرے ہاتھ پر نشانات آسمانی کو ظاہر کرتا ہے۔ تم میں اگر کوئی شخص اپنے مذہب کی پیروی سے اس مقام کو حاصل کر چکا ہے تو وہ میرے مقابلہ پر آئے تا دعا اور مباہلہ سے ہم ایک دوسرے کی صداقت کو آشکارا کریں۔ ہم دعا کریں کہ وہ شخص جو جھوٹ بولتا اور تعلق باللہ کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اسے سچے کی زندگی میں خدا رسوا اور ہلاک کرے تا سچے مذہب پر وہ ایک نشان ہو۔ لیکن کوئی مقابلہ پر نہ آیا۔ نہ تو عیسائیوں میں سے کوئی پادری مقابلہ پر آیا اور نہ آریہ اور نہ کسی اور غیر مسلم قوم میں سے کوئی سامنے آیا۔ دور بیٹھے سب باتیں بناتے رہے۔ اس روحانی مقابلہ کی کسی کو جرأت نہ ہوئی کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج اسلام سے باہر کسی مذہب کا پیرو اپنے مذہب کی پیروی کر کے کسی روحانی تجربہ اور مشاہدہ اور تعلق باللہ کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ مذہب مر چکے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر حضرت مرزا صاحب کا ظہور نہ ہوتا تو مسلمانوں میں بھی نہ کسی عالم کو یہ دعویٰ تھا اور نہ کسی پیر طریقت کو۔ سب کے ہاتھ میں خشک

منطق کے سوا اور کچھ نہ تھا جو نہ تو قلوب کو تسلی بخش سکتی ہے اور نہ کسی مذہب کو زندہ اور سچا ثابت کرنے کے لئے یقین کے مقام تک پہنچا سکتی ہے۔ اس مادہ پرستی کے زمانہ میں بڑے بڑے عالم جن کی طرف مسلمانوں کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں مادی فلسفہ کے چکر سے باہر نہ نکل سکے۔ ایسے زمانہ میں حضرت مرزا صاحب کا روحانیت اور تعلق باللہ کا یہ چیلنج اس قدر عظیم الشان ہے کہ اسلام کی صداقت پر دل ایک زندہ ایمان سے لبریز ہو جاتا ہے اور آپ کی عظیم الشان شخصیت کا ایک عقلمند کو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تعصب جدا بات ہے۔ اس ایک ہی امر کو انصاف اور صدق دلی سے جو دیکھے گا اس کا دل حضرت مرزا صاحب کی عظمت اور صداقت کے سامنے جھک جائے گا۔

آج حضرت مرزا صاحب کی اس شاندار مدافعت اور اشاعت اسلام کے بعد جب مخالفین کے اعتراضات کے بادل چھنٹ گئے اور اسلام کا خوبصورت چہرہ آفتاب کی طرح چمک اٹھا اور مسلمانوں کے قلوب اسلام کی صداقت پر یقین سے بھر گئے تو جس کا جو دل چاہے حضرت مرزا صاحب کی نسبت باتیں بنائے اور منہ آئے لیکن جن لوگوں کو وہ زمانہ یاد ہے جب اسلام پر پادریوں اور آریوں اور دہریوں کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اور بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعوذ باللہ سیاہ سے سیاہ تصویر اہل عالم کے سامنے پیش کی جا رہی تھی اور مسلمان ان حملوں سے پڑے سسک رہے تھے۔ اور مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ ان اعتراضات سے متاثر ہو کر اندر ہی اندر اسلام سے برگشتہ ہو رہا تھا اس وقت وہ عظیم الشان مدافعت حضرت مرزا صاحب کی طرف سے شروع ہوئی جس نے ہوا کا رخ پلٹ دیا اور اعتراضات کے بادلوں کو اڑا کر اسلام کے چہرہ کو ہر ایک داغ سے صاف کر کے دنیا کے سامنے نمایاں کر دیا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں جرأت ایمانی اور اسلام کی صداقت پر یقین پیدا ہو گیا۔ جس طرح جب بارش برستی ہے تو صرف دریا اور چشمے ہی اس پانی سے لبریز نہیں ہوتے بلکہ جابجا دور افتادہ کنوؤں میں بھی پانی چڑھ آتا ہے۔ اسی طرح حضرت مرزا صاحب کے لٹریچر نے فقط اُن لوگوں کے سینوں کو ہی نور ایمان سے معمور نہیں کیا جنہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا بلکہ روحانیت و معرفت الٰہی کی اس بارش نے ان دور افتادہ لوگوں کو بھی اس ایمان سے بہرہ اندوز کر دیا جنہوں نے براہ راست آپ کے لٹریچر سے استفادہ نہیں کیا۔ گویا اسلام کی صداقت اور غلبہ کی ایک ہوا چل گئی جس نے ایمان کی ہر ایک خشک کھیتی کو سرسبز کر دیا اور ظاہر ہے کہ فیض روحانی و ایمانی ربانی اور روحانی لوگوں سے ہی متعلق اور انہی کی توجہ اور دعا کا اثر ہوتا ہے محض فلسفہ یہ اثر نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر اقبال جیسے فلسفی خدا کو ایک

(Ultimate Reality) یعنی آخری علت اور حقیقت سے بڑھ کر بیان نہیں کر سکتے یہ عارفانِ الٰہی اور مردانِ کامل کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ خدا کو (Personal God) ثابت کر کے دکھا دیتے ہیں کہ خدا اس ساری کائنات کے لئے علت العلل ہی نہیں بلکہ اس کا ہر ایک انسان سے ذاتی اور شخصی تعلق بھی ہو سکتا ہے اور وہ اب ہے جس کی گود میں بندہ ایک بچے کی طرح پرورش پاتا اور اور اس سے اپنے باپ اور ماں کی طرح محبت رکھ سکتا اور مستفیض ہو سکتا ہے ٭

حضرت مرزا صاحب کی حفاظت و اشاعت اسلام پر اسلامی اخبارات کی آراء

حضرت مرزا صاحب نے اسلام کی حفاظت و اشاعت میں جو علم کلام پیدا کیا اور جو خدمات کیں آپ کی وفات پر غیر احمدی مسلمان اخبارات نے جو ماتم کیا اس میں سے دو تین حوالے یہاں نقل کرتا ہوں الفضل ما شهدت به الاعداء۔

مولانا عمادی کی رائے ۱۹۰۸ء میں اخبار وکیل امرتسر اس زمانہ کے اسلامی اخباروں میں سب سے زیادہ متین اور وقیع اور بلند پایہ اخبار تھا اس کے ایڈیٹر مولوی عبداللہ العمادی صاحب مسلمانوں میں اپنے علم و فضل اور ادب و انشا پردازی کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ احمدی نہ تھے۔ لیکن ایک غیر متعصب قلب اپنے پہلو میں رکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی وفات پر اخبار وکیل میں اپنے نام سے ایک مقالہ "موت عالم" کے عنوان سے سپرد قلم کیا۔ ان میں سے بعض اقتباسات یہاں نقل کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:-

"وہ شخص بہت بڑا شخص جس کا قلم سحر تھا۔ اور زبان جادو۔ وہ شخص جو دماغی عجائبات کا مجسمہ تھا۔ جس کی نظر فتنہ اور آواز حشر تھی۔ جس کی انگلیوں سے انقلاب کے تار اُلجھے ہوئے تھے جس کی دو مٹھیاں بجلی کی دو بیٹریاں تھیں۔ وہ شخص جو مذہبی دنیا کیلئے تیس برس تک زلزلہ اور طوفان رہا جو شور قیامت ہو کر خفتگانِ ہستی کو بیدار کرتا رہا۔ خالی ہاتھ دنیا سے اٹھ گیا۔ یہ تلخ موت یہ زہر کا پیالہ موت جس نے مرنے والے کی ہستی تہ خاک پنہاں کر دی۔ ہزاروں، لاکھوں زبانوں پر تلخ کامیاں بن کر رہے گی۔ اور قضا کے حملہ نے ایک جیتی جان کے ساتھ جن آرزوؤں

اور تمناؤں کا قتل عام کیا ہے صدائے ماتم مدتوں تک اس کی یادگار تازہ رکھے گی۔ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی رحلت اس قابل نہیں کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے اور مٹنے کے لئے امتداد زمانہ کے حوالے کر کے صبر کر لیا جائے۔ ایسے لوگ جن سے مذہبی یا عقلی دنیا میں انقلاب پیدا ہو ہمیشہ دنیا میں نہیں آتے۔ یہ نازش فرزندان تاریخ بہت کم منظر عالم پر آتے ہیں اور جب آتے ہیں تو دنیا میں انقلاب پیدا کر کے دکھا جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کی اس رحلت نے ان کے بعض دعاوی اور بعض معتقدات سے شدید اختلاف کے باوجود ہمیشہ کی مفارقت پر مسلمانوں کو ان تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کو محسوس کرا دیا کہ ان کا ایک بڑا شخص اُن سے جدا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ مخالفین اسلام کے مقابلہ پر اسلام کی اس شاندار مدافعت کا جو اس کی ذات سے وابستہ تھی خاتمہ ہو گیا۔ ان کی یہ خصوصیت کہ وہ اسلام کے مخالفین کے برخلاف ایک فتح نصیب جرنیل کا فرض پورا کرتے رہے ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس احساس کا کھلم کھلا اعتراف کیا جائے تاکہ وہ مہتم بالشان تحریک جس نے ہمارے دشمنوں کو عرصہ تک پست اور پامال بنائے رکھا آئندہ بھی جاری رہے۔...... مرزا صاحب کا لٹریچر جو مسیحیوں اور آریوں کے مقابلہ پر اُن سے ظہور میں آیا قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اور اس خصوصیت میں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس لٹریچر کی قدر و عظمت آج جبکہ وہ اپنا کام پورا کر چکا ہے ہمیں دل سے تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت ہرگز لوح قلب سے نسیاً منسیاً نہیں ہو سکتا جبکہ اسلام مخالفین کی یورشوں میں گھر چکا تھا۔ اور مسلمان جو حافظ حقیقی کی طرف سے عالم اسباب و وسائط میں حفاظت کا واسطہ ہو کر اس کی حفاظت پر مامور تھے اپنے قصوروں کی پاداش میں پڑے سسک رہے تھے اور اسلام کیلئے کچھ نہ کرتے تھے یا نہ کر سکتے تھے۔ ایک طرف حملوں کے امتداد کی یہ حالت تھی کہ ساری مسیحی دنیا اسلام کی شمع عرفان حقیقی کو سر راہ منزل مزاحمت سمجھ کر مٹا دینا چاہتی تھی اور عقل و دولت کی زبردست طاقتیں اس حملہ آور کی پشت گری کے لئے ٹوٹی پڑتی تھیں۔ اور دوسری طرف ضعف مدافعت کا یہ عالم تھا کہ توپوں کے مقابلہ پر تیر بھی نہ تھے۔ اور حملہ اور مدافعت دونو کا قطعی وجود ہی نہ تھا"

مسلمانوں کی اس عدم مدافعت پر بحث کرتے ہوئے آگے چل کر مولانا عمادی صاحب حضرت مرزا صاحب کی طرف سے جو مدافعت شروع ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس مدافعت نے نہ صرف عیسائیت کے اس ابتدائی اثر کے پرخچے اڑائے جو سلطنت کے سایہ میں ہونے کی وجہ سے حقیقت میں اس کی جان تھا اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اس کے اس زیادہ خطرناک اور مستحق کامیابی حملہ کی زد سے بچ گئے بلکہ خود عیسائیت کا طلسم دھواں ہو کر اڑنے لگا...... انہوں نے مدافعت کا پہلو بدل کے مغلوب کو غالب بنا کے دکھا دیا ہے۔ اگر ہم آج اپنے نئے اور پرانے اختلافات سے قطع نظر کرکے محض اسلام کی خدمت غائت المقصود قرار دے لیں۔ تو یقیناً اس جوشیلے اور اسلام کی خدا داد طاقت سے چشم پوشی کرنیوالے لاٹ پادری (بشپ) کی زندگی میں ہی جس نے ایک مسیحی مشن کی پچاس سالہ جوبلی کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے دوسری جوبلی کے لئے دہلی کی مسجد عظمیٰ کے کیتھڈرل بنائے جانے کا ادعا نار وا ظاہر کیا تھا۔ وہ وقت آجائے کہ اسلام کی روحانی فتوحات سینٹ پال کے گرجے کو مریم و مسیح کی پرستش کی بجائے ایک خدا کی عبادت گاہ بنا دیں۔ اور ناقوس کلیسیا کے بدلے اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمد رسول اللّٰہ کا زمزمۂ قدسی فضا میں گونجنے لگے...... غرض مرزا صاحب کی یہ خدمت آنیوالی نسلوں کو گرانبار احسان رکھے گی کہ انہوں نے قلمی جہاد کرنیوالوں کی پہلی صف میں شامل ہو کر اسلام کی طرف سے فرض مدافعت ادا کیا اور ایسا لٹریچر یادگار چھوڑا جو اس وقت تک کہ مسلمانوں کی رگوں میں زندہ خون رہے اور حمایت اسلام کا جذبہ ان کے شعار قومی کا عنوان نظر آئے قائم رہے گا۔"

"اس کے علاوہ آریہ سماج کی زہریلی کچلیاں توڑنے میں مرزا صاحب نے اسلام کی بہت خاص خدمت انجام دی ہے...... اُن کی آریہ سماج کے مقابلہ کی تحریروں سے اس دعویٰ پر نہایت صاف روشنی پڑتی ہے کہ آئندہ ہماری مدافعت کا سلسلہ خواہ کسی درجہ تک وسیع ہو جائے ناممکن ہے کہ یہ تحریریں نظر انداز کی جا سکیں...... اپنے مذہب کے علاوہ مذاہب غیر پر ان کی نظر نہایت وسیع تھی۔ اور وہ اپنی ان معلومات کا نہایت سلیقہ سے استعمال کر سکتے تھے۔ تبلیغ و تلقین کا یہ ملکہ ان میں پیدا ہو گیا تھا کہ مخاطب کسی قابلیت یا کسی مشرب و ملت کا ہو ان کے برجستہ جواب سے ایک دفعہ ضرور گہرے فکر میں پڑ جاتا تھا ہندوستان آج مذاہب کا عجائب خانہ ہے اور جس کثرت سے چھوٹے بڑے مذاہب یہاں موجود ہیں اور باہمی کشمکش سے اپنی موجودگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں اس کی نظیر غالباً دنیا میں کسی جگہ سے نہیں مل سکتی۔ مرزا صاحب کا دعویٰ تھا کہ میں ان سب کے لئے حَکَم و عَدَل ہوں۔ اس میں

کلام نہیں کہ ان مختلف مذاہب کے مقابل پر اسلام کو نمایاں کر دینے کی اُن میں مخصوص قابلیت تھی......آئندہ اُمید نہیں کہ ہندوستان کی مذہبی دنیا میں اس شان کا شخص پیدا ہو جو اپنی اعلیٰ خواہشیں محض اس طرح مذہب کے مطالعہ میں صرف کر دے۔ فقط"

ایڈیٹر اخبار وکیل کی رائے

اس کے بعد ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء کو اسی اخبار وکیل میں ایڈیٹر اخبار کی طرف سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں سے کچھ اقتباسات نقل کرتا ہوں:-

"اگرچہ مرزا صاحب نے علوم مروجہ اور دینیات کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی مگر اُن کی زندگی اور زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص فطرت لیکر پیدا ہوئے تھے جو ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اپنے مطالعہ اور فطرت سلیمہ کی مدد سے مذہبی لٹریچر پر کافی عبور حاصل کیا اور ۱۸۷۷ء کے قریب جب کہ ان کی ۳۵-۳۶ سال کی عمر تھی ہم ان کو غیر معمولی مذہبی جوش میں سرشار پاتے ہیں۔ وہ ایک سچے اور پاکباز مسلمان کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا دل دنیوی کششوں سے غیر متاثر ہے۔ وہ خلوت میں انجمن اور انجمن میں خلوت کا لطف اٹھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ ہم اسے بے چین پاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں ہے جس کا پتہ فانی دنیا میں نہیں ملتا۔ اسلام اپنے گہرے رنگ کے ساتھ اس پر چھایا ہوا ہے۔ کبھی وہ آریوں سے مباحثہ کرتا ہے۔ کبھی حمایت اور حقیقت اسلام میں وہ بسیط کتابیں لکھتا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں بمقام ہوشیارپور جو مباحثات انہوں نے کئے اُن کا لطف اب تک دلوں سے محو نہیں ہوا.....غیر مذاہب کی تردید میں اور اسلام کی حمایت میں جو نادر کتابیں اُنہوں نے تصنیف کی تھیں ان کے مطالعہ سے جو وجد پیدا ہوا وہ اب تک نہیں اُترا ہے۔ ان کی کتاب براہین احمدیہ نے غیر مسلموں کو مرعوب کر دیا اور اسلامیوں کے دل بڑھا دیئے اور مذہب کی پیاری تصویر کو اُن آلائشوں اور گرد و غبار سے صاف کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جو مجاہیل کی توہم پرستیوں اور فطری کمزوریوں نے چڑھا دیئے تھے۔ غرضکہ اس تصنیف نے کم از کم ہندوستان کی حد میں دنیا میں ایک گونج پیدا کر دی جس کی صدائے بازگشت ہمارے کانوں میں اب تک آ رہی ہے......کیرکٹر کے لحاظ سے مرزا صاحب کے دامن پر سیاہی کا چھوٹا سا دھبہ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ ایک پاکباز جینا جیا۔ اور اس نے ایک متقی زندگی بسر کی۔ غرضیکہ مرزا صاحب کی ابتدائی زندگی کے پچاس سالوں نے بلحاظ اخلاق و عادات اور پسندیدہ

اطوار اور کیا بلحاظ خدمات و حمایت دین مسلمانان ہند میں ان کو ممتاز برگزیدہ اور قابل رشک مرتبہ پر پہنچا دیا۔"

ایڈیٹر صادق الاخبار ریواڑی کی رائے

ایڈیٹر صاحب صادق الاخبار ریواڑی کی رائے ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

"چونکہ مرزا صاحب نے اپنی پُر زور تقریروں اور شاندار تصنیف سے مخالفین اسلام کے ان لچر اعتراضات کے دندان شکن جواب دیکر ہمیشہ کے لئے ساکت کر دیا ہے۔ اور ثابت کر دکھایا ہے کہ حق حق ہی ہے۔ اور واقعی مرزا صاحب نے حق حمایت اسلام کما حقہ ادا کرکے خدمت دین اسلام میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ انصاف متقاضی ہے کہ ایسے اولوالعزم حامیٔ اسلام اور معین المسلمین۔ فاضل اجل۔ عالم بے بدل کی ناگہانی اور بے وقت موت پر افسوس کیا جائے۔"

ایڈیٹر اخبار علیگڑھ انسٹیٹیوٹ کی رائے

اخبار علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی رائے ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

"بے شک مرحوم اسلام کا ایک بہت بڑا پہلوان تھا۔"

ایڈیٹر اخبار کرزن گزٹ کی رائے

اخبار کرزن گزٹ کے ایڈیٹر مرزا حیرت دہلوی یکم جون ۱۹۰۸ء کے پرچہ میں اس طرح رقم طراز ہیں:۔

"مرحوم کی وہ اعلیٰ خدمات جو اُس نے آریوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں اسلام کی کی ہیں وہ واقعی بہت ہی تعریف کی مستحق ہیں۔ اس نے مناظرہ کا بالکل رنگ ہی بدل دیا اور ایک جدید لٹریچر کی بنیاد ہندوستان میں قائم کر دی۔ نہ بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے بلکہ ایک محقق ہونے کے ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے آریہ اور بڑے سے بڑے پادری کو یہ مجال نہ تھی کہ وہ مرحوم کے مقابلہ میں زبان کھول سکتا۔ جو بے نظیر کتابیں آریوں اور عیسائیوں کے مذاہب کی رد میں لکھی گئی ہیں اور جیسے دندان شکن جواب مخالفین اسلام کو دیئے گئے آجتک معقولیت سے ان کا جواب الجواب ہم نے تو نہیں دیکھا سوائے اس کے کہ آریہ نہایت بدتہذیبی سے اسلام یا پیشوایان اسلام یا اصول اسلام کو گالیاں دیں کوئی معقول جواب اب تک نہ دیا نہ دے سکتے ہیں۔ اگرچہ مرحوم پنجابی تھا مگر اس کے قلم میں اسقدر قوت تھی کہ آج سارے پنجاب بلکہ سارے ہند میں بھی اس قوت کا کوئی لکھنے والا نہیں۔ ایک پُر جذبہ اور قومی الفاظ کا انبار اس کے دماغ میں بھرا رہتا تھا اور جب وہ لکھنے بیٹھتا تو چچے تلے الفاظ کی ایسی آمد ہوتی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ مولوی نور الدین مرحوم خلیفہ اوّل

یہ جو لوگ ناواقف ہیں وہ تو اپنی غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کتابوں میں مولوی نورالدین نے بہت مدد دی ہے۔ مگر ہم اپنی ذاتی واقفیت سے کہتے ہیں کہ حکیم نورالدین۔ مرحوم مرزا کے مقابلہ میں چند سطریں بھی نہیں لکھ سکتا۔ اگرچہ مرحوم کے اُردو علم ادب میں بعض بعض مقامات پر پنجابی رنگ اپنا جلوہ دکھا دیتا ہے تو بھی اُس کا پُرزور لٹریچر اپنی شان میں بالکل نرالا ہے اور واقعی اس کی بعض بعض عبارتیں پڑھنے سے ایک وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اگرچہ کوئی باقاعدہ تعلیم عربی علم ادب اور صرف نحو کی کہیں حاصل نہیں کی۔ تو بھی اپنی خداداد ذہانت اور طبیعت کی جودت سے اتنی قابلیت عربی میں پیدا کر لی کہ بے تکلف عربی لکھتا تھا۔"

جمعیۃ احرار کے صدر کی رائے

جمعیۃ احرار کے صدر چودھری افضل حق صاحب کی رائے ملاحظہ ہو۔ اپنی کتاب "فتنۂ ارتداد اور پولٹیکل قلابازیاں" کے صفحہ ۴۶ پر لکھتے ہیں:۔

"آریہ سماج کے معرض وجود میں آنے سے پیشتر اسلام جسد بیجان تھا جس میں تبلیغی حس مفقود ہو چکی تھی۔ سوامی دیانند کی مذہب اسلام کے متعلق بدظنی نے مسلمانوں کو تھوڑی دیر کے لئے چونکا کر دیا۔ مگر حسب معمول جلدی خواب گراں طاری ہو گئی۔ مسلمانوں کے دیگر فرقوں میں تو کوئی جماعت تبلیغی اغراض کے لئے پیدا نہ ہو سکی۔ ہاں ایک دل مسلمانوں کی غفلت سے مضطرب ہو کر اُٹھا۔ ایک مختصر سی جماعت اپنے گرد جمع کر کے اسلام کی نشرواشاعت کے لئے بڑھا۔ اگرچہ مرزا غلام احمد صاحب کا دامن فرقہ بندی سے پاک نہ ہوا۔ تاہم اپنی جماعت میں وہ اشاعتی تڑپ پیدا کر گیا جو نہ صرف مسلمانوں کے مختلف فرقوں کیلئے قابل تقلید ہے بلکہ دنیا کی تمام جماعتوں کیلئے نمونہ ہے۔"

فرقہ بندی کا الزام غلط ہے

ایک دشمن کا یہ اعتراف کس قدر قابل وقعت ہے کہ مسلمانوں کی غفلت اور جمود کی حالت میں جبکہ آریہ سماج کا تازیانہ بھی اُن کو جگا نہ سکا تھا۔ صرف ایک دل تھا جس میں اشاعت اسلام کی تڑپ پیدا ہوئی اور وہ مرزا غلام احمد کا دل تھا اور آپ نے اس زمانہ میں جب اسلام اس قدر خطرہ کی حالت میں تھا سب سے پہلے اشاعت و حفاظت اسلام کے لئے جماعت قائم کی جو دنیا کی تمام جماعتوں کیلئے نمونہ ہے۔ باقی رہا یہ کہنا کہ آپ کا دامن فرقہ بندی سے پاک نہ تھا بالکل غلط ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اسلام میں سے فرقہ بندی کو مٹانے کے لئے آپ نے ہی اس زمانہ میں وہ بنیادی اصول قائم کیا جس پر مسلمان اگر عمل کریں تو آج مسلمانوں میں سے فرقہ بندی کا نشان مٹ جاتا ہے۔ دنیا میں مختلف انسانوں کی باوجود ایک نسل میں سے ہونے کے جس طرح شکل و صورت میں اختلاف ہے

اسی طرح طبائع میں بھی اختلاف ہے۔ اس لئے آرا اور خیالات میں اختلاف ہونا ناگزیر ہے۔ پس مسلمانوں میں اتحاد و وحدت پیدا کرنے کے لئے اسلام جیسے فطری مذہب کا بنیادی اصول یہی ہونا چاہئے تھا کہ اصولوں میں اتحاد پیدا کرکے باقی فروعات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اور نظر انداز کرنے کے یہ معنے نہیں کہ ان باتوں پر کبھی بحث نہ کی جائے یا غلطی کرنیوالوں کی غلطی کو نہ بتایا جائے۔ بلکہ معنے یہ ہیں کہ فروعات میں اختلاف کی وجہ سے کسی دوسرے مسلمان کو کافر نہ کہا جائے اور اسلام سے خارج نہ کیا جائے۔ غلطی بے شک بتلاؤ مگر اس غلطی کی وجہ سے اُسے کافر نہ کہو۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اسی اصول کی طرف توجہ دلائی۔ اور آپ نے اپنی جماعت کو اسی مسلک پر قائم کیا کہ کسی کلمہ گو اہل قبلہ کو کافر نہ کہا جائے اگر کوئی کافر کہے تو اُسے روکو۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اُسی کا بائیکاٹ یعنی مقاطعہ کرو۔ اور یہ تعزیر آپ نے فقط اس لئے جاری کی تا مسلمانوں میں سے یہ تکفیر مسلمانان کا مرض دور ہو جائے۔ آپ کا بڑا زور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اسی بات پر تھا کہ کسی شخص میں ننانوے وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ اسلام کی ہو تب بھی اُسے کافر نہ کہو۔ پس فرقہ بندی سے آزاد وہی جماعت ہو سکتی ہے جس کا اصول یہ ہو کہ وہ تمام اہل قبلہ کلمہ گوؤں کو مسلمان سمجھتی ہے۔ اور انہیں کافر کہنے والے کو یہاں تک بُرا سمجھتی ہے کہ ایسے شخص سے مقاطعہ کرنے کو بھی تیار رہتی ہے اور وہ فقط احمدیہ جماعت ہے جس کا مرکز لاہور ہے اور جس کا بحیثیت جماعت کے یہ مسلک ہے۔ پس جب تک اسی مسلک کو اختیار نہ کیا جائے گا۔ مسلمانوں میں سے فرقہ بندی کی لعنت دُور نہیں ہو سکتی۔

حضرت اقدس مرزا صاحب نے اسلام کی مدافعت جس قدر شاندار طریق سے کی وہ دوست دشمن سب کو مسلم ہے۔ جیسا کہ میں اوپر مُشتے نمونہ از خروارے بعض اخبارات کی آرا اس معاملہ پر نقل کر چکا ہوں۔ ایسی بہت سی آرا ہیں جو طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے جس کسی کا دل چاہے حضرت اقدس مرزا صاحب کی تصنیفات براہین احمدیہ۔ سرمۂ چشم آریہ آئینہ کمالات اسلام۔ انجام آتھم۔ ضمیمہ انجام آتھم۔ شحنۂ حق۔ نور القرآن۔ نسیم دعوت۔ آریہ دھرم۔ اسلام اور اس کی فلاسفی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں ملاحظہ کرکے خود پرکھ لے اور اندازہ کرلے۔

اشاعت اسلام

حضرت اقدس مرزا صاحب نے یہی نہیں کیا کہ فقط اسلام کی حفاظت کی بلکہ آپ نے اسلام کو اس مادیت اور دہریت کے زمانہ میں دنیا کے سامنے بڑے زور سے پیش کیا جبکہ مسلمانوں میں سیاسی تنزل

کے ساتھ احساس کمتری بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اور ایک مسلمان کا قلب مسیحی اور مادی تہذیب سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ اسے اس بات سے قطعاً مایوسی تھی کہ مسیحی اقوام یورپ جو علمی اور سیاسی ترقی میں تمام اقوام عالم کے پیش پیش ہیں کبھی اسلام کی طرف متوجہ بھی ہو سکتی ہیں۔ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں یہ خیال نہ گزر سکتا تھا کہ وہ اپنے مذہب کو جو اسلام ہے ان ترقی یافتہ قوموں کے سامنے پیش کر سکتا ہے بلکہ وہ اسلام کو اپنا مذہب ظاہر کرنا باعث ننگ و عار سمجھنے اور مسلمان کہلانے سے شرمانے لگا تھا۔ اسی سلسلہ میں جن بزرگوں نے مثلاً سید امیر علی یا سرسید احمد خاں وغیرہ نے مذہب اسلام کے متعلق کچھ لکھا بھی تو اپالوجی کے رنگ میں لکھا یعنی اسلام کی ہر ایک بات کی جو یورپ کے مذاق کے خلاف نظر آئی معذرت کے رنگ میں توجیہ کی۔ گویا یورپ کا فلسفہ اور اس کا مذاق سب مسلّمہ صداقتیں تھیں جن کے خلاف اگر کچھ اسلام میں نظر آیا تو اس کی معذرت اور توجیہ کر کے اس کو پورا کیا گیا۔ یہ وہ احساس کمتری تھا جو مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ پر چھایا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اسلام کو یورپ کے سامنے پیش کرنے کا خیال مسلمانوں کے دماغ میں خواب میں بھی نہیں آیا تھا کہ ان حالات میں قادیان کے گمنام گاؤں سے حضرت مرزا غلام احمد کی تمام دنیا سے الگ اور انوکھی ایک آواز اٹھی کہ اگرچہ مسلمانوں کا سیاسی تنزّل اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے مگر لیظھرہٗ علی الدّین کلّہٖ کے خدائی وعدہ کے ماتحت اس کے رُوحانی غلبہ کا وقت آگیا ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی تنزل اور چیز ہے اور اسلام کا رُوحانی غلبہ اور چیز ہے۔ چنانچہ ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی تنزّل کی حالت میں اللہ تعالیٰ اسلام کو رُوحانی طور پر غالب کر کے فاتح اور حاکم قوموں کو اسلام کا حلقہ بگوش اور خادم بنا تا رہا ہے۔ تاتاریوں نے جب بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مسلمان مغلوب ہو کر ان کے قدموں کے نیچے پامال ہو گئے تو اسلام کے روحانی غلبہ کا کرشمہ خدا نے دکھا کر دنیا کو حیران کر دیا۔ اور انہی تاتاری فاتحین کو اسلام کا حلقہ بگوش کر کے انہیں خادم دین بنا دیا۔ پس جب مسلمانوں کی مادی تلوار ختم ہو چکتی ہے تو اسلام کی روحانی تلوار کام کرتی ہے۔ یہ کرشمہ اللہ تعالیٰ اس لئے دکھاتا ہے تا دنیا پر عیاں ہو جائے کہ اسلام اپنے غلبہ کے لئے کسی مادی تلوار کا محتاج نہیں۔ اس کا غلبہ ہمیشہ روحانیت سے ہوا ہے۔ اور ہمیشہ روحانیت سے ہو گا۔ صداقت اور حقانیت اپنی نشر و اشاعت میں کسی حکومت اور تلوار کی محتاج نہیں ہوا کرتی۔ صداقت اپنا لوہا آپ منواتی ہے پس قرآن کریم کی ابدی صداقتیں اور محمد رسول اللہ صلعم کا اُسوہ حسنہ اگر کسی قوم کے سامنے صحیح اور معقول طور پر پیش کیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ طبائع اس کے آگے جھک نہ جائیں۔ آپ نے محض یہ دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ عملی طور پر ایک مبسوط کتاب براہین احمدیہ قرآن کریم اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی

صداقت اور حقیّت پر لکھ کر بڑے دھڑلے سے دنیا کے سامنے پیش کی۔ اور اُردو اور انگریزی اشتہار کے ذریعہ تمام ہندوستان، یورپ، امریکہ اور بلاد غیر میں اعلان کیا کہ اس کے تین سو دلائل میں سے اگر کوئی شخص کسی ایک دلیل کو بھی توڑ دے تو اس کو میں دس ہزار روپے کا انعام دینے کو تیار ہوں۔ یہی اشتہار مسٹر الگزنڈر ویب مشہور امریکی نو مُسلم کے اسلام لانے کا موجب ہوا۔ آج تک کسی کو اس چیلنج کے مقابلہ کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ چیلنج آج بھی قائم ہے۔ اس کتاب براہین احمدیہ میں اسلام کے متعلق کوئی اپالوجی نہیں ہے۔ بلکہ علاوہ معقول سے معقول دلائل کے جو سب سے عجیب اور اہم بات اس میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کو اصل قرار دیکر اس کی رُوحانیت کو یورپ کی مادیت کے مقابلہ میں پیش کر کے رُوحانیت کا غلبہ دکھایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ رُوحانیت کا انکار کر کے یورپ نے انسانیت کے سب سے اہم جزو کی طرف سے آنکھ بند کر لی ہے۔ گویا روحانی اور مادی علوم کی دو آنکھوں میں سے یورپ کی دائیں آنکھ یعنی روحانیت کی آنکھ بند ہے۔ وہ علوم کے حصول میں ایک کانے کی طرح ہے جس کی دائیں آنکھ ماری ہوئی ہے۔ جس طرح یورپ مادی سائنس کا علمبردار ہے اسی طرح اسلام رُوحانی سائنس کا علمبردار ہے۔ یورپ کو مادی علوم میں ترقی کر جانے کی وجہ سے اسقدر متکبّر نہیں ہو جانا چاہیئے کہ وہ اپنی حدود سے بڑھکر بغیر مشاہدہ اور تجربہ کے روحانی سائنس کا انکار کر دے اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر مشرق کو یورپ کے سامنے مادی علوم سیکھنے کیلئے زانوئے شاگردی تہ کرنے کی ضرورت ہے تو یورپ یعنی مغرب کو اسلام کے سامنے روحانی علوم سیکھنے کیلئے زانوئے شاگردی تہ کرنیکی ضرورت ہے۔ ہر ایک علم کو اسکے ماہر سے پوچھو۔ روحانی علوم کا ماہر ضروری نہیں کہ مادی ترقیات کا بھی عالم ہو اور مادی سائنس کا ماہر دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ روحانی علوم کا بھی ماہر ہے۔ ہوائی جہاز بنانے کا طریق پوچھنے ہم نبی کے پاس نہیں جائینگے بلکہ اس کیلئے کسی مادی سائنس کے ماہر سے استفسار کیا جائیگا۔ اسی طرح خدا پرستی اور روحانیت کے متعلق بجائے نبی یا عارف انسان کے کسی مادی سائنس کے عالم کے پاس جانا سراسر حماقت اور ضلالت ہے۔ مکان بنانے کیلئے ہم انجنیر سے مشورہ لینگے ڈاکٹر کو نہیں بلائیں گے۔ اور کسی مرض کی تشخیص کرانے اور اس کے لئے نسخہ لکھانے کے لئے ہم ڈاکٹر سے مشورہ لیں گے کسی انجنیر کو نہیں بلائیں گے۔ جب مادی علوم کے دائرہ کے اندر یہ حال ہے تو مادی اور روحانی علوم کے حدود تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پس یورپ کی مادی ترقی کو دیکھ کر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان اس سے مرعوب ہو جائیں اور اُن سے ڈر کر اسلام کے محکم اصولوں کی تاویلیں کرتے پھریں اور معذرت کے رنگ میں اُن سے دبکر صلح کریں۔ بلکہ مادہ پرستی کی وجہ سے انسانیت کا جو پہلو نامکمل رہ گیا ہے اسے اسلام کی

رُوحانیت کو پیش کر کے مکمل کرنا چاہئے۔ اور جو غلطیاں اور ٹھوکریں مادہ پرستی نے رُوحانیت کے بارے میں کھائی ہیں ان کی اصلاح کرنی چاہئے۔

غرضکہ اس شان کے ساتھ آپ نے اسلام کو اس کتاب براہین احمدیہ میں پیش کیا ہے اور آپ نے عام فلسفیوں کے خلاف وہی طریق اختیار کیا جو انبیا اور ان کے کامل متبعین اہل حال کا ہے کہ استدلال کا رُخ باطن سے ظاہر کی طرف ہے یعنی خدا کی ہستی اور روحانیت کے متعلق سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ مشاہدہ اور تجربہ سے مَیں نے خدا کے وجود پر اطلاع پائی اور وہ میری دعاؤں کو سُنتا اور مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور اُس سے خبر پا کر مَیں اسلام کی صداقت کی گواہی دیتا ہوں۔ اس کے بعد فلسفیانہ دلائل بھی پیش کئے ہیں جو آپ کے علیٰ وجہ البصیرت ہونے کی وجہ سے غلطیوں اور مغالطوں سے پاک ہیں اور اس قدر معقول اور مستحکم ہیں کہ اُن میں سے کسی ایک دلیل کے توڑنے پر آپ نے بڑی دلیری سے دس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔

حضرت مرزا صاحب کی اس خصوصیت کو کبھی بھول نہ جانا چاہئے کہ آپ اسلام کی جو تصویر پیش کرتے تھے وہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلعم سے ماخوذ ہوتی تھی حتیٰ کہ جو دلائل ہوتے تھے وہ بھی قرآن سے مستنبط ہوتے تھے۔ اسلام کو پیش کرتے وقت اس میں اپنی طرف سے رنگ آمیزی کرنے یا لوگوں سے ڈر کر کسی مسئلہ کو چھپا جانے یا اس کی رکیک تاویلیں کرنے کو آپ گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ جس مذہب کی بنیاد صریح طور پر قرآن و سنت نہیں وہ اسلام نہیں ہو سکتا وہ پیش کرنیوالے کا محض اپنا دماغی تخیل ہے۔ اسی لئے سر سید احمد خاں کی نیچریت اور اہل قرآن کی چکڑالویت کو آپ سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کے خلاف آپ کا قلم چلتا رہا۔ ہر ایک بدعت جو بعض فقہا یا متاخرین صوفیا نے اسلام میں ملا دی ہے اُسے نہایت بُرا سمجھتے تھے۔ آپ نے ایک مجدّد کے فرائض کو کامل طور پر ادا کیا اور وہ یہ تھا کہ اسلام کو ہر ایک قسم کی بدعت اور آمیزش سے جو عوام الناس کی جہالت اور کورانہ تقلید اور بعض نام کے صوفیوں کی غلط کارانہ روش اور زمانہ موجودہ کے تاثرات کے ماتحت نیچریت اور چکڑالویت نے پیدا کر دی تھیں صاف کر کے خالص اسلام کو جو قرآن اور سنت رسولؐ پر مبنی ہے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے نہ تو اہل حدیث علما کی طرح مذہب کو ایک خشک اور روحانیت سے خالی مسائل کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا۔ اور نہ روحانیت کے غلط مفہوم کو سامنے رکھ کر بعض متاخرین صوفیا کی بدعات کو اختیار کیا۔ بلکہ ان تمام غلطیوں سے دین کو پاک کر کے مسلمانوں کے ہاتھ میں دیا۔ حتیٰ کہ آپ دلائل تک کیلئے

بھی قرآن سے باہر نہ جاتے تھے کہ انسانی فلسفہ میں ٹھوکر کا احتمال ہے۔ آپ کی نظر میں نہ یونانی فلسفہ کی کوئی حقیقت تھی اور نہ موجودہ زمانہ کے فلسفہ کا آپ کے قلب پر کوئی رعب تھا۔ وہ احساس کمتری جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بوجہ ان کی غلامانہ ذہنیت کے مغربی فلسفہ نے پیدا کر رکھی ہے اس کی ہوا تک آپ کو نہ لگی تھی۔ جب مغربی فلسفہ اور کسی اسلامی اصول میں اختلاف نظر آتا تو آپ قطعاً مغربی فلسفہ سے مرعوب نہ ہوتے بلکہ نہایت دلیری اور مردانگی سے اس مسئلہ کو لیتے اور نہایت محققانہ نظر ڈالتے ہوئے مغربی فلسفہ کی غلطیوں کو طشت از بام کر دیتے۔ اور یہ کام ایسی آسانی سے آپ کے ہاتھوں سرزد ہوتا کہ غور کرنے والا انسان حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا۔ کہ ایک گاؤں کا رہنے والا انسان جو انگریزی زبان اور اس کے علوم سے ناآشنا ہے کس قدر آسانی سے مغربی فلسفہ کی غلطی کو نکال کر دکھا دیتا اور اسلام کی صداقت کا بول بالا کر دیتا ہے صاف ظاہر تھا کہ یہ علم لدنی تھا جو خدا کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا۔ آپ صاحب حال تھے۔ اسلامی اصولوں کے متعلق آپ اس یقین اور عرفان کے مقام پر پہنچے ہوئے تھے جہاں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی کسی وسوسہ اور شبہ کا گزر نہیں ہو سکتا۔ آپ اسلامی اصولوں کی صداقت پر ۲+۲ دو اور دو چار کی طرح یقین رکھتے اور اس لئے مغربی فلسفہ سے مقابلہ کے وقت آپ ذرا نہ گھبراتے اور نہایت جرأت اور دلیری اور کامیابی پر پورا یقین رکھتے ہوئے آپ مسئلہ متنازعہ فیہ پر محققانہ نظر ڈالتے اور بحث کرتے اور آخر ایک فاتح جرنیل کی طرح اس میدان میں باطل کو شکست دیکر مغربی فلسفہ کی غلطی اور اسلام کی صداقت کو نمایاں کر کے دکھا دیتے۔ اور پھر اسلام کے اصولوں کی صداقت کو اس قدر خوبصورت طریق اور دل کش پیرایہ میں پیش کرتے کہ انسان ان اصولوں کا عاشق ہو جاتا اور دل ان کی طرف پانی ہو کر بہنے لگتا۔ جن لوگوں نے ۱۸۹۶ء میں جلسۂ اعظم تحقیق مذاہب دیکھا ہے وہ اس لطف کو نہیں بھول سکتے جو حضرت مرزا صاحب کے لیکچر کو سن کر پبلک کو حاصل ہوا۔ اس مذہبی دنگل میں دنیا کے ہر ایک مذہب عیسائی، سناتن دھرم ہندو، آریہ سماج، برہمو سماج، دیو سماج سکھ، یہود، مسلمان وغیرہم غرضیکہ ہر ایک مذہب کے بڑے بڑے نامور پہلوان یعنی عالم و فاضل یگانۂ روزگار نمائندے موجود تھے اور جن پانچ سوالات پر ہر ایک نمائندہ نے اپنے اپنے مذہب کے رو سے روشنی ڈالی تھی ان پر سب نے اپنے اپنے مضامین پڑھے۔ وہ پانچ سوالات حسب ذیل تھے:۔

(۱) انسان کی جسمانی، اخلاقی اور روحانی حالتیں۔

(۲) انسان کی زندگی کے بعد کے حالات۔

(۳) دنیا میں انسان کی ہستی کی اصل غرض کیا ہے۔

(۴) کرم یعنی اعمال کا اثر دنیا اور عاقبت میں کیا ہوتا ہے۔

(۵) علم یعنی گیان و معرفت کے ذرائع کیا کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ پانچ سوال ایسے ہیں جو مذہب کے اغراض و مقاصد کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ ہر ایک نمائندہ نے ان سوالات پر اپنے اپنے مذہب کے رُو سے روشنی ڈالنی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے سوا تمام نمائندگان مذہب نے ان سوالات کے جو جوابات دیئے وہ لوگوں کے دلوں کو کسی تشفی بخش علم سے بہرہ اندوز نہ کر سکے۔ سب سے بڑھ کر نقص یہ تھا کہ ہر ایک نے جو کچھ پیش کیا وہ زیادہ تر اپنے دماغ کا تخیل پیش کیا۔ اپنی اپنی الہامی کتابوں سے اوّل تو کچھ پیش ہی نہ کیا اور کیا بھی تو بہت کم برائے نام۔ اس لئے جو کچھ انہوں نے پڑھا وہ بجائے اپنے مذہب کے محض اپنے خیالات کی نمائندگی تھی۔ البتہ حضرت مرزا صاحب نے ان سوالات کے جو جواب دیئے وہ اسقدر تسلی بخش اور علم و حکمت سے پُر تھے کہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس سارے جلسہ کا ماحصل آپ کا یہ مضمون تھا۔ اور اس جلسہ کا مقصد آپ کے اس مضمون سے بوجہ احسن پورا ہُوا۔ آپ نے جو کچھ پیش کیا سب قرآن کریم سے پیش کیا اپنی طرف سے کچھ نہ تھا بلکہ ہر بات پر آیت قرآنی کا حوالہ تھا اور ان آیات سے جو کچھ آپ استنباط فرماتے اور اس کی تفسیر میں جو حقائق و معارف بیان فرماتے انہیں سُن سُن کر تمام مسلم و غیر مسلم اہل علم اور فہمیدہ طبقہ حیرت سے سر دھنتا۔ مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ آیات قرآنی کی تفسیر سُن سُن کر جھومتے اور وجد کرتے۔ اور غیر مذاہب کے نمائندے تو اس حقائق و معارف کے بحر بیکراں کو سُن کر مبہوت ہو گئے اور بڑے بڑے وہریوں اور ملحدوں کے سر ان صداقتوں کے آگے جھک گئے۔ اور اثر کا یہ عالم تھا کہ کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ دوست دشمن مسلم غیر مسلم سب بُت بنے بیٹھے ہوئے تھے اور لیکچر کا ایسا فوق العادت اثر تھا کہ گویا ملائک آسمان سے نور کے طبق لیکر اُتر رہے ہیں۔ اور ہر ایک دل اسکی طرف ایسا کھینچا گیا تھا کہ گویا ایک دست غیب اس کو کشاں کشاں عالم وجد کی طرف لیجا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس حالت وجد میں وقت کے ختم ہونے کا کسی کو احساس تک نہ ہُوا۔ جب صدر جلسہ نے یہ اعلان کیا کہ وقت ختم ہو گیا تو سامعین کو سخت صدمہ ہُوا کیونکہ آپ کے مضمون کا ابھی پہلا سوال بھی ختم نہیں ہُوا تھا۔ اور علم و حکمت کے یہ موتی ابھی لٹائے جا رہے تھے جو درمیان میں وقت ختم ہو جانے نے بڑی پریشانی پیدا کر دی۔ آپ کے لیکچر کے بعد مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی کا لیکچر تھا۔ انہوں

نے اعلان کر دیا کہ میں اپنے مضمون کا وقت بھی حضرت مرزا صاحب کے مضمون کیلئے دیتا ہوں۔ اس اعلان پر مجمع میں اس قدر خوشی کا اظہار ہوا کہ دیکھ کر تعجب اور حیرت ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی جو اس مضمون کو پڑھ رہے تھے برابر پڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ساڑھے چار بج گئے اور جلسہ کا وقت ختم ہو گیا لیکن ابھی پہلا سوال بھی ختم نہ ہوا تھا۔ آخر لوگوں نے اصرار کیا کہ اس لکچر کو برابر اختتام تک پڑھا جائے۔ چنانچہ منتظمین جلسہ نے جن میں تمام مذاہب کے نمائندے شامل تھے اعلان کیا کہ بلالحاظ وقت کے یہ مضمون جاری رہے۔ ساڑھے پانچ بجے جا کر پہلا سوال ختم ہوا لیکن لوگوں کا اصرار برابر جاری تھا کہ مضمون کو ختم کیا جائے۔ آخر منتظمین جلسہ نے خاص اس مضمون کے لئے کانفرنس کا ایک دن اور بڑھایا۔ غرضکہ دو روز میں قریباً ۷½ گھنٹوں میں جا کر یہ مضمون ختم ہوا۔ اس مضمون کے پڑھنے کے دوران میں لوگوں کی حالت یہ تھی کہ خوشی اور اثر سے آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور بعض رقیق القلب زار زار روتے تھے۔ اور سامعین کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایمان اور عرفان کی سیڑھیوں پر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ہر نئے نکتۂ معرفت اور دقیقۂ علم و حکمت پر آب حیات کا ایک گھونٹ کانوں کے رستہ قلب میں اترتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس لکچر کے ساتھ ہی تمام لاہور میں ایک شور پڑ گیا۔ اور نہ صرف اس کانفرنس کے ارباب حل و عقد نے بلکہ ہر ایک موافق و مخالف نے یہ تسلیم کر لیا کہ جناب مرزا صاحب کا "مضمون بالا رہا"۔ مخالف اخبارات میں بھی آپ کے اس مضمون کی فضیلت و فوقیت کا اعتراف کیا گیا۔ لاہور کے انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے صاف لفظوں میں اقرار کیا کہ "اس مذہبی کانفرنس میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا مضمون سب سے بالا رہا" غرضکہ اس جلسہ میں اسلام کو تمام مذاہب عالم پر وہ نمایاں فتح حاصل ہوئی کہ لیظهره علی الدین کله کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آج اس "جلسۂ اعظم تحقیق مذاہب کی روئداد" ساری کی ساری اسی نام سے ایک کتاب کی شکل میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ جس میں ہر ایک مذہب کے نمائندہ کی تقریریں بھی طبع شدہ موجود ہیں۔ ان کو پڑھو تو صاف نظر آتا ہے کہ دوسری تمام تقریریں دھندلے مٹی کے دیئے (چراغ) ہیں۔ جن کی ٹمٹماتی روشنی حضرت مرزا صاحب کے مضمون کے آفتاب کی روشنی کے سامنے ناپید ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کتاب میں حضرت مرزا صاحب کے مضمون کو پڑھ کر انسان کے دل میں اسلام کی صداقت کا ایک نور پیدا ہوتا ہے اور روح لذت عرفان سے وجد کر اٹھتی ہے۔ آپ کے اس مضمون کا انگریزی ترجمہ مولوی محمد علی صاحب نے

"ٹیچنگز آف اسلام" (Teachings of Islam) کے نام سے جب شائع کیا اور اس کی انگلستان میں اشاعت ہوئی تو صدہا قلب سلیم رکھنے والے انگریزوں کیلئے موجب ہدایت بن گیا اور وہ مسلمان ہوگئے۔ روس کا مشہور عالم کونٹ ٹالسٹائے اسے پڑھ کر حیران رہ گیا اور ایک خط کے ذریعہ بڑی تعریف کی۔

ایک اسی لیکچر پر کیا منحصر ہے آپ نے اسلام پر جو لٹریچر بھی پیدا کیا وہ ایسا شاندار اور اسقدر صداقت اور علم و حکمت سے پُر ہے کہ کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو اگر تعصب کی وجہ سے دل سے انصاف اور حق طلبی کا مادہ سلب نہ ہوگیا ہو تو ایک دفعہ تو اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اسلام کی صداقت اور حسن و جمال کے آگے اس کا سر جھک جاتا ہے۔ بڑے بڑے اہل الرائے لوگوں کا جو آپ کے دعوے سے اختلاف رکھتے تھے یہ اقرار تھا کہ آپ نے اسلام کی وہ شاندار خدمت کی ہے جس کی نظیر اس تیرہ سو سال میں اُمت محمدیہ میں نہیں ملتی۔ براہین احمدیہ پر مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب آپ کے سب سے بڑے مخالف کا ریویو میں نقل کرچکا ہوں۔ ایک دفعہ پھر سن لو۔ لکھتے ہیں:-

"یہ کتاب اس زمانہ میں موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں شائع نہیں ہوئی اور آئندہ کی خبر نہیں۔ لعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امرا...... اور اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی و جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر مسلمانوں میں بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ ہمارے ان الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم سے کم ایک ایسی کتاب بتادے جس میں جملہ فرقہائے مخالفین اسلام خصوصاً آریہ و برہمو سماج سے اس زور و شور سے مقابلہ پایا جاتا ہو۔ اور دو چار ایسے اشخاص انصار اسلام کی نشان دہی کرے جنہوں نے اسلام کی نصرت مالی و جانی و قلمی و لسانی کے علاوہ حالی نصرت کا بھی بیڑا اٹھالیا ہو۔ اور مخالفین اسلام و منکرین الہام کے مقابلہ میں مردانہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو کہ جس کو وجود الہام کا شک ہو وہ ہمارے پاس آکر اس کا تجربہ و مشاہدہ کرلے۔ اور اس تجربہ و مشاہدہ کا اقوام غیر کو مزہ بھی چکھا دیا ہو" (اشاعۃ السنہ جلد ۷)

اس میں شک نہیں کہ مولویوں کے تکفیر کے ڈر سے بہت لوگوں کی آوازیں جو حضرت مرزا صاحب کی خدمت اسلام کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں دب کر رہ گئیں۔ لیکن حضرت اقدس مرزا صاحب کی وفات پر اخباروں میں اہل الرائے اصحاب نے جو کچھ آپ کی خدمات دینیہ کا اعتراف کیا ان میں سے چند بطور نمونہ میں درج کرچکا ہوں اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے آپ کی تصنیفات موجود ہیں جس کا دل چاہے پڑھ کر اپنی تسلی کرلے۔

اشاعت اسلام کے ذرائع آپ نے اشاعت اسلام کیلئے مختلف ذرائع اختیارات کئے۔ لیکچروں اور اشتہاروں اور تصنیفات کتب کے علاوہ ۱۹۰۲ء میں آپ نے ایک ماہوار رسالہ ریویو آف ریلیجنز مولوی محمد علی صاحب ایم اے کی ادارت میں جاری فرمایا جس میں اسلام کے عقائد اور اصولوں اور اہم مسائل پر آپ کی اور مولوی محمد علی صاحب کی قلم سے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مضمون شائع ہوتے رہے۔ آپکے مضامین کا انگریزی میں مولوی محمد علی صاحب ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اس رسالہ نے اسلامی اور مسیحی دنیا میں ایک تہلکہ ڈال دیا۔ اور اسلام کی فوقیت اور فضیلت کا اعتراف دوست دشمن سب کی زبانوں سے ہونے لگا۔ اور اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ ایک حقیقت بن کر سامنے نظر آنے لگا اور تمام اکناف عالم میں ایک ہوا چل گئی جس سے اگر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت پر یقین پیدا ہوا تو غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام سے نفرت دور ہو کر اس کی عزت و عظمت نے جگہ لے لی۔ لیکن اتنا ہی نہیں۔ یہ کام ایسا نہ تھا جو حضرت مرزا صاحب کی زندگی میں ہی اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا۔ اس کی تکمیل کے لئے صدیاں درکار تھیں اس لئے اس کام کو جاری رکھنے کے لئے آپ نے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون (آل عمران) کے حکم کے ماتحت ایک جماعت بنائی جو لوگوں کو اسلام کی طرف بلائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور اس جماعت کے ساتھ خدا کا وعدہ ہے کہ وہ کامیاب ہوگی۔ سو آپ نے ایک جماعت بنا کر اس سے دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا عہد لیا اور اشاعت اسلام میں تن من دھن قربان کر دینے کی اسے وصیت کی۔ اس جماعت نے کیا کام کیا یہ میں انشاء اللہ تعالیٰ آگے چل کر بیان کروں گا۔ لوگ معترض ہیں کہ جماعت کیوں بنائی۔ لیکن کیا کسی کام پر مداومت بغیر جماعت کے بھی ہو سکتی ہے۔ کاش کوئی غور کرے اور سوچے۔

حکم و عدل کے فرائض کو پورا کیا

اشاعت اسلام کے سلسلہ میں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اسلام کو غیر اقوام کے سامنے پیش کرنے سے قبل مجدد وقت کا سب سے پہلا فرض تھا کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ اسلام کی صحیح تصویر مطابق قرآن و سنت کے کیا ہے جو بانی اسلام نے پیش کی تھی۔ اور ہر ایک بدعت یا اختلاف جو اس زمانہ فیج اعوج میں اسلام میں داخل ہو گیا تھا اُسے دور کر کے صراط مستقیم کو واضح کر دے۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے اس زمانہ کے مجدد کا جہاں ابن مریم نام رکھا اس وجہ سے کہ کسر صلیب اور مسیحیوں

میں اشاعت اسلام کی ڈیوٹی اس کے سپرد تھی۔ وہاں آپ نے اسے حکم اور عدل کا خطاب بھی عطا فرمایا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکماً عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر...... الخ (صحیح بخاری) ترجمہ: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ قریب ہے کہ ابن مریم تم میں نازل ہو حکم وعدل ہو کر یعنی وہ اسلام کے مختلف فرقوں کے باہمی تنازعات میں عدل یعنی قرآن وحدیث کے مطابق انصاف سے فیصلہ دے گا اور صلیب کو توڑیگا اور خنزیر کو قتل کرے گا...... پس حضرت مرزا صاحب کا جن کا دعویٰ اس صدی کے مجدد ہونے کا تھا ہاں وہی مجدد جس کو ابن مریم اور حکم وعدل کے معزز خطابات سے عزت بخشی گئی فرض تھا کہ مسلمانوں کے اصولی مسائل ومعتقدات میں ان کے تمام باہمی اختلافات وتنازعات کا قرآن وسنت کے تحت حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ دیتے تاکہ صراط مستقیم واضح ہو کر اسلام کا زرخالص ایک مبلغ کے ہاتھ میں ہوتا جسے وہ بڑی دلیری سے غیر مسلم اقوام کے سامنے پیش کرسکتا۔ اور اہل علم وتحقیق طالبان حق کی محفلوں میں وہ زرخالص کھوٹا نہ ثابت ہوتا حضرت مرزا صاحب کی تصنیفات وتحریرات اور تقاریر ان پرحکمت فیصلوں سے بھری پڑی ہیں۔ میں یہاں مختصراً بطور نمونہ بعض امور کو پیش کرتا ہوں تفصیل حضرت اقدس کی کتب میں ملاحظہ ہو۔ یہاں اپنی سمجھ کے مطابق محض خلاصہ اور اشارہ پر میں نے اکتفا کیا ہے وباللہ التوفیق۔

(۱) اسلام میں پہلا اختلاف سنی، شیعہ اور خوارج کی تقسیم

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف اُمت محمدیہ میں جو رونما ہوا وہ خلافت کے بارے میں تھا اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے وقت اجماع صحابہ سے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تھے۔ مگر بعد میں سیاسی اغراض کے دلدادہ لوگوں نے اس کا انکار کیا۔ اور حضرت علیؓ کو نہ معلوم کیوں آنحضرت صلعم کے بعد خلافت کا حقدار فرض کرکے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کی خلافت کا انکار کردیا۔ حضرت علیؓ کو سب سے بڑھ کر خلافت کا حقدار سمجھنے کی وجہ مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر رشتہ داری کو مقدم رکھا جائے (حالانکہ اسلام سلطنت اور خلافت کے لئے کسی رشتہ داری کا قائل نہیں) تو حضرت علیؓ اگر رسول اللہ صلعم کے داماد تھے تو حضرت عثمانؓ بھی حضور صلعم کے داماد تھے۔ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ آنحضرت صلعم کے خسر تھے۔ اگر خدمات دینیہ کو مقدم رکھا جائے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا مرتبہ حضرت علیؓ سے کہیں بلند نظر آتا ہے۔ اگر سلطنت اور سیاست کو سنبھالنے کی قابلیت کو دیکھا جائے تو بھی واقعات حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مقام کو حضرت علیؓ

سے بہت بلند کر کے دکھاتے ہیں تو حضرت علی کی نسبت خلافت کے بارے میں یہ فضیلت کی رائے میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ بہرحال اس زمانہ میں سیاسی اغراض نے ایک جماعت پیدا کر دی جو بظاہر حُبّ علی کے نام سے ان خلفائے ثلاثہ کو نعوذ باللہ غاصب اور منافق قرار دینے لگی۔ یہ لوگ شیعان علی اور بعد میں مجرد شیعہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ ان کے مقابل میں ایک اور جماعت پیدا ہوئی جن کو حضرت علیؓ سے سخت اختلاف تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے دشمن تھے بلکہ انہیں حضرت عثمان کو شہید کرنے کی سازش میں ملوث گردانتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی کی خلافت کے زمانہ میں ان کی بغاوت کو حضرت علی نے نہایت سختی سے فرو کیا۔ پس اسلام میں تین فرقے ہو گئے (۱) ایک شیعہ جو فقط حضرت علی کو خلیفہ برحق مانتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ تینوں خلفا کو غاصب اور منافق اور تمام صحابہ اور ازواج مطہرات کو جو اس وقت موجود تھے سوائے معدودے چند کے سب کو منافق سمجھتے تھے (۲) دوم خوارج جو حضرت علی کو ظالم اور غاصب سمجھتے تھے۔ (۳) اور سوم اہل سنت والجماعت جو تمام خلفا کو برحق اور تمام صحابہ اور ازواج مطہرات کو خدا کے برگزیدہ مانتے تھے۔

حضرت مرزا صاحب کا فیصلہ حضرت مرزا صاحب نے صاف صاف اعلان فرمایا کہ اکابر اہل سنت والجماعت کا مذہب ہی حق ہے اور آپ کا مسلک بھی یہی ہے۔ آپ نے شیعہ اور خوارج دونو کو رد کر دیا۔ اور چونکہ شیعوں کی طرف سے بہت سی تصانیف خلفائے ثلاثہ بالخصوص حضرت ابوبکر کے غاصب ہونے پر لکھی جا چکی تھیں۔ اس لئے آپ نے بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں ان کے الزامات کی بڑے زور سے تردید کی۔ علمائے اہل سنت نے اگرچہ شیعہ مذہب کا بڑی کثرت سے رد کیا ہے۔ اور بڑی کامیابی کے ساتھ رد کیا ہے۔ مگر ان کی بنا روایات پر زیادہ اور آیات قرآنی پر کم ہے۔ لیکن حضرت مرزا صاحب نے شیعہ مذہب کی تردید محض قرآن کریم کی آیات سے اس شد و مد سے کی ہے جس سے یہ مذہب باطل خس و خاشاک کی طرح اُڑ جاتا ہے۔ آپ نے اپنی کتاب سر الخلافہ میں بڑے زور سے ثابت کیا ہے کہ کسی خلافت کی سچائی کا معیار قرآن کریم سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آیت استخلاف میں خلافت حقہ کا بدیہی نشان اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنًا (النور) کہ اسلام کی اس کے ضعف کے بعد تمکین اور استحکام اور مسلمانوں پر اگر حالت خوف وارد ہو تو اس کو امن سے بدل دینا۔ یہ نشان جس صفائی سے حضرت ابوبکر کی خلافت میں پورا ہوا کسی دوسرے خلیفہ کی خلافت اس کے مقابلہ میں ٹھیر نہیں سکتی۔ آنحضرت صلعم کی وفات

کے بعد جب سارا عرب مرتد ہوگیا اور اسلام پر سخت ضعف کی حالت وارد ہوگئی۔ اور مسلمان مختلف مدعیانِ نبوت کی موجودگی اور تمام ملک عرب کی بغاوت کی وجہ سے سخت خوف کی حالت میں گھر گئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر کی خلافت کے ذریعہ اسلام کا یہ ضعف استحکام و تمکین سے اور اور مسلمانوں کا خوف امن سے جس طرح مبدل ہؤا وہ اسلام کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ پس کسی شخص کی خلافت قرآن کریم کے معیار خلافت حقہ پر اگر پُوری اُتر سکتی ہے تو وہ فقط حضرت ابوبکر کی خلافت ہے۔ غرضنکہ حضرت مرزا صاحب نے قرآن کریم سے شیعہ مذہب کا نہایت شدومد سے ردکیا۔ اور جو کچھ کیا قرآن کریم سے کیا۔ آپ کا قول تھا کہ قرآن کریم قطعاً شیعہ مذہب کو برداشت نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم کسی حسب نسب کا قائل نہیں۔ وہاں تقویٰ و طہارت سب پر مقدم ہے۔ اِنَّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم کے ماتحت کسی شخص کی بزرگی اس کا حسب و نسب نہیں بلکہ اس کا تقوےٰ و طہارت ہے۔ ہم حضرت علیؓ اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسین کی عزت کرتے اور اُن سے محبت رکھتے ہیں اس لئے کہ اُن میں تقویٰ و طہارت تھا اور وہ خدا کے برگزیدے تھے۔ نہ محض اس لئے کہ وہ آنحضرت صلعم کے رشتہ دار تھے۔ بغیر تقویٰ و طہارت کے نبی کی رشتہ داری کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ اگر نبی کی رشتہ داری کوئی فائدہ دے سکتی تو حضرت نوح اور حضرت سلیمان کے بیٹوں اور حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کو کیوں فائدہ نہ دیا۔ اور قرآن کریم میں صاف لکھا ہے کہ واذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذٍ کہ جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن کوئی نسبی تعلق باقی نہ رہے گا۔

غرضنکہ آپ نے ثابت کرکے دکھادیا کہ شیعہ اور خوارج ہر دو فریق گمراہی اور غلطی پر ہیں۔ صحیح طریق اہل سنت والجماعت کا ہے تفصیل آپ کی کتب میں ہے۔

(۲) اہل سنت والجماعت میں قرآن و حدیث اور فقہ کے مدارج میں اختلاف کا فیصلہ

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور اسلام پھیلتا گیا تو ہزارہا کی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہونے اور نئے سے نئے واقعات پیش آنے لگے۔ قوانین شریعت کی بنا قرآن اور حدیث پر تھی۔ اس زمانہ میں چھاپہ خانہ نہ تھا۔ حدیث کی کتب اس کثرت سے رائج نہ تھیں جیسی آج ہیں۔ زیادہ تر زبانی روایات اور قلمی تصانیف کے ذریعہ علم حدیث لوگوں تک پہنچتا تھا۔ پھر ہر ایک شخص کی سمجھ اور فہم اور طریق استنباط مسائل میں بھی اختلاف ہؤا کرتا ہے اس لئے قرآن و حدیث سے مسائل کے استنباط میں اختلاف ہوجانا ناگزیر تھا۔ قرآن کریم تو سب کے پاس تھا مگر احادیث میں سے جو حدیث جس امام کے پاس

پہنچی آخر اُس نے اُسی میں سے مسائل کا استنباط کرنا تھا اور اپنی سمجھ کے مطابق کرنا تھا۔ نتیجہ یہ کہ فقہی مسائل میں اختلاف پیدا ہونے لگا۔ اگرچہ قرآن و حدیث سے اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق استنباط کرنا جسے اجتہاد کرنا کہتے ہیں صحابہ کے وقت سے شروع ہو گیا تھا اور ان میں حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہ رضؓ کا مقام بہت بلند تھا۔ لیکن بعد کے زمانہ میں صدہا فقہا اسلام میں پیدا ہوئے جن میں سے چار اشخاص فقاہت اور اجتہاد کے امام تسلیم کئے گئے۔ ایکؔ تو امام مالک۔ دوسرےؔ امام ابوحنیفہ تیسرےؔ امام شافعی۔ چوتھےؔ امام حنبل۔ ان بزرگوں کے اجتہادی مسائل کو پڑھو تو ان میں اس قدر اختلاف نظر آئے گا کہ بعض دفعہ انسان متحیر رہ جاتا ہے۔ اور اُس وقت خدا کے اس قول کی صداقت آفتاب کی طرح نظر آنے لگتی ہے کہ لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ کہ اگر یہ قرآن خدا کے غیر کی طرف سے ہوتا تو تم اس میں کثرت سے اختلاف پاتے۔ پس اصول مذہب میں اختلاف سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ قوانین شریعت اور اصول ہدایت خدا کی طرف سے بذریعہ وحی انسان کو دیئے جاتے۔ چنانچہ فقہ انسانی کو دیکھو کہ ایک ہی بنیاد اور اساس ہے۔ مگر جب مختلف انسانی دماغ اس سے مسائل استنباط کرنے لگتے ہیں تو کس قدر مختلف راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ اُدھر قرآن کریم کو دیکھو تو اس میں صدہا قسم کے مسائل شرعیہ اور حقائق و معارف الٰہیہ موجود ہوتے ہوئے پھر ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا منبع انسانی دماغ نہ تھا بلکہ وحی الٰہی تھی۔

مقلدین کا وجود عوام الناس میں تقلید کا مادہ ہوتا ہے اور ان کی کمیٔ علم بھی تقلید پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے اہل سنت والجماعت میں ان ائمہ مجتہدین کی تقلید عام طور پر رائج ہو گئی۔ چونکہ حضرت امام ابوحنیفہ صاحب کے شاگرد رشید امام ابو یوسف صاحب خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں سلطنت کی طرف سے قاضی یعنی جج تھے۔ اس لئے حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے تمام سلطنت میں جو ہندوستان ترکستان، افغانستان، ایران، عراق، شام و روم عرب وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی فقہ حنفی کا رواج بڑی کثرت سے ہو گیا۔ لیکن فقہ شافعی و حنبلی و مالکی بھی اپنی اپنی جگہ موجود رہیں۔ چنانچہ شمالی افریقہ میں مالکی فقہ کا کثرت سے رواج ہوا۔

اہل حدیث یا غیر مقلدین کا وجود اس تقلید کی وجہ سے آپس میں مختلف فرقہ ہائے مقلدین حنفی و شافعی و مالکی و حنبلی میں اختلاف کے ساتھ ساتھ مخالفت کا پیدا ہو جانا بھی لازمی امر تھا۔ اس لئے اہل تحقیق نے اس کورانہ تقلید کو اچھی نظر سے نہ دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا کیونکہ شریعت کمال کو پہنچ گئی۔ لیکن اجتہاد کا دروازہ کس طرح بند ہو سکتا ہے جبکہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں نئے نئے

واقعات سے مسلمانوں کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اور نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ پس کورانہ تقلید ایک نہایت لغو امر ہے۔ انہوں نے قرآن و احادیث کو لیکر ان سے خود اجتہاد کرنا شروع کیا۔ رفتارِ زمانہ نے کتابت و طباعت کو اسقدر ترقی دی اور کتب دینیہ کی اشاعت اس کثرت سے ہوئی کہ ان محققین کی جماعت کو ایسی احادیث صحیحہ بھی مل گئیں جو ان ائمہ مجتہدین کے اجتہادات سے مختلف تھیں۔ پس انہوں نے تقلید کو ترک کر کے ان احادیث کی پیروی کو مقدم کر لیا اور سنت نبوی کے سامنے اجتہادِ شخصی کو ترک کر دیا۔ یہ لوگ غیر مقلد یا اہل حدیث کہلائے۔

کسی فقیہ کا مطلب یہ نہ تھا کہ حدیث صحیح کے سامنے ان کے اجتہاد کی تقلید کی جائے بلکہ ان کے صاف اقوال موجود ہیں کہ حدیث صحیح کے سامنے ہمارے اقوال کو ترک کر دو۔ لیکن ہر ایک فرقہ میں غالیوں کا ایک گروہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ائمہ مجتہدین کے مقلدین میں یہ غلو رائج ہو گیا کہ "ایں حدیث صحیح است اما مذہب ما ایں نیست" یعنی یہ حدیث تو صحیح ہے مگر ہمارا مذہب یہ نہیں ہے۔ یعنی امام کے قول کو رسولؐ کے قول پر مقدم کر لیا۔ اس کے بالمقابل اہل حدیث کا یہ مسلک تھا کہ وہ ائمہ مجتہدین کے اقوال پر حدیث کو مقدم کرتے تھے اور یہی مسلک صحیح تھا لیکن آہستہ آہستہ ان میں بھی یہ غلو پیدا ہو گیا کہ ائمہ مجتہدین کے اقوال پر تو حدیث کو مقدم کرتے ہی تھے۔ قرآن کریم کی آیات پر بھی احادیث کو مقدم کرنے لگے۔ اور جہاں آیات قرآنی اور احادیث میں تضاد نظر آیا وہاں بجائے اس کے کہ احادیث کی وہ تاویل کریں جو قرآن سے تطبیق کھائے۔ یا اگر تاویل نہ ہو سکے تو اسے ترک کر دیں کیونکہ رسول اللہ صلعم کا کوئی قول اور فعل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ حدیث کو مقدم کرنے اور قرآن کریم کی آیت کو منسوخ قرار دینے لگے۔

چکڑالویوں کا وجود اس کے ردِ عمل کے طور پر آخر کار ہمارے زمانہ میں چکڑالوی پیدا ہو گئے جو اپنے آپ کو پہلے تو اہل قرآن کہتے تھے پھر اہل الذکر کہنے لگے۔ پھر اُمت مسلمہ کہنے لگے جنہوں نے تمام احادیث صحیحہ کو نعوذ باللہ ایک جھوٹ کا طومار قرار دیکر سب کو رد کر دیا۔ اور خود ہر ایک مسئلہ قرآن کریم میں سے استنباط کرنے لگے۔ فہم کی کمی اور اختلاف کی وجہ سے مختلف چکڑالویوں نے نماز اور روزہ اور ہر ایک مسئلہ کی ایسی ایسی عجیب اور ایک دوسرے سے مختلف شکلیں نکالیں کہ عقل انسانی حیران ہو کر رہ گئی۔ اور یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت نبی کریم صلعم نے قرآن کریم میں سے جو عبادت اور شریعت کے مسائل استنباط کئے اور اپنے نمونہ سے اُن پر عمل کر کے دکھایا وہ بجائے خود وحی الٰہی کے ماتحت استنباط تھا جسے وحی خفی کہتے ہیں اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے کہ ثم ان علینا بیانہ (القیمہ) کہ جس طرح قرآن کریم کی وحی جلی

جناب الٰہی کی طرف سے تھی۔ اُسی طرح قرآن کریم کی تفہیم بھی جو حضرت نبی کریم صلعم کو ہوتی تھی خدا کی وحی خفی کے ماتحت ہوتی تھی۔ اگر وحی الٰہی سے آپ کا استنباط نہ ہوتا تو دماغ انسانی کے استنباط کی بوالعجبیاں تو ان چکڑالویوں کے طرح طرح کے استنباط اور ان کے اختلافات سے ظاہر ہے۔

حضرت اقدس مرزا صاحب کا محاکمہ

اس سے قبل اہل حدیث یعنی غیر مقلدین کا مباحثہ مقلدین یعنی ائمہ مجتہدین کے پیروی کرنیوالوں سے تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ لیکن اب یہ نیا فرقہ چکڑالویوں کا جو نکلا تو یہ اہل حدیث پر بڑی سخت چوٹ تھی اس لئے اُن کا آپس میں مباحثہ ہو جانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ چکڑالوی فرقہ کے بانی مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی اور اہل حدیث فرقہ کے چوٹی کے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی میں مباحثہ ہوگیا۔ اس پر محاکمہ جو حضرت اقدس مرزا صاحب کی قلم سے ۲۷۔ نومبر ۱۹۰۲ء کو شائع ہوا وہ بجائے خود ایک شاہکار ہے۔ جس میں چکڑالویوں اور اہل حدیث (یعنی غیر مقلدین) اور مقلدین (حنفی وغیرہ) سب پر روشنی پڑ گئی ہے اس لئے اس میں سے بعض اقتباسات یہاں درج کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

"فریقین کی تحریرات سے معلوم ہوا کہ مباحثہ مندرجہ عنوان کے پیش آنے کی وجہ یہ تھی کہ مولوی عبداللہ صاحب احادیث نبویہ کو محض ردّی کی طرح خیال کرتے ہیں اور ایسے الفاظ منہ پر لاتے ہیں جن کا ذکر کرنا بھی سوء ادب میں داخل ہے۔ اور مولوی محمد حسین صاحب نے انکے مقابل یہ حجت پیش کی تھی کہ اگر احادیث ایسی ہی ردی اور لغو اور ناقابل اعتبار ہیں تو اس سے اکثر حصے عبادات اور مسائل فقہ کے باطل ہو جائیں گے۔ کیونکہ احکام قرآنی کی تفاصیل کا پتہ حدیث کے ذریعہ سے ہی ملتا ہے ورنہ صرف اگر قرآن ہی کافی سمجھا جائے تو پھر محض قرآن کے رُو سے اس پر کیا دلیل ہے کہ فریضۂ صبح کی دو رکعت اور مغرب کی تین رکعت اور باقی تین نمازیں چار چار رکعت ہیں۔ یہ اعتراض ایک زبردست پیرایہ میں ہے۔ گو اپنے اندر ایک غلطی رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس اعتراض کا مولوی عبداللہ صاحب نے کوئی شافی جواب نہیں دیا۔ محض فضول باتیں ہیں جو لکھنے کے بھی لائق نہیں۔ ہاں اس اعتراض کا نتیجہ آخرکار یہ ہوا کہ مولوی عبداللہ صاحب کو ایک نئی نماز بنانی پڑی جس کا جمیع اسلام کے فرقوں میں نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ اُنہوں نے التحیات اور درود اور دیگر تمام ادعیہ ماثورہ جو نمازمیں پڑھی جاتی ہیں درمیان سے اُڑا دیں اور ان کی جگہ صرف قرآنی آیتیں رکھ دیں۔ ایسا ہی اور بہت کچھ نمازمیں تبدیلی کی ہوگی۔ لیکن کیا یہ سچ ہے کہ حدیثیں ایسی ہی ردّی اور لغو ہیں جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب نے سمجھا ہے۔ معاذ اللہ ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان ہر دو فریق میں سے ایک فریق نے افراط کی راہ اختیار کر رکھی ہے اور دوسرے نے تفریط کی۔ فریق اوّل یعنی

مولوی محمد حسین صاحب اگرچہ اس بات میں سچ پر ہیں کہ احادیث نبویہ مرفوعہ متصلہ ایسی چیز نہیں ہیں کہ ان کو ردّی اور لغو سمجھا جائے۔ لیکن وہ حفظ مراتب کے قاعدہ کو فراموش کر کے احادیث کے مرتبہ کو اس بلند مینار پر چڑھاتے ہیں جس سے قرآن شریف کی ہتک لازم آتی ہے اور اس سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ اور کتاب اللہ کی مخالفت اور معارضت کی وہ کچھ بھی پروا نہیں کرتے۔ اور حدیث کے قصوں کو ان قصوں پر ترجیح دیتے ہیں جو کتاب اللہ میں بتصریح موجود ہیں اور حدیث کے بیان کو کلام اللہ کے بیان پر ہر ایک حالت میں مقدم سمجھتے ہیں اور یہ صریح غلطی ہے اور جادۂ انصاف سے تجاوز ہے۔ اللہ جلّ شانہ قرآن شریف میں فرماتا ہے فبای حدیث بعد اللّٰہ وآیاتہ یؤمنون۔ یعنی خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس حدیث پر ایمان لائیں گے اس جگہ حدیث کے لفظ کی تنکیر جو فائدہ عموم کا دیتی ہے صاف بتلا رہی ہے کہ جو حدیث قرآن کے معارض اور مخالف پڑے اور کوئی راہ تطبیق کی پیدا نہ ہو اس کو رد کردو۔ اور اس لفظ حدیث میں ایک پیشگوئی بھی ہے جو بطور اشارۃ النص اس آیت سے مترشح ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ آیت ممدوحہ میں اس بات کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی اس اُمت پر آنے والا ہے کہ جب بعض افراد اس اُمت کے قرآن شریف کو چھوڑ کر ایسی حدیثوں پر بھی عمل کریں گے جن کے بیان کردہ قصّے قرآن شریف کے بیانات سے مخالف اور معارض ہوں گے۔ غرض یہ فرقہ اہل حدیث اس بات میں افراط کی راہ پر قدم مار رہا ہے کہ قرآنی شہادت پر حدیث کے بیان کو مقدم سمجھتے ہیں۔ اور اگر وہ انصاف اور خدا ترسی سے کام لیتے تو ایسی حدیثوں کی تطبیق قرآن شریف سے کر سکتے تھے۔ مگر وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ خدا کے قطعی اور یقینی کلام کو بطور متروک اور مہجور کے قرار دیدیں۔ اور اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ ایسی حدیثوں کو جن کے قصّے کتاب اللہ سے مخالف ہیں یا تو چھوڑ دیں اور یا ان کی کتاب اللہ سے تطبیق کریں۔ یہ وہ افراط کی راہ ہے جو مولوی محمد حسین نے اختیار کر رکھی ہے۔ اور ان کے مخالف مولوی عبد اللہ نے تفریط کی راہ پر قدم مارا ہے جو سرے سے احادیث سے انکار کر دیا ہے۔ اور احادیث سے انکار ایک طور سے قرآن شریف کا بھی انکار ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ کی محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے وابستہ ہے اور آنجناب کے عملی نمونوں کے دریافت کے لئے جن پر اتباع موقوف ہے حدیث بھی ایک

ذریعہ ہے۔ پس جو شخص حدیث کو چھوڑتا ہے وہ طریق اتباع کو بھی چھوڑتا ہے۔ اور مولوی عبداللہ صاحب کا یہ قول کہ تمام حدیثیں محض شکوک اور ظنون کا ذخیرہ ہیں یہ قلت تدبر کی وجہ سے خیال پیدا ہوا ہے۔ اور اس خیال کی اصل جڑ محدثین کی ایک غلط اور نامکمل تقسیم ہے جس نے بہت سے لوگوں کو دھوکا دیا ہے کیونکہ وہ یوں تقسیم کرتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں ایک تو کتاب اللہ ہے اور دوسرے حدیث۔ اور حدیث کتاب اللہ پر قاضی ہے۔ گویا احادیث ایک قاضی یا جج کی طرح کرسی پر بیٹھی ہیں اور قرآن اُن کے سامنے ایک مستغیث کی طرح کھڑا ہے اور حدیث کے حکم کے تابع ہے۔ ایسی تقریر سے بیشک ہر ایک کو دھوکا لگے گا کہ جبکہ حدیثیں ڈیڑھ سو برس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد جمع کی گئی ہیں اور انسانی ہاتھوں کے مس سے وہ خالی نہیں ہیں۔ اور باایں ہمہ وہ احاد کا ذخیرہ اور ظنی ہیں اور ان میں قسم متواترات شاذ و نادر ہیں جو حکم معدوم کا رکھتی ہیں اور پھر وہی قرآن شریف پر قاضی بھی ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام دین اسلام ظنیات کا ایک تودہ انبار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ظن کوئی چیز نہیں ہے۔ اور جو شخص محض ظن کو پنجہ مارتا ہے وہ مقام بلند حق سے بہت نیچے گرا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ یعنی ظن حق الیقین کے مقابل پر کچھ چیز نہیں۔ پس قرآن شریف تو یوں ہاتھ سے گیا کہ وہ بغیر قاضی صاحب کے فتووں کے واجب العمل نہیں اور متروک اور مہجور ہے۔ اور قاضی صاحب یعنی احادیث صرف ظن کے میلے کچیلے کپڑے زیب تن رکھتے ہیں جن سے احتمال کذب کسی طرح مرتفع نہیں۔ کیونکہ ظن کی تعریف یہی ہے کہ وہ دروغ کے احتمال سے خالی نہیں ہوتا۔ پس اس صورت میں نہ تو قرآن ہمارے ہاتھ میں رہا اور نہ حدیث اس لائق کہ اس پر بھروسہ ہو سکے۔ گویا دونو ہاتھ سے گئے۔ یہ غلطی ہے جس نے اکثر لوگوں کو ہلاک کیا اور صراط مستقیم جس کو ظاہر کرنے کے لئے مَیں نے اس مضمون کو لکھا ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اسلامی ہدایتوں پر قائم ہونے کے لئے تین چیزیں ہیں۔ (۱) قرآن شریف جو کتاب اللہ ہے جس سے بڑھ کر ہمارے ہاتھ میں کوئی کلام قطعی اور یقینی نہیں وہ خدا کا کلام ہے۔ وہ شک اور ظن کی آلائشوں سے پاک ہے (۲) دوسری سنّت اور اس جگہ ہم اہل حدیث کی اصطلاحات سے الگ ہو کر بات کرتے ہیں یعنی ہم حدیث اور سنت کو ایک چیز قرار نہیں دیتے جیسا کہ رسمی محدثین کا طریق ہے۔ بلکہ حدیث الگ چیز ہے اور سنّت الگ چیز سنّت سے مراد ہماری صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی فعلی روش ہے جو اپنے اندر تواتر

رکھتی ہے اور ابتدا سے قرآن کے ساتھ ہی ظاہر ہوئی۔ اور ہمیشہ ساتھ ہی رہیگی۔ یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف خدا کا قول ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل۔ اور قدیم سے عادۃ اللہ یہی ہے کہ جب انبیا علیہم السلام خدا کا قول لوگوں کی ہدایت کے لئے لاتے ہیں تو اپنے فعل سے یعنی عملی طور پر اس قول کی تفسیر کر دیتے ہیں تا اس قول کا سمجھنا لوگوں پر مشتبہ نہ رہے اور اس قول پر آپ بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی عمل کراتے ہیں (۳) تیسرا ذریعہ ہدایت کا حدیث ہے۔ اور حدیث سے مراد ہماری وہ آثار ہیں کہ جو قصوں کے رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ڈیڑھ سو سال بعد مختلف راویوں کے ذریعہ سے جمع کئے گئے ہیں پس سنت اور حدیث میں ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ سنت ایک عملی طریق ہے جو اپنے ساتھ تواتر رکھتا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے جاری کیا۔ اور وہ یقینی مراتب میں قرآن شریف سے دوسرے درجہ پر ہے۔ اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کی اشاعت کے لئے مامور تھے ایسا ہی سنت کی اقامت کے لئے بھی مامور تھے۔ پس جیسا کہ قرآن شریف یقینی ہے ایسا ہی سنت معمولہ متواترہ بھی یقینی ہے۔ یہ دونو خدمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے بجا لائے اور دونو کو اپنا فرض سمجھا۔ مثلاً جب نماز کیلئے حکم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کے اس قول کو اپنے فعل سے کھول کر دکھلا دیا اور عملی رنگ میں ظاہر کر دیا کہ فجر کی نماز کی یہ رکعات ہیں اور مغرب کی یہ۔ اور باقی نمازوں کے لئے یہ رکعات ہیں۔ ایسا ہی حج کر کے دکھلایا۔ اور پھر اپنے ہاتھ سے ہزار ہا صحابہ کو اس فعل کا پابند کر کے سلسلہ تعامل بڑے زور سے قائم کر دیا پس عملی نمونہ جو اب تک اُمت میں تعامل کے رنگ میں مشہود و محسوس ہے اسی کا نام سنت ہے لیکن حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے روبرو نہیں لکھوایا اور نہ اس کے جمع کرنے کے لئے کوئی اہتمام کیا۔ کچھ حدیثیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع کی تھیں لیکن پھر تقوے کے خیال سے انہوں نے وہ سب حدیثیں جلا دیں کہ میرا سماع بلا واسطہ نہیں ہے خدا جانے اصل حقیقت کیا ہے۔ پھر جب وہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم کا گزر گیا تو بعض تبع تابعین کی طبیعت کو خدا نے اس طرف پھیر دیا کہ حدیثوں کو بھی جمع کر لینا چاہئے۔ تب حدیثیں جمع ہوئیں۔ اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ اکثر حدیثوں کو جمع کرنیوالے بڑے متقی اور پرہیزگار تھے انہوں نے جہاں تک ان کی طاقت میں تھا حدیثوں کی تنقید کی اور ایسی حدیثوں سے بچنا چاہا جو اُن کی رائے میں موضوعات میں سے تھیں اور ہر ایک

مشتبہ الحال راوی کی حدیث نہیں لی۔ بہت محنت کی مگر تاہم چونکہ وہ ساری کارروائی بعد از وقت تھی اس لئے وہ سب ظن کے مرتبہ پر رہی۔ با ایں ہمہ سخت ناانصافی ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ سب حدیثیں لغو اور نکمی اور بے فائدہ اور جھوٹی ہیں۔ بلکہ ان حدیثوں کے لکھنے میں اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور اس قدر تحقیق اور تنقید کی گئی ہے جو اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔ یہودیوں میں بھی حدیثیں ہیں اور حضرت مسیح کے مقابل پر بھی وہی فرقہ یہودیوں کا تھا جو عامل بالحدیث کہلاتا تھا۔ لیکن ثابت نہیں کیا گیا کہ یہودیوں کے محدثین نے ایسی احتیاط سے وہ حدیثیں جمع کی تھیں جیسا کہ اسلام کے محدثین نے۔ تاہم غلطی ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ جب تک حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں اس وقت تک لوگ نمازوں کی رکعات سے بے خبر تھے یا حج کرنے کے طریق سے ناآشنا تھے۔ کیونکہ سلسلۂ تعامل نے جو سنت کے ذریعہ سے ان میں پیدا ہوگیا تھا تمام حدود اور فرائض اسلام ان کو سکھلا دیئے تھے۔ اس لئے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ان حدیثوں کا دنیا میں اگر وجود بھی نہ ہوتا جو مدت دراز کے بعد جمع کی گئیں تو اسلام کی اصل تعلیم کا کچھ بھی حرج نہ تھا۔ کیونکہ قرآن اور سلسلہ تعامل نے ان ضرورتوں کو پورا کر دیا تھا۔ تاہم حدیثوں نے اس نور کو زیادہ کیا۔ گویا اسلام نورٌ علیٰ نور ہوگیا۔ اور حدیثیں قرآن اور سنت کے لئے گواہ کی طرح کھڑی ہوگئیں۔ اور اسلام کے بہت سے فرقے جو بعد میں پیدا ہوگئے ان میں سے سچے فرقہ کو احادیث صحیحہ سے بہت فائدہ پہنچا۔ پس مذہب اسلم یہی ہے کہ نہ تو اس زمانہ کے اہل حدیث کی طرح حدیثوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھا جائے کہ قرآن پر وہ مقدم ہیں۔ اور نیز اگر ان کے قصے صریح قرآن کے بیانات سے مخالف پڑیں تو ایسا نہ کریں کہ حدیثوں کے قصوں کو قرآن پر ترجیح دی جائے اور قرآن کو چھوڑ دیا جائے اور نہ حدیثوں کو مولوی عبداللہ چکڑالوی کے عقیدہ کی طرح محض لغو اور باطل ٹھیرایا جائے۔ بلکہ چاہیئے کہ قرآن اور سنت کو حدیثوں پر قاضی سمجھا جائے۔ اور جو حدیث قرآن اور سنت کے مخالف نہ ہو اس کو بسر وچشم قبول کیا جائے یہی صراط مستقیم ہے۔ مبارک وہ جو اس کے پابند ہوتے ہیں۔ نہایت بدقسمت اور نادان وہ شخص ہے جو بغیر لحاظ اس قاعدہ کے حدیثوں کا انکار کرتا ہے۔ ہماری جماعت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی حدیث معارض اور مخالف قرآن اور سنت نہ ہو تو خواہ کیسی ہی ادنیٰ درجہ کی حدیث ہو اس پر وہ عمل کریں۔ اور انسان کی بنائی ہوئی فقہ پر اس کو ترجیح دیں۔ اور اگر حدیث میں کوئی مسئلہ نہ ملے اور نہ سنت میں اور نہ قرآن میں مل سکے تو اس صورت میں فقہ حنفی پر عمل کریں

کیونکہ اس فرقہ کی کثرت خدا کے ارادہ پر دلالت کرتی ہے۔ اور اگر بعض موجودہ تغیرات کی وجہ سے
فقہ حنفی کوئی صحیح فتویٰ نہ دے سکے تو اس صورت میں علما اس سلسلہ کے اپنے خداداد اجتہاد
سے کام لیں۔ لیکن ہوشیار رہیں کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کی طرح بے وجہ احادیث سے
انکار نہ کریں۔ اور جہاں قرآن اور سنّت سے کسی حدیث کو معارض پاویں تو اس حدیث کو
چھوڑ دیں۔ یاد رکھیں کہ ہماری جماعت بہ نسبت عبداللہ کے اہل حدیث سے اقرب
ہے۔ اور عبداللہ چکڑالوی کے بیہودہ خیالات سے ہمیں کچھ بھی مناسبت نہیں
ہر ایک جو ہماری جماعت میں ہے اسے یہی چاہئے کہ وہ عبداللہ چکڑالوی کے عقیدوں سے
جو حدیثوں کی نسبت وہ رکھتا ہے بدل متنفر اور بیزار ہو۔ اور ایسے لوگوں کی صحبت سے حتی الوسع
نفرت رکھیں کہ یہ دوسرے مخالفوں کی نسبت زیادہ برباد شدہ فرقہ ہے۔ اور چاہئے کہ نہ وہ
مولوی محمد حسین کے گروہ کی طرح حدیث کے بارے میں افراط کی طرف جھکیں اور نہ عبداللہ کی
طرح تفریط کی طرف مائل ہوں۔ بلکہ اس بارے میں وسط کا طریق اپنا مذہب سمجھ لیں۔
یعنی نہ تو ایسے طور سے بکلی حدیثوں کو اپنا قبلہ وکعبہ قرار دے دیں جن سے قرآن متروک اور
مہجور کی طرح ہو جائے۔ اور نہ ایسے طور سے ان حدیثوں کو معطل اور لغو قرار دے دیں جن سے
احادیث نبویہ بکلی ضائع ہو جائیں ......"

متکلمین اسلام کے اختلاف کا فیصلہ

قرآن کریم کا دعویٰ تھا کہ وہ قرآن الحکیم یعنی علم وحکمت سے پُر ایک کتاب ہے۔
اور علیم حکیم خدا کے علم سے نازل شدہ ہے۔ اس لئے اس کی سکھائی ہوئی ہر ایک
ہدایت اور اصول مبنی بر علم وحکمت ہے۔ اور جو قوم صحابہ کی اس کے ذریعہ تیار ہوئی وہ اُمّی ہونے
کے باوجود اسقدر علم وحکمت سے بہرہ یاب ہوئی کہ دنیا کی معلم بن گئی۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا
گیا اور دل ودماغ میں انوار نبوّت کی روشنی ہلکی پڑتی گئی اور معرفت الٰہی میں کمزوری اور رُوحانی اور
مذہبی مسائل میں فلسفہ اور دیگر علوم دنیوی کی ظلمت کا اثر اپنا رنگ دکھانے لگا۔ ویسے ویسے علمائے اسلام
اور ائمہ دین کو ضرورت پیش آئی کہ وہ فلسفہ کے دلدادہ لوگوں کے سامنے مذہب کو ایسے دلائل سے مزیّن
کر کے پیش کریں جن سے اعتراضات اور وساوس کا قلع قمع ہو جائے۔ یہ لوگ متکلمین کہلائے اور
اوران کا طریق استدلال علم کلام کے نام سے موسوم ہوا۔ ان متکلمین کا گروہ کئی حصوں میں منقسم تھا:۔
(۱) حنابلہ تو وہ لوگ تھے جو مذہب کے معاملہ میں ظاہر الفاظ سے پھرنا یا ان کی کوئی تاویل کرنا کسی
صورت میں بھی جائز نہ سمجھتے تھے۔

(۲) معتزلہ۔ حنابلہ کی ضد تھے۔ اُنہوں نے مذہبی مسائل میں عقل کے دخل کو ضروری سمجھا اور ہر ایک بات میں معقولیت کو تلاش کرنا ضروری جانا۔ یہاں تک تو درست تھا لیکن بدقسمتی سے اُنہوں نے اپنے زمانہ کے فلسفہ اور انسانی مبلغ علم اور دائرۂ عقل کو اسقدر اہمیت دی کہ ہر ایک مذہبی اور رُوحانی مسئلہ کو یونانی فلسفہ اور اپنے مبلغ علم وعقل پر ماپنے کی کوشش کی اور جو مسئلہ اُن کے نزدیک اس معیار پر پُورا نہ اُتر سکا اس کی تاویلیں کرنی شروع کر دیں جو بعض دفعہ اسقدر رقیق اور بعید ہوتی تھیں جن سے مذہب کی اصل شکل بگڑ جاتی تھی۔ اور اس کا مقصد فوت ہو جاتا تھا۔ اس کی شکل موجودہ زمانہ میں ہمیں سر سید احمد خاں مرحوم کی پیش کردہ نیچریت میں نظر آتی ہے جو اس زمانہ کا اعتزال ہے۔

(۳) معتزلہ کے علم کلام سے جو نقصان اسلام کی اصل شکل کو پہنچ رہا تھا اس کی تلافی کے لئے امام ابو الحسن اشعری نے کچھ اصول تجویز کئے جن کے ذریعہ معتزلہ اور حنابلہ کی افراط و تفریط کا علاج کرنا چاہا۔ ان اصولوں کے پابند لوگ **اشاعرہ** کہلائے۔ اگرچہ اشاعرہ کے اصولوں سے کسی قدر اصلاح رو پذیر ہوئی مگر ابھی بہت سی غلطیاں اور نقص باقی تھے۔ تفصیل[1] کا یہ موقعہ نہیں قصہ مختصر یہ کہ اکثر شافعی متکلمین اشاعرہ تھے۔ اشاعرہ کے بعض اصولوں کی امام ابو منصور ماتریدی نے اصلاح کی۔ جنہوں نے اس اصلاح کو قبول کیا وہ ماتریدیہ کہلائے۔ حنفی متکلمین اکثر ماتریدیہ ہوئے ہیں۔ چونکہ میں اس کتاب کے شروع میں ہی ان امور پر تفصیل سے بحث کر آیا ہوں اسلئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

حضرت اقدس مرزا صاحب کا مسلک

ہمارا زمانہ مغربی فلسفہ اور سائنس کا زمانہ تھا آج وہ ہتھیار جن سے یونانی فلسفہ کا مقابلہ کیا جاتا تھا بیکار ہو چکے تھے۔ پرانے فلسفہ کے مصطلحات اور مقدمات کو آج لوگ محض لفظی گورکھ دھندا قرار دیکر رد کر چکے تھے جیسا کہ میں ابتدائے کتاب میں لکھ آیا ہوں حضرت اقدس مرزا صاحب کسی پرانے علم کلام کے پابند نہ تھے۔ بلکہ آپ نے اپنا ایک نیا علم کلام پیدا کیا جو قرآن کریم پر مبنی تھا۔ چونکہ معتزلہ کی طرح سر سید احمد خاں اور ان کے ہم خیال مغربی فلسفہ کے سامنے سپر ڈال چکے تھے اور طرح طرح کی تاویلوں سے اسلام کو اس فلسفہ کے ماتحت لانے کی کوشش کرتے تھے اس لئے آپ کو ان لوگوں کی تاویلات سے سخت نفرت تھی وہ انہیں اس زمانہ کے معتزلہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ابھی آپ جوان تھے اور سیالکوٹ تشریف لے گئے تو وہاں سر سید احمد خاں کی تفسیر جو ابھی نئی نئی شائع ہوئی تھی آپ کو سُنائی گئی تو اُسے آپ نے نہایت ناپسند کیا۔ آپ نے اپنی متعدد کتابوں

---

[1] تفصیل کے لئے مولانا شبلی مرحوم کی کتاب علم الکلام ملاحظہ ہو۔ (مؤلف)

مثلاً براہین احمدیہ، سرمہ چشم آریہ، آئینہ کمالات اسلام، برکات الدعا، اسلام اور اس کی فلاسفی وغیرہ میں ان معتزلیوں اور نیچریوں کے اصولوں کا نہایت زور سے رد کیا ہے۔ آپ اس امر کو نہایت غیر معقول سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات اور اس کے علم اور اس کی قدرت کو انسان اپنے اوپر قیاس کرے۔ خدا کی صفات اور اس کے علم اور قدرت کی نسبت اپنی طرف سے اٹکلیں دوڑانا خطرناک غلطی ہے۔ اسی کو خدا تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ قتل الخرّاصون (الذّاریات) کہ یہ اٹکل دوڑانے والے ہلاک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم وہی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ خود اپنی جناب سے وحی الٰہی کے ذریعہ انسان کو بخشے۔ انسان کا محدود علم اور محدود عقل اس لامحدود ہستی کی ذات اور صفات کو کیونکر شناخت کر سکتی ہے۔ اپنی طرف سے اٹکلیں دوڑانا پرلے درجہ کی حماقت اور موجب ضلالت ہے۔ خود خدا کی ہستی پر بھی مجرد عقل اور فلسفہ سے یقینی دلائل مرتب نہیں ہو سکتے۔ عقل اور فلسفہ ہمیں صرف یہیں تک رہبری کر سکتا ہے کہ اس ساری کائنات کا کوئی خالق اور مالک ہونا چاہیئے۔ لیکن وہ ہے بھی اس کا جواب فلسفہ نہیں دے سکتا۔ جب تک وہ ذات خود کسی قلب پر تجلّی کر کے انا الموجود نہ کہے۔ یہ یقین کس طرح پیدا ہو کہ وہ ضرور ہے اور بندوں کے ساتھ اس کا تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کمرہ کا دروازہ اگر اندر سے بند ہو تو دلیل کے رنگ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کمرہ میں ضرور کوئی ہونا چاہیئے جس نے اندر سے دروازہ بند کر رکھا ہے۔ لیکن اندر ضرور کوئی ہے۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اندر والا آواز نہ دے کہ میں ہوں۔ پس دلائل عقلی یہاں تک تو رہبری کر سکتے ہیں کہ اس کائنات کا ضرور کوئی خالق اور علت اولیٰ ہونا چاہیئے۔ لیکن وہ ضرور ہے اور فلاں فلاں صفات کا مالک ہے۔ یہ وحی الٰہی ہی بتا سکتی ہے یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہستی اور اپنی صفات اور افعال و سنن الٰہیہ کے بارے میں خود انسان کو علم عطا کرے۔ اور یہیں سے انبیاء و رسل کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ بغیر نبوت کے معرفت الٰہی نصیب نہیں ہوتی۔ انسان کا محدود علم اور محدود عقل لامحدود ذات اور اس کی صفات کی شناخت کس طرح کر سکتی ہے۔ اور جو اپنی اٹکلیں دوڑاتے ہیں وہ طرح طرح کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اسی لئے حضرت مرزا صاحب نے جب اشاعت اسلام کا بیڑا اٹھایا تو سب سے پہلے براہین احمدیہ میں قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی نبوت کے منجانب اللہ ہونے پر دلائل عقلی و نقلی و حالی تحریر فرمائے تا کہ اپنے علم کلام کی بنیاد آپ نے جس کتاب پر رکھی تھی اس کے منجانب اللہ ہونے کا تصفیہ ہو جائے۔ اس معاملہ میں آپ نے صرف فلسفیانہ دلائل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے مشاہدہ اور تجربہ کو بھی بڑے زور سے پیش کیا کہ قرآن کریم کی ہدایات پر چل کر میں نے منزل مقصود کو یعنی اس خدا کو

پایا جو تمام کائنات کا خالق اور قرآن کا نازل کرنے والا ہے۔ اور وحی والہام کا مزہ میں نے خود چکھا اور اسے سچا پایا اور جس کسی کو شک ہو وہ میرے پاس آوے اور ان نشانات آسمانی کو ملاحظہ کرے جو میرے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ قرآن کریم اور رسالت محمدیہ کے منجانب اللہ ہونے کے بارے میں ظاہر فرما رہا ہے۔ حضرت مرزا صاحب نے تمام دنیا کو اس معاملہ میں بڑا زبردست چیلنج دیا۔ اور اسی پر ان کا سارا علم کلام مبنی ہے۔ وہ قرآن کریم کو اصل قرار دیتے ہیں کہ یہ خدا کا علم ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے۔ وہ جو علم اپنی نسبت دیگا وہی یقینی ہے۔ باقی سب ظنی ہے۔ اسی لئے حنابلہ معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ، نیچریہ وغیرھم تمام متکلّمین کے درمیان فیصلہ کی راہ جو آپ نے تجویز کی تھی وہ یہی تھی کہ جو کچھ قرآن بیان کرتا ہے اس سے ایک قدم اِدھر اُدھر نہ ہو خواہ فلسفہ کچھ بھی کہے۔ ایک شعر میں کیا خوب فرماتے ہیں:۔ ؎

یک قدم دُوری ازاں روشن کتاب ✦ نزدِ ما کفر است و خسران و تباب

ازالہ اوہام حصّہ دوم میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر قرآن اور حدیث کے مقابل پر ایک جہان عقلی دلائل کا دیکھو تو ہرگز اس کو قبول نہ کرو۔ اور یقیناً سمجھو کہ عقل نے لغزش کھائی ہے۔"

دوسرے لفظوں میں انسانی علم اور عقل میں لغزش کا احتمال ہے مگر خدا کا علم غلط نہیں ہو سکتا۔ عقل انسانی آج ایک بات کو معقول سمجھ کر اس پر ناز کرتی ہے کل علم کی ترقی اُسے مجبور کرتی ہے کہ اس کو ترک کر کے اس کے خلاف کسی دوسری بات کو معقول سمجھنے لگے کیونکہ انسان کا علم ترقی کرتا رہتا ہے اور دماغی نشوونما کے ساتھ ساتھ عقل انسانی کی وسعت بھی ترقی کرتی رہتی ہے۔ پس انسان کو فوراً ہی اس فلسفہ کے سامنے جو ایک زمانہ میں عقل انسانی تجویز کرتی ہے سر نہیں جھکا دینا چاہیے۔ چاہیئے کہ اسے قرآن و احادیث صحیحہ پر عرض کیا جائے۔ اگر وہ اس کے مطابق ہے تو اُسے قبول کر لینا چاہیئے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ الحکمۃ ضالۃ المومن کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں سے ملے لیلو۔ ہاں عقل انسانی کی پیش کردہ حکمت وہی صحیح ہو سکتی ہے جو قرآن الحکیم کی پیش کردہ حکمت کے خلاف نہ ہو کیونکہ قرآن خدا کے علم تام سے نازل شدہ کلام ہے۔ عقل انسانی کی ٹھوکر کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ وہ یونانی فلسفہ جو کل تک معقولیت کا معیار سمجھا جاتا تھا آج اس کا بست سا حصّہ غیر معقول سمجھ کر رد کر دیا گیا۔

ممکن ہے کہ اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ پھر عقل انسانی کا کیا فائدہ ہوا۔ میں کہتا ہوں عقل

ایک بڑی نعمت ہے اور بُرے بھلے اور غلط اور صحیح میں امتیاز کے لئے یہ نہایت ضروری چیز ہے لیکن انسانی حواس اور عقل سب ایک حد کے اندر محدود ہیں۔ جس طرح دیکھنے اور سُننے کے حواس ایک حد کے اندر کام کرتے ہیں۔ اگر حد سے بڑھ کر کام لیا جائے گا تو وہ ٹھوکر کا موجب ہو جائیں گے مثلاً دُور سے ایک شکاری انسان کو جانور سمجھ کر اُس پر گولی چلا دیتا ہے۔ یا فاصلہ سے بات کچھ کی کچھ سمجھ کر انسان غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قوت باصرہ اور قوت سامعہ وغیرہ اپنی حد سے باہر ٹھوکر کھا جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی لامحدود ذات اور صفات اور روحانیات کے معاملہ میں جو انسان کے عقل اور فہم سے بالاتر اور نہاں در نہاں ہیں عقل انسانی کو ٹھوکر کھا جانے کا احتمال غالب ہے۔ انسان اپنی قوت باصرہ کی مدد کے لئے جس طرح دُوربین اور خوردبین لگا لیتا ہے تا دُور کی اور باریک در باریک چیزیں میں نظر غلطی نہ کرے۔ اور قوت سامعہ کی مدد کے لئے مائکروفون اور لاؤڈ اسپیکر لگا لیتا ہے تا آواز کو ٹھیک طرح سُن سکے۔ اسی طرح ان امور باطنی میں عقل انسانی کی وحی الٰہی دستگیری فرماتی ہے۔ اور جہاں مجرد عقل رہبری نہیں کر سکتی وہاں وحی الٰہی اس کی مدد کر کے منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔ پس وحی الٰہی عقل کے خلاف نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ علم عقل انسانی کو بخشتی ہے جو انسان کی عقل سے بالاتر ہوتا ہے۔ بوجہ انسان کے علم کے محدود ہونے کے مجرد عقل کو وہاں تک بار نہیں ہوتا اس لئے انسان کے علم کی اس کمی کو خدا کا علم پورا کر کے عقل کو ان علوم روحانیت و معرفت الٰہی میں صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔ اور ہر ایک ٹھوکر سے بچاتا ہے پس وحی الٰہی عقل کی متمم اور مکمل ہوتی ہے۔ نہ کہ اس کے خلاف۔ وہ بالاتر از عقل امور میں اس کی مدد کر کے اس کو منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔ مناسب ہے میں بیان "خلاف عقل" اور "بالاتر از عقل" میں حضرت مرزا صاحب کے ارشادات کا خلاصہ عرض کر دوں۔

"خلاف عقل" اور "بالاتر از عقل" میں فرق

معتزلیوں اور نیچریوں کو بڑا ناز اپنی عقل پر ہے چنانچہ وہ کسی چیز کو جو ان کی محدود عقل میں نہ آوے ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ اگر کوئی مذہبی اصول ہوگا تو وہ اسے مروڑ کے اپنی محدود عقل اور فلسفہ کے ماتحت لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ بجائے خود نہایت غیر معقول ہے جس کی نامعقولیت کو حضرت مرزا صاحب نے نہایت کھول کر سرمہ چشم آریہ میں بیان فرمایا ہے۔ سب سے پہلے آپ نے انسانی عقل کے دائرہ کو محدود بتلایا ہے۔ مختلف استعداد کے لوگوں میں عقل انسانی کا فرق ہے۔ جو ایک کے نزدیک معقول ہے دوسرے کے نزدیک غیر معقول ہے۔ آج جہالت کی وجہ سے جو چیز غیر معقول نظر آتی ہے وہ کل علم کی ترقی کی وجہ

سے نہایت معقول نظر آنے لگتی ہے یعنی عقل انسانی برابر زمانہ اور دماغی ارتقا و نشو و نما اور نئی نئی دریافتوں اور تحقیقاتوں کے ذریعہ ترقی کرتی رہتی ہے۔ تو پھر کسی امر کا محض اس وجہ سے انکار کر دینا کہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتا دانشمندی نہیں۔ جب ریل کا انجن نکلا تو اس زمانہ کے سائنسدانوں نے انکار کیا کہ عقل میں نہیں آتا۔ جب بے تار کی تار برقی ایجاد ہوئی تو تمام یورپ کے سائنسدان مخالف ہو گئے کہ یہ نہایت غیر معقول بات ہے۔ لیکن آخر مشاہدہ اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ کسی چیز کا انکار محض اس وجہ سے کر دینا کہ ہماری عقل ابھی تک اس کی تہ تک پہنچ نہیں سکی سخت غلطی ہے۔ پس عقلمند آدمی کا کام یہ ہے اور معقولیت اس امر کی متقاضی ہے کہ انسان "خلاف عقل" اور "بالاتر از عقل" امور میں فرق کرے ایک وہ اصول متعارفہ ہوتے ہیں جو ریاضی کے قاعدوں کی طرح مسلمات عقلی ہوتے ہیں۔ مثلاً دو اور دو چار ہوتا ہے۔ جو کہے دو اور دو پانچ ہوتے ہیں وہ خلاف عقل بات کرتا ہے۔ پس یہ بات تو ماننے کے قابل نہیں ہو سکتی کیونکہ خلاف عقل ہے۔ لیکن جو بات اصول متعارفہ اور مسلمات عقلی کے خلاف نہیں وہ اگر سمجھ میں نہ آوے تو اُسے "خلاف عقل" نہیں کہہ سکتے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ "بالاتر از عقل" ہے یعنی ہماری عقل ابھی اُس تک پہنچ نہیں سکی۔ ممکن ہے کل علم کی ترقی کے ساتھ عقل انسانی اس پر حاوی ہو جائے اس وقت وہ بالاتر از عقل نہیں رہے گی۔ بے تار کی تار برقی نکالنے والے کو یہ تو کہہ سکتے تھے کہ یہ بات بالاتر از عقل ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ بات خلاف عقل ہے۔ آخر جنہوں نے اسے خلاف عقل قرار دیا تھا انہیں سخت منہ کی کھانی پڑی۔ اور آج وہی بات جسے کل خلاف عقل کہا جاتا تھا نہایت درجہ معقول ثابت ہوئی۔ وہ بات اسوقت جب سائنسدانوں کو اس کا علم نہ تھا ان کے لئے بالاتر از عقل تھی لیکن خلاف عقل نہ تھی۔ اسی طرح اگر کسی مذہبی مسئلہ یا معجزہ کی تہ کو آج ہماری عقل نہیں پا سکتی۔ تو اُسے ہم بالاتر از عقل تو کہہ سکتے ہیں اور اس کی حقیقت کو حوالہ بخدا کر سکتے ہیں لیکن اسے خلاف عقل نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہماری عقل کسی چیز کی حقیقت کو اگر نہ پا سکے تو محض اتنی سی بات پر اسے خلاف عقل نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں بالاتر از عقل کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ "بالاتر از عقل" والا معاملہ بھی نسبتی ہے جو امر ایک کی سمجھ میں نہ آیا وہ دوسرے کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جو معاملہ آج سمجھ میں نہیں آیا وہ کل یا آج سے بیس برس کے بعد سمجھ میں آ سکتا ہے۔ پس "خلاف عقل" اور "بالاتر از عقل" میں فرق کرنا ہر ایک عقلمند انسان کا فرض ہے۔ ورنہ پھر وہ کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ عقل اور سائنس کی ترقی اسی وجہ سے ہوئی کہ جو امر بالاتر از عقل نظر آیا دانا لوگ اس کی حقیقت کو پانے کے درپے ہو گئے اور خدا نے اس سعی کو بارور کیا اور وہ اس کی تہ تک پہنچ گئے۔ اگر وہ پہلے سے ہی اسے "خلاف عقل" سمجھ کر بیٹھ رہتے تو کسی قسم کی ترقی نہ کر سکتے

پس ہر قسم کی ترقی اس بالاتر از عقل اور خلاف عقل میں فرق کرنے پر منحصر ہے۔ حضرت مرزا صاحب کو تمام متکلمین میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے سب سے پہلے بالاتر از عقل اور خلاف عقل کے فرق کو مسائل دینیہ میں لاکر علم دین میں تحقیقات اور ترقیات کا دروازہ کھول دیا۔ اور اعتزال اور نیچریت کی جڑ پر تبر رکھ دیا۔

صفات الٰہیہ اور ان سے خدا کے نیست سے ہست کرنے پر قادر ہونے کا استدلال

الغرض حضرت مرزا صاحب اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور افعال اور علم اور قدرت کے بارے میں جو کچھ بھی بیان فرماتے تھے اس میں قرآن کریم کی بیان کردہ صفات الٰہیہ اور سنن سے ایک انچ بھی باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کہ اس میں ٹھوکر لگ جانے کا احتمال ہے۔ معرفت الٰہی کے لئے جو صفات قرآن کریم نے بیان کردی ہیں بس وہی صراط مستقیم ہے جو کچھ اُن سے استدلال ہو سکتا ہے وہ درست ہے۔ اپنی طرف سے قیاس آرائیاں اور موشگافیاں ضلالت ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان صفات پر غور کرنے کے لئے سارے قرآن پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو صفات قرآن کریم میں بیان فرمائی ہیں وہ دو رنگ میں ہیں ایک تو تشبیہی جن میں اس کی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق یعنی انسان کی صفات کی ہم شکل نظر آتی ہیں۔ مثلاً خدا دیکھتا ہے اور سُنتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسرے تنزیہی صفات جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی صفات میں کچھ بھی شراکت انسان کے ساتھ نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کہ لیس کمثلہ شیئٌ وھو السمیع البصیر کہ کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہ سُننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اللہ الصمد۔ اللہ بے احتیاج ہے اُسے کسی چیز کی حاجت نہیں۔ البتہ سب اس کے محتاج ہیں۔ یعنی وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ مگر اس کا سننا اور دیکھنا اگرچہ مشابہت تو انسان کے دیکھنے اور سُننے سے رکھتا ہے مگر اس کا دیکھنا اور سُننا نہ تو انسان کے دیکھنے اور سننے کی طرح محدود ہے۔ اور نہ ان ذرائع کا محتاج ہے جن کا انسان دیکھنے اور سننے میں محتاج ہے۔ انسان سننے کے لئے اپنے اندر کان اور خارج میں ہوا کا محتاج ہے ورنہ وہ سُن نہیں سکتا۔ انسان دیکھنے کے لئے اپنے اندر آنکھ اور خارج میں روشنی کا محتاج ہے ورنہ وہ دیکھ نہیں سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا سُننا اور دیکھنا ان تمام احتیاجات سے بالاتر ہے۔ اُسے سننے کے لئے نہ کان اور ہوا کی احتیاج ہے اور نہ دیکھنے کے لئے روشنی اور آنکھ کی احتیاج ہے کیونکہ وہ صمد ہے یعنی کسی چیز کا محتاج نہیں۔ پس یہ تنزیہی صفت اس کی صفات کو مخلوق کی صفات سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کسی چیز کے خلق کرنے یعنی بنانے میں اپنے اندر ہاتھ اور خارج میں مادہ کا محتاج ہے

مگر اللہ تعالیٰ نہ اپنے اندر ہاتھ اور نہ خارج میں کسی مادہ کا محتاج ہے۔ اگرچہ ید کا لفظ قرآن کریم میں آیا ہے جیسا کہ فرمایا۔ فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شیءٍ و الیہ ترجعون (یٰس) پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹو گے۔ مگر یہ ہاتھ انسان کی طرح کوئی جسمانی ہاتھ نہیں ہو سکتا جس کی احتیاج انسان کو ہوتی ہے بلکہ قدرت کا ہاتھ ہے جس کے اندر تمام زمین و آسمان کی بادشاہی ہے لیس کمثلہ شیءٌ اور صفت صمد کے ماتحت یہ اشتراک فقط لفظی ہے۔ اسی طرح خدا کو خلق کرنے میں کسی مادہ کی احتیاج نہیں کیونکہ وہ صمد ہے یہ کہنا کہ خدا بھی انسان کی طرح مادہ کے بغیر کچھ نہیں بنا سکتا۔ نہ وہ نیست سے ہست کر سکتا ہے۔ نہ ہست سے نیست کر سکتا ہے۔ یہ درحقیقت وہی غلطی ہے کہ خدا کی صفات کو انسان کی صفات کے معیار پر پرکھا جاتا ہے اگر انسان کی طرح وہ مادہ کے بغیر کچھ پیدا نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کی صفات کا اندازہ کرنے کے لئے بھی انسان کی صفات کے حدود کو مدنظر رکھا جانا ضروری ہے۔ تو پھر وہ انسان کی طرح نہ تو بغیر کان اور ہوا کے سن سکتا ہے اور نہ بغیر آنکھ اور روشنی کے دیکھ سکتا ہے۔ تعجب ہے کہ مشبہ ظاہریہ پر تو یہ معترض لوگ ہنستے ہیں کہ یہ لوگ خدا کو انسان کی طرح جسمانی کان اور آنکھ کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ اور خدا کی قدرت اور علم کو انسان کی قدرت اور علم کے معیار پر مانتے ہیں لیکن خود وہی بات کرتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں پر ہنستے ہیں۔ آخر خدا کو پیدا کرنے میں مادہ کا محتاج قرار دینا انسان کی صفت اور قدرت پر اس کی صفت خلق کو ناپنا نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان نیست کو ہست نہیں کر سکتا لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکلا کہ خدا بھی نیست سے ہست نہیں کر سکتا۔ خدا کے علم اور قدرت اور اس کی صفات کو انسان کے علم اور قدرت اور صفات کے پیمانہ پر ناپنا کہاں کی عقلمندی ہے بلکہ سخت جہالت اور ضلالت ہے۔ رہا یہ کہنا کہ ہم کائنات میں کہیں نیست سے ہست ہوتے نہیں دیکھتے طفلانہ باتیں ہیں۔ ہر ایک سائنس دان جانتا ہے کہ قانون ابدا اور تھا اور قانون اعادہ اور ہے۔ ابتدا میں دنیا کیسے بنی اس کا کسی شخص کو یقینی علم نہیں محض تخیل اور مختلف نظریئے ہیں۔ مگر اتنا سب کو مسلم ہے کہ وہ قوانین موجودہ قوانین قدرت سے جو آج ہمیں نظر آرہے ہیں مختلف تھے۔ مثلاً آج ہم مرغی سے انڈا پیدا ہوتا دیکھتے ہیں اور انڈے سے مرغی۔ بیج سے درخت پیدا ہوتا دیکھتے ہیں اور درخت سے بیج۔ اس کے خلاف نہیں دیکھتے۔ لیکن کوئی نہیں بتا سکتا کہ ابتدا میں کونسی چیز پہلے پیدا ہوئی مرغی یا انڈا۔ درخت یا بیج۔ بہرحال پہلے انڈا پیدا ہوا یا مرغی وہ اس موجودہ قانون کے مطابق تو نہیں پیدا ہوئی کسی اور ہی قانون کے ماتحت پیدا ہوئی۔

جو موجودہ قانون سے مختلف تھا اور جسے آج ہم نہیں دیکھتے۔ درخت یا بیج میں سے جو چیز بھی پہلے پیدا ہوئی وہ اس قانون سے مختلف قانون کے ماتحت پیدا ہوئی جو آج ہمیں نظر آتا ہے اس لئے اس قانون کو قانون ابدا کہا جاتا ہے جس کے ماتحت ابتدائے آفرینش میں چیزیں پیدا ہوئیں اور موجودہ قوانین کو جن کے ماتحت دنیا کا چکر چل رہا ہے قانون اعادہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے۔ ھو یبدیٔ و یعید۔ زالبرج۔ یعنی خدا کے ہاتھ میں قوانین ابدا بھی ہیں اور قوانین اعادہ بھی۔ اب ظاہر ہے کہ قوانین اعادہ پر قوانین ابدا کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ انسان تو کوئی اس وقت موجود نہ تھا کہ اُن قوانین کو بچشم خود دیکھتا۔ جو کچھ ہے آخر محض قیاس ہی قیاس ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ ما اشھدتم خلق السمٰوات والارض ولا خلق انفسھم۔ یعنی آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور ان کی جانیں پیدا کرنے کے وقت تم موجود نہ تھے۔ پس جب انسان اس وقت موجود نہ تھا تو جو کچھ اس قانون ابدا کے متعلق رائے زنی کی جاتی ہے وہ محض قیاس ہی قیاس ہے۔ جو ممکن ہے صحیح ہو اور ممکن ہے غلط ہو۔ ابھی کل کی بات ہے۔ پچاس برس گزرے ہوں گے جو فلسفی مادہ کو ازلی ابدی قرار دیتے تھے جس کے سامنے معتزلہ، نیچری اور آریہ سب نے سر تسلیم خم کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ثابت ہوا کہ مادہ کوئی چیز نہیں۔ یہ فقط بجلی کے مفردات (الکٹرون) ہیں۔ بعد میں پتہ لگا کہ یہ الکٹرون نیبیولا سے پیدا شدہ ہیں۔ اس کے بعد پتہ لگا کہ نیبیولا ایتھر کی تاریک شعاعوں سے پیدا ہوا ہے۔ اب ایتھر کی شعاعوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ ایسے ایتھری ذرات یا امواج سے پیدا شدہ ہیں جن کی ہستی علم حساب کے رو سے تو مان لی جاتی ہے مگر درحقیقت ان کا وجود کچھ بھی نہیں۔ فقط انرجی ہی انرجی ہے یعنی قوت یا قدرت ہے۔ اور وہ قوت اسقدر زبردست ہے کہ پانی کے ایک قطرہ میں اس قدر انرجی جمع شدہ ہے کہ اگر ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں تو ایک قطرہ کی انرجی سے ایک بڑا جہاز دنیا کے گرد آٹھ دفعہ چکر لگا سکتا ہے۔ گویا کسی قادر کی قدرت یا قوت کا سارا مظاہرہ ہے حقیقت میں کچھ بھی نہیں یعنی سائنس بھی قریبًا اسی بات کے اوپر آن پہنچی ہے کہ جو کچھ کائنات ہمیں نظر آتی ہے اسے کسی قدرت نے وجود بخشا ہے ورنہ درحقیقت کچھ بھی نہ تھا۔ اور آئنسٹائن کی تھیوری نے تو مخلوق کے ازلی ابدی نہ ہونے پر مہر لگا دی۔ اُس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ایک مخلوق جو حدود رکھتی ہے جس طرح طول، عرض، عمق اس کی تین حد بندیاں ہیں اسی طرح Time/Space یعنی زمان/مکان اسکی چوتھی حد بندی ہے یعنی کوئی مخلوق جو حدود رکھتی ہے اور مادہ اس میں سب سے پہلے شامل ہے وہ یقینًا زمان اور مکان کی حد بندی کے اندر مقید ہے اور ان چیزوں کو جو حد بندی کے اندر مقید ہیں ازلی ابدی کہنا فاش غلطی ہے پس سوائے خدا کے جو ایک غیر محدود

ہستی ہے محدود ہستیوں کو ازلی ابدی کہنا نہایت غیر معقول اور موجودہ فلسفہ اور سائنس کی موجودہ تحقیقات کے رُو سے جہالت ہے لیکن حضرت مرزا صاحب نے جو مادہ اور روح کے ازلی ابدی ہونے سے انکار کیا تو اسکی وجہ نہیں کہ اُن کے سامنے سائنس کی یہ تحقیقات تھی۔ یہ تحقیقات تو ان کی وفات کے کئی سالوں کے بعد ہوئی۔ ان کی زندگی میں تو مادہ کو ازلی ابدی قرار دیا جاتا تھا۔ ان کا استدلال قرآن سے تھا قرآن کہتا تھا کہ ھو اللہ احد کہ وہ خدا ایک ہے۔ اپنی ذات میں اپنی صفات میں اپنے افعال میں ایک ہے۔ اللہ الصمد وہ بے احتیاج ہے۔ اسے کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اس کی احد صفت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے ازلی ابدی ہونے میں کوئی ذات اس کی شریک نہ ہو۔ وہ صمد ہے اسے پیدا کرنے کے لئے کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اس کی شان یہ ہے کہ انما امرہٗ اذا اراد شیئًا ان یقول لہٗ کن فیکون کہ اس کا امر تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے یعنی محض خدائی ارادہ اس چیز کو نیست سے وجود میں لے آتا ہے۔ یہاں بعض فلسفیوں نے اعتراض کیا ہے کہ "خدا کس چیز کو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ آخر اس کا وجود ذہنی موجود ہوتا ہے" یہ وجود ذہنی بچوں کی سی باتیں ہیں۔ مجھے اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ کوئی صاحبزادہ صاحب نیا نیا فلسفہ پڑھ کر گھر آئے تھے والدین کے ساتھ صبح ناشتہ کرنے بیٹھے تو باپ سوچ میں پڑا ہوا تھا فلسفی بیٹے نے پوچھا کہ کیا فکر ہے۔ باپ بولا کہ "انڈے دو ہیں۔ اور ہم آدمی تین ہیں تقسیم کس طرح ہو" بیٹے نے کہا کہ میں ابھی ثابت کئے دیتا ہوں کہ انڈے تین ہیں۔ دو تو میز پر رکھے ہوئے ہیں اور تیسرا میرے ذہن میں موجود ہے" باپ ہنس پڑا اس نے کہا بہت خوب ایک انڈا میں کھائے لیتا ہوں اور دوسرا تمہاری ماں کھالے گی تیسرا ذہنی انڈا تم کھا لو" غرضیکہ وجود ذہنی کوئی وجود نہیں۔ آیت کا مطلب صاف ہے کہ خدا جو کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے محض اس کا ارادہ اس چیز کو عدم سے وجود میں لے آتا ہے۔ اسے پہلے سے کسی چیز کے موجود ہونے کی ضرورت نہیں۔ خدا کی اس قدرت کا علم ہمیں قرآن سے ملتا ہے جو خدا کا کلام ہے۔ گویا خدا نے اپنی خدائی کی شان یہ بتلائی کہ وہ انسان کی طرح عاجز نہیں کہ نیست سے ہست یا ہست سے نیست نہ کر سکے وہ علیٰ کل شیءٍ قدیر اور فعال لما یرید ہے محض اپنے ارادہ سے نیست کو ہست اور ہست کو نیست کر سکتا ہے۔ انسان کے علم اور قدرت پر اس کے علم اور قدرت کو ناپنا غلطی اور ضلالت بلکہ گستاخی ہے اور مخلوق کو اس کے ساتھ ساتھ ازلی ابدی ماننا اس کی صفت احد اور صفت الاوّل کے خلاف ہے۔ اگر مخلوق بھی ازلی ہونے میں اس کے ساتھ شریک ہے تو پھر وہ الاوّل یعنی سب سے پہلے اس کا وجود کیسے ٹھیرے گا اور قدیم ہونے میں اس کی صفت احد

میں شرک لازم آئے گا۔

یہ کہنا ایک مغالطہ ہے کہ مخلوق اگرچہ خدا کے ساتھ ساتھ قدیم سے ہے۔ مگر وہ معلول ہے اور خدا علت یعنی اس کا اور خدا کا معلول اور علت ہونا ایسا ہے جیسے چابی کے گھومنے سے تالے کا کھلنا کہ دونوں ایک ہی وقت میں ظہور پکڑتے ہیں مگر ایک علت ہے دوسرا معلول۔ مجھے اس مثال سے تعجب آتا ہے کہ قدامت کی مثال ایک حادث چیز سے دی جاتی ہے۔ اور تالے کے کھلنے کو نیست سے ہست کرنے سے کیا تعلق۔ ایک محرک کی مثال میں تو یہ تالے چابی کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن خلق کسی تحریک کا نام نہیں۔ پس خالق اور مخلوق کے لئے یہ مثال پیش کرنا غلطی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ معتزلہ خدا کی خالقیت کو فلسفہ کے ماتحت محض مادہ کی شکل کو بدلنے تک محدود رکھتے ہیں۔ اس لئے تالے کا کھلنا جو محض اس کی حالت کا بدلنا ہے بطور مثال کے وہ پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن منطقی پیچوں کو الگ کر دیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ مسئلہ حل نہیں ہوا کہ آیا قرآن کریم کے رُو سے خدا مادہ کا خالق ہے یا نہیں یعنی اُسے نیست سے ہست کرنے پر بھی قادر ہے یا نہیں۔ قرآن کریم صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ کو خالق کل شئی قرار دیتا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ مادہ کسی شکل میں بھی ہو وہ شئے میں داخل ہے۔ معتزلہ تو اس معاملہ میں اس قدر متشدد رہے ہیں کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں اُنہوں نے قرآن کو غیر مخلوق کہنے والے علماء اہل سُنت کو پٹوایا۔ مروایا اور ہر طرح کے ظلم و ستم اُن پر توڑے کیونکہ معتزلہ قرآن کو جو خدا کا کلام ہے شئی قرار دے کر اُس کا خالق بھی خدا کو قرار دیتے تھے۔ لیکن فلسفہ کے مقابلہ میں اُن کا یہ احساس کمتری کس قدر تعجب خیز ہے کہ مادہ کو شئے نہیں قرار دیتے۔ اور یہاں خالق کل شئی کی آیت بھول جاتی ہے۔ مگر خود فلسفہ نے بھی اُن کا ساتھ نہ دیا۔ سائنس نے مادہ کی ابتدا انرجی یعنی قوت کو قرار دے کر مادہ کے قدیم ہونے سے انکار کر دیا۔ اور ابھی آگے چل کر کیا ہو یہ کسی کو علم نہیں۔ لیکن یہ حقیقت منکشف ہو چکی کہ محض انسان کے دماغ کے فلسفہ پر جس چیز کی بنیاد ہوگی وہ علیٰ شفا جرف ھار کی مصداق ہوگی یہ ریت کا کھوکھلا کنارہ آج نہیں تو کل گرے گا۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ خدا کے علم پر عقائد کی بنیاد رکھی جائے۔

باقی رہا معتزلہ کا یہ اعتراض کہ اگر کبھی ایسا ہوا ہو کہ خدا تھا اور مخلوق نہ تھی تو اس سے صفت خلق کا تعطل لازم آتا ہے۔ یہ اعتراض جہالت سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا مخلوق کے لئے علت ارادی ہے نہ کہ علت اضطراری۔ علت اضطراری میں تعطل صفات سے اس چیز کے وجود کی نفی ہو جاتی ہے۔

اس کی مثال ہے روشن چراغ اور اس کی روشنی۔ روشنی معلول ہے اور روشن چراغ اس کی علّت لیکن یہ علّت اضطراری ہے۔ ناممکن ہے کہ چراغ روشن ہو اور روشنی اس سے نہ نکلے۔ روشنی نہ نکلے گی تو وہ روشن چراغ نہ ہوگا۔ علّت ارادی کی مثال یہ ہے کہ انسان حیوان ناطق ہے یعنی وہ بولنے والا جاندار ہے۔ یہاں بولنا معلول ہے اور انسان علّت ہے مگر یہ علّت ارادی ہے۔ اس لئے انسان کا فعل اس کے ارادہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ وہ جب ارادہ کرتا ہے بولتا ہے۔ جب ارادہ نہیں کرتا نہیں بولتا پس اگر خدا صاحب ارادہ ہستی ہے تو انسان کی طرح اس کی مثال علت ارادی سے ہی دی جاسکتی ہے نہ کہ علّت اضطراری سے۔ خدا کی وہ صفات جو افعال کے رنگ میں ظہور پکڑتی ہیں بالقوہ تو ہمہ وقت اس میں موجود ہیں مگر بالفعل اسی وقت ہوتی ہیں جب وہ ارادہ کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے کہ فعالٌ لما یرید یعنی اس کے افعال اس کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پس اس کی خلق صفت کا ظہور اس کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے جب وہ ارادہ کرتا ہے تو کوئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ جب نہیں کرتا تو نہیں پیدا ہوتی جس طرح انسان میں بولنے کی قوت بالقوہ ہمہ وقت موجود ہے مگر بالفعل اسی وقت ہوتی ہے جب وہ ارادہ کرتا ہے۔ جب وہ ارادہ نہیں کرتا اور نہیں بولتا تو کوئی نہیں کہتا کہ اس سے انسانی صفت کا تعطل لازم آگیا اور اب وہ انسان نہیں رہا۔ اسی طرح خدا میں خلق کرنے کی صفت بالقوہ تو ہمہ وقت موجود ہے مگر وہ افعال میں اسی وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جب ارادۂ الٰہی ہوتا ہے اس کا نام تعطّل صفات رکھنا حماقت ہے۔ مثلاً خدا کی صفت غفور رحیم ہے۔ یعنی وہ گنہگار کے گناہوں کو رحم فرما کر بخش بھی دیتا ہے تو کیا جب تک کوئی گناہ نہ کرے اس کی صفت غفور رحیم کا تعطّل لازم آئے گا۔ پھر ضروری ہوا کہ انسان گناہ کرتا رہے تا خدا کی غفور رحیم صفت کا تعطّل لازم نہ آئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کو اس کی خدائی سے جواب مل جانے سے بچانے کے لئے گناہ کے محرک شیطان کا وجود نہایت ضروری ہوا۔ اور ازل سے خدا کے ساتھ ساتھ اس کا وجود ماننا چاہئے تا کہ خدا کی غفور رحیم صفت کا تعطّل لازم نہ آئے۔ کیونکہ اگر شیطان نہ ہو اور لوگ گناہ نہ کریں تو خدا کا تعطّل صفات ہو کر اس کی خدائی جاتی رہے۔ (نعوذ باللہ من ھٰذہ الھفوات) یہ تو مجوسیوں کا عقیدۂ ثنویہ ہوگیا کہ یزدان اور اہرمن ابتدا سے ساتھ ساتھ چلے آئے ہیں۔ دراصل یہ تعطّل صفات کا جھگڑا اس طرح پیدا ہوا کہ دہریہ لوگ خدا کو علت اضطراری کے رنگ میں بلاارادہ بلاشعور علت اولیٰ مانتے ہیں۔ قرآن نے خدا کو صاحب علم صاحب قدرت صاحب ارادہ ہستی پیش کیا ہے۔ پس قرآن کے ماننے والے کو

خدا کو علت اضطراری قرار دیکر تعطّل صفات کا ڈراوا دینا حد درجہ کی ضلالت اور دہریوں کی تقلید ہے۔

امکان کذب باری تعالیٰ کا رد

خدا کی صفات کو زیر نظر نہ رکھنے سے جو غلطیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب خدا علیٰ کلّ شئ قدیر پر تمہارا اتنا زور ہے تو کیا وہ اپنے جیسا دوسرا خدا بھی پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت مرزا صاحب نے فرمایا کہ یہ اعتراض معترض کی اللہ تعالیٰ کی صفات سے پرلے درجہ کی جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ جو پیدا ہوگا وہ مخلوق ہوگا وہ خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا غیر مخلوق ازلی و ابدی ہے۔ پس ایسا سوال کرنا جو خدائی صفات کے منافی ہو سائل کی جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح بعض علما اس پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ کیا خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ وہ اسے خدا کی قدرت کاملہ کے خلاف سمجھتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول نہ سکے۔ وہ کہتے ہیں بول تو سکتا ہے مگر بولتا نہیں۔ دراصل وہ خدا کو بھی انسان سمجھ لیتے ہیں جس میں بدی کی طرف مائل ہو جانے کا امکان ہے۔ حضرت مرزا صاحب کا ارشاد تھا کہ خدا کی صفت حق ہے یعنی وہ سرتاپا سچ ہے پس جب حق اس کی صفت ہے تو اس کی طرف امکاناً بھی جھوٹ منسوب کرنا خدا کو اس کی خدائی سے جواب دینا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سوال کرے کہ آفتاب کا نور بجائے روشنی کے تاریکی بھی دے سکتا ہے؛ خدا تو حق ہے اگر اس میں امکان کذب مانا جائے تو پھر وہ خدا نہ رہا۔ خدا کی قدرت کاملہ کا ظہور اس کی صفات کے ماتحت اور مطابق ہوتا ہے نہ کہ صفات کچھ اور ہوں اور افعال کچھ اور۔

وحدت وجود کا رد

حضرت اقدس مرزا صاحب نے وحدت وجود یعنی عقیدۂ ہمہ اوست کا بھی رد کیا کیونکہ اس میں بھی ساری کائنات کا قدم لازم آتا تھا۔ آپ وحدت شہود کے قائل تھے۔ اور وحدت وجود کو آپ بعض ہندو جوگیوں اور مجوسیوں اور بعض اباحتی صوفیوں کی ایجاد سمجھتے تھے یا بعض معتزلیوں نے عدم معرفت الٰہی کی وجہ سے اس عقیدہ میں پناہ لی ورنہ اس کے اندر کوئی حقیقت نہیں۔ آپ کا ارشاد تھا کہ قرآن کریم اس عقیدہ کو نہایت صراحت سے رد کرتا ہے اور انسان کا انتہائی کمال عبودیت کاملہ تامہ میں بتلاتا ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ یٰا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربك راضیۃً مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (الفجر) کہ اے نفس اطمینان یافتہ اپنے رب کی طرف لوٹ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ یہاں اُس انسان کامل کو جو نفس مطمئنہ کے اعلیٰ مقام تک پہنچ چکا جو انسانیت کے کمالات

کی انتہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ میرے بندوں (عبادی) میں داخل ہو جا۔ گویا اب وہ اس مقام پر پہنچ گیا جو عبودیت تامہ کاملہ کا مقام ہے اور اس لئے ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون (کہ میں نے جن اور انس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے بندے بنیں کے ماتحت اپنے مقصد تخلیق کو پا لیا۔ پس انسان خدا نہیں وہ کتنے بھی کمالات حاصل کرے خدا نہیں بن سکتا۔ اس کے کمالات کی انتہا عبودیت کاملہ تامہ ہے۔ نہ کہ خدائی۔

استویٰ علے العرش کی تفسیر حضرت مرزا صاحب نے استویٰ علے العرش کی جو تفسیر فرمائی ہے اس کا ذکر کرنا بھی میں اس جگہ مناسب سمجھتا ہوں۔ اگرچہ اس کے معنے نفاذ امر مختلف مفسرین نے کئے ہیں اور وہ اپنی جگہ نہایت ٹھیک ہیں لیکن صفات الٰہیہ کو مدنظر رکھ کر جو تفسیر اس کی حضرت مرزا صاحب نے فرمائی ہے وہ نہایت لطیف اور کئی مسائل پر روشنی ڈالنے والی ہے۔ اس لئے آپ کی تصنیف چشمۂ معرفت صفحہ ۲۶۷ سے ۲۷۰ تک کی اصل عبارت یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔ تحریر فرماتے ہیں :-

"خدا تعالیٰ نے عاجز انسانوں کو اپنی کامل معرفت کا علم دینے کے لئے اپنی صفات کو قرآن شریف میں دو رنگ پر ظاہر کیا ہے :-

(۱) اوّل اس طور پر بیان کیا ہے جس سے اس کی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق کی صفات کی ہم شکل ہیں جیسا کہ وہ کریم رحیم ہے محسن ہے اور وہ غضب بھی رکھتا ہے اور اس میں محبت بھی ہے اور اس کے ہاتھ بھی ہیں۔ اور اس کی آنکھیں بھی ہیں اور اس کی ساقیں بھی ہیں اور اس کے کان بھی ہیں ...... پس ان تشبیہی صفات سے کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا انسان ان صفات میں خدا سے مشابہ ہے اور خدا انسان سے مشابہ ہے (۲) اس لئے خدا نے ان صفات کے مقابل پر قرآن شریف میں اپنی تنزیہی صفات کا بھی ذکر کر دیا۔ یعنی ایسی صفات کا ذکر کیا جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی ذات اور صفات میں کچھ بھی شراکت انسان کے ساتھ نہیں اور نہ انسان کو اس کے ساتھ کچھ مشارکت ہے نہ اس کا خلق یعنی پیدا کرنا انسان کے خلق کی طرح ہے نہ اس کا رحم انسان کے رحم کی طرح ہے۔ نہ اس کا غضب انسان کے غضب کی طرح ہے نہ اس کی محبت انسان کی محبت کی طرح ہے۔ نہ وہ انسان کی طرح کسی مکان کا محتاج ہے اور یہ ذکر یعنی خدا کا اپنی صفات میں

انسان سے بالکل علیحدہ ہونا قرآن شریف کی کئی آیات میں تصریح کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک یہ آیت ہے لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر یعنی کوئی چیز اپنی ذات اور صفات میں خدا کی شریک نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے...... اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے۔ ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش ط (ترجمہ) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا پھر اُس نے عرش پر قرار پکڑا یعنی اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کر کے اور تشبیہی صفات کا ظہور فرما کر پھر تنزیہی صفات کے ثابت کرنے کے لئے مقام تنزہ اور تجرد کی طرف رُخ کیا جو وراء الورا مقام اور مخلوق کے قرب وجوار سے دُور تر ہے۔ وہی بلند تر مقام ہے جس کو عرش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے تو تمام مخلوق چیز عدم میں تھی اور خدا تعالیٰ وراء الورا مقام میں اپنی تجلیات ظاہر کر رہا تھا جس کا نام عرش ہے یعنی وہ مقام جو ہر ایک عالم سے بلند تر اور برتر ہے اور اسی کا ظہور اور پرتو تھا اور اس کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور جب مخلوق ظاہر ہوئی تو پھر اس نے اپنے تئیں مخفی کر لیا اور چاہا کہ وہ ان مصنوعات کے ذریعہ سے شناخت کیا جائے ..... غرض ابتدا میں خدا کی صفت وحدت کا دَور تھا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس دَور نے کتنی دفعہ ظہور کیا بلکہ یہ دَور قدیم اور غیر متناہی ہے۔ بہرحال صفت وحدت کے دَور کو دوسری صفات پر تقدم زمانی ہے پس اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں خدا اکیلا تھا اور اس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور پھر خدا نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور اسی تعلق کی وجہ سے اُس نے اپنے یہ اسماء ظاہر کئے کہ وہ کریم اور رحیم ہے اور غفور اور توبہ قبول کرنیوالا ہے ..... اور اس نے اپنی یہ صفات اپنی کتاب میں بیان فرمائیں کہ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور محبت کرتا ہے اور غضب کرتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ اور پیر اور آنکھ اور کان کا بھی ذکر کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس کا دیکھنا انسان کے دیکھنے کی طرح نہیں۔ اور اس کا سننا انسان کے سننے کی طرح نہیں اور اس کا محبت کرنا انسان کے محبت کرنے کی طرح نہیں اور اُس کا غضب انسان کے غضب کی طرح نہیں اور اس کے ہاتھ پیر اور آنکھ کان مخلوق کے اعضا کی طرح نہیں بلکہ وہ ہر ایک بات میں بے مثل ہے اور بار بار صاف فرما دیا کہ یہ اُس کی تمام صفات اُس کی ذات کے مناسب حال ہیں انسان کی صفات کی مانند

نہیں اور اس کی آنکھ وغیرہ جسم اور جسمانی نہیں اور اس کی کسی صفت کو انسان کی کسی صفت سے مشابہت نہیں۔ مثلاً انسان اپنے غضب کے وقت پہلے غضب کی تکلیف آپ اُٹھاتا ہے اور جوش وغضب میں فوراً اس کا سرور دُور ہو کر ایک جلن سی اس کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے اور ایک مادہ سوداوی اس کے دماغ میں چڑھ جاتا ہے اور ایک تغیر اس کی حالت میں پیدا ہوجاتا ہے مگر خدا ان تغیرات سے پاک ہے اور اس کا غضب ان معنوں سے ہے کہ وہ اس شخص سے جو شرارت سے باز نہ آوے اپنا سایۂ حمایت اُٹھالیتا ہے اور اپنے قدیم قانون قدرت کے موافق اس سے ایسا معاملہ کرتا ہے جیسا کہ ایک غضبناک انسان کرتا ہے۔ لہٰذا استعارہ کے رنگ میں وہ معاملہ اس کا غضب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی اس کی محبت انسان کی محبت کی طرح نہیں کیونکہ انسان غلبۂ محبت میں بھی دکھ اٹھاتا ہے۔ اور محبوب کے علیحدہ اور جُدا ہونے سے اس کی جان کو تکلیف پہنچتی ہے۔ مگر خدا ان تکالیف سے پاک ہے ایسا ہی اُس کا قرب بھی انسان کے قرب کی طرح نہیں کیونکہ انسان جب ایک کے قریب ہوتا ہے تو اپنے پہلے مرکز کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر وہ باوجود قریب ہونے کے دُور ہوتا ہے اور باوجود دور ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی ہر ایک صفت انسانی صفت سے الگ ہے۔ اور صرف اشتراک لفظی ہے اس سے زیادہ نہیں اسی لئے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے لیس کمثلہٖ شیءٌ یعنی کوئی چیز اپنی ذات یا صفات میں خدا تعالیٰ کے برابر نہیں اب ناظرین با انصاف پر ظاہر ہو کہ اسی مطلب کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اللّٰہ الذی خلق السّمٰوات والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش یعنی خدا وہ ہے جس نے سب کچھ چھ دن میں پیدا کر کے پھر اپنے مقام وراء الورا کی طرف توجہ کی* اور عرش پر قرار پکڑا۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ عرش سے مراد قرآن شریف میں وہ مقام ہے جو تشبیہی مرتبہ سے بالاتر اور ہر ایک عالم سے برتر اور نہاں در نہاں اور تقدس اور تنزہ کا مقام ہے وہ کوئی ایسی جگہ نہیں کہ پتھر یا اینٹ یا کسی اور چیز سے بنائی گئی ہو اور خدا اس پر بیٹھا ہُوا ہو۔ اسی لئے عرش کو غیر مخلوق کہتے ہیں

---

*حاشیہ۔ ہم کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ اس آیت سے مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی تشبیہی صفات کا اظہار فرما کر پھر اس مقام کی طرف توجہ کی جو بے مثل و مانند ہونے کا مقام ہے جس کو زبان شرع میں عرش کہتے ہیں جو تمام عالموں سے برتر اور وہم وخیال سے بلند ہے۔ اور عرش کوئی مخلوق چیز نہیں ہے بلکہ محض وراء الورا مقام کا نام عرش ہے جس سے مخلوق کو کوئی اشتراک نہیں۔ منہ

اور خدا تعالیٰ جیسا کہ یہ فرماتا ہے کہ کبھی وہ مومن کے دل پر اپنی تجلی کرتا ہے ایسا ہی وہ فرماتا ہے کہ عرش پر اس کی تجلی ہوتی ہے اور صاف طور پر فرماتا ہے کہ ہر ایک چیز کو مَیں نے اُٹھایا ہوا ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ کسی چیز نے مجھے بھی اُٹھایا ہوا ہے اور عرش جو ہر ایک مقام سے برتر مقام ہے وہ اس کی تنزیہی صفت کا مظہر ہے اور ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ ازل اور قدیم سے خدا میں دو صفتیں ہیں ایک صفت تشبیہی۔ دوسری صفت تنزیہی۔ اور چونکہ خدا کے کلام میں دونوں صفات کا بیان کرنا ضروری تھا یعنی ایک تشبیہی صفت اور دوسری تنزیہی صفت اس لئے خدا نے تشبیہی صفات کے اظہار کے لئے اپنے ہاتھ آنکھ محبت غضب وغیرہ صفات قرآن شریف میں بیان فرمائے اور پھر جبکہ احتمال تشبیہ کا پیدا ہوا تو بعض جگہ لیس کمثلہٖ شیءٌ کہہ دیا اور بعض جگہ ثم استوٰی علی العرش کہہ دیا...... اس آیت کے ظاہری معنے کے رُو سے اس جگہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے خدا کا عرش پر قرار نہ تھا۔ اس کا یہی جواب ہے کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ وراء الورا ہونے کی ایک حالت ہے جو اس کی صفت ہے۔ پس جبکہ خدا نے زمین و آسمان اور ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور ظلّی طور پر اپنے نور سے سورج چاند اور ستاروں کو نور بخشا اور انسان کو بھی استعارہ کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اپنے اخلاق کریمہ اس میں پھونک دیئے تو اس طور سے خدا نے اپنے لئے ایک تشبیہ قائم کی مگر چونکہ وہ ہر ایک تشبیہ سے پاک ہے اس لئے عرش پر قرار پکڑنے سے اپنے تنزہ کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے بلکہ سب سے الگ اور وراء الورا مقام پر ہے۔ اور پھر سورۃ طٰہٰ جزو ۱۶ میں یہ آیت ہے الرحمٰن علی العرش استوٰی (ترجمہ) خدا رحمٰن ہے جس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اس قرار پکڑنے سے یہ مطلب ہے کہ اگرچہ اس نے انسان کو پیدا کر کے بہت سا قرب اپنا اس کو دیا مگر یہ تمام تجلیات مختص الزمان ہیں یعنی تمام تشبیہی تجلیات اس کی کسی خاص وقت میں ہیں جو پہلے نہیں تھیں مگر ازلی طور پر قرارگاہ خدا تعالیٰ کی عرش ہے جو تنزیہ کا مقام ہے کیونکہ جو فانی چیزوں سے تعلق کر کے تشبیہ کا مقام پیدا ہوتا ہے وہ خدا کی قرارگاہ نہیں کہلا سکتا۔ وجہ یہ کہ وہ معرض زوال میں ہے اور ہر ایک وقت میں زوال اس کے سر پر ہے بلکہ خدا کی قرارگاہ وہ مقام ہے جو فنا اور زوال سے پاک ہے پس وہ مقام عرش ہے۔ اس جگہ ایک اور اعتراض مخالف لوگ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عرش کو آٹھ فرشتے اُٹھائیں گے جس سے اشارۃ النص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں چار فرشتے

عرش کو اٹھاتے ہیں۔ اور اب اس جگہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اس کے عرش کو اٹھاوے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تم سن چکے ہو کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے جو اٹھائی جائے یا اٹھانے کے لائق ہو بلکہ صرف تنزہ اور تقدس کے مقام کا نام عرش ہے اسی لئے اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں۔ ورنہ ایک مجسّم چیز خدا کی خالقیت سے کیونکر باہر رہ سکتی ہے اور عرش کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب استعارات ہیں۔ پس اس سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسا اعتراض محض حماقت ہے۔ اب ہم فرشتوں کے اُٹھانے کا اصل نکتہ ناظرین کو سناتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے تنزہ کے مقام میں یعنی اس مقام میں جبکہ اس کی صفت تنزہ اس کی تمام صفات کو روپوش کر کے اس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے جس مقام کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں عرش ہے تب خدا عقول انسانیہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اس کو دریافت کر سکے۔ تب اس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو دنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں٭۔ (۱) اوّل ربوبیت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی رُوحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے۔ چنانچہ رُوح اور جسم کا ظہور ربوبیت کے تقاضہ سے ہے اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اس کے خارق عادت نشانوں کا ظہور میں آنا ربوبیت کے تقاضہ سے ہے۔ (۲) دوم خدا کی رحمانیت جو ظہور میں آچکی ہے یعنی جو کچھ اس نے بغیر پاداش اعمال بے شمار نعمتیں انسان کے لئے میسر کی ہیں یہ صفت بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے۔ (۳) تیسری خدا کی رحیمیت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اوّل تو صفت رحمانیت کے تقاضہ سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفت رحیمیت کے تقاضہ سے نیک اعمال اُن سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر ان کو آفات سے بچاتا ہے یہ صفت بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۴) چوتھی صفت مالکِ یوم الدّین ہے یہ بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ

٭ حاشیہ خدا تعالیٰ نے تمام اجرام سماوی و ارضی پیدا کر کے پھر اپنے وجود کو وراء الوراء مقام میں مخفی کیا جس کا نام عرش ہے اور یہ ایسا نہاں در نہاں مقام ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی چار صفات ظہور پذیر نہ ہوتیں جو سورۂ فاتحہ کی پہلی آیات میں ہی درج ہیں تو اس کے وجود کا کچھ پتہ نہ لگتا۔ یعنی ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکِ یوم الجزا ہونا سو یہ چاروں صفات استعارہ کے رنگ میں چار فرشتے خدا کے کلام میں قرار دیئے گئے ہیں جو اس کے عرش کو اٹھا رہے ہیں یعنی اس وراء الوراء مقام میں جو خدا ہے اس مخفی مقام سے اس کو دکھا رہے ہیں۔ ورنہ خدا کی شناخت کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا۔ منہ

نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔ یہ چاروں صفتیں ہیں جو اس کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں یعنی اس کے پوشیدہ وجود کا ان صفات کے ذریعہ سے اس دنیا میں پتہ لگتا ہے۔ اور یہ معرفت عالم آخرت میں دوچند ہو جائے گی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔"

اسی کتاب چشمۂ معرفت میں دوسری جگہ حضرت مرزا صاحب نے استویٰ علے العرش کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ استویٰ کا صلہ جب علیٰ ہو تو اس کے معنے ایسی جگہ قرار پکڑنا ہوتا ہے جو اس کے مناسب حال ہو۔ مثلاً استوت علی الجودی کے معنے ہیں کہ جودی پہاڑ پر وہ کشتی ایسی جگہ جا ٹھیری جو اہل کشتی کے مناسب حال تھی یعنی انہیں وہاں اترنے میں آسانی اور ضروریات کی چیزیں مہیا کرنے میں سہولت تھی۔ پس استویٰ علی العرش میں ایسا قرار پکڑنا ہی مراد ہو سکتا ہے جو جناب باری کے مناسب حال ہے اور وہ مقام تنزہ اور تجرد ہے۔

اسی طرح آپ نے ایک اور جگہ ستۃ ایام میں ایام سے مراد مطلق زمانہ یا دَور لیا ہے۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ جب ابھی آسمان و زمین پیدا نہ ہوا تھا اس وقت نہ سورج تھا نہ زمین۔ تو یہ ۲۴ گھنٹہ کا دن تو یہاں مراد نہیں ہو سکتا جو زمین اور سورج کے باہم تعلق سے پیدا ہوتا ہے پس یہاں تو مراد مطلق زمانہ ہی ہو سکتا ہے جس کے طول کا علم خود خالق کائنات کو ہی ہے ولاغیر۔ عربی زبان میں یوم کا لفظ مطلق زمانہ اور وقت پر بھی بولا جاتا ہے۔ اب چونکہ زمانہ بجائے خود کوئی چیز نہیں بلکہ محدود اشیا کی حدبندی کا نام ہے اس لئے یوم کا مطلب محض مراتب اور درجات باقی رہ جاتا ہے یعنی زمین و آسمان اپنی پیدائش کے سلسلہ میں چھ دَور یا چھ مرتبوں میں سے گزرا۔ خواہ وہ مراتب یا مراحل ایتھر[1] نیبولا[2]۔ الکٹرون[3]۔ جمادات[4] نباتات[5]۔ حیوانات[6] ہوں جیسا کہ اس زمانہ کی سائنس بتلاتی ہے۔ خواہ کوئی اور مراتب ہوں جن کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ بہرحال اس تمام کائنات کی پیدائش اور نشو و نما چھ مرتبوں پر مشتمل ہے۔ جو یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوئے۔ براہین احمدیہ حصہ پنجم میں حضرت مرزا صاحب نے سورۃ المومنون کے پہلے رکوع کی چند آیات کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ خود انسان کی جسمانی اور رُوحانی پیدائش و نشو و نما بھی چھ مراتب میں ہی ظہور پذیر ہوتی ہے نطفہ۔ علقہ۔ مضغہ۔ عظام۔ کسونا العظام لحمًا۔ ثم انشانٰہ خلقًا اٰخر میں جس طرح جسمانی پیدائش کے چھ مراتب کا ذکر ہے۔ اسی طرح سورۃ مومنون کی ابتدائی آیات میں انسان کی رُوحانی پیدائش کے چھ مراتب کا ذکر ہے۔ فی صلوٰتھم[1] خٰشعون۔ عن اللغو[2] معرضون۔ للزکوٰۃ[3] فاعلون۔ لفروجھم[4] حٰفظون۔ لاماناتھم[5] وعھدھم راعون۔ علیٰ صلوٰتھم[6] یحافظون۔ اور وہاں نہایت دلکش اور مبسوط تفسیر کرکے ان

ان مراتب کی تشریح فرمائی ہے۔

نوٹ:۔ مذکورہ بالا تحریر میں جو استویٰ علی العرش پر حضرت مرزا صاحب نے فرمائی ہے۔ وحدت وجود۔ اور قدامت مادہ یا قدامت مخلوق کے قائلین کے غلط اور گمراہ کن عقائد کا رد اور حنابلہ کی ظاہر پرستی کی اصلاح سبھی کچھ تو شامل ہے۔

سنت اللہ اور معجزہ کے متعلق معتزلیوں اور نیچریوں کا رد

اللہ تعالیٰ کے صفات اور افعال کے سلسلہ میں حضرت اقدس مرزا صاحب نے سنت اللہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آپ اس پر وقتاً فوقتاً مختلف کتب میں جو تحریر فرماتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

قرآن کریم میں ایک اصطلاح ہے سنت اللہ اُس سے مراد وہ عادات الٰہیہ یا قوانین الٰہیہ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل اور تام سے قرآن مجید میں فرمایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمادیا ہے کہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ عادات یا قوانین الٰہیہ میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے پس اگر ان کے خلاف کوئی واقعہ سنائے تو اُسے ہرگز یقین نہ کرو۔ بدقسمتی سے بعض نیچریوں اور معتزلیوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت سائنس کے ذریعہ ہم قوانین قدرت کا علم رکھتے ہیں اُسی کو قرآن نے سنت اللہ کہا ہے پس اس کے خلاف اگر کچھ ہم دیکھیں یا سنیں گے تو ہم ہرگز نہیں مانیں گے حالانکہ یہ صریح طور پر غلط ہے۔ قرآن کریم میں جس سنت اللہ کا ذکر ہے وہ وہی عادات و قوانین الٰہیہ ہیں جن کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے نہ کہ اس کے غیر میں۔ چونکہ ان قوانین و عادات الٰہیہ کا علم جناب الٰہی نے اپنے علم کامل سے ہمیں عطا فرمایا ہے اس لئے ان میں غلطی کا احتمال باقی نہیں کیونکہ جناب الٰہی کا علم اپنے قوانین کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ وہ جب اپنا قانون بیان فرمائے گا تو ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کوئی امر اس میں سے باہر رہ جائے۔ یہی وہ قوانین الٰہیہ ہوتے ہیں جن کے متعلق فرمایا ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا یعنی تو ان قوانین الٰہیہ میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ پس ان کے خلاف اگر کوئی واقعہ تمہیں سنایا جائے تو ہرگز اسے قبول نہ کرو کیونکہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خدا کا قانون بدل جائے۔ مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ فیمسک التی قضی علیہا الموت کہ جس پر موت وارد ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس نفس کو روک لیتا ہے یعنی اس دنیا میں اسے وہ واپس نہیں بھیجتا۔ ایسا ہی دوسری جگہ فرماتا ہے حرامٌ علی قریۃٍ اھلکنٰھا انھم الیھم لا یرجعون یعنی جس بستی کے لوگوں کو ہم ہلاک کر دیتے ہیں ان پر حرام ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا کے لوگوں کی طرف واپس لوٹائے جائیں۔ اب یہ وہ سنت اللہ ہے جسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ

نے اپنے علم کامل سے خود بیان فرما دیا ہے۔ اس لئے اس ارشاد الٰہی کے بعد ہم کسی نبی یا ولی کا اس قسم کا کوئی معجزہ نہیں مان سکتے کہ اس نے کسی حقیقی مردے کو جس کی روح قبض ہو چکی تھی زندہ کر دیا۔ کیونکہ یہ سنت اللہ کے خلاف ہے اور خدا کا ارشاد ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کہ تو اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ پس اگر کسی نبی یا ولی کے معجزہ میں ہم کسی موتی کے احیاء کا ذکر پڑھیں گے تو وہاں حقیقی مردے کا زندہ ہو جانا معنے نہیں کر سکتے بلکہ اس کے دوسرے معنوں کی طرف رجوع کرینگے یعنی روحانی طور پر مردہ لوگوں میں نئی زندگی کی روح پھونکنا۔ یا کسی مصیبت میں مبتلا شخص کی تکلیف کا دور ہو جانا یا کسی کالمیت مریض کا شفا پا جانا۔ الغرض جس سنت اللہ کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ فقط وہ قوانین و عادات الٰہیہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل سے قرآن کریم میں ذکر فرما دیا ہے۔ اس سے مراد وہ قوانین قدرت نہیں ہیں جن کو انسان نظائر قدرت کے مشاہدات اور تجربات سے اخذ کرتا ہے۔ اور جس علم کو اصطلاح حکما میں نیچرل فلاسفی اور عرف عام میں سائنس کہتے ہیں۔ انسان کے محدود مشاہدات اور تجربات سے اخذ کردہ قوانین کا نام سنت اللہ رکھنا جہالت ہے کیونکہ انسان کا علم خدا کے علم کی طرح کامل نہیں بلکہ بلاشبہ ناقص اور محدود ہے۔ وہ کس قدر بھی غور اور خوض کے ساتھ مشاہدوں اور تجربوں کے بعد ایک قانون اخذ کرے اور وہ ممکن ہے کہ بالکل صحیح بھی ہو۔ تاہم یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس قانون کے ہر ایک پہلو پر حاوی ہو گیا ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ اس میں کچھ امور ایسے ہوں جو اس کی نظر سے مخفی رہ گئے ہوں۔ اس لئے ان قوانین قدرت کے خلاف جنہیں ہم سائنس کے ذریعہ دریافت کرتے ہیں اگر ہمیں کچھ سنایا جاوے گا تو ہم فوراً اس کا انکار اس بنا پر نہیں کر سکتے کہ وہ امر ہمارے مشاہدہ اور تجربہ سے اخذ کئے ہوئے قانون قدرت کے خلاف ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ اس قانون کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہ ہو سکا ہو۔ پس جو امر ہماری سمجھ اور مشاہدہ سے باہر ہو اس پر فوراً یہ فتویٰ لگا دینا کہ یہ سنت اللہ کے خلاف ہے نہایت درجہ کی جہالت ہے جس حالت میں کہ خدا کی مخلوق اور اس کی عجائبات اور اس کی قدرت کے قوانین پر انسان کی محدود عقل اور اس کا ناقص علم حاوی نہیں تو پھر ہمارا اصول یہ ہونا چاہئے کہ ہر ایک نئی بات جو ظہور میں آوے اُسے اپنی عقل سے بالاتر اور اپنے علم کے مخالف دیکھ کر فوراً ہی رد نہ کر دیں بلکہ خوب متوجہ ہو کر اس کے ثبوت یا عدم ثبوت کا حال جانچیں۔ اگر وہ ثابت ہو جائے تو اپنے دریافت کردہ قوانین قدرت کی فہرست میں اس کو بھی داخل کر لیں۔ اور اگر وہ ثابت نہ ہو تو صرف اتنا کہہ دیں کہ "ثابت نہیں"۔ مگر اس بات کے کہنے کے ہم پھر بھی مجاز نہ ہوں گے کہ وہ امر

سنت اللہ کے خلاف ہے کیونکہ سنت اللہ کے مطابق یا مخالف کسی چیز کو سمجھنے کیلئے
ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دائرہ کی طرح خدا تعالےٰ کے تمام قوانین ازلی
ابدی پر محیط ہو جائیں۔ اور بخوبی ہمارا فکر اس بات پر احاطہ تام کرے کہ خدا تعالےٰ نے
روز ازل سے آج تک کیا کیا قدرتیں ظاہر کیں اور آئندہ اپنے ابدی زمانہ میں کیا کیا
قدرتیں ظاہر کرے گا۔ اور کیا وہ جدید در جدید قدرتوں کے ظاہر کرنے پر بھی قادر ہو گا یا کولھو کے بیل کی
طرح انہی چند قدرتوں میں مقید اور محصور رہے گا جن کو ہم دیکھ چکے ہیں۔ اور اگر انہی میں مقید اور محصور
رہے گا تو باوجود اس کی غیر محدود الوہیت اور قدرت اور طاقت کے یہ مقید اور محصور ہونا کس وجہ سے
ہو گا۔ کیا وہ آپ ہی وسیع قدرتوں کے دکھلانے سے عاجز آ گیا یا کسی دوسرے قاسر نے اس پر جبر
کر کے اسے مزید قدرتوں کے ظہور سے بند کر دیا۔ پھر ایک بڑا بھاری نقص یہ پیدا ہو گا کہ وہ ان
قدرتوں کے محدود ہو جانے سے خود بھی محدود ہو جائے گا۔ الغرض انسان کی یہ قدرت ہی نہیں
کہ وہ ایک محدود زمانہ کے محدود تجارب سے خدا کی سنت پر پوری طرح حاوی ہو جاوے۔ اور اپنے
محدود تجارب پر خدا تعالیٰ کے غیر متناہی سلسلۂ قدرت کو ختم سمجھے۔ اور آئندہ کیلئے نئے اسرار
کھلنے سے ناامید ہو جائے۔ عقلمندی تو یہ ہے کہ سائنس کے دریافت کردہ قوانین قدرت کو ہمیشہ
عجائبات جدید الظہور کا تابع رکھا جائے۔ نہ یہ کہ جو عجائبات خواص عالم نئے نئے کھلتے جائیں ان
کو باوجود ثبوت کے اس وجہ سے رد کر دیں کہ جو کچھ آج تک ہمیں معلوم ہے یہ اس سے زائد
امر ہے۔ اس سے تو تمام ترقیات سائنس رک جائیں گی اور اگر اس پر اہل سائنس کا عمل ہوتا تو
سائنس ہرگز اسقدر ترقی نہ کرتی۔ پس اس سے زیادہ بے سمجھی اور نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ
اپنے چند روزہ اور محدود اور مشتبہ تجربہ کو خدا تعالیٰ کا مکمل قانون قدرت یعنی سنت اللہ
خیال کر لیا جائے۔ اور پھر آئندہ جو اسرار کھلتے جائیں ان کو اس بنا پر خلاف سنت اللہ سمجھ
لیں کہ وہ ہمارے معلومات سابقہ سے زیادہ ہیں۔

معجزہ بجائے خود سنت اللہ ہے

اسی سلسلہ میں حضرت اقدس مرزا صاحب نے جو کچھ معجزات کے متعلق تحریر فرمایا
اور نیچریوں اور معتزلیوں کا جس طریق پر رد کیا ہے وہ تو بہت مبسوط ہے۔ مگر میں
یہاں نہایت اختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ بطور نمونہ عرض کرتا ہوں:۔

سب سے پہلے یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ معجزہ کسی سنت اللہ کے توڑنے کا نام نہیں جیسا کہ
عام خیال ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معجزہ بجائے خود ایک سنت اللہ ہے جس کا ظہور برگزیدگان الٰہی

اور انبیاء کے ساتھ ان کے منجانب اللہ ہونے پر بطور نشان کے ہوا کرتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یا عادات جو بنی آدم سے تعلق رکھتی ہیں دو طور کی ہیں۔ ایک عادات عامہ جو اسباب کے پردہ میں مستور ہو کر سب پر مؤثر ہوتی ہیں۔ دوسری عادات خاصہ جو توسط اسباب اور بلا توسط اسباب خاص ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں جو اس کی محبت اور رضا میں کھوئے جاتے ہیں یعنی جب انسان بکلی خدا تعالیٰ کی طرف انقطاع کر کے اپنی عادت بشریہ کو رضائے حق کے حصول کے لئے تبدیل کر دیتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اس کی اس تبدیل شدہ حالت کے موافق اس کے ساتھ ایک خاص معاملہ کرتا ہے جو دوسروں سے نہیں کرتا۔ اُسے خارق عادت کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سنت اللہ یعنی عادت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مطلب فقط اسقدر ہے کہ وہ عادت عامہ الٰہیہ کے خلاف ہے۔ ہم عالم ظاہر میں بھی یہی قانون دیکھتے ہیں۔ دو شخص جیسے جیسے دوستی اور محبت اور اخلاص میں بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے دونو طرف سے آپس کے معاملات میں خصوصیات بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ گویا ہر ایک دوست اپنے دوست کے ساتھ عوام الناس کی نسبت معاملہ خارق عادت رکھتا ہے۔ پس خوارق کی کل جس سے عجائبات قدرتیہ یعنی عادات خاصہ الٰہیہ حرکت میں آتی ہیں وہ انسان کی تبدیل یافتہ روح ہے۔ جب اس میں تبدیلی اپنے کمال پر پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ اپنے آثار نمایاں طور پر دکھلانے لگتی ہے۔ اور بعض دفعہ عشق الٰہی کے پُرزور جذبات اور صدق اور یقین کی سخت کوششیں ایسے مقام پر انسان کو پہنچا دیتی ہیں کہ اس عجیب حالت میں اگر وہ آگ میں ڈالا جائے تو آگ اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتی۔ اگر وہ شیروں اور بھیڑیوں اور ریچھوں کے آگے پھینک دیا جائے تو وہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ اس وقت وہ صدق اور عشق کے کامل اور قوی تجلیات سے بشریت کے خواص کو پھاڑ کر کچھ اور ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح لوہے کے ظاہر و باطن پر آگ مستولی ہو کر اس کو اپنے رنگ میں لے آتی ہے اسی طرح یہ بھی آتش محبت الٰہی کے ایک سخت استیلا اور غلبہ کی وجہ سے کچھ کچھ اس طاقت عظمیٰ کے خواص ظاہر کرنے لگتا ہے جو اس پر محیط ہو گئی ہے۔ سو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ وہ عبودیت پر ربوبیت کا کامل اثر پڑنے سے اس سے ایسے خوارق ظاہر ہوں جو عادت عامہ الٰہیہ سے بالاتر ہیں نظر آئیں۔ بلکہ تعجب تو تب ہونا چاہئے کہ اگر ایسے اثر کے بعد بھی عبودیت کی معمولی حالت میں کچھ فرق پیدا نہ ہو۔ کیونکہ اگر لوہا آگ میں تپانے سے کسی قدر خاصہ آگ کا ظاہر کرنے لگے تو یہ امر سراسر مطابق قانون قدرت ہے لیکن اگر سخت تپانے کے بعد اسی پہلی حالت پر رہے اور اصلی خاصیت جدید اس میں پیدا نہ ہو تو یہ

عند العقل صریح باطل ہے پس معجزہ بجائے خود ایک سنت الٰہی ہے جس کا ظہور برگزیدگان الٰہی کے ساتھ عادات خاصہ الٰہیہ کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور اس کا ظہور اس وقت بالخصوص ضروری ہوتا ہے جب ایک برگزیدہ انسان منصب نبوت یا ماموریت پر فائز المرام ہوتا ہے۔ اندراں حالت اللہ تعالیٰ اپنے اوپر لازم پکڑ لیتا ہے کہ اس بندہ کی تائید میں ایسے نشانات ظاہر فرمائے جس سے اس کے منجانب اللہ ہونے اور اس کی وحی اور کتاب کے خدا کے کلام ہونے پر عوام کی نظر میں بھی مہر تصدیق ثبت ہو جائے۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی علیم اور قدیر صفات کے ماتحت اپنے علم کامل سے اُس بندہ پر ایسے امور غیبیہ اور اسرار لدنیہ کا اظہار فرماتا اور اپنی قدرت کاملہ سے ایسی نصرتوں اور تائیدات الٰہیہ کے نظارے دکھاتا ہے اور وہ اپنے اندر ایسے امتیازات خصوصی رکھتے ہیں کہ انسان کا علم اس کی مثل لانے اور انسان کی طاقت اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آجاتی ہے۔

اس کو اصطلاح اسلام میں **معجزہ** اور قرآن کی زبان میں **آیت اللہ** کہتے ہیں۔

دیدار الٰہی کے متعلق عقیدہ معتزلہ دیدار الٰہی کے قائل نہیں۔ اشاعرہ وحنابلہ وغیرہ دیدار الٰہی کے قائل ہیں حضرت اقدس مرزا صاحب بھی دیدار الٰہی کے قائل تھے۔ معتزلہ کا سب سے بڑا فلسفیانہ اعتراض یہ ہے کہ جو چیز نظر نہیں آتی وہ کیسے نظر آسکتی ہے۔ اگر نظر آسکنا ممکن ہے تو اب کیوں نظر نہیں آتی۔ یہ اعتراض کسی پہلے زمانہ میں کوئی قدر و قیمت رکھتا ہو تو رکھتا ہو آجکل تو یہ اعتراض جہالت پر مبنی سمجھا جائے گا۔ ہر ایک چیز کے نظر آنے کے لئے روشنی کی مختلف شعاعوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم کے اندر یا ایک صندوق کے اندر کی چیزیں ہمیں نظر نہیں آتیں لیکن ایکس رے کی شعاعوں کے ساتھ وہی چیزیں صاف طور پر نظر آنے لگتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھنے کے لئے ایک خاص روشنی کی ضرورت ہے جو نور ایمان و عمل سے پیدا ہوتی ہے اور جس کے ساتھ قلب کی آنکھ عالم باطن یا عالم روحانیات کا نظارہ کرتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ انسان کے تمام حواس کا مرکز اس کا قلب ہے۔ یعنی دیکھنے، سُننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے وغیرہ جملہ حواس کے مرکز انسان کے قلب میں ہیں۔ جسمانی آنکھ اور کان اور ناک اور زبان اور چمڑا محض ذرائع ہیں جن سے مختلف چیزوں کے احساسات عالم ظاہر سے قلب کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لئے جب تک قلب متوجہ نہ ہو اور اس کی آنکھ نظارہ نہ کرے ظاہری آنکھ کچھ بھی نہیں دیکھتی جب تک قلب کا کان نہ سُنے۔ انسان کا ظاہری کان کچھ نہیں سُنتا۔ اسی لئے بعض دفعہ اگر قلب کسی اور طرف متوجہ ہو تو سامنے سے کوئی شخص گزر جاتا ہے اور دیکھنے والا اُسے نہیں دیکھتا اور پاس بیٹھے ہوئے لوگ باتیں کر رہے ہوں اور سننے والا کچھ نہیں سُنتا کیونکہ

اصل مرکز نے اُس نظارہ یا آواز کو محسوس نہیں کیا۔ اگرچہ ذرائع حواس نے ان احساسات کو قلب کی طرف منتقل کیا مگر قلب نے انہیں لیا نہیں۔ اس لئے نہ کچھ دیکھا نہ کچھ سُنا۔ پس تمام حواس کا اصل مرکز قلب ہے۔ یہ جسمانی کان اور آنکھ وغیرہ ظاہری مادی دنیا سے احساسات کو قلب کی طرف منتقل کرنے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن جو نظارے یا آوازیں عالم روحانیات یعنی عالم باطن کی ہوتی ہیں انہیں دیکھنے یا سننے کے لئے قلب کو ان ظاہری ذرائع حواس کی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ براہ راست قلب پر اثر انداز ہوتی ہیں اسی لئے رویا و کشوف کے نظارے اور وحی و الہام کی آوازیں براہ راست قلب کی آنکھ اور کان سنتے ہیں اس کیلئے ظاہری آنکھ اور کان کی حاجت نہیں کیونکہ یہ تو فقط عالم مادی کے نظاروں اور آوازوں کو قلب تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔ عالم روحانیات یا باطن کی آوازوں اور نظاروں کو قلب تک پہنچانے کے لئے ان کی کوئی حاجت نہیں۔ وہاں ذرائع رُوحانی ہیں جو ملائکہ کہلاتے ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ مشکل یہ ہے کہ مادی فلسفہ کسی روحانیت کا قائل نہیں۔ وہ یہ مانتا ہے کہ عدم علم سے کسی شے کا عدم لازم نہیں آتا۔ لیکن کس قدر تعجب ہو کہ رُوحانیت کا علم نہ رکھتے ہوئے پھر بھی اس کے تکبر نے اُسے رُوحانیت کا منکر بنا رکھا ہے۔ وہ روحانیت کے نام کو حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور کبھی اس کی تحقیقات کی طرف توجہ نہیں کرتا یہی وہ تکبر ہے جو اچھے اچھوں کو حق کا منکر بنائے رکھتا ہے۔ روحانیت کا علم بردار انبیاء اور اولیاء کاملین کا گروہ ہے مذہب کی بنا ہی روحانیت پر ہے اور معتزلہ کا روحانیت سے الگ ہو کر مادی فلسفہ پر مذہب کو ڈھالنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ مذہب دنیا کو ایک حقیقت سکھاتا ہے کہ اس کائنات میں فقط عالم مادی ہی کا وجود نہیں بلکہ اس کے ساتھ عالم روحانیت کا بھی وجود ہے جو اس ظاہر کے ساتھ بطور باطن کے ہے اور دو تو ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ ہیں کہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ دو خطوط کی طرح ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی چل رہے ہیں تو بالکل درست ہے۔ اسی لئے عالم روحانیت کو سمجھانے کے لئے ہم عالم مادی ظاہری سے استدلال کریں تو درست ٹھہرتا ہے۔ جیسا کہ اکثر قرآن کریم کا قاعدہ ہے حضرت مرزا صاحب کا اس مادہ پرستی کے زمانہ میں بہت اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ مادی فلسفہ سے قطعاً مرعوب نہ ہوئے اور منہاج نبوت پر قدم مارتے ہوئے عالم روحانیت کو بڑے زور سے اہل دنیا کے سامنے پیش کیا اور بتایا کہ یہ کوئی فلسفہ یا خوش عقیدگی کے رنگ میں عقیدہ نہیں ہے بلکہ میں اس میں صاحب تجربہ ہوں۔ اور جو کچھ کہتا ہوں مشاہدہ اور تجربہ کے بعد کہتا ہوں۔ گویا آپ نے روحانیت کو ایک سائنس کے رنگ میں پیش کیا اور بڑے دھڑلے سے پیش کیا اور دعوت

عام دی کہ جس کسی کو تحقیق حق منظور ہے میرے پاس آئے اور میرے پاس رہ کر روحانیت کی چیزوں کا مشاہدہ اور تجربہ کرے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جو آپ کے پاس گئے اُن پر روحانی عالم کے دروازے کھولے گئے اور ان کے اپنے مشاہدوں اور تجربوں نے انہیں بھی یقین کے مرتبہ پر پہنچا دیا اور اُن سے اسلام کیلئے وہ قربانیاں کروا دیں جو جب تک کہ عالم روحانیت پر یقین نہ ہو انسان کر نہیں سکتا۔

ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن میں ہے۔ ولا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (الانعام) کہ انسان کی نظریں اس کو درک نہیں کر سکتیں۔ البتہ وہ اس کی نظروں کو درک کرتا ہے۔ یہاں اول تو مراد ظاہری آنکھ کی نظر ہے اور اگر باطنی آنکھ کی نظریں بھی مراد لی جائیں تو درک کے معنی یہاں یہی ہو سکتے ہیں کہ اسے پوری طرح محسوس اور معلوم کر لینا اور یہ سچ ہے کہ ایک محدود نظر غیر محدود ہستی پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ ایک پہاڑ کی عظمت کے سامنے وہ خیرہ ہو کر رہ جاتی ہے اور پوری طرح اس پر حاوی نہیں ہوتی۔ آفتاب کی چمک کے سامنے وہ عاجز آجاتی ہے اور اس کو نظر جما کر نہیں دیکھ سکتی تو خدا کی عظمت وشان اور اس کی تجلی کو پوری طرح پالینا اور برداشت کر لینا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ دیکھنے میں کسی چیز پر پوری طرح حاوی نہ ہونا اور بات ہے اس کا سرے سے نظر ہی نہ آنا اور بات ہے۔ آنحضرت صلعم کو معراج میں جو دیدار الٰہی کا شرف حاصل ہوا اس کے متعلق قرآن کریم میں صاف لفظوں میں ذکر ہے کہ ما زاغ البصر وما طغیٰ (النجم) یعنی آپ کے قلب کی آنکھ جمال الٰہی کو برداشت کر گئی اور ٹیڑھی بھی نہ ہوئی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ دیدار الٰہی کے وقت خدائی تجلی کی شوکت سے بیہوش ہو کر گر گئے تھے جس سے آنحضرت صلعم کی استعداد روحانی کی بلندی کا پتہ لگتا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کی وجہ سے جو غیر محدود ہے انسان کی (جو ایک محدود مخلوق ہے) نظر دیدار کے وقت جمال الٰہی پر پوری طرح حاوی نہ ہو یہ اور بات ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ دیدار الٰہی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک عارف کی قلب کی آنکھ اس کائنات میں خدا کا جلوہ چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ میں دیکھتی ہے مگر وہ اس کی معرفت پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ تو حضرت محمد رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ما عرفناک حق معرفتک۔ کہ جو تیری معرفت کا حق ہے وہ میں نے بھی نہیں پہچانا۔ تو اس کے یہ معنے تو نہیں کہ خدا کو عارف باللہ کی آنکھ نہیں دیکھتی۔ نہیں۔ دیکھتی تو ضرور ہے مگر اس پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح عالم روحانیت میں جمال جو باطنی امر ایک ظاہر اور متمثل شکل میں نظر آتا ہے اُسی عارف کی آنکھ اس جلوہ الٰہی کو ظاہر میں دیکھے گی۔ ہاں اس پر حاوی نہ اب ہوئی نہ آئندہ ہو گی۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ۔ جو شخص اس دنیا میں

اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ یعنی جس آنکھ نے اس کائنات میں خدا کا جلوہ نہ دیکھا وہ آخرت میں بھی اس جلوہ سے محروم ہوگی اور دیدار الٰہی سے بے نصیب ہوگی۔ مگر عارف اس سے کیوں بے نصیب ہو۔

ملائکہ کے متعلق عقیدہ معتزلہ اور نیچری ملائکہ کا خارج میں کوئی وجود نہیں مانتے بلکہ قدرت کی مختلف قوتوں کو ہی ملائکہ کا نام دیتے ہیں حالانکہ یہ صریح قرآن کریم اور تمام انبیاء و اولیاء کے مشاہدات اور تجربات کے خلاف ہے۔ لیکن مادی فلسفہ کی غلامی روحانی ہستیوں کے منوانے میں زبردست روک بن جایا کرتی ہے۔ وہی یہاں بھی ہوا۔ حضرت اقدس مرزا صاحب ملائکہ کے خارجی روحانی وجود کے قائل تھے آپ نے دلائل فلسفیانہ سے ملائکہ کو ثابت کرنے کے لئے جو کچھ اپنی تصنیفات میں تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یہ ہے:۔

ملائکہ وہ نورانی اور روحانی ہستیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے افعال کے ظہور کے وقت بطور وسائط کام کرتی ہیں۔ عام اصطلاح کے ماتحت یہ دو اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک سفلی اور دوسرے علوی۔" (۱) سفلی ملائکہ وہ ہیں جن کا تعلق عالم مادی سے ہے (۲) اور علوی ملائکہ وہ ہیں جن کا تعلق عالم روحانیت سے ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے افعال کو اس عالم ظاہر میں ہم قدرت کے قوانین اور حوادثات اور اشیاء کے خواص کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ پس دنیا کی ہر ایک قوت جو کام کر رہی ہے اور ہر ایک ذرہ جو اپنے خواص کو ظاہر کر رہا ہے اور ہر ایک تقدیری امر جو رونما ہو رہا ہے اس کا اصل خالق اور حقیقی مسبب تو جناب الٰہی کی ذات ہے خواہ درمیان میں کتنے ہی اسباب و وسائط کیوں نہ موجود ہوں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ وراء الوراء اور تمام علائق مادی سے منزہ اور مقدس ہے اس لئے افعال الٰہیہ کے ظہور کے وقت مادی اسباب کے سلسلہ اور اپنی مسبب حقیقی ذات کے درمیان جناب الٰہی ہمیشہ ایک سبب روحانی و باطنی ضرور رکھتے ہیں جسے ملک یا فرشتہ کہتے ہیں۔ جیسے ایک شخص جو تصویر بناتا ہے وہ اس امر کیلئے کہ اس کا پاکیزہ ہاتھ سیاہی یا رنگ سے آلودہ نہ ہو۔ ایک قلم ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس سے وہ تصویر بناتا ہے۔ بنانے والا دراصل مصور خود ہوتا ہے وہ قلم کو فقط اس لئے ہاتھ میں لے لیتا ہے تا اس کا ہاتھ سیاہی اور رنگ سے آلودہ نہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مقدس منزہ ذات جب عالم اسباب مادی کو خلق کرتی اور اس میں تصرفات کرتی ہے تو اپنے تنزہ اور تقدس کے

تقاضہ سے جن ذرائع باطنی رُوحانی کو استعمال کرتی ہے انہی کا نام ملائکہ ہے۔ یہ وہ نورانی روحانی ہستیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کے ماتحت اس کے افعال کو معرض ظہور میں لاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو ظہور میں لانے کے لئے وہ عالم مادی کی ہر ایک قوت اور ہر ایک ذرہ سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور اس کی مشیت کے ماتحت بالکل اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح ایک مصوّر کے ہاتھ میں قلم کام کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہ کچھ کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں بعض مشرکین عرب زمانۂ جاہلیت میں انہیں دیویاں بنا کر پرستش کرتے تھے۔ اور آج بھی اکثر ہندو انہیں دیوتا بنا کر پوجتے ہیں مگر یہ سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ ان سے مدد مانگنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شخص بجائے مصوّر سے سوال کرنے کے اس کی قلم سے سوال کرے کہ میری تصویر اچھی بنا دو۔ الغرض ملائکہ اسباب ظاہری کے ہر سلسلہ کے ابتدا میں سبب باطنی ہوتے ہیں جن کا ایک طرف تو تعلق خدا سے ہوتا ہے اور دوسری طرف عالم مادی سے۔ وہ عالم ظاہر کی ہر ایک قوت اور ہر ایک ذرّہ کے خواص کے لئے بمنزلہ رُوح کے ہوتے ہیں اور جناب الٰہی کی مشیت کے ماتحت اس تمام کائنات کی مشینری کو چلاتے ہیں۔ عرف عام میں انہی ملائکہ کو سفلی ملائکہ کہا جاتا ہے۔

(۲) جو ملائکہ باطنی و روحانی عالم میں مشیت الٰہی کے ماتحت افعال الٰہیہ کو ظہور میں لاتے ہیں۔ وہ عرف عام میں علوی ملائکہ کہلاتے ہیں۔ عالم رُوحانی میں اگرچہ مادہ کی ظلمت تو موجود نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال اور حکومت وسطوت اس امر کی متقاضی ہے کہ احکام الٰہیہ کی تعمیل اس عالم میں بھی خدام رُوحانی کے ذریعہ ہو۔ انسان کے قلب پر نیکیوں کی تحریک کرنیوالے اور نبیوں اور ولیوں کی طرف وحی الٰہی پہنچانیوالے بھی علوی ملائکہ ہوتے ہیں کیونکہ نیکیوں کی تحریکات اور وحی الٰہی کا تعلق عالم باطن اور ملاء اعلیٰ سے ہے نہ کہ زمین اور مادی دنیا سے۔

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان وسائط کی محتاج نہیں یہ وسائط و اسباب بھی تو اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ البتہ اس نے اس تمام کائنات کا سلسلہ چونکہ اسباب کے ماتحت چلایا ہے اور اسباب کے پردوں میں اپنی ذات کو مخفی رکھ کر انسان کو موقعہ دیا ہے کہ وہ اس کو پانے کے لئے جدوجہد کرے تا اس طرح وہ ان تمام کمالات رُوحانی و اخلاقی کو حاصل کر سکے جو انسان کے پیدا کرنے کی غرض وغایت ہے۔ اسلئے (۱) ایک تو اس کی ذات کا تنزیہ اور تقدس اس امر کا متقاضی تھا کہ اسباب مادی کی ظلمت اور اس کی ذات مقدس کے درمیان ایک سبب نورانی روحانی بھی ہو جس کو مَلَک کہتے ہیں (۲) دوسرے

اس کی حکومت اور عظمت بجائے خود اس امر کی متقاضی تھی کہ اس کے احکام کی بذریعہ خدام تعمیل ہو۔ یعنی افعال الٰہیہ کے لئے خدام کے وجود کی اسے حاجت نہیں۔ فقط حکومت و جلالت شان کا تقاضہ ہے کہ ایسا ہو۔

تقدیر۔ دُکھ اور سُکھ کے متعلق عقیدہ

ہر ایک عقلمند جانتا ہے کہ دنیا کی تمام ترقی و ارتقا اور پیدائش و نشو و نما اختلاف پر مبنی ہے۔ انسان کی ترقی اعمال صالحہ سے وابستہ ہے۔ اور اعمال ظہور میں نہیں آسکتے اگر اختلاف نہ ہو۔ انسان کے جنس اور مراتب اور حالات و طبائع میں اگر اختلافات نہ ہوتے تو دنیا ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ مثلاً مرد و عورت بڑے اور چھوٹے۔ امیر اور غریب۔ دکھی اور سکھی وغیرہ وغیرہ کے اختلافات نہ ہوں تو نہ نسل انسانی باقی رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کسی کے کام آسکتا ہے پس اعمال ہی مفقود ہو گئے جن سے تمام ترقیات دنیوی و اخروی وابستہ ہیں۔ لہذا دنیا میں اختلافات کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ جس طرح یہ ضروری ہے کہ مختلف انسانوں کی شکلیں مختلف ہوں تاکہ دنیا کا کام چل سکے۔ اور ایک آدمی کی شخصیت پر دوسرے کا دھوکا نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف انسانوں کی اندرونی شکلیں یعنی طبائع بھی مختلف ہوں۔ تاکہ ان کا دائرۂ عمل مختلف ہو اور وہ اس طرح ایک دوسرے کے کام آسکیں۔ اگر سب امیر ہوتے یا سب فقیر ہوتے یا سب بڑھئی ہوتے یا سب لوہار ہوتے یا سب کاشتکاری کو ہی پسند کرتے تو مختلف پیشے جو انسان کے لئے کس قدر مفید اور ضروری ہیں ظہور میں نہ آتے۔ اور دنیا میں جو ترقیاں آج ہو رہی ہیں وہ کبھی نہ ہوتیں۔ اسی طرح ان اختلافات کی وجہ سے ہی انسان کے مختلف جذبات اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں اور وہ اخلاق ظہور میں آتے ہیں جن پر انسانیت کی بنا ہے اور جو انسان کی روحانی اور اخروی ترقی کیلئے ازبس ضروری ہیں۔ اگر غربت اور دکھ نہ ہوتا تو انسان میں صبر اور محنت۔ جفاکشی اور سعی حلم اور تحمل وغیرہ کے اخلاق کہاں سے پیدا ہوتے۔ اگر امارت اور سکھ نہ ہوتا تو انسان میں شکر گزاری اور فیاضی، ہمدردی اور سخاوت وغیرہ کے اخلاق کہاں سے پیدا ہوتے۔ پس حضرت مرزا صاحب کے نزدیک سکھ اور دکھ خدا کی طرف سے دو طریقے انسانوں کے امتحان کے ہیں جن کے ذریعہ انسان کے اخلاق کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ بعض دفعہ دکھ انسان کے اپنے ہاتھوں اپنے اعمال کی سزا کے طور پر بھی آتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم کہ تمہیں مصیبت نہیں پہنچی مگر جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا۔ مگر دنیا میں بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بطور امتحان اور ابتلا کے انسان پر دکھ اور مصیبت آتی ہے تاکہ اس کے

اخلاق کا امتحان ہو۔ اور اس مصیبت میں پڑ کر اس کے جذبات کا صحیح نشو و نما اخلاق فاضلہ کی شکل میں ہو۔ اس کا تکبر اور غفلت ٹوٹ کر اس میں صبر اور تحمّل۔ محنت اور جفاکشی۔ شجاعت اور توکل کے اخلاق فاضلہ ترقی کریں جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے:۔ لنبلونکم بشیءٍ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات ط وبشر الصابرین (البقرہ) بے شک ہم تمہیں آزمائیں گے خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور صبر کرنیوالوں کو خوش خبری سنا دو۔ گویا وہ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح بعض دفعہ سکھ اور خوشحالی سے انسان کو آزمایا اور اسے امتحان میں ڈالا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ انا جعلنا ما علیہا زینۃً لھا لنبلوھم ایھم احسن عملاً ۹ (الکھف) کہ ہم نے زمین پر جو زیب و زینت اور عیش و تنعم کے سامان بنائے ہیں وہ اس لئے ہیں تا کہ ہم ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ پس سکھ بھی اس لئے آتا ہے کہ انسان کے دوسری قسم کے اخلاق مثلاً خدا کی نعمتوں کی شکر گزاری مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی۔ سخاوت اور فیاضی وغیرہ کے اخلاق ترقی کریں۔ پس دونو قسم کی حالتیں یعنی دکھ اور سکھ خدا کی تقدیر کے ماتحت انسان پر آتے ہیں تا انسان کے مختلف اخلاق ترقی پذیر ہوں۔

ہاں یہ بھی سچ ہے کہ لوگ دُکھ اور سُکھ میں طرح طرح کی بداعمالیوں کے بھی مرتکب ہو جاتے ہیں۔ افلاس اور دکھ میں بددیانتی اور چوری اور مکاری اور جھوٹ اور شکوہ و شکایت کے اور امارت اور سکھ میں تکبر اور غفلت۔ بدچلنی اور عیاشیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنے اعمال میں مجبور نہیں امتحان اور آزمائش کے معنے ہی یہ ہیں کہ یہ انسان کا اپنا فعل ہے کہ جو راہ وہ چاہے اختیار کرے۔ متکلمین اسلام میں ایک وہ گروہ ہے جو انسان کو اپنے افعال میں مجبور خیال کرتا ہے۔ یہ جبریہ کہلاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو انسان کو اپنے ہر ایک معاملہ میں با اختیار سمجھتے ہیں یہ قدریہ کہلاتے ہیں لیکن حضرت مرزا صاحب کا فیصلہ اہل سنت کے مذہب کے حق میں ہے کہ لاجبر ولا اختیار یعنی انسان نہ اپنے ہر فعل میں مجبور ہے اور نہ ہر رنگ کا اُسے اختیار حاصل ہے۔ خود انسان کے اندر دونو باتیں نظر آتی ہیں۔ انسان کو جو قویٰ خدا نے عطا کئے ہیں ان میں سے بعض انسان کے مقدرت میں ہیں اور بعض نہیں۔ مثلاً انسان کے جسم میں مختلف اعضا کام کر رہے ہیں۔ دل حرکت کر رہا ہے۔ معدہ کام کر رہا ہے۔ خون رگوں میں دوڑ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں میں انسان کا کوئی دخل نہیں۔ لیکن بعض اعضا ایسے ہیں جن کے افعال انسان کی مقدرت کے اندر ہیں۔ مثلاً آنکھوں سے دیکھنا یا نہ دیکھنا۔ کانوں سے سُننا یا نہ سُننا۔ ہاتھ سے کوئی کام کرنا یا نہ کرنا۔ زبان سے بولنا وغیرہ وغیرہ۔ بعض دفعہ

ایک ہی عضو کے دو فعل ہوتے ہیں ایک میں انسان مجبور ہوتا ہے۔ دوسرا اس کی مقدرت کے اندر ہوتا ہے۔ مثلاً زبان سے چکھتے ہیں جو ذائقہ اسے محسوس ہوگا اس میں وہ مجبور ہے۔ زبان کھٹے کو کھٹا اور میٹھے کو میٹھا ہی کہے گی۔ وہ کھٹے کو میٹھا اور میٹھے کو کھٹا نہیں بتا سکتی۔ لیکن زبان سے بولنا انسان کی مقدرت اور وسعت کے اندر ہے۔ خواہ وہ زبان سے بولے یا نہ بولے۔ سچ بولے یا جھوٹ بولے اللہ نے انسان کو شریعت کے اوامر و نواہی میں وہیں تک مکلّف کیا ہے جہاں تک اس کی مقدرت اور وسعت کے اندر ہے جیسا کہ فرمایا۔ لا یکلّف اللہ نفسًا الّا وسعہا۔ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مکلّف نہیں کرتا مگر وہیں تک جہاں تک اس کی وسعت و مقدرت ہے۔ پس اسی حصہ میں انسان اپنے افعال و اقوال کا ذمہ دار اور خدا کے سامنے جوابدہ ہے جو حصہ انسان کی وسعت اور مقدرت کے اندر ہے جو اس سے باہر ہے۔ اس میں انسان خدا کے حضور بازپرس کے نیچے نہیں۔

خیر اور شر بعض حکماء نے یہ بحث اٹھائی ہے کہ خیر اور شر کیا ہے۔ اور ان میں سے خدا نے کیا پیدا کیا اور کیا نہیں پیدا کیا حضرت مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ خدا کی صفت الحکیم نے جو کچھ پیدا کیا وہ حکمت کیلئے پیدا کیا اور اس کائنات میں ہر چیز کا وجود ضرور ہے کہ اپنی جگہ نافع اور کوئی مقصد رکھتا ہو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت صاف نظر آتی ہے کہ اس کائنات میں ہر چیز کا وجود اسی وقت مفید اور نفع رساں ہوتا ہے جب وہ اپنی حد کے اندر ہو۔ جو چیز حد سے گزر جائے وہ بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جاتی ہے مثلاً غذا انسان کے لئے کس قدر ضروری اور مفید چیز ہے۔ لیکن ایک حد کے اندر۔ اگر حد سے زیادہ کھایا جائے تو بدہضمی ہو کر علالت اور ہلاکت پیدا کر دے گی۔ پانی کس قدر نافع اور انسان کیلئے موجب زندگی ہے لیکن اگر حد سے زیادہ پی لیا جائے تو نقصان دے جائے گا۔ ہوا اور بارش کس قدر مفید چیز ہے لیکن اگر حد سے زیادہ بڑھ جائے تو سیلاب اور طوفان بن کر فنا کر دیگی۔ آگ کس قدر مفید ہے مگر حد سے بڑھی ہوئی شہروں کو خاکستر کر دے گی۔ اسی طرح بظاہر نقصان رساں چیزیں اسی لئے مضر نظر آتی ہیں کہ ان کا استعمال حد سے زیادہ ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اگر وہ حد کے اندر رہیں تو بجائے خود نہایت مفید ہیں۔ مثلاً سنکھیا جو کھا لیتا ہے مر جاتا ہے۔ مگر جب وہی سنکھیا ایک حد کے اندر استعمال کیا جاتا ہے تو نہایت مقوی اور خون کو صاف کرنیوالا اور تازہ خون پیدا کرنے والا ثابت ہوتا۔ شہد کی مکھی کا زہر، سانپ کا زہر چونکہ ہمارے سامنے حد سے گزری ہوئی صورت میں آتا ہے۔ اس لئے نقصان رساں نظر آتا ہے۔ لیکن ایک ڈاکٹر جانتا ہے کہ ایک حد کے اندر یہ تمام زہر وجع المفاصل اور مختلف دردوں میں بیحد مفید ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر مختلف جذبات ہیں۔

جب وہ اپنی حد کے اندر کام کرتے ہیں تو وہی اخلاق فاضلہ اور اعمال حسنہ کہلاتے ہیں۔ اور جب وہ حد سے گزر جائیں تو انہی کو اعمال سیئہ کہتے ہیں۔ مثلاً حرص کا جذبہ انسان میں اگر نہ ہو تو انسان نہ مال کمائے نہ دنیا میں کوئی محنت اور ترقی کرے اور نہ آخرت کیلئے کسی عمل کی ضرورت سمجھے۔ پس جب جذبہ ایک حد کے اندر کام کرتا ہے تو انسان دینی و دنیوی ترقیوں کا موجب ٹھیرتا ہے۔ دنیا کا مال و عزت وجاہت۔ آخرت کا ثواب اسی جذبہ کے نیچے انسان حاصل کرتا ہے۔ اسی جذبہ کو حد کے اندر رکھنے سے انسان دیانت داری اور راستبازی محنت اور جفاکشی جیسے اعمال حسنہ کا مرتکب ہوتا ہے لیکن اگر یہ جذبہ حد کے اندر نہ رہے تو بد دیانتی ٹھگی، ڈکیتی، چوری، جھوٹ، خیانت، غبن وغیرہ تمام اعمال سیئہ کا انسان مرتکب ہوجائے گا۔ گویا خدا نے تو انسان کو یہ جذبہ اُسے ترقی دنیوی و اخروی کے لئے عطا فرمایا تھا۔ لیکن وہ تبھی مفید ہوسکتا تھا جب وہ ایک حد کے اندر اسے رکھتا ہے۔ حد سے گزر جانے سے وہ مضر ہوگیا۔ اسی طرح غصہ کی مثال لیلو۔ غصہ ایک جذبہ ہے جو اگر حد کے اندر رکھا جائے تو تو اس سے شجاعت، غیرت، دلیری و بہادری وغیرہ کے اعمال حسنہ صرزد ہوں گے۔ لیکن اگر یہ حد سے گزر جائے تو گالی گلوچ، مارپیٹ، قتل و غارت وغیرہ اعمال سیئہ پیدا ہو جائیں گے۔ گویا خدا نے تو یہ جذبہ انسان کے اندر اس لئے پیدا کیا تھا کہ اس سے انسان اعمال حسنہ کا مرتکب ہو کر کمالات دنیوی و اخروی کو حاصل کرے لیکن وہ تبھی مفید ہوسکتا تھا جب انسان اسے ایک حد کے اندر رکھتا اسی طرح تمام جذبات کا حال ہے۔ بلکہ تمام حواس اور قویٰ جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں وہاں بھی یہی قاعدہ چلتا ہے۔ مثلاً زبان سے بولنا اس کے لئے بھی ایک حد مقرر ہے۔ کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا۔ کیا بولنا مفید ہے اور کیا مضر ہے۔ ان سب کیلئے ایک حد مقرر ہے۔ ہاتھ سے کام کرنا کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ اس کے لئے بھی ایک حد مقرر ہے۔ قرآن کریم نے ان حدود کا نام جن کی پابندی سے ہی انسان اپنے تمام جذبات اور حواس اور قویٰ کا اپنے خالق کی منشا کے مطابق استعمال کرسکتا ہے۔ حدود اللہ نام رکھا ہے۔ ان کی پابندی کا نام خیر یا نیکی ہے۔ اور ان حدود کو توڑنے کا نام شر یا بدی ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے تلك حدود الله ومن يطع الله ورسوله يدخله جنٰت تجري من تحتها الانهار خٰلدين فيها وذلك الفوز العظيم ۰ ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله نارًا خالدًا فيها ولهم عذاب مهين (النساء) یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے اللہ اُسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ اس میں رہ پڑے گا۔ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول

کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی باندھی ہوئی حدود سے بڑھ جاتا ہے اللہ اُسے آگ میں داخل کریگا۔ وہ رہ پڑے گا اس میں۔ اور اس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ قرآن کریم نے آیت مذکورہ بالا میں بتلا دیا کہ حدود اللہ کی پابندی کا بدلہ جنت ہے یعنی وہ خیر ہے اور حدود اللہ کے توڑنے کا بدلہ جہنم ہے یعنی وہ شر ہے۔ اور حدود اللہ کی پابندی کا معیار اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ اور ان کی معصیت حدود اللہ کے توڑنے کا دوسرا نام ہے۔ اور سچ بھی یہی ہے کیونکہ جس خدا نے انسان کو جذبات قویٰ اور حواس عطا فرمائے ہیں اور ان کے لئے یہ قاعدہ بنایا کہ وہ ایک خاص حد کے اندر مفید اور نفع رساں ہو سکتے ہیں اور حد سے گزر جانے پر وہی مفید جذبات وغیرہ مضر ہو جاتے ہیں تو پھر اسی خدا کا یہ کام تھا جو ان تمام چیزوں کا خالق اور ان حدود کا بنانے والا ہے کہ اپنے علم کامل سے ان حدود اللہ کا صحیح صحیح اور پورا علم انسان کو عطا کرتا تا وہ ان حدود اللہ کی پابندی سے خیر کا مرتکب ہو کر دین اور دنیا میں ترقی کرے اور اس کمال کو حاصل کرے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے اور اس تنزل اور عذاب سے بچ جائے جو شر یعنی حدود اللہ کے توڑنے سے اس کے لازم حال ہوتا ہے۔ پس انہی حدود اللہ کے متعلق علم اور ہدایت جو وقتاً فوقتاً خدا نے انسان کو دی ہے کتاب اور رسالت کہلاتی ہے جس کی اطاعت میں حدود اللہ کی پابندی اور معصیت میں حدود اللہ کی شکست مضمر ہے۔

آدم اور شیطان کا مقابلہ اس ہدایت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے آدم سے یا آدم کے وجود میں کل نوع انسان سے کیا تھا۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرہ) کہ جب جب میری طرف سے ہدایت آئے (یہ انہی حدود اللہ کے متعلق ہدایت تھی) تو جو میری ہدایت کی اتباع کرے گا پس ان پر نہ تو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وعدہ اس لئے ہوا تھا کہ انسان کے اندر حرص، شہوت و محبت، غصہ وغیرہ کے جذبات حیوانی تو رکھے جانے ازبس ضروری تھے۔ تا کہ انسان ان کے ذریعہ اپنی روزی کمائے اور اپنی زندگی اور اپنی نسل کو قائم رکھے اور اپنی زندگی اور نسل کو ان کے دشمنوں سے بچاتا رہے اور انہیں حدود اللہ کے مطابق کام میں لا کر دینی و دنیوی ترقیات اور ان کمالات کو حاصل کرے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔ اور یہ بھی ضروری تھا کہ ان جذبات کو حرکت میں لانے کے لئے کوئی محرک ان کے حسب حال پیدا کیا جاتا۔ چونکہ یہ جذبات جو اگرچہ خاک سے پیدا شدہ ہیں۔ مگر ارتقا کے ماتحت وہ انسان کے اندر ایک نار کی شکل اختیار کر جاتے ہیں جیسا کہ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ حرص اور

شہوت اور غصہ وغیرہ کے جذبات کا جس وقت ہیجان ہوتا ہے اُس وقت وہ ایک آگ اپنے تن بدن میں محسوس کرتا ہے۔ تو اسی مناسبت سے جو محرک ان جذبات کے لئے پیدا کیا گیا وہ ایک ناری مخلوق ہے جسے قرآن نے جن یا ابلیس کا نام دیا ہے۔ اس محرک کا وجود انسان کی فطرت کا جزو نہیں بلکہ اس کا وجود خارجی ہے۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ جو "علم تجزیہ نفس" کا بڑا ماہر ہے اس نے نفس انسانی کو تین حصوں میں منقسم مانا ہے۔ ایک ایگو (ego) یعنی شخصیت انسانی جو کہتی ہے کہ میں ہوں۔ دوسرے سوپر ایگو (Superego) جو انسان کو نیکی اور اخلاق فاضلہ کی تحریک کرتا ہے۔ تیسرے اڈ یا اٹ (Id) وہ جو انسان کو بدی کی تحریک کرتا ہے اسے اپنے ضروری کام بھلا دیتا ہے۔ اُسے غلط رستہ پر ڈال دیتا ہے۔ غرضکہ وہ انسان کا دشمن ہے۔ قرآن نے بھی تین ہی ہستیاں مانی ہیں (۱) ایک نفس انسانی جو کہتی ہے کہ میں ہوں (۲) دوسرے مَلک یعنی فرشتہ جو انسان کو نیکی کی تحریک کرتا رہتا ہے یہ فرائڈ کا (Super ego) ہوا۔ (۳) تیسرے جن یا ابلیس جو بدی کی تحریک کرتا ہے۔ یہ فرائڈ کا اڈ ہوا لیکن قرآن کے بیان کردہ نیکی وبدی کے فلسفہ کا ڈاکٹر فرائڈ سے یہ فرق ہے کہ قرآن ان دونوں نیکی وبدی کے محرکوں کو نفس انسانی سے خارج قرار دیتا ہے۔ اس کا تجزیہ نفس انسانی کا یہ ہے کہ نفس انسانی کے اندر ایک طرف تو ضمیر یا کانشنس ہے اور اس کا محرک فرشتہ ہے۔ اور دوسری طرف جذبات حیوانی ہیں اور ان کا محرک ابلیس ہے جیسا کہ میں بتا چکا ہوں انسان کی زندگی اور ترقی کے لئے جذبات حیوانی کا ہونا ضروری تھا اور ان کی تحریک کیلئے ابلیس کا ہونا بھی ضروری تھا لیکن یہ محرک ایسا زبردست ہے کہ اگر اُسے روکا نہ جائے تو یہ بے لگام ہو کر انسان کو حدود اللہ کے اندر نہیں رہنے دیتا بلکہ حد سے گزار کر ہلاک کر دیتا ہے تو اس کے روکنے کے لئے خدا نے انسان کو ضمیر اور اس کا محرک فرشتہ عطا کیا اور ساتھ ہی عقل بخشی جو ضمیر کی آواز پر کان دھر کے انسان کو خبردار کرتی رہتی ہے کہ بس۔ خدا کی مقرر کردہ حد آن پہنچی۔ اس سے آگے جذبات کا گھوڑا نہ بڑھانا۔ مثلاً اپنی عزت اور غیرت کے ماتحت انسان کو غصہ آ جاتا ہے۔ اس غصہ کو ایک حد کے اندر رکھ کر عزت نفس کو قائم رکھنا خوبی ہے۔ جن یا ابلیس اس جذبہ کو تحریک دے گا۔ اور چونکہ وہ انسان کا دشمن ہے۔ وہ کسی حدبندی پر قائم نہیں رہنا چاہتا۔ وہ اس غصہ کے ماتحت قتل وغارت تک انسان کو پہنچا دے گا۔ لیکن ضمیر اور عقل کی آواز پر ایک غصہ میں آیا ہوا آدمی اگر کان دھرے گا تو وہ ایک حد پر آ کر اُسے روک دیں گے۔ اور جائز حد یا حدود اللہ سے آگے بڑھنے نہیں دیں گے۔ ڈاکٹر فرائڈ کا نظریہ غلط ہے۔ نیکی کا محرک اور بدی کا محرک نفس انسانی کے اجزا نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ اجزا

نفس کے ہیں تو انسان کا نیکی کرنا یا بدی کرنا نہ اس کی نیکی ہے نہ بدی ہے۔ محض فطرت کی اتباع کسی جاندار کے لئے کوئی وجہ خوبی نہیں۔ اور نہ اسے کسی بدی کے لئے مورد الزام ٹھیراتی ہے۔ نیولے کا سانپ کو مار دینا کوئی نیکی نہیں۔ اور بھیڑیے کا کسی کو پھاڑ ڈالنا کوئی بدی نہیں۔ ڈاکٹر فرائڈ بیچارہ تو عملاً نیکی بدی کا قائل ہی نہیں۔ وہ ان کمالات روحانی سے بے خبر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اڈ کو جو محرک بدی ہے انسان کی فطرت میں جزو ٹھیراتا ہے اور دوسری طرف اُسے انسان کا دشمن قرار دیتا ہے۔ جس کے یہ معنے ہوئے کہ انسان کی فطرت انسان کی دشمن ہے اور اسے ہلاک کر ڈالنا چاہتی ہے اور یہ بالبداہت غلط ہے۔ فطرت انسانی انسان کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ نہ کہ اسے ہلاک کرنا۔ پس وہی صحیح ہے جو خالق فطرت انسانی نے اپنے علم کامل سے قرآن میں فرمایا۔ کہ دونو محرک نیکی اور بدی کے خارجی وجود ہیں۔ ضمیر کے محرک کا نام ملک یا فرشتہ ہے۔ کیونکہ ضمیر اُن کا ملکوتی حصّہ ہے۔ اور جذبات حیوانی کے محرک کا نام جن یا ابلیس ہے۔ ابلیسی تحریک کے ماتحت جب کوئی انسان جذبات کی پیروی سے حدود اللہ کو توڑ دیتا ہے تو اسی ابلیس کو قرآن کی اصطلاح میں شیطان کہا جاتا ہے جس کے معنے ہلاک ہوجانے والا اور خدا سے دُور ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ جب آدم وحوا سے ابلیس نے الٰہی حدود کو توڑ کر معصیت کا ارتکاب کروایا تو قرآن نے اُسے شیطان کے لقب سے یاد کیا۔ فرماتا ہے فازلھما الشیطٰن عنھا یعنی شیطان نے ان دونو کو اس حالت سے پھسلا دیا

الغرض نفس انسانی بطور ایک جج کے ہے جو عقل کی مدد سے ضمیر کی آواز جو ملک کی تحریک کے ماتحت مستفتی ہے اور جذبات کے جوش میں جو ابلیس کی تحریک کے ماتحت پیدا ہوتا ہے فیصلہ دیتا ہے۔ اگر اُس نے ضمیر اور عقل کی آواز پر کان دھرا اور فیصلہ اُن کے حق میں دیا تو حدود اللہ کی پابندی کی وجہ سے نیکی کا مرتکب ہوگیا۔ اور اگر جذبات کے جوش نے اندھا کر دیا اور ضمیر اور عقل کی نہ سُنی تو حدود اللہ کو توڑ کر بدی کا مرتکب ہوگیا۔

لوگوں کا یہ اعتراض کہ خدا نے شیطان کو پیدا کیوں کیا بالکل بے معنی ہے۔ خدا نے شیطان کو پیدا نہیں کیا۔ خدا نے تو جذبات حیوانی کو تحریک میں لانے کے لئے جن یا ابلیس کو پیدا کیا۔ اگر انسان جذبات حیوانی کے پیچھے لگ کر حدود اللہ کو توڑ دے اور وہ جن اپنی سرکشی کی وجہ سے اس جذبات حیوانی کے غلام انسان کے لئے شیطان ثابت ہو تو یہ انسان کا اپنا فعل ہے۔ باقی رہا یہ وسوسہ کہ جذبات اور ان کے محرک وجود ہی کیوں پیدا کیا گیا؟ تو یہ ایسا ہی اعتراض ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ موٹر کار میں انجن اور اس کا چلانے والا پرزہ کیوں لگایا گیا۔ اعمال انسانی اور ان کی وجہ سے

تمام ترقیات انسانی جذبات حیوانی کی موجودگی اور مختلف حالتوں کے مطابق ان کو حرکت میں لاتے رہنے پر ہی منحصر ہیں۔ اگر یہ جذبات نہ ہوں یا وہ حرکت میں نہ آئیں تو نہ انسان ہو اور نہ اسکے اعمال ہوں۔ اور نہ ترقیات کی منازل طے ہوں۔ اگر موٹر کار میں سے انجن نکال دیا جائے یا اگر انجن تو ہو مگر اس کا چلانے والا پرزہ ہی نہ ہو تو وہ موٹر کار ہی نہ چلیگی اور نہ کوئی منزل طے ہوگی عقلمندی تو یہ ہے کہ موٹر کار میں انجن ضرور ہو اور جتنا زبردست انجن ہو اُتنا ہی عمدہ امر ہے۔ ہاں اس انجن کو موقعہ پر روکنے اور سیدھے رستہ پر ڈالنے کے لئے بھی کوئی پرزہ ہو اور چلانیوالے میں اتنی سمجھ اور عقل ہو کہ کہاں انجن کو چلانا ہے اور کہاں روکنا ہے اور کس طرف کو موڑنا ہے اور کس رستہ پر چلانا ہے۔ پس انسان میں جذبات حیوانی کا ہونا اس کی ترقیات کی منازل کے طے کرنے کے لئے ازبس ضروری تھا اور اس کو چلانے کے لئے محرک پرزہ جن یا ابلیس نامی بھی ہونا ضروری تھا۔ ہاں جذبات کے اس انجن کو روکنے اور سیدھے رستہ پر ڈالنے کے لئے دوسرا پرزہ ضمیر کا اور چلانیوالے کے دماغ میں عقل و تمیز کا ہونا بھی ضروری تھا کہ کس موقعہ پر انجن کو چلائے اور کس موقعہ پر روکے اور کس طرف کو موڑے۔

وحی الٰہی کی ضرورت لیکن اس انجن کو کس رستہ پر چلائے اور کہاں تک چلائے اور کس طرف کو موڑے۔ اس کے لئے اس خالق علیم و حکیم کی طرف سے ہی اُسے علم ملنا چاہئے تھا کیونکہ جذبات کو کن حدود پر روکا جائے جن سے انسان کے اخلاق فاضلہ کا ظہور ہو اس کا پُورا پُورا علم دینے کے لئے انسان کی اپنی عقل و ضمیر کافی نہ تھی۔ عقلوں میں اسقدر اختلاف ہے۔ پھر وقت اور سوسائٹی تعلیم و تعلّم کے ماتحت عقل انسانی ترقی و تنزل کرتی رہتی ہے۔ خود انسان کی ضمیر مسخ ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی کی عقل سود کو بدترین گناہ سمجھتی ہے۔ اور کوئی اُسے ایک نہایت مفید چیز سمجھتا ہے۔ کوئی عورت کے لئے پردہ دانائی سمجھتا ہے اور دوسرا اسی پردہ کو ترقی انسان کے لئے روک جانتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی شک نہیں کہ موٹی موٹی باتیں اخلاق کی ضمیر انسانی بتلا دیتا ہے۔ لیکن اس کی تفصیلات اور جزئیات میں صدہا امور ہیں جہاں وہ انسان کی عقل کی مطلق مدد نہیں کرسکتا۔ اور کون جانتا ہے کہ یہ موٹی موٹی باتیں بھی انسان نے وحی الٰہی کی ہی مدد سے سیکھی ہوں۔ کیونکہ جب سے انسان ہے تب سے وحی الٰہی کا سلسلہ بھی ہے یہ حد باندھنا کہ جذبات حیوانی کو کہاں پر روکنے یا جائے یہ اُسی کا کام تھا جس نے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور اسی دن اس کی ضرورت پیش آئی جس دن پہلا انسان پیدا ہوا یا اس میں عقل و تمیز پیدا ہوئی اور وہ اپنے اعمال کا ذمہ وار ٹھیرا۔ پس خدا نے سب سے پہلے انسان کی اپنے علم سے مدد کی جسے وحی الٰہی کہتے ہیں اور اس کے ذریعہ تمام نوع انسانی سے وعدہ فرمایا کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ

ولا ھم یحزنون (البقرہ) کہ میں ہمیشہ انسان کو اس معاملہ میں مدد دینے کیلئے اپنی ہدایت بھیجتا رہوں گا۔ پس جو کوئی تم میں سے ان ہدایات کی اتباع کریگا ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دوسری جگہ اسی ہدایت کے بھیجنے کے متعلق فرمایا۔ یا بنی ادم امّا یاتینکم رسل منکم یقصّون علیکم ایاتی فمن اتقیٰ واصلح فلا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون (الاعراف) اے بنی آدم جب جب تم میں سے رسول آویں اور میری آیتیں (یعنی وہی ہدایتیں جن کا ذکر پہلی آیت میں گزر چکا) تم پر پڑھیں پس جو تقویٰ سے کام لیگا اور اصلاح کریگا ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ پس نبیوں رسولوں کا آنا اور خدا کی طرف سے کتاب کی صورت میں ہدایتیں لانا اسی لئے تھا کہ تا انسان حدود اللہ کو پہچان کر اور اپنی ضمیر اور عقل سے کام لیکر جذبات کی موٹرکار کو صحیح رستہ پر چلانا اور روکنا سیکھے اور اسطرح اسکی ترقیات کمالات کی منازل طے ہوں۔

اسلام کے کامل مذہب ہونے پر ایک زبردست دلیل

اسی لئے حضرت مرزا صاحب نے اپنے علم کلام میں مذاہب کی معیار صداقت کا یہ اصول قائم کیا کہ مذہب اگر تربیت انسانی کیلئے آتا ہے تو کامل مذہب وہی ہو سکتا ہے جس کی الہامی کتاب میں کل انسانی جذبات کی تربیت و تعدیل کا سامان ہو۔ جو جذبات حیوانی انسان میں ہیں وہ سب کے سب اپنی جگہ نہایت مفید اور انسان کی ترقیات کیلئے ان کا ہونا بیحد ضروری ہے۔ سچے اور کامل مذہب کا یہ کام نہیں کہ انہیں ذبح کرے بلکہ ایک کامل کتاب اللہ کا فرض ہے کہ وہ ان تمام جذبات کو تعدیل میں لانے کیلئے ان تمام حدود اللہ کی تعلیم دے جن کے ماتحت لاکر تکمیل و تربیت نفس کی جائے۔ جو مذہب ان جذبات کو ذبح کرنا سکھاتا ہے وہ خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا اس لئے رہبانیت خدا کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ مذہب جذبات کو فنا کرنے کیلئے نہیں آتا بلکہ انہیں حدود اللہ یعنی قواعد و ضوابط کے ماتحت لاکر ان سے حسب منشاء الٰہی کام لینا سکھاتا ہے جن سے انسان کی ترقیات کی منازل طے ہوتی ہیں۔ ہاں ایسا ہوا ہے کہ بعض حالات کے ماتحت بعض قومی مذاہب نے اخلاق کے صرف ایک پہلو پر زور دیا ہے۔ فرعون کی غلامی میں جب بنی اسرائیل قوم میں جبن اور بزدلی حد درجہ کی پیدا ہو گئی تو حضرت موسیٰ کے ذریعہ توریت میں جلالی یعنی تشدد کی تعلیم دی گئی تا قوم میں مردانگی کی روح پیدا ہو۔ اور بعد میں جب یہود میں یہ تشدد حد سے بڑھ گیا تو حضرت عیسیٰ نرمی کی تعلیم لیکر آئے۔ اسی طرح ویدک تعلیم میں چونکہ غیر اقوام پر تشدد اور سختی کی تعلیم تھی اسلئے ہنود کو بدھ نے آکر نرمی اور خاکساری کی تعلیم دی لیکن جب عالمگیر مذہب اسلام کا آیا تو قرآن کے ذریعہ ایسی تعلیم دی گئی جو تمام جذبات کی تربیت و تعدیل کرتے ہوئے انسان کے اخلاق فاضلہ اور اس کے نفس کی کماحقہٗ تکمیل کرتی تھی اور یہی مذہب کی غرض و غایت ہو سکتی ہے جو اسلام کے ذریعہ اپنے کمال کو پہنچ گئی اور اسی لئے اسلام کو دنیا کا آخری اور کامل مذہب ماننا پڑتا ہے۔

نبوت و رسالت کی حقیقت

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں نبوت و رسالت کا مقصد یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے

انسان کو صحیح علم اور ہدایت بخشے جس کے ذریعہ انسان اپنے خالق کی شناخت حاصل کر سکے اور اس کی بنائی ہوئی حدود کے مطابق اپنے اعمال کو لا کر خیر کا مرتکب ہو اور شر سے بچے اور اس طرح اپنے خالق اور مالک سے تعلق پکڑ کر کمالات انسانی کو حاصل کر سکے۔ اسی امر کے لئے کہ یہ ہدایتیں خدا کی طرف سے آئی ہیں ان نبیوں کے ہاتھ پر خدا کے علم اور قدرت کے ماتحت ایسے نشانات آسمانی اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے جن سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ مدعی کی رسالت منجانب اللہ ہے۔ گویا نبوت و رسالت کا مقصد تو انسان کو وہ ہدایات الٰہیہ پہنچانا ہوتا ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا معجزات فقط مؤیدات کے رنگ میں ظہور میں آتے ہیں تا ان ہدایتوں کے منجانب اللہ ہونے پر مخلوق کو پورا یقین آ جائے کیونکہ یہی یقین عمل کی تحریک پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک طرف تو سیدھے سادے مسلمان علماء نے نبی و رسول کی یہ تعریف کر دی کہ نبی وہ ہے جو معجزہ دکھائے۔ حالانکہ معجزات مؤیدات نبوت میں سے ہیں نہ کہ خود نبوت۔ اگر اسے نبوت کے ساتھ لازم ہی گردانا ہو تو ایک جز نبوت کا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حقیقی نبوت تو وہ ہدایات ہیں جن پر عمل کر کے انسان حدود اللہ اور خود اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر کے فلاح دارین حاصل کرتا ہے۔

حضرت مرزا صاحب وحی الٰہی کا نزول خارج سے مانتے تھے

یہ تو سب مسلمان اور اہل کتاب مانتے ہیں کہ یہ ہدایات جن کا اوپر ذکر ہوا بذریعہ وحی انبیاء پر نازل ہوتی ہیں لیکن اس کی کیفیت کیا ہے اس کے بارے میں افسوس ہے کہ حکماء اسلام نے فلسفۂ مادی کے سامنے سپر ڈال دی ہے اور ان کے احساسات کمتری نے وحی الٰہی کے نزول کی کیفیت کو جسمانی قوتوں اور استعدادوں کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ مادی فلسفی اسے حقارت سے ٹھکرا نہ دیں۔ حالانکہ شرمندہ تو مادی فلسفیوں کو ہونا چاہیئے تھا کہ وہ روحانی کیفیات کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے اور پھر اس طرح اس کے متعلق بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے ہیں۔ گویا کہ وہ اس حصۂ علم کے بھی ماہر ہیں۔ چاہیئے تھا کہ وہ ان معاملات میں روحانیات کے صاحب حال اور ماہرین اہل کشف و الہام کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتے اور ہمارے حکماء اسلام اس معاملہ میں نہایت دلیری و جسارت سے ان صاحب حال بزرگوں سے سند پکڑتے مگر وہی احساس کمتری۔ مادی فلسفیوں کے آگے اپالوجی (معذرت) کے رنگ میں وحی الٰہی کی کیفیت کو ایک جسمانی استعداد اور تخیل کے رنگ میں پیش کر کے داد طلب کرنے لگے۔ یہاں تک تو سب کو مسلم ہے کہ انبیاء کے دل میں دقیق باتیں خود بخود بغیر سکھانے اور سننے کے روشن اور ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور بغیر تعلیم و تعلم یا دماغ کی مدد کے علم حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن محض اس قوت کو ہی

وحی والہام کا نام دے دینا درست نہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک گویا شاعری کے ملکہ کی طرح وحی یا الہام ایک جسمانی قوت ہے جس کے ذریعہ ایک خیال دل سے اٹھتا ہے اور دل پر ہی پڑتا ہے۔ اور صاحب وحی ایک شاعر کی طرح اسے اپنے الفاظ میں ادا کر کے لوگوں کو سنا دیتا ہے۔ یہیں تک نہیں جبرئیل اور ملائکہ کے نزول کی یوں تشریح کی ہے کہ انسان کی قوت متخیلہ صورتوں کو ترکیب دیکر انسان کے حس مشترک کے سامنے پیش کر دیتی ہے اور وہ اُسے خارج میں نظر آنے لگتی ہے۔ گویا مجنونوں کے (Hallucination قوت متخیلہ کے ذریعہ فرضی شکلوں کا نظر آنا) سے بڑھ کر ریا و کشوف کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ تمام باتیں قرآن کے صریح خلاف ہیں۔ لیکن حکمائے اسلام مادی فلسفیوں سے اس قدر خائف اور متاثر نظر آتے ہیں کہ وہ اسی میں اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ پس حضرت مرزا صاحب کا ... کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے بہانگ دہل یہ اعلان کیا کہ کچھ شک نہیں کہ انبیا اور محدثین (یعنی وہ غیر انبیا صاحب حال بزرگ جو خدا سے وحی والہام پاتے ہیں) میں بغیر دماغی مدد اور تعلیم و تعلم کے علم حاصل کرنے کی استعداد تو ضرور ہوتی ہے مگر وہ اس لئے ہوتی ہے کہ بغیر اپنے دماغی فکر و تدبر یا کسی انسان سے تعلیم حاصل کرنے کے براہ راست خدا سے علم حاصل کر سکے۔ یہ استعداد نوع انسان میں سب میں ہے مگر کسی میں فطری طور پر کم اور کسی میں زیادہ۔ اور اکثر مادی الجھنوں اور دنیا کے جھگڑوں میں پڑ کر یہ استعداد صفر کے برابر رہ جاتی ہے۔ انبیا اور محدثین میں یہ استعداد بڑی نمایاں اور عبادت و ریاضت اور اعمال صالحہ کے ذریعہ اسقدر ترقی کر جاتی ہے کہ براہ راست خدا کی طرف سے علم حاصل ہونے لگتا ہے۔ اور یہ تمام علم خارج سے اسی طرح آتا ہے جس طرح دنیا کے ظاہری علوم حواس کے ذریعہ قلب میں داخل ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ظاہری علوم کو قلب تک پہنچنے کے لئے ظاہری حواس خمسہ مثلاً کان آنکھ وغیرہ سے آنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر روحانی علوم کو ظاہری حواس خمسہ کے ذریعہ قلب کی طرف منتقل ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اس سے قبل بحث کر چکا ہوں کہ آنکھ اور کان اور کل حواس کا اصلی مرکز انسان کا قلب ہے۔ درحقیقت قلب ہی دیکھتا اور سنتا اور سونگھتا اور چکھتا اور لمس کے ذریعہ محسوس کرتا ہے۔ ظاہری آنکھ اور کان محض قلب تک مادی ظاہری عالم سے احساسات کو پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ روحانی باطنی عالم کے احساسات کو ان مادی ذرائع سے گزرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ براہ راست قلب میں داخل ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح خارج سے داخل ہوتے ہیں جس طرح مادی دنیا سے احساسات داخل ہوتے ہیں۔ گویا جو بھی علم انسان کے قلب میں داخل ہوتا ہے خواہ وہ مادی دنیا سے ظاہری حواس کے ذریعہ قلب میں داخل ہو خواہ وہ روحانی دنیا سے قلب میں داخل ہو۔ وہ

خارج سے آتا ہے۔ اندر سے نہیں نکلتا۔ انسان میں علم کے حصول کیلئے حواس کی موجودگی ہی بتاتی ہے کہ علم کا منبع انسان کے قلب کے باہر ہے نہ کہ اندر۔ دنیا کا علم ہو یا خدا کی طرف سے نازل شدہ علم ہو علم ہمیشہ خارج سے آئے گا نہ کہ اندر سے نکلے گا جس طرح عالم ظاہر میں آواز کو قلب کی طرف منتقل کرنے کا ذریعہ اسباب ظاہری ہوا اور کان ہیں اور کسی چیز کو دیکھنے کا ذریعہ روشنی اور آنکھ ہیں۔ اسی طرح عالم باطن میں خدائی آواز کو قلب تک منتقل کرنے کے لئے اسباب باطنی ملائکہ ہیں۔ پس ایک صاحب وحی والہام کبھی تو کلام سنتا ہے کبھی کوئی نظارہ دیکھتا ہے کبھی سونگھتا اور چکھتا اور لمس کرتا ہے۔ اور ان سب علوم کا نزول اس کے قلب پر خارج سے ہوتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب اس میں صاحب تجربہ تھے۔ ان کا دعویٰ محدث ہونے کا تھا جو اگرچہ نبی تو نہیں ہوتے مگر نبی کی طرح خدا کے مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف اور صاحب وحی والہام ہوتے ہیں انہوں نے صاف لفظوں میں بار بار تحریر فرمایا کہ ان معاملات میں میں صاحب تجربہ ہوں اور جو کچھ قرآن وحدیث میں وحی کے نزول کی کیفیت لکھی ہے کہ خدا کا کلام خارج سے بذریعہ ملائکہ نازل ہوتا ہے وہی لفظاً لفظاً صحیح ہے۔ آپ کی تمام کتب میں جہاں وحی والہام کا ذکر ہے وہاں اس امر پر بھی خاص طور پر زور دیا ہے کہ وحی الٰہی خارج سے آتی ہے قلب کے اندر سے نہیں نکلتی۔ بطور نمونہ آپ کی کتاب برکات الدعا میں سے ایک اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

"وحی کی مثال اگر دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کے ساتھ دی جائے تو شاید تار برقی (یعنی بے تار کی تار برقی یا ریڈیو۔ ناقل) سے مشابہ ہے جو اپنے ہر ایک تغیر کی آپ خبر دیتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وحی کے وقت جو برنگ وحی ولایت میرے پر نازل ہوتی ہے۔ ایک خارجی اور شدید الاثر تصرف کا احساس ہوتا ہے اور بعض دفعہ یہ اثر ایسا قوی ہوتا ہے کہ مجھ کو اپنے انوار میں ایسا دبا لیتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ میں اس کی طرف کھینچا گیا ہوں کہ میری طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس تصرف میں کھلا اور روشن کلام سنتا ہوں۔ اور بعض وقت ملائکہ کو دیکھتا ہوں اور سچائی میں جو اثر اور ہیبت ہوتی ہے مشاہدہ کرتا ہوں اور وہ کلام بسا اوقات غیب کی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ایسا تصرف اور اخذ خارجی ہوتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کا ثبوت ملتا ہے۔ اب اس سے انکار کرنا ایک کھلی صداقت کا خون کرنا ہے۔

نوٹ۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ ملائک بعض وقت نظر آتے ہیں بلکہ بسا اوقات ملائک کلام میں اپنا واسطہ ہونا ظاہر کر دیتے ہیں۔"

یہاں حضرت اقدس مرزا صاحب نے وحی کی مثال تاربرقی سے دی ہے۔ مناسب ہے کہ سائنس کی موجودہ تحقیقات بھی عرض کردوں شاید کسی مادی فلسفہ کے شیدائی کو فائدہ ہو۔ موجودہ تحقیقات یہ ہے کہ انسان کا قلب بھی ایک نہایت ذکی الحس ریڈیو ہے جس طرح مختلف لمبائی کی برقی لہریں مختلف جگہوں سے آوازوں کو اس میں منتقل کرتی رہتی ہیں اور ریڈیو کی سوئی جس اندازہ کی برقی لہروں کیلئے موزوں اور مطابق کردو وہی آوازیں اس میں آنے لگتی ہیں۔ اسی طرح انسان کا قلب بھی جس قسم کی باطنی برقی لہروں سے تعلق پکڑتا ہے اسی طرف کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ خدا سے تعلق پکڑنے والوں کو خدا اور ملاء اعلیٰ کی آوازیں اور شیطان سے تعلق پکڑنے والوں کو شیطانی آوازیں اور خواہشات وتمنیٔ نفس میں منہمک رہنے والوں کو حدیث نفس کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جس قدر ریڈیو کی ساخت اعلیٰ اور اس میں صفائی ہوتی ہے اسی قدر اس میں آواز بھی صاف آتی ہے۔ اسی طرح جس قدر انسان کے قلب کی بناوٹ اعلیٰ اور صفائی پاکیزہ تر ہوگی اسی قدر صفائی سے اس کو عالم روحانی کی آوازیں بھی آئیں گی۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ ہزاروں میل کے فاصلہ سے ایک انسان اپنے قلب کے خیالات کو دوسرے آدمی کے قلب پر منتقل کرسکتا ہے بلکہ اس سے ہم کلام بھی ہوسکتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا کاٹھ کا ریڈیو کیا کچھ کرتا ہے تو انسان کا قلب تو خدا کا بنایا ہوا ریڈیو اور عجائبات کا مجموعہ اور اسرار کا گنجینہ ہے۔ نادان انسان اپنی لاعلمی اور جہالت سے بہت سے حقائق کا جلدی سے انکار کرجاتا ہے۔

قرآن کریم کا علم خدا کا علم ہے تعجب ہے کہ معتزلہ اور سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے ہمخیال بزرگ مادہ پرست فلسفیوں سے مرعوب ہوکر کیونکر ان عقائد کے سامنے سر تسلیم خم کرگئے جو خلاف قرآن ہیں۔ قرآن میں بار بار صاف لفظوں میں موجود ہے کہ وحی قرآن کا نزول خارج سے الفاظ میں ہوتا تھا۔ میں فقط ایک آیت کے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ورنہ صدہا آیتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرانه فاذا قرانه فاتبع قرانه ثم ان علينا بيانه (القیٰمہ) اے پیغمبر وحی الٰہی کو جلدی لینے کے لئے اپنی زبان کو نہ چلانے لگ جایا کرو۔ بیشک قرآن کو جمع کردینا اور پڑھنا ہمارا کام ہے۔ تو جب ہم قرآن پڑھا کریں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کیا کرو۔ پھر اس کا سمجھا دینا بھی ہمارا کام ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ شروع شروع میں رسول اللہ صلعم وحی الٰہی کو جلدی لینے کی خاطر جلدی جلدی پڑھنے لگتے تھے اس سے آپ کو روک دیا گیا کہ آپ جلدی نہ کیا کریں۔ آپ کے قلب میں یعنی حافظہ میں جمع کردینا اور بعد میں کتاب کی

شکل میں جمع کر دینا اور اس کا پڑھنا یہ ہمارا کام ہے۔ جب ہم پڑھیں تو اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کلام نازل ہوتا تھا وہ خارج سے نازل ہوتا تھا اور الفاظ میں نازل ہوتا تھا جیسے پڑھا جاتا تھا اور اس طرح پڑھا جاتا تھا کہ جس کی پڑھنے میں نہایت آرام سے پیروی کی جا سکتی تھی اور جس کو جلدی جلدی پڑھنے میں غلطی لگ جانے کا احتمال تھا۔ پھر ثم ان علینا بیانہ فرما کر یہ بھی بتلا دیا کہ وہ الفاظ تھے جن کے معنی اور مفہوم کے لئے سمجھانے کی بھی ضرورت تھی۔ اگر وہ دل کا خیال تھا تو معنی پہلے ہوتے جن کے لئے الفاظ کی تلاش ہوتی۔ ان حالات میں کسی انسان کو اپنے ما فی الضمیر کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ ٹھیک ملنے یا نہ ملنے کا سوال تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن معنی کو سمجھنے کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ معنی تو پہلے دل میں پیدا ہوئے اب اُسے ظاہر کرنے کے لئے الفاظ کی تلاش ہے نہ کہ معنی کی۔ البتہ جب وحی الفاظ میں نازل ہوگی تو اُسے پڑھنے اور پڑھنے کی پیروی کرنے کا سوال درمیان میں آئے گا۔ اور اگر اس بات کی ضرورت ہے کہ ان الفاظ کے معنے بھی سمجھائے جائیں تو صاف ظاہر ہے کہ وہ الفاظ خارج سے آئے ہیں جن کے معنوں کا علم صاحب وحی کو نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ پیشگوئیوں کے سمجھنے میں جب خدا کی طرف سے خاص طور پر ان کی تفہیم نہ ہو تو خود صاحب وحی کو بھی بعض دفعہ غلطی لگ جاتی ہے۔ الفاظ تو بعد میں سچے ثابت ہوتے ہیں مگر جو مفہوم اس کا اجتہادی طور پر صاحب وحی نے سمجھا تھا وہ غلط نکل جاتا ہے۔

استجابت دعا کے متعلق عقیدہ مادہ پرست فلسفیوں کے عقائد میں احساس کمتری نے آخر معتزلیوں اور نیچریوں سے اجابت دعا کا انکار کروا دیا۔ چونکہ مادی فلسفی خدا کا وجود اگر تسلیم کرتا ہے تو صرف اسی قدر کہ وہ اس ساری کائنات یعنی کل کے لئے بطور علت اولیٰ ہے۔ اس کے اجزا سے براہ راست تعلق رکھنے سے سلسلہ اسباب مانع آجاتا ہے۔ حالانکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اگر خدا کا اس کل کے ایک ایک جز، ایک ایک ذرہ سے تعلق نہ ہو تو پھر وہ خدا نہیں رہتا۔ کیونکہ پھر نہ ان چیزوں کا اسے علم ہو سکتا ہے اور نہ ان پر وہ قدرت رکھ سکتا ہے۔ اگر اسے ان کا علم اور ان پر قدرت نہیں تو وہ خدا کاہے کا ہوا کسی مشین چلانے کا ایک بے شعور بے علم بے ارادہ پہلا پرزہ ہوا۔ ایسے خدا کو ماننے کی نہ کوئی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اس کے ماننے میں کوئی فائدہ ہے۔ جب انسان کو جو اس ساری کائنات کا ایک جزو ہے اس سے تعلق پکڑنے میں یا اس کو پکارنے میں کوئی فائدہ نہیں تو اس کی عبادت اور اطاعت کا کیا فائدہ۔ اغلب ہے کہ وہ اس جز کی نسبت کوئی علم ہی نہ رکھتا ہو نہ اس کی آواز سنتا ہو۔ اور سنے بھی تو اُسے قدرت نہیں کہ اس کی کوئی مدد کرے کیونکہ اس طرح اس کا انتظام گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ تو پھر یہ کہنا کہ

دعا کا مقصد فقط دل کی تسلی ہے نہایت لغو ہے۔ دل کو یہ جھوٹی تسلی کیوں دی جاتی ہے۔ خدا نہ ہؤا نعوذ باللہ کوئی یورپین سیاسی مدبر ہؤا کہ جھوٹی تسلیاں دے کر خوش کرتا رہتا ہے۔ پس انبیا اور محدثین کا دنیا میں اسی لئے ظہور ہؤا تا خدا کی نسبت صحیح علم اور معرفت انسان کو بخشی جائے اور بتایا جائے کہ خدا صاحب ارادہ صاحب علم صاحب قدرت ہستی ہے جس کا علم اور قدرت اور جس کی ربوبیت کا فیضان اس کل کے ایک ایک جزو ایک ایک ذرہ پر حاوی ہے۔ بالخصوص انسان پر اس کا فیضان نہ صرف ربوبیت کے رنگ میں ہے بلکہ رحمانیت، رحیمیت، مالکیت کے رنگ میں بھی بڑا زبردست اور استوار ہے۔ اس نے نہ صرف انسان کو پیدا کیا اور اسے نشو ونما دی بلکہ یہ کل کائنات اس کی ترقی اور فلاح کیلئے پیدا کی ہے۔ اور اگر انسان اس کی مرضی کے مطابق عمل کرے تو اسے لامتناہی ترقیات اور کمالات کا وارث بنا کر خلافت الٰہیہ کے مقام عالی پر پہنچانے کے لئے تیار ہے۔ اس نے اپنی رضا کی راہیں نبیوں کے ذریعہ نوع انسان کے لئے واضح کر دی ہیں جن پر چلنے کے لئے انسان کو ہر وقت خدا سے اعانت طلب کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انسان کو صاحب ارادہ اور صاحب عقل وتمیز بنا کر اسے موقعہ دیا گیا ہے کہ وہ اس دنیا میں جہاں آزمائش کے طریق پر قدم قدم پر ٹھوکریں موجود ہیں اپنے ارادہ سے خدا کے بتائے ہوئے رستہ پر چل کر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے والا بنے۔ اس لئے سب سے پہلی اور سب سے جامع دعا اسے یہ سکھائی گئی کہ وہ ایاک نعبد وایاک نستعین کا اقرار کرتا ہؤا اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم خدا سے ہر وقت مانگتا ہے کہ اے میرے رب ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں کیونکہ تیرے بندے ہیں تو ہمیں سیدھے رستہ پر چلا اور اس پر کامیاب کر۔ ان لوگوں کا رستہ جن پر تیرا انعام ہؤا۔ پھر فرمایا ادعونی استجب لکم۔ تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔ یہ وعدہ سچا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی مدد کرتا صراط مستقیم پر چلنے میں ان کی دستگیری فرماتا ہے۔ یہی حال تمام دعاؤں کا ہے۔ اگر خدا واقعی انسان کا رب ہے اور وہ متصرف بالارادہ ہے تو وہ کیوں اپنے بندہ کی مدد کرنے پر قادر نہیں۔ نیچریوں کا یہ اعتراض نہایت لغو اور مہمل ہے کہ خدا اگر لوگوں کی دعا قبول کرنے لگے تو اس کا انتظام درہم برہم ہو جائے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ یہ خدا کا ہی قانون ہے کہ ہر ایک انسان جس امر میں اپنا عجز محسوس کرتا ہے وہ اپنے سے زیادہ طاقت اور علم رکھنے والے کی طرف امداد کے لئے رجوع کرتا ہے اور اس کی امداد سے فائدہ اٹھا کر اپنی مشکل کو حل کر لیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنا وزنی اسباب اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ قلی سے امداد طلب کرتا ہے جو اس کا اسباب اٹھا لیتا ہے اور اس کی مشکل کو حل کر دیتا ہے۔

ایک شخص اپنے کسی عزیز مریض کے مرض کو نہیں سمجھتا اور اس کا علاج نہیں جانتا تو وہ ایک ڈاکٹر کی طرف امداد کے لئے رجوع کرتا ہے اور اس کے علم سے فائدہ اٹھا کر اپنی مشکل کو حل کرتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کو ڈاکوؤں سے خطرہ ہے وہ حاکم کی طرف امداد کیلئے رجوع کرتا ہے اور اس کی طاقت اور حکومت سے فائدہ اٹھا کر اپنی مشکل کو حل کرتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص اپنی مشکل میں خدائے علیم و قدیر کی طرف رجوع کرتا ہے وہ مشکلات ایسی ہیں جنہیں خدا کی قدرت کا ہاتھ ہی حل کرسکتا ہے۔ انسان کے بس کی بات نہیں۔ یا وہ شخص اپنی معرفت کاملہ سے جانتا ہے کہ صحیح اسباب کا مہیا کرنا بھی فضل ربی پر منحصر ہے۔ پس اگرچہ میں اسباب سے کام لے سکتا ہوں اور لے رہا ہوں لیکن کون جان سکتا ہے کہ آیا میرا قدم صحیح اسباب پر ہے یا غلط پر۔ اور ان کے نتائج کیا نکلیں گے۔ اس لئے وہ خدا کے کامل علم اور کامل قدرت کی طرف رجوع کرتا ہے اور وہ صراط مستقیم ڈھونڈتا ہے جس پر چلنے سے وہ اپنی مشکل کو حل کرسکے۔ تو ایسے موقعہ پر اگر خدا اس کی مدد کرے تو انتظام کائنات کیوں درہم برہم ہو۔ جب کہ ایک قلی کی بوجھ اٹھانے میں مدد۔ ایک ڈاکٹر کی مرض کی تشخیص اور علاج میں مدد۔ ایک حاکم کی ڈاکوؤں سے بچانے میں امداد خدا کے کسی انتظام کو برباد نہیں کرتی۔ تو خود خدا کی اپنے بندوں کو امداد خدا کے انتظام کائنات کو کیوں برباد کرنے کا موجب ہو۔ پس بات سچی یہی ہے کہ خدا نے اس کائنات کو اسی طریق پر چلایا ہے اور اس میں یہی قانون بنایا ہے کہ ایک کم طاقت طاقت والے سے اور ایک کم علم علم والے سے امداد طلب کرنے کی حاجت رکھتا ہے۔ پس خدا سے جو علم کامل اور قدرت کاملہ رکھتا ہے عاجز اور کم علم انسان کا امداد طلب کرنا اور اس سے اپنی مشکلات کو حل کرلینا عین مطابق قانون قدرت ہے۔ پھر یہ فقط ایک نظریہ ہی نہیں ہے بلکہ ہزارہا راستبازوں اور مومنین کا اپنا تجربہ اس پر شاہد حال ہے۔ چنانچہ حضرت مرزا صاحب نے سر سید احمد خاں کو اپنی کتاب برکات الدعا میں دعوت دی ہے کہ میرے پاس آکر اجابت دعا کا نمونہ ملاحظہ کرلیں۔ اس دعوت میں آپ نے ایک نظم بھی لکھی تھی جس میں سے تین اشعار میں یہاں نقل کرتا ہوں :۔ ؎

از دعا کن چارۂ آزار انکار دعا — چوں علاج مے ز مے وقت خمار و التہاب
اے کہ گوئی گر دعاہا را اثر بودے کجاست — سوئے من بشتاب بنمایم ترا چوں آفتاب
ہاں مکن انکار زیں اسرار قدرتہائے حق — قصہ کوتاہ کن ببیں از ما دعائے مستجاب

اجابت دعا کے ان نمونوں میں جو آپ نے سر سید احمد خاں کے آگے کتاب برکات الدعا میں پیش کئے ہیں ایک نمونہ لیکھرام پشاوری کی پیشگوئی تھی جو اجابت دعا کا نتیجہ تھی۔ اور جس کی میعاد کے اندر ہلاکت نے اجابت دعا کی صداقت پر مہر ثبت کردی۔ ایک لیکھرام ہی کے متعلق کیا آپ کی صدہا

مستجاب دعاؤں کے نمونے آپ کی کتابوں برکات الدعا۔ تریاق القلوب حقیقۃ الوحی۔ براہین احمدیہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ اور پاس بیٹھنے والوں نے خود دیکھے اور تجربہ کئے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس مادہ پرستی کے زمانہ میں حضرت اقدس مرزا صاحب کا دعا پر اسقدر زور دینا اور اس کی استجابت کے بارے میں تجربہ کرنے کے لئے ہر ایک مادہ پرست اور نیچری کو چیلنج دینا آپ کے وہ کارنامے ہیں جن سے آپ کی وہ عظمت و شان نظر آتی ہے اور اس یقین اور معرفت کا پتہ ملتا ہے جو گزشتہ تیرہ سو سال میں ہمیں اُمت میں نظر نہیں آتا۔ دعا ہی ساری خدا پرستی اور تعلق باللہ کی جڑھ ہے۔ استجابت دعا سے ہی زندہ ایمان اور معرفت و محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ اس دہریت اور لامذہبی کے زمانہ میں استجابت دعا کا عقیدہ زندہ کرنا دین کی سب سے بڑی خدمت تھی جو حضرت مرزا صاحب سے ظہور میں آئی۔ استجابت دعا کے تجربے دنیا کے آگے پیش کرنے اور منکرین استجابت دعا کو تجربہ کے لئے دعوت دیکر ان پر حجت تمام کر دینا ایسا کارنامہ ہے جو ایک مجدد نہیں بلکہ مجدد اعظم کے ہی شایان ہو سکتا ہے۔

حضرت اقدس مرزا صاحب کی دعا کے متعلق معرفت اس قدر بلند اور نظر اتنی وسیع تھی کہ آپ کی نظر میں دنیا میں ہر ایک شخص جو فکر اور تدبیر کے ذریعہ اسباب سے کام لیتا اور کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتا ہے وہ بھی دعا کی ہی مجوبانہ شکل ہے۔ اور اس کی کامیابی بھی اجابت دعا کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔ بطور نمونہ آپ کی کتاب ایام الصلح میں سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

"غرض جبکہ ہماری رُوح ایک چیز کے طلب کرنے میں بڑی سرگرمی اور سوز و گداز کے ساتھ مبدأ فیض کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے اور اپنے تئیں عاجز پا کر فکر کے ذریعہ سے کسی اور جگہ سے روشنی ڈھونڈتی ہے تو درحقیقت ہماری وہ حالت بھی دعا کی ہی ایک حالت ہوتی ہے۔ اسی دعا کے ذریعہ سے دنیا کی کل حکمتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور ہر ایک بیت العلم کی کنجی دعا ہی ہے۔ اور کوئی علم اور معرفت کا دقیقہ نہیں جو بغیر اس کے ظہور میں آیا ہو۔ ہمارا سوچنا ہمارا فکر کرنا اور ہمارا طلب امر مخفی کے لئے خیال دوڑانا یہ سب امور دعا میں ہی داخل ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ عارفوں کی دعا آداب معرفت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اور اُن کی رُوح مبدأ فیض کو شناخت کر کے بصیرت کے ساتھ اس کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اور محجوبوں کی دعا صرف ایک سرگردانی ہے جو فکر اور غور اور طلب اسباب کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ سے ربطِ معرفت نہیں اور نہ اس پر یقین ہے وہ بھی غور اور فکر سے یہی چاہتے ہیں کہ غیب سے کوئی کامیابی کی بات ان کے دل میں پڑ جائے اور ایک عارف دعا

کرنے والا بھی اپنے خدا سے ہی چاہتا ہے کہ کامیابی کی راہ اس پر کھلے لیکن محجوب جو خدا تعالیٰ سے ربط نہیں رکھتا وہ مبدأ فیض کو نہیں جانتا اور عارف کی طرح اس کی طبیعت بھی سرگردانی کے وقت ایک اور جگہ سے مدد چاہتی ہے اور اسی مدد پانے کے لئے وہ فکر کرتا ہے۔ مگر عارف اس مبدأ کو دیکھتا ہے۔ اور یہ تاریکی میں چلتا ہے اور نہیں جانتا کہ جو کچھ فکر اور خوض کے بعد بھی دل میں پڑتا ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ متفکر کے فکر کو بطور دعا قرار دیکر بطور قبول دعا اس علم کو فکر کرنیوالے کے دل میں ڈالتا ہے۔ غرض جو حکمت اور معرفت کا نکتہ فکر کے ذریعہ سے دل میں پڑتا ہے وہ بھی خدا سے ہی آتا ہے۔ اور فکر کرنے والا اگرچہ نہ سمجھے مگر خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ مجھ سے ہی مانگ رہا ہے۔ سو آخر وہ خدا سے اس مطلب کو پاتا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے یہ طریق طلب روشنی اگر علی وجہ البصیرت اور ہادیٔ حقیقی کی شناخت کے ساتھ ہو تو یہ **عارفانہ دعا ہے**۔ اور اگر صرف فکر اور خوض کے ذریعہ سے یہ روشنی معدوم مبدأ سے طلب کی جائے اور منور حقیقی کی ذات پر نظر نہ ہو تو وہ محجوبانہ دعا ہے۔"

حضرت اقدس مرزا صاحب نے آگے چل کر یہ بھی بتلایا ہے کہ ایک **عارف** تدابیر کو بھی دعا کے ذریعہ سے ہی تلاش کرتا ہے۔ اس کے بعد اجابت دعا پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"حکیم مطلق ہماری دعاؤں کے بعد دو طور سے نصرت اور امداد کو نازل کرتا ہے (۱) ایک یہ کہ اس بلا کو دور کرتا ہے جس کے نیچے ہم دب کر مرنے کو طیار ہیں۔ (۲) دوسرے یہ کہ بلا کی برداشت کے لئے ہمیں فوق العادت قوت عنایت کرتا ہے بلکہ اس میں لذت بخشتا ہے اور انشراح صدر عنایت فرماتا ہے۔"

ایک مومن پر اسلام نے دعا کیوں فرض کی ہے اس کی چار وجوہات تحریر فرماتے ہیں:-

"(۱) ایک یہ کہ تا ہر ایک وقت اور ہر ایک حالت میں خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر توحید پر پختگی حاصل ہو کیونکہ خدا سے مانگنا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ مرادوں کا دینے والا صرف خدا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ تا دعا کے قبول ہونے اور مراد کے ملنے پر **ایمان قوی** ہو۔

(۳) تیسرے یہ کہ اگر اور رنگ میں عنایت الٰہی شامل حال ہو تو علم اور حکمت زیادت پکڑے۔

(۴) چوتھے یہ کہ اگر دعا کی قبولیت کا الہام اور رؤیا کے ساتھ وعدہ دیا جائے اور اسی طرح ظہور میں آوے تو **معرفت الٰہی** ترقی کرے۔ اور **معرفت** سے یقین اور یقین سے محبت اور محبت سے ہر ایک گناہ اور **غیر اللہ سے انقطاع** حاصل ہو جو حقیقی نجات کا ثمرہ ہے۔"

زندہ ایمان پیدا کرنے کیلئے نمازیں دعاؤں پر زور

حضرت مرزا صاحب اپنی جماعت میں زندہ ایمان پیدا کرنے اور ان میں معرفت و محبت الٰہی کے ترقی کرنے کے لئے اپنے مریدوں کو نمازیں سنوار کر اور سمجھ سمجھ کر توجہ سے پڑھنے کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ اور ان میں کثرت سے دعائیں کرنے پر بہت زور دیتے تھے۔ صوفیاء کے تمام اوراد و وظائف کو جو قرآن و سنت سے ماخوذ نہیں ہیں آپ پسند نہیں کرتے تھے۔ بڑا زور اس بات پر تھا کہ نماز سنوار کر اور توجہ اور خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھی جائے۔ بالخصوص نماز تہجد اور اس میں کثرت سے دعائیں کرنے کی بہت تاکید فرماتے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ نماز میں دعائے ماثورہ جو امت کے تعامل میں ہیں وہ ضرور مانگنی چاہئیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اپنی مرادیں اگر خدا کے حضور میں عرض کرنی ہوں اور عربی نہ آتی ہو تو نوافل نمازوں میں اپنی زبان میں بھی ہر ایک شخص دعا کر سکتا ہے۔ سجدہ میں تسبیح کے بعد اور قومہ میں ربنا لک الحمد کے بعد اور جلسہ میں درود شریف کے بعد انسان جو چاہے دعا کر سکتا ہے۔ اگر عربی زبان میں نہیں کر سکتا تو اپنی مادری زبان میں کرلے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک عربی نہ جاننے والا ساری نماز ہی اپنی مادری زبان میں پڑھ لے آپ اسے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وجہ یہ کہ ایک عالمگیر مذہب جو ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ کیلئے ہو۔ اور مختلف مادری زبانیں رکھنے والی اقوام کا ایک مشترک مذہب ہو۔ اس کی اجتماعی عبادت مثلاً نماز یا حج کیلئے ضرور ہے کہ ایک مشترک زبان ہو تا ہر ایک قوم کا مسلمان جو مختلف زبان رکھتا ہے ایک امام کے پیچھے اور ایک جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکے۔ اور حج کر سکے۔ اگر مختلف زبانوں میں نماز پڑھی جائے مثلاً ایک بنگالی اگر بنگالی زبان میں نماز پڑھا رہا ہو تو ایک افغان اس کی اقتدا کیسے کر سکتا ہے۔ وہ کیا جانتا ہے کہ یہ کیا پڑھا رہا ہے۔ ایک افغان اگر پشتو میں نماز پڑھا رہا ہو تو ایک ہندوستانی کیا سمجھے گا کہ یہ کیا پڑھ رہا ہے اور وہ کیسے اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ایک عالمگیر مذہب کے لئے اجتماعی عبادات کے واسطے ایک مشترک زبان ہو اور وہ سوائے عربی کے دوسری نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سورۂ فاتحہ جیسی جامع اور کامل دعا کی عربی زبان ہی متحمل ہو سکتی تھی۔ اور قرآن عربی زبان میں ہی خدا کا کلام ہے پس ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قرآن اور نماز کو عربی زبان میں پڑھے اور نماز کا ترجمہ سیکھے جو ایک ان پڑھ سے ان پڑھ انسان بھی ایک ہفتہ کے اندر سیکھ سکتا ہے۔ قرآن کریم کا ترجمہ جتنی اس کی مقدرت ہو سیکھے لیکن نماز کا ترجمہ ہر ایک مسلمان کے لئے سیکھنا ضروری ہے تا انسان نماز سمجھ کر پڑھے اور عربی میں پڑھے تا تمام دنیا کے مختلف زبانیں رکھنے والے مسلمانوں کی وحدت اور اشتراک فی العبادت میں فرق نہ پڑے۔ بار بار دعائے ماثورہ کے علاوہ اگر کوئی اور

عا مانگنی ہو اور اپنی مشکل جناب الٰہی میں عرض کرنی ہو اور عربی نہ آتی ہو تو اپنی مادری زبان میں عرض معروض کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ توجہ اور خشوع وخضوع بڑھ جانے کا موجب ہو جائے گا۔

مکالمات الٰہیہ کا سلسلہ امت محمدیہ میں قیامت تک جاری ہے

استجابت دعا کے بارے میں نیچریوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ دعا کے بعد کسی واقعہ کے ظہور پذیر ہو جانے سے یہ کیسے پتہ لگ سکتا ہے کہ یہ امر اجابت دعا کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے وہ اسی طرح ہونیوالا ہو پس استجابت دعا پر تبھی یقین ہو سکتا ہے کہ جب وہ ایک نشان کے رنگ میں ظاہر ہو اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جب ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے ایک یاس کا عالم طاری ہو اور دعا کے بعد جناب الٰہی کی طرف سے الہام یا کشف یا رویا کے ذریعہ قبولیت دعا کی بشارت دی جائے اور پھر اس کے بعد یکدم رنگ پلٹ جائے اور مخفی در مخفی اسباب پیدا ہو کر وہ یاس امید سے اور ناکامی کامیابی سے مبدل ہو جائے۔ مثلاً ایک مرض میں ڈاکٹر اور اطبا جواب دے چکے ہوں اور بظاہر اسباب مریض کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو اس وقت دعا کے بعد اگر الہام یا رویا کے ذریعہ جناب الٰہی کی طرف سے بشارت ملے اور پھر ایسے اسباب نادرہ جمع ہو جائیں جو مریض کو شفایاب کر دیں تو پھر استجابت دعا پر یقین اور خدا کی ہستی پر ایک زندہ ایمان پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے عارفوں کے نزدیک مکالمات الٰہیہ یعنی خدا کی طرف سے وحی والہام و رویا و کشوف وہ چیزیں ہیں جن سے ایمان ترقی کرتا اور ایک سالک اپنے سلوک کی انتہائی منزل مقصود کو پالیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین تام پیدا ہو کر وہ ہر ایک گناہ اور غیر اللہ سے انقطاع تام حاصل کر کے توحید اور معرفت و محبت الٰہی کے مقام عالی پر جا پہنچتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب نے اسی امر کو زندہ کیا۔ اس مادہ پرستی کے زمانہ میں جب خدا کی ہستی پر یقین دلوں سے مٹ چکا اور مٹ رہا تھا اور خدا کی وحی و الہام کو جو مذہب کی بنیاد ہے گزشتہ زمانہ کا ڈھکوسلا اور افسانہ قرار دیکر اس سے ایمان اٹھ چکا تھا۔ آپ نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کیا کہ خدا ہے اور وہ زندہ خدا ہے۔ اور آج بھی اپنے بندوں کے ساتھ اسی طرح تعلق رکھتا ہے جس طرح گزشتہ زمانہ میں رکھتا تھا۔ جس طرح وہ زمانہ ماضی میں اپنے برگزیدوں کی دعائیں سنتا اور ان سے ہمکلام ہوتا تھا اور ان کو اپنے انعامات اور قبولیت دعا کی بشارتیں دیتا تھا آج بھی یہی سب فیضان اس کے اپنے بندوں کے ساتھ شامل حال ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تمام ادیان میں اب صرف دین اسلام ہی ہے جو ایک زندہ مذہب ہے۔ اور قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم ہی وہ زندہ کتاب اور زندہ رسول ہیں جن کی اتباع سے خدا ملتا ہے اور خدا کا ملنا اور اس کا مکالمہ مخاطبہ

گزشتہ زمانہ کے افسانے نہیں بلکہ زمانۂ حال میں بھی ایک حقیقت ہے اور میں اس میں صاحب تجربہ و مشاہدہ ہوں جس کا دل چاہے میرے پاس آکر تجربہ کرے۔ آپ نے بار بار بذریعۂ اشتہارات و تصنیفات اس امر کا اعلان کیا اور تمام مذاہب اور دہریوں اور فلسفیوں پر حجت تمام کر دی لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس معاملہ میں جس سے اسلام کے زندہ مذہب ہونے پر ایک دلیل روشن قائم ہوتی تھی مخالفت کرنیوالے مسلمان علماء بھی تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ معقولی یا منقولی کونسی دلیل ان کے ہاتھ میں اس کے خلاف تھی۔ بلکہ سب کی سب حضرت مرزا صاحب کی تائید میں تھی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ابتدائے آفرینش آدم سے خدا اپنے برگزیدہ بندوں سے ہم کلام ہوتا آیا ہے تو آج اس کی یہ صفت تکلم کی کیوں زائل ہو گئی۔ مانا کہ جو ہدایات اور احکام حدود اللہ یعنی شریعت کے متعلق بذریعہ وحی انسان کو دیئے جانے تھے وہ سب قرآن میں اپنی تکمیل کو پہنچ گئے اس لئے ختم نبوت ہو گئی لیکن ترقی معرفت الٰہی اور تکمیل منازل سلوک کے لئے مبشرات کے رنگ میں مکالمات الٰہیہ کا سلسلہ کیوں بند ہو گیا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ غیر انبیاء سے بھی خدا تعالیٰ ہم کلام ہوتا رہا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ لقد کان فی من قبلکم رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن فی امتی احد فعمر۔ بیشک تم سے پہلے لوگوں میں ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوتا تھا گو وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ میری اُمت میں اگر کوئی شخص ایسا ہے تو عمر ہے۔ گویا اس حدیث کے رُو سے یہ مسلم امر ہے کہ آنحضرت صلعم سے قبل ایسے لوگ بھی ہوتے رہے ہیں جن سے خدا ہم کلام ہوتا تھا اور آپ کی اُمت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے۔ چنانچہ حضرت عمر ان میں سے ایک تھے۔ خود رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ لم یبق من النبوۃ الا المبشرات (البخاری) کہ نبوت میں سے باقی نہیں رہا مگر مبشرات۔ انہی مبشرات کو جو جزو نبوت ہے وحی ولایت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے حضرت موسیٰ کی والدہ کو ایک بیکسی اور بے بسی کی حالت میں جب بچے کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ وحی الٰہی تسلی اور اس کی جان بچانے کے لئے کسی ہدایت کی ضرورت تھی تو آج ایک بیکس انسان کو جو خدا کی طرف اپنی مشکلات اور حاجات کو لے جائے اور اس سے اس کی آسانی اور حل کا طلبگار ہو کیوں بشارت اور ہدایت کی ضرورت نہیں۔ حضرت عیسیٰ کی والدہ کو تکمیل منازل سلوک اور ترقی ایمان اور نشان الٰہی کے رنگ میں اگر وحی الٰہی کی ضرورت تھی تو آج اُمت محمدیہ کے ایک فرد کو کیوں اس کی ضرورت نہیں۔ آخر امت محمدیہ نے ایسا کیا قصور کیا ہے جو اس پر ان انعامات اور احسانات الٰہیہ کا دروازہ بند کر دیا گیا لیکن یہ غلط ہے۔ یہ

دروازہ انعامات اور فیضان الٰہیہ کا کھلا ہے اور ہمیشہ کیلئے کھلا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا (یونس) کہ مومنوں کو اس دنیا کی زندگی میں بشارتیں دی جاتی ہیں۔ تتنزل علیھم الملائکۃ (حم السجدۃ) ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کا خدا گوسالہ سامری نہیں جو اپنے پرستار کی دعا کا جواب نہ دے سکے جیسا کہ قرآن میں یہ تنبیہ وارد ہے۔ افلا یرون الّا یرجع الیھم قولًا ولا یملک لھم ضرًا ولا نفعًا (طٰہٰ) کیا ان لوگوں کو اتنی بات بھی سوجھ نہیں پڑتی کہ وہ گوسالہ ان کی بات کا جواب نہ دے سکتا تھا اور نہ ان کو نفع و نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا تھا۔ گویا پرستش اور عبادت کے لائق وہی ہو سکتا ہے جو دعا کرنیوالے کا جواب دے اور دعاؤں کو قبول کر کے اسے نفع و نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہو جس میں یہ نہیں وہ محض ایک بُت اور گوسالہ ہے جو نہ جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہے نہ نفع و نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہے۔ پس قرآن کریم نے جو خدا پیش کیا ہے وہ اپنے پرستاروں کی دعائیں سُنتا اُنہیں نفع پہنچا سکتا اور نقصان سے بچا سکتا ہے اور ان کی دعاؤں کا جواب دیتا ہے بشرطیکہ قلب کے کان اس کی آواز سننے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اور یہ تقویٰ و طہارت سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مقدس اور پاک ذات کسی ایسے قلب سے تعلق نہیں پکڑ سکتی جس میں کسی قسم کی گناہ کی گندگی اور غیر اللہ کی آلائش موجود ہو۔ پس خدا آج بھی بولتا ہے جیسا کہ وہ ہمیشہ سے اپنے برگزیدہ بندوں سے بولتا چلا آیا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سُنتا اور ان کا جواب دیتا ہے۔ اس کے کلام کی صفت اس کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مانا کہ اس کی یہ صفت اس کے ارادہ کے ماتحت معرض فعل میں آتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک خاص وقت کے بعد ہمیشہ کے لئے اس سے الگ ہو جائے اور وہ مطلق بولنا چھوڑ دے۔ خدا کی صفات میں زوال کا [illegible] ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اس کا بولنا ہمیشہ ضرورت اور حکمت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب تک دنیا کو وحی الٰہی کے ذریعہ توحید اور معرفت الٰہی اور حدود اللہ یعنی شریعت کے متعلق ہدایت کی ضرورت تھی وہ انبیاء کے ذریعہ یہ ہدایات نازل فرماتا رہا۔ ان کی وحی کو وحی نبوت یا کتاب کہا جاتا ہے۔ یہ وحی سرکاری وحی تھی جس پر ایمان لانے کے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا اور جو سرکاری قاصد حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ خدا کے رسولوں کو بھیجی جاتی تھی۔ لیکن جب ہدایات الٰہیہ قرآن کریم کی صورت میں اپنی تکمیل کو پہنچ گئیں اور کسی مزید ہدایت کی ضرورت نہ رہی تو ان معاملات کی نسبت مزید وحی کی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے وحی نبوت بند ہو گئی اور نبوت کا کام ختم ہو گیا۔

لیکن وحی نبوت کے بند ہونے سے یہ نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے کہ خدا نے اپنے برگزیدہ بندوں سے مبشرات کے رنگ میں بھی کلام کرنا بند کر دیا۔ بندوں کو تو تکمیل منازل سلوک کے لئے ہمیشہ خدا کے مکالمہ کی ضرورت رہی اور رہے گی۔ خدا کے تکلّم کی صفت اور بندوں کو تکمیل سلوک کے لئے اس کی ضرورت زائل نہیں ہو سکتی۔ پس وحی نبوت کی اگر ضرورت نہ رہی تو وحی ولایت کی ضرورت تو بدستور باقی ہے۔ اور اگر آج حضرت مرزا صاحب اس کا دعویٰ کر کے مذہب کی اس سب سے بڑی ضرورت کو زندہ نہ کرتے تو مذہب کا قصہ ختم تھا۔ کیونکہ مذہب کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ اگر وحی الٰہی کا وجود اب دنیا میں کوئی نہ رہا تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ پہلے بھی تھا۔ اور اگر پہلے زمانہ میں اس کا وجود برحق ہے تو آج یہ کیوں موجود نہیں۔ اگر خدا وہی حی و قیوم اور متکلم خدا ہے تو آج اس نے اپنی عادت کیوں بدل دی۔ پس وحی ولایت کا دعویٰ درحقیقت وحی نبوّت پر بطور ایک دلیل کے ہے کیونکہ اس سے خدا کا انسان کے ساتھ بولنا ثابت ہوتا ہے۔

جن مسلمان علمائے ظاہر نے وحی ولایت کا انکار کیا دراصل اُنہوں نے قرآن و حدیث اور اولیائے امت کے اقوال کی طرف توجہ نہیں کی۔ قرآن و حدیث میں سے چند حوالے میں بطور نمونہ پیش کر چکا ہوں ایسے بہت سے حوالجات اور بھی موجود ہیں۔ تاریخ اسلام کو مطالعہ کرو گے تو صاف نظر آئیگا کہ اُمت محمدیہ میں مکالمات و مخاطبات الٰہیہ کا شرف اولیاء اللہ کو ہمیشہ حاصل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا۔ ہمارے زمانہ میں جو مغربی فلسفہ کے زیر اثر تعلیم یافتہ طبقہ نے مکالمات الٰہیہ کا انکار کیا ہے وہ علم دین سے بے خبری اور موجودہ زمانہ کے مادی فلسفہ کا اثر ہے۔ پس ضروری تھا کہ اس دہریت اور مادہ پرستی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مجدّد اور امام اشاعت و حفاظت اسلام کیلئے کھڑا ہوتا وہ اس زمانہ کی اسی سب سے بڑی دہریت اور الحاد کی بیماری یعنی وحی الٰہی کے انکار کا علاج کرتا جس سے نہ صرف اسلام بلکہ تمام الہامی مذہب کی جڑوں پر تبر چل رہا تھا۔ یہی وجہ ہے جو حضرت اقدس مرزا صاحب نے اپنے وحی و الہام کو دیگر اولیائے امت کی طرح بغیر نشر و اشاعت کے نہیں چھوڑا۔ بلکہ اسے بڑی تحدی اور زور کے ساتھ مشتہر کیا اور تمام منکرین کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور آپ کے پاس ٹھہریں اور وحی الٰہی کے بارے میں نشانات آسمانی کا ملاحظہ کریں اور اپنے شکوک کا ازالہ کریں۔ اسی اشاعت الہام و نشانات آسمانی میں مذہب کی اور اسلام کی زندگی مضمر تھی جسے افسوس ہے کہ لوگوں نے محل اعتراض بنا لیا۔ اور اتنا نہ کیا کہ آپ کی دعوت کو قبول کرتے اور کچھ نہ سہی ایک نیا تجربہ ہی ہوتا۔ آخر اسلام بلکہ مذہب کی زندگی کے لئے اس کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ مکالمات و مخاطبات الٰہیہ کا

وجود مذہب کے لئے بطور بنیاد کے ہے۔ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تو مذہب تو ختم ہو چکا اور اس امر کے ثبوت کے لئے کسی زندہ اور موجود انسان کے اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جب وہ لوگوں کو دعوت عام دے رہا ہو کہ اس کے پاس آ کر وحی الٰہی کے متعلق اپنی تسلی کر لیں اور پھر جب یہ بھی ایک حقیقت ہو کہ جو لوگ آپ کی صحبت میں بیٹھے انہوں نے استجابت دعا اور مکالمات و مخاطبات الٰہیہ کے نمونے اور نشانات اس قدر دیکھے کہ ان پر دن چڑھ گیا۔ بلکہ ان میں سے بعضوں نے علیٰ قدر مراتب استجابت دعا اور مکالمات الٰہیہ کا ذاتی طور پر ایسا تجربہ حاصل کیا جس سے ان کا ایمان یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ اور کیا یہ سچ نہیں کہ موجودہ مادہ پرستی کے زمانہ میں خدا اور اس کے کلام کا جس شدت سے انکار ہوا دیسا انکار دنیا کی تاریخ میں ہمیں کہیں نظر نہیں آتا۔ تو پھر کیا زمانہ کی یہ ضرورت اس امر کا تقاضہ نہ کرتی تھی کہ جو مجدّد و امام اِس صدی کے سر پر خدا کی طرف سے مبعوث ہو اُسے خاص طور پر خدا اپنے مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف فرما دے اور گزشتہ زمانہ کے تمام اولیاء کاملین اور محدثین سے بڑھ کر اس پر یہ انعام ہو تا منکرین الہام دہریوں اور مادہ پرستوں پر حجت تمام ہو۔ اور اس کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ اپنے الہامات اور رؤیا و کشوف کو دیگر مجدّدین و محدّثین کی طرح مخفی نہ رکھے بلکہ بڑے زور سے ان کی اشاعت کرے تا دنیا سے دہریت اور مادہ پرستی کا تخم مٹ جائے۔ اور اپنے تجربہ کو کھول کر بیان کرے اور بتائے کہ الہام اور وحی الٰہی خارج سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے نہ کہ دل سے اُٹھ کر دل پر ہی پڑتا ہے جیسا کہ نیچریوں کا خیال ہے۔ پس حضرت مرزا صاحب کے دعویٰ الہام نے زمانہ کی ایک اشد ضرورت کو پورا کیا۔ اور وہ اس دہریت کی خشک سالی میں زندگی کی ایک بارش کی طرح آیا جس سے ایمان کی کھیتیاں از سر نو زندہ ہو گئیں لیکن خدا کی طرف سے کونسا شخص آیا جس کی اپنی ہی قوم نے مخالفت نہ کی ہو۔ ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون۔ کوئی بھی خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نہ آیا جس کی خود اس کی قوم نے تحقیر اور مخالفت نہ کی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور صحابہ کرام کی خدمات دینیہ اور بزرگی اور تقدس و طہارت کا کون عقلمند انکار کر سکتا ہے۔ مگر آج تک نعوذ باللہ ان پر لعنت بھیجنے والے شیعوں کا گروہ موجود ہے۔ حضرت علی کے تقویٰ و طہارت کے باوجود ان کو کافر قرار دینے والے خوارج اب تک موجود ہیں۔ حضرت امام مالک کو جلا وطن کرنے والے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کو قید کرنے اور زہر پلانے والے حضرت امام شافعی کو کافر اور نعوذ باللہ اضر من ابلیس یعنی شیطان سے زیادہ نقصان رساں کہنے والے۔ امام حنبل کو کوڑے پٹوانے اور جیل خانہ میں ڈالنے والے

حضرت امام بخاری اور حضرت امام غزالی پر کفر کا فتویٰ لگانیوالے حضرت سید عبد القادر جیلانی رح پر پانچسو کفر کے فتوے لگانیوالے۔ حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو کافر قرار دیکر قید کروانیوالے۔ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کروانیوالے۔ حضرت محی الدین شیخ اکبر سرتاج صوفیاں کو کافر بلکہ اکفر کہنے والے اور ان کے کفر میں شک کرنیوالوں کو بھی کافر قرار دینے والے سب مسلمان علما اور ان کے متبعین ہی تھے تو حضرت مرزا صاحب اس سنت سے کیوں باہر رہتے۔ بجائے اس کے کہ مسلمان ان کی اس اسلامی خدمت کو جو بوجہ صاحب حال ہونے کے آپ سے بن آئی اور جس کا اس زمانہ میں کوئی دوسرا شخص اہل نہ تھا قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے خود مسلمانوں نے اس کے ساتھ استہزا کیا اور یہ نہ سمجھا کہ ہم اس طرح خود اپنی جڑوں پر تبر چلا رہے ہیں اور یکے بر سر شاخ و بن مے برید کے مصداق بن رہے ہیں۔ اگر وحی و الہام پر مذہب اور اسلام کی بنا ہے۔ اور اس کا اس مادہ پرستی کے زمانہ میں انکار شدت سے ہو رہا ہے تو اس کا ثبوت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص اُٹھ کر یہ کہتا کہ میں بطور یقین کے اس کے وجود کا علم رکھتا ہوں اس لئے کہ میں اس میں صاحب تجربہ ہوں۔ مرزا صاحب سے دشمنی اور نفرت تھی تو کوئی اور مسلمان علما یا مشائخ میں سے اُٹھتا اور اس حالی ثبوت کو پیش کرتا کیونکہ اس کے سوا اور کوئی ثبوت ہو نہیں سکتا۔ ایک روحانی تجربہ کیلئے مادی دلائل کبھی تسلی بخش نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے تو تجربات روحانی ہی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اور کسی نے تو کیا اُٹھنا تھا۔ جو اُٹھا اُسی کو گرانے کے لئے مسلمان دوڑ پڑے۔ اپنے ہی پہلوان کو ٹانگ سے پکڑ کر گرانے کی کوشش کس ذہنیت پر دلالت کرتی ہے یہی کہ عقل اور ایمان کا نور جا رہا۔ اور جہالت اور بیوقوفی کی ظلمت سر پر سوار ہے۔

اپنے الہامات کو قرآن کی اتباع کے ثمرات کے طور پر پیش کیا

پھر لطف یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے یہ مخالفت اس شخص مرزا غلام احمد کی ہو رہی تھی جو کہتا تھا کہ آج اسلام ہی ایک زندہ مذہب ہے اور قرآن ہی ایک زندہ کتاب اور محمد رسول اللہ صلعم ہی ایک زندہ رسول ہیں۔ اور تمام دیگر ادیان کی نسبت اعلان کیا کہ ممکن ہے کہ ابتدا میں وہ مذاہب خدا کی طرف سے ہوں جیسا کہ ان میں سے بعض تو ضرور تھے مگر اسلام جیسے کامل و مکمل اور عالمگیر مذہب کے آنے کے بعد علیحدہ علیحدہ ان قومی مذاہب کی ضرورت نہ رہی اس لئے وہ مذاہب مردہ ہو گئے اور ان کے ثمرات پیچھے رہ گئے۔ گویا ان میں جو کچھ تھا وہ زمانہ ماضی میں گزر چکا اور اب کچھ نہیں۔ کیونکہ وہ مذاہب زندہ نہیں رہے۔ مگر اسلام چونکہ ایک زندہ مذہب ہے اس لئے اس کے ثمرات تو تی اکلہا کل حین کے مطابق اسی طرح آج بھی ملتے ہیں جس طرح زمانہ ماضی میں ملتے تھے۔ اسلام کے زندہ مذہب ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں ہر زمانہ میں ایسے

متبعین کامل ہوتے رہے ہیں جو خدا سے تعلق پکڑتے اور اس کے مکالمات و مخاطبات سے مشرف ہوتے رہے ہیں۔ اور اس زمانہ میں میرا وجود اس کا زندہ ثبوت ہے۔ میں نے جو کچھ پایا وہ سب قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی اتباع کے ثمرات ہیں۔ آج سوائے اسلام کے کوئی مذہب ایسا نہیں کہ جس کی اتباع سے یہ فیض مل سکے۔ اگر کسی کو دعویٰ ہو تو میرے مقابل پر آئے۔ یہ دعویٰ بڑی بلند آہنگی سے بار بار آپ نے کیا جس میں سے چند اشعار میں یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔ ؎

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے
کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے

کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے
یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے

ہم نے اسلام کو خود تجربہ کر کے دیکھا
نور ہے نور اُٹھو دیکھو سُنایا ہم نے

اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نُور نہ تھا
کوئی دکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے

آزمائش کے لئے کوئی نہ آیا ہر چند
ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے
لو تمہیں طَور تسلّی کا بتایا ہم نے

مصطفےٰ پر ترا بے حد ہو سلام اور رحمت
اس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے

گویا آپ کے ہاتھ پر جو نشانات آسمانی ظاہر ہو رہے تھے اور آپ کو مکالمات و مخاطبات الٰہیہ کا جو دعویٰ تھا اس کا مقصد فقط اس قدر تھا کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اس کا خدا ایک زندہ خدا ہے۔ جو آج بھی اپنے بندوں سے تعلق پکڑتا اور ان پر اپنے فیضان و انعامات کی بارش برساتا ہے مگر اس کو پانے اور اس کے انعامات سے بہرہ اندوز ہونے کا ایک ہی رستہ ہے کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی اتباع کی جائے۔ اس راہ کے سوا اور تمام راہیں خدا تک پہنچنے کی بند ہیں پس حضرت مرزا صاحب نے جو کچھ پیش کیا قرآن اور محمد رسول اللہ صلعم کی صداقت کیلئے پیش کیا۔ جیسا کہ آنحضرت کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

اُس نور پہ فدا ہوں اُس کا ہی میں ہوا ہوں
وہ ہے میں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

پس حضرت مرزا صاحب کی مسلمانوں نے مخالفت کیوں کی یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ بدظنی اور جلد بازی۔ اور اپنی شامتِ اعمال۔ ورنہ آپ کا یہ وہ کارنامہ تھا کہ چاہئے تھا کہ مسلمان اسے سر آنکھوں پر اُٹھا کر رکھتے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ آپ نے اگر ایک طرف دہریوں اور لامذہبوں پر اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وحی الٰہی کے بارے میں صدہا دلائل عقلیہ کے علاوہ یوں حجت

تمام کی کہ مشاہدہ اور تجربہ سے بڑھ کر اور کوئی یقینی دلیل نہیں ہو سکتی اور میں اس میں صاحب تجربہ ہوں کہ میں نے خدا کو پایا اور اس کے مکالمات و مخاطبات کا شرف مجھے حاصل ہے تو دوسری طرف تمام اہل مذاہب پر یوں حجت تمام کی کہ اگر مذہب کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کو خدا سے ملائے تو پھر اسلام کے سوا اب کوئی سچا اور زندہ مذہب نہیں جس کے ذریعہ بندہ خدا کو پاتا اور اس کے مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہوتا ہے اور میں اس میں صاحب تجربہ اور صاحب حال ہوں جس کا دل چاہے میرے مقابلہ پر آوے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جو تیرہ سو سال میں اُمت محمدیہ میں سے کسی بزرگ سے وقوع میں نہیں آیا۔ تمام دنیا کے دہریوں اور ملحدوں اور کافروں اور منکرین وحی و الہام کے مقابلہ میں جس دلیری اور جرأت سے اس خدا کے شیر نے اسلام کے متعلق اپنے مشاہدہ اور تجربہ کو پیش کیا ہے وہ تمام مجددین میں سے آپ کو امتیاز بخشتا ہے۔ اور اس وجہ سے آپ کو مجدد اعظم کے لقب سے پکارا جائے تو نہایت مناسب حال ہے۔ اسلام کی صداقت پر اپنے یقین تام اور کفار کے مقابلہ میں مردانہ وار چیلنج کا ذکر کرتے ہوئے کس شان سے فرماتے ہیں ؎

دگر اُستاد را نامے ندانم | کہ خواندم در دبستانِ محمدؐ
بکارِ دیں نترسم از جہانے | کہ دارم رنگِ ایمانِ محمدؐ
چہ ہیبت ہا بداوند ایں جواں را | کہ ناید کس بہ میدانِ محمدؐ
الا اے دشمنِ نادان و بے راہ | بترس از تیغِ بُرّانِ محمدؐ
رہِ مولیٰ کہ گم کردند مردم | بجو در آل و اعوانِ محمدؐ
الا اے منکر از شانِ محمدؐ | ہم از نورِ نمایانِ محمدؐ
کرامت گرچہ بے نام و نشان است | بیا بنگر ز غلمانِ محمدؐ

مندرجہ ذیل اشعار میں قرآن کریم پر معترض کو کس شان سے للکارتے ہیں۔ ؎

اے عزیزو سُنو کہ بے قرآں | حق کو ملتا نہیں کبھی انساں
جن کو اُس نور کی خبر ہی نہیں | اُن پہ اُس یار کی نظر ہی نہیں
بحرِ حکمت ہے وہ کلام تمام | عشقِ حق کا پلا رہا ہے جام
اُس کے منکر جو بات کہتے ہیں | یونہی ایک واہیات کہتے ہیں
بات جب ہو کہ میرے پاس آویں | میرے منہ پر وہ بات کہہ جاویں
مجھ سے اس دلستاں کا حال سُنیں | مجھ سے وہ صورت و جمال سُنیں

آنکھ پھوٹی تو خیر کان سہی ۔۔۔ نہ سہی یوں ہی امتحان سہی

قرآن کے کامل کتاب ہونے کو مختلف طریق سے ثابت کرکے دکھایا

قرآن کریم کی محبت تو حضرت اقدس مرزا صاحب کے دل میں اس قدر بسی ہوئی تھی کہ جہاں آپ نے اپنے اشعار میں اللہ تعالیٰ سے اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم سے اظہار تعشق کیا ہے جو پہلے بھی عاشقان خدا و رسولؐ کرتے رہے ہیں۔ وہاں آپ نے قرآن کریم سے بھی اظہار تعشق کیا ہے اور بقول ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم یہ خصوصیت حضرت مرزا صاحب کی ایسی ہے جو تمام تاریخ اسلام میں الگ نمایاں نظر آتی ہے اور اس اُمّت مرحومہ کے کسی اور فرد میں نظر نہیں آتی۔ بلکہ آپ کا وظیفہ ہی قرآن کریم تھا۔

تزکیۂ نفس کیلئے قرآن کریم کو وظیفہ بناکر دکھادیا

صوفیوں نے تزکیۂ نفس کے لئے طرح طرح کے چلّے اور وظائف اور اوراد بنا رکھے ہیں۔ مگر حضرت مرزا صاحب کا وظیفہ ہمہ وقت قرآن تھا۔ آپ پر بھی ایک وقت ایسا آیا کہ آپ نے دنیا سے الگ ہوکر ایک مجاہدہ اختیار کیا اور یہ کئی ماہ کا لمبا مجاہدہ تھا۔ مگر اس مجاہدہ میں بھی آپ کا وظیفہ صوم و صلوٰۃ کے علاوہ فقط قرآن کریم تھا گویا آپ نے اپنے عمل سے یہ دکھلا دیا کہ اگر کوئی مسلمان مجاہدہ اختیار کرنا چاہتا ہے یا تزکیۂ نفس کے لئے ریاضت شاقہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ مجاہدہ اور ریاضت شاقہ قرآن کریم کا مطالعہ اور اس کے مطالب پر غور و خوض ہے۔ تاریخ تصوّف میں آپ کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھا جانے کے قابل ہے کیونکہ آپ نے اس طرح مجاہدات تصوّف میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا ہے جو عین مطابق حکم خدا و رسولؐ ہے اور جس سے بہتر طریق مجاہدہ و ریاضت کا ہو نہیں سکتا۔ قرآن کریم کی محبت حضرت مرزا صاحب کے نہ صرف دل میں اور زبان پر تھی بلکہ عمل سے اس قدر نمایاں تھی کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ آپ کے تمام اقوال اور اعمال قرآن کریم کی اطاعت سے پُر تھے۔ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

یک قدم دُوری ازاں روشن کتاب ۔۔۔ نزد ما کفر است و خسران و تباب

قرآن کریم کی صداقت پر دلائل

قرآن کریم پر حضرت اقدس مرزا صاحب جس طرح خود عاشق تھے اسی طرح آپ کی شب و روز کوشش یہ تھی کہ ایک عالم کو اس کا عاشق بنا دیا جائے۔ اس لئے آپ نے شب و روز خدمت قرآن کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ سب سے پہلی معرکۃ الآرا کتاب جو آپ نے تصنیف فرمائی وہ براہین احمدیہ تھی جو قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صداقت پر دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کا ایک مجموعہ ہے جن کے ذریعہ سے آپ نے ہر ایک

مذہب پر اتمام حجت کیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا پورا نام ہے۔ البراھین الاحمدیہ علیٰ حقیقۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ۔ اس کے بعد بھی تمام عمر تصنیف و تالیف ٹریکٹ اور اشتہارات تقریر و تحریر کے ذریعہ خدمت قرآن ہی آپ کا مشغلہ رہا۔ اور مختلف آیات قرآنی کی جو تفسیر آپ کی قلم سے نکلی ہے وہ علم و حکمت کا ایک سمندر ہے جس کی نظیر تیرہ سو سال کی جملہ تفاسیر میں کہیں نظر نہیں آتی۔ آپ کی تفسیر کی شان ہی جدا ہوتی ہے۔ ایسے ایسے معارف و حقائق آلہیہ اور غوامض و اسرار روحانی اس میں نظر آتے ہیں کہ انسان حیرت سے سر دھنتا ہے اور دل بول اُٹھتے ہیں کہ یہ تفسیر روح القدس کی تائید سے لکھی گئی ہے جنہوں نے جلسہ اعظم تحقیق مذاہب میں آپ کے مضمون میں آیات قرآنی کی تفسیر سنی ہے یا پڑھی ہے وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر جو حضرت مرزا صاحب کی قلم سے نکلی ہے اس سے مسلمانوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور اُن کے دل و دماغ علم و حکمت کی روشنی سے منور ہوگئے۔ ورنہ مسلموں کے سر قرآن کریم کی عظمت اور علم و حکمت کے سامنے جھک گئے اور بے اختیار ان کی زبان سے تحسین و آفرین کی صدا بلند ہوگئی۔ جنہوں نے آپ کی تصنیف آئینہ کمالات اسلام اور براہین احمدیہ حصہ پنجم پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ بعض دفعہ چند آیات کی تفسیر اور اس کے معارف و حقائق سینکڑوں صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں اور علم و حکمت کا ایک سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آپ کی تفاسیر کو پڑھ کر صاف نظر آنے لگتا ہے کہ واقعی مسلمانوں کی ہر ایک مشکل کا حل اور ہر ایک اعتراض اور وسوسہ کا جواب قرآن کریم میں موجود ہے۔

عظمت قرآن کو مخالفین کے مقابلہ میں ثابت کرکے دکھا دیا

قرآن کریم کی عظمت کو مخالفین اسلام کے مقابل پر جس خوبی کے ساتھ حضرت اقدس مرزا صاحب نے ثابت کرکے دکھایا ہے اور انہیں لاجواب کیا ہے اس میں آپ کی نظیر متکلمین میں کہیں نہیں ملے گی۔ آپ نے تحدی کے طور پر تین باتیں مخالفین کے سامنے پیش کیں اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی الہامی کتاب کو ان میں سے کسی ایک معیار پر پرکھ کر دکھائیں۔

(۱) اوّل یہ کہ قرآن کریم تمام مذہبی صداقتوں کا جامع ہے۔ اور کوئی مذہبی صداقت ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جو کسی مذہبی کتاب نے پیش کی ہو یا آج کسی شخص کے ذہن میں آسکے اور وہ قرآن کریم میں موجود نہ ہو۔ اور جو مذہبی صداقت بھی اس میں ہے وہ اپنی کامل اور مکمل شکل میں ہے۔

(۲) قرآن کریم نے تمام عقائد باطلہ کی جو دنیا کی کسی قوم میں پائے جاتے ہوں دلائل کے ساتھ تردید کی ہے۔

(۳) قرآن کریم نہ صرف ہر ایک دعویٰ کو خود پیش کرتا ہے بلکہ اس کے دلائل بھی خود دیتا ہے۔

الغرض حضرت مرزا صاحب نے قرآن کریم کو جسے اس زمانہ میں مسلمانوں نے محض تعظیم کیلئے گھروں میں رکھا ہوا تھا یا زیادہ سے زیادہ تلاوت کے ثواب کے لئے سمجھا ہوا تھا۔ جنگ مذاہب میں دنیا کا زبردست ترین حربہ ثابت کیا مگر اس ناشکری کا کیا علاج کہ اسی عظیم الشان محسن کو ہمارے مکفر علماء نے دشمن اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی۔

قرآن کریم کو ایک علم و حکمت کی کتاب ثابت کیا

حضرت اقدس مرزا صاحب نے نہ صرف غیر مذاہب کے مقابلہ پر قرآن کریم کی عظمت کو ظاہر کیا بلکہ آپ نے قرآن کریم کو علم و حکمت اور معرفت الٰہی اور روحانیت کے سائنس کی ایک مکمل کتاب ثابت کیا۔ اور یہ دکھایا کہ آج جس قدر وساوس اور اعتراضات دہریت اور مادی تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں ان سب کا جواب اور علاج قرآن شریف میں موجود ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا کہ جسقدر علم اور سائنس دنیا میں ترقی کرے گی اسی قدر قرآن کریم کی عظمت و شان بھی زیادہ ظاہر ہوگی۔ خواجہ کمال الدین مرحوم مسلم مشنری انگلستان فرماتے تھے کہ ایک دفعہ دہریوں کے ایک جلسہ میں مجھے اسلام پر تقریر کرنے کا موقعہ ملا۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا وقت تھا۔ پانچ منٹ سوال کے لئے اور پانچ منٹ جواب کیلئے مقرر تھے۔ پانچ منٹ میں اعتراض کرنا تو آسان ہے مگر جواب دینا کس قدر مشکل ہے۔ لیکن میں نے اس قدر برجستہ جواب دیئے کہ یورپ کے دہریوں کی عقل دنگ ہوگئی۔ لیکن اس کامیابی کا سہرا درحقیقت حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ کے سر پر ہے اس لئے کہ ان دہریوں کا کوئی اعتراض نہ تھا جس کا جواب میں حضرت اقدس مرزا صاحب کی تصنیفات میں پڑھ نہیں چکا تھا۔ پنجاب کے ایک گاؤں کا رہنے والا جو کبھی اپنے گاؤں سے نہیں نکلا۔ اگر کبھی نکلا تو سیالکوٹ اور لاہور سے آگے نہیں گیا یا زیادہ سے زیادہ پنجاب کے اندر ہی شاذ و نادر سفر کیا۔ جسے مادی سائنس اور نئے دریافت شدہ علوم سے قطعاً مس نہیں جو انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتا۔ باتیں سنو تو ایسی بھولی بھالی کہ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ اس قدر سادگی اور دنیا سے بے خبری کی حالت میں یہ شخص دہریت اور مادہ پرستی کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہے تو تمام علوم جو موجودہ زمانہ میں لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط ہیں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں اور اس کے قلم سے ان تمام وساوس اور اعتراضات کا جواب اس طرح اور اس خوبصورتی سے نکل جاتا ہے کہ اس کا ایک مرید یورپ

جاتا ہے تو وہاں کے دہریہ اور مادہ پرست جو بھی اعتراض کرتے ہیں ان کے جواب اپنے مرشد کی کتاب میں موجود پاتا ہے اور ان دہریوں کو لاجواب کر دینے میں ذرا بھی تو دیر نہیں لگتی۔ اس کے علاوہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے ملانوں کی اختراع کردہ تمام بدعات اور زوائد سے پاک کر کے اسلام کا وہ زر خالص اپنی جماعت کے ہاتھ میں دیا کہ یورپ ایشیا کے داناؤں کی جس مجلس میں پیش کیا گیا ان کے دل اس کی صداقت کے آگے جھک گئے۔ ایک دفعہ خواجہ کمال الدین مرحوم نے یورپ میں بڑے بڑے حکما اور داناؤں کی مجلس میں جب اسلام کو پیش کیا تو پریذیڈنٹ نے اٹھ کر کہا کہ قابل لیکچرار نے جو مذہب پیش کیا ہے وہ ٹھیک میرے دل کا مذہب ہے۔ اس پر سامعین میں سے ایک انگریز نے اٹھ کر کہا کہ نہ صرف آپ کا بلکہ سامعین میں سے ہر ایک کے دل کا مذہب یہی ہے کہ عین مذہب فطرت ہے قرآن کریم میں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بل ھو آیات بینٰت فی صدور الذین اوتوا العلم وما یجحد بآیاتنا الا الظالمون ہ (العنکبوت) یعنی یہ قرآن کریم دلائل و براہین سے پُر آیات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں ہیں یعنی ان کے دل ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں اگر وہ انصاف سے کام نہ لیں تو انکار کر دیں۔ لیکن انصاف سے کام لیں گے تو دل بول اٹھیں گے کہ یہ مذہب تو ہمارے دل کا ہے۔ پس قرآن کریم کا یہ دعویٰ اس مادہ پرستی اور دہریت کے زمانہ میں حضرت اقدس مرزا صاحب نے اپنے علم لدنّی سے سچ ثابت کر کے دکھا دیا۔

مسلمانوں کی دینی مشکلات کا حل قرآن کریم سے کیا

حضرت اقدس مرزا صاحب نے جس طرح غیر مذاہب پر قرآن کریم کے ذریعہ سے اتمام حجت کیا۔ مسلمانوں کی دینی مشکلات یعنی ان کے اندرونی اختلافات کا علاج بھی آپ نے قرآن کریم کو ہی بتایا۔ اور تمام اختلافات کو اس طرح حل کرنے کی ہدایت دی کہ قرآن کریم کو سب پر مقدم کیا جائے اور حدیث کو اس حد تک قبول کیا جائے کہ وہ قرآن کریم کے خلاف نہ ہو۔ اور اجتہاد ائمہ کو اس حد تک مانا جائے کہ وہ قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو۔ یوں صرف مسلمانوں کو قرآن کریم کی اس عظمت کی طرف توجہ دلائی جس کا وہ مستحق تھا۔

مسلمانوں کی دنیوی مشکلات کا حل قرآن کریم سے کیا

حضرت اقدس مرزا صاحب نے نہ صرف مسلمانوں کی دینی مشکلات کو قرآن کریم سے حل کرنے کی راہ بتلائی بلکہ آج دنیا میں جو ہر قسم کی جدوجہد جاری ہے اس میں بھی مسلمانوں کی ہر قسم کی مشکلات کو حل کرنے کا ذریعہ قرآن کریم کو ہی بتایا۔ اور صاف طور پر دکھلا دیا کہ ان کی دنیوی ترقی اور دوسری قوموں پر برتری بھی قرآن کریم کو ہی مشعل راہ بنانے سے وابستہ ہے اور بتایا کہ قرآن کریم کی ہدایات ابدی صداقتیں ہیں جس طرح پہلے مسلمانوں نے صرف قرآن کو اپنا

رہنما بنا کر دنیوی فلاح حاصل کی اسی طرح آج بھی مسلمانوں کی دنیوی فلاح قرآن کریم سے ہی وابستہ ہے اور یوں توجہ دلائی کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ قرآن کریم کو پڑھے اور اسے سمجھے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے اور اپنی تمام دینی و دنیوی مشکلات میں اسی سے نور و ہدایت حاصل کرے۔

جہاد بالقرآن کو رائج دیا اور اس طرح مسئلہ جہاد کی اصلاح کی

جہاد اسلام میں ایک اہم فریضہ ہے لیکن کچھ تو اکثر مولویوں کی نا سمجھی اور کچھ پادریوں کے پروپاگنڈے کے اثر سے عام طور پر مسلمانوں میں جہاد کے مفہوم میں ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی جسے حضرت مرزا صاحب نے دُور کرنا ضروری سمجھا اور وہ غلط فہمی یہ تھی کہ گویا جہاد کے معنے ہیں تلوار سے اشاعت دین کرنا۔ یہ غلطی ایسی تھی جس نے اسلام کے خلاف پروپاگنڈا کرنے میں پادریوں اور اسلام کے دشمنوں کو بہت مدد دی اور اہل علم اور معقول طبقہ کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت بیٹھ گئی۔ کیونکہ صداقت اپنے منوانے کے لئے کسی تلوار اور جبر و اکراہ کی محتاج نہیں ہوتی وہ خود دلوں کو مسخر کرتی چلی جاتی ہے۔ کسی صداقت کو قبول کرنے کے لئے قلوب براہین اور دلائل سے فتح ہوتے ہیں۔ تلوار کسی کو نہیں منوا سکتی کہ فلاں عقیدہ درست ہے۔ کوئی شخص تلوار سے ڈر کر اگر کسی عقیدہ کو مان بھی لے تو اس کا دل اس کو مان نہیں سکتا پس جبر و اکراہ سے منافقت پیدا ہوتی ہے۔ ایمان نہیں پیدا ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم نے صاف لفظوں میں یہ اعلان فرمایا ہے۔ **لا اکراہ فی الدین** (البقرہ) کہ دین میں کوئی جبر و اکراہ اور زبردستی نہیں۔ پھر فرمایا۔ افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین (یونس) کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لے آویں۔ گویا اکراہ سے ایمان نہیں پیدا ہوا کرتا۔ پس جب خود قرآن اس کے خلاف ہے تو پھر تلوار سے اشاعت دین کیا معنی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو دین کی خاطر تلوار پکڑنی پڑی مگر وہ اسلام کی حفاظت کے لئے تھی نہ کہ اشاعت کے لئے۔ برابر تیرہ برس تک کفار مکہ نے طرح طرح کے مظالم مسلمانوں پر توڑے تاکہ وہ اس سچے مذہب کو چھوڑ دیں جو آنحضرت صلعم لائے تھے۔ اور اس کی خاطر انہوں نے ہر طرح کی جابرانہ اور ظالمانہ کاروائیاں کیں جن کو پڑھ کر رونا آتا ہے۔ نہایت بے رحمی سے خدا کے وفادار بندوں اور نوع انسان کے فخر لوگوں کو ان شریر درندوں نے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بعض کی ٹانگیں پکڑ کر چیر دیں۔ اور یتیم بچوں اور عاجز اور مسکین عورتوں کو گلی کوچوں میں ذبح کر ڈالا۔ خدا کے پاک اور مقدس رسول کو جس پر زمین اور آسمان سے بے شمار سلام ہوں بارہا پتھر مار مار کر خون سے آلودہ کر دیا گیا۔ مگر باایں ہمہ خدا تعالیٰ کی طرف سے قطعی طور پر یہ تاکید تھی کہ شر کا مقابلہ ہرگز نہ کرو کہ خدا بغاوت اور فساد کو پسند نہیں کرتا۔ برابر تیرہ برس تک یہ مظالم جاری رہے

ان ظالموں نے تیس برس تک مقابلہ کر کے مسلمان مردوں اور عورتوں اور بچوں کو بھوک سے تڑپایا اور مکہ کی زمین ان خدا کے فرمانبردار بندوں پر جو ان تمام سختیوں کو محض خدا کے لئے صبر سے برداشت کر رہے تھے تنگ ہو گئی اور خود رسول کریم صلعم کے شہید کرنے کے لئے زبردست منصوبے کئے گئے۔ تب جا کر جناب الٰہی کی طرف سے فقط ہجرت کرنے کا حکم ہوا۔ لڑنے کا حکم پھر بھی نہ ہوا جب حضرت نبی کریم صلعم اور آپ کی چھوٹی سی جماعت ہجرت کر کے مدینہ چلی گئی تو مکہ والوں نے دیکھا کہ اسلام تو اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا گھر کر گیا ہے کہ اُسے کسی صورت مٹایا نہیں جا سکتا اس لئے مناسب ہے کہ ان ماننے والوں کو اور اس مذہب کے بانی کو ہی مٹا دیا جائے تا اس طرح یہ مذہب دنیا سے مٹ جائے۔ چنانچہ وہ اس مقصد کے لئے ایک فوج گراں لیکر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ تب خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ اب دین کی حفاظت کے لئے تم کو جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اُذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا ان اللہ علی نصرھم لقدیر۝ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر الحق (الحج) یعنی خدا نے ان مظلوم لوگوں کی جو قتل کئے جاتے رہے اور ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے فریاد سُن لی۔ اُن کو اب جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن اس جنگ پر بھی دو حد بندیاں عائد کر دیں۔ اوّل یہ کہ قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۝ (البقرہ) کہ اللہ کے رستہ میں جنگ کرو مگر انہی سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھنا خدا حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں صاف شرط لگا دی کہ یہ جنگ مدافعت ہے۔ لہذا انہی سے لڑ سکتے ہو جو تم سے لڑیں۔ جو تم سے نہیں لڑتے اُن سے لڑنا حد سے بڑھنا ہے۔ اور حد سے بڑھنا خدا کو پسند نہیں۔ دوسرے یہ کہ جہاں جنگ ختم ہو جانی چاہئے اُس کی بھی تصریح فرما دی۔ فرماتے ہیں:- وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ (البقرہ) اور جنگ کرو یہاں تک کہ مومنوں کی ایذا رسانی کا خاتمہ ہو جائے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے یعنی مذہبی آزادی کامل طور پر حاصل ہو جائے اور لوگوں کا مذہب اللہ کے لئے ہو۔ کسی غیر اللہ کے ڈر اور خوف سے نہ ہو محض خدا کے لئے کسی کا مذہب ہونے کے یہی معنے ہیں کہ اُسے ضمیر اور مذہب کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔ پس ان آیات میں یہ بات صاف کر دی کہ یہ جنگ مدافعت اور مذہبی آزادی کے لئے ہے۔ جب یہ حاصل ہو جائے تو جنگ کو ختم کرو۔ جس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں مذہب کے لئے جنگ کرنا خاص حالات میں اور نہایت

شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ جب وہ حالات اور شرائط موجود نہ ہوں تو مذہب کے لئے جنگ کرنا جس کا دوسرا نام جہاد بالسیف ہے جائز نہیں بلکہ اسے اعتدا فرمایا یعنی حد سے بڑھ جانا جو خدا کو پسند نہیں۔

حضرت مرزا صاحب نے جہاد کا حکم منسوخ نہیں کیا

حضرت مرزا صاحب نے جہاد کے حکم کو منسوخ نہیں کیا جو ایسا کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ اور آپ پر افترا کرتا ہے۔ ہمارے مولوی مُلاّ تو قرآن میں ناسخ و منسوخ آیتوں کے قائل ہیں۔ حضرت مرزا صاحب تو کسی ناسخ منسوخ کے قائل نہ تھے۔ وہ سارے قرآن کو واجب التعمیل سمجھتے تھے اور اس میں سے ایک شوشہ کی بھی کمی بیشی کو کفر اور الحاد سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی تصنیف نشان آسمانی میں حضرت مرزا صاحب فرماتے ہیں:

"اور اس بات پر محکم ایمان رکھتا ہوں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور آنجناب کے بعد اس اُمت کیلئے کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیا ہو یا پرانا۔ اور قرآن کریم کا ایک شوشہ یا نقطہ منسوخ نہیں ہوگا"

اسی قسم کی اور بھی تحریریں ہیں۔ اتنی صریح تحریروں کے بعد حضرت مرزا صاحب پر یہ بہتان باندھنا کہ آپ نے جہاد کے قرآنی حکم کو منسوخ کیا صریح ظلم اور شرارت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ جو شخص قرآن کریم کے ایک شوشہ کے بھی نسخ کا قائل نہ ہو اُسے قرآن کریم کے ایک حکم کو منسوخ کرنیوالا قرار دینا کس قدر ناانصافی اور بہتان طرازی ہے۔

حضرت مرزا صاحب نے مسئلہ جہاد میں غلط فہمی کو رفع کیا

حضرت مرزا صاحب کا مجدد اور مصلح ہونے کا دعویٰ تھا۔ وہ صریح دیکھ رہے تھے کہ پادری شب و روز یہ پراپگنڈا کر رہے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا اور ان کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے آریوں نے بھی یہی غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ بدقسمتی سے نادان دوست مولویوں کے عقیدے بھی یہی تھے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ صاحب عقل اور ارباب بصیرت میں اسلام بدنام ہو رہا تھا۔ اسی طرح مہدی معہود کے متعلق مسلمانوں کا عام طور پر یہی خیال تھا کہ وہ جب آئے گا تو بنوک شمشیر دین اسلام پھیلائے گا۔ اسلام کے خوبصورت چہرہ پر یہ بدنما داغ تھے جن کو مٹانا ایک مصلح کا کام تھا۔ حضرت مرزا صاحب نے بتایا کہ اسلام میں کسی کافر کو بلاوجہ قتل کرنا قطعاً جائز نہیں چہ جائیکہ اس کا نام جہاد رکھا جائے۔ قرآن کریم میں تو یہ لکھا ہے کہ

ولتکن منکم اُمۃٌ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون ہ (آل عمران) کہ تم میں ہمیشہ ایک جماعت رہنی چاہئے جو لوگوں کو اسلام اور بھلائی

کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم کرے اور بدی کو روکے اور یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں۔ لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ تم میں ایک جماعت ہمیشہ رہنی چاہیئے جو کافروں کو قتل کرے اور ان کو اپنے دین میں جبراً داخل کرے (دیکھو نور الحق حصہ اوّل) بیشک دشمن سے بچنے کے لئے حفاظت کا سامان مہیا رکھنے کا حکم ہے۔ لیکن دشمن سے بچنے کے لئے فوج اور جنگ کا سامان تیار رکھنا اور بات ہے۔ اور زبردستی کافروں کو اسلام میں داخل کرنا یا ان کو محض ان کے کفر کی وجہ سے قتل کرنا یہ امر دیگر ہے۔ کفار سے دین کیلئے جنگ کرنے کا حکم بیشک ہے مگر اس حالت میں کہ جب وہ دین سے روکیں اور اسلام کا نور بجھانے کے لئے منصوبے کریں اور دشمنوں کے مقام پر کھڑے ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جنگ کرنا مقصد قرآن میں سے نہیں۔ ہاں بعض حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا جن میں جنگ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ پس اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا آپ کے زمانہ میں ہندوستان کی انگریزی حکومت سے جنگ کرنا جہاد کہلا سکتا ہے حضرت مرزا صاحب نے جو کچھ جواب دیا میں اس کے اصل الفاظ یہاں نقل کر دیتا ہوں فرماتے ہیں

"لا شك ان وجوه الجهاد معدومة في هذا الزمن وهذه البلاد" (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ)

یعنی جہاد کی شرائط اس ملک میں اور اس زمانہ میں پائی نہیں جاتیں۔ آپ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جہاد کا حکم اب منسوخ ہے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ جہاد بالسیف کی شرائط اس ملک میں اور اس زمانہ میں نہیں پائی جاتیں۔ یہی بات جب گاندھی نے کہی اور عدم تشدد کو صحیح رستہ بتایا تو بڑے بڑے مسلمان علماء اس کے پیچھے ہو گئے۔ یہی بات مولانا محمد علی خاں مرحوم نے کہی تو سارے ہندوستان سے صدائے تحسین و مرحبا بلند ہوئی۔ لیکن سب سے پہلے جب یہی بات حضرت مرزا غلام احمد صاحب نے کہی تو سب آگ بگولا ہو گئے تھے۔ اسی کا نام ہوتا ہے تعصب اور بغض۔ ورنہ آخر کیا وجہ کہ وہی بات حضرت مرزا صاحب کہیں تو بہت بری۔ اور ایک ہندو کہے تو سب مسلمان اس کو اٹھا کر سر پہ رکھ لیں۔ اور ایک دوسرا مسلمان کہے تو وہ قوم کا سچا لیڈر کہلائے

جہاد بالقرآن کو رواج دیا

الغرض حضرت اقدس مرزا صاحب نے مسئلہ جہاد سے غلط فہمی کو رفع کیا اور بتایا کہ جہاد بالسیف ایک وقتی چیز اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے اصلی جہاد جس کا قرآن کریم میں حکم ہے وہ ہے جہاد بالقرآن جیسا کہ قرآن کریم میں حکم ہے کہ جاھدھم بہ جہاداً کبیراً کہ کفار کے ساتھ قرآن کریم کے ذریعہ جہاد کبیر کرو۔ یعنی قرآن ہی وہ زبردست حربہ ہے جسے ہاتھ میں لیکر مسلمانوں کو باطل کی فوج پر حملہ آور ہونا چاہیئے چنانچہ حضرت اقدس مرزا صاحب کا اپنا یہی معمول تھا کہ جب کسی اہم مسئلہ پر لکھنے کی ضرورت

پیش آئی تو اس مسئلہ کو ذہن میں رکھ کر ایک دفعہ سارے قرآن شریف کو پڑھ جاتے تاکہ قرآن کریم سے اس مسئلہ کے متعلق ہدایت اور روشنی حاصل کریں۔ بلکہ ساتھ ساتھ وہ آیات بھی نوٹ کرتے جاتے جو اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔ اور یہی ہدایت آپ کی طرف سے کل مسلمانوں کو تھی کہ ہر مشکل کے لئے قرآن کریم کی طرف رجوع کرو۔ اور جو دلیل دو قرآن کریم سے دو۔ خدائی دلیلوں کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ گویا ہر ایک کفر اور باطل کی فوج کے مقابلہ میں قرآن کریم کے حربہ سے کام لو۔ اس جہاد بالقرآن کو اس غلبۂ کفر کے زمانہ میں رواج دینا آپ کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ اور جو کامیابی اس میں آپ کو حاصل ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے کہ باطل کی فوج کو ہر جگہ آپ کے اور آپکے شاگردوں کے لٹریچر کے مقابلہ میں شکست فاش ہوئی۔ آپ کے ملفوظات میں سے ایک اقتباس میں یہاں پیش کرتا ہوں جس میں آپ نے جہاد بالقرآن پر زور دیتے ہوئے سیف کی بجائے قلم سے کام لینے کی تاکید فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"ابتدائے اسلام میں دفاعی لڑائیوں اور اسلامی جنگوں کی اس لئے بھی ضرورت پڑتی تھی کہ دعوت اسلام کرنے والے کا جواب ان دنوں دلائل و براہین سے نہیں بلکہ تلوار سے دیا جاتا تھا اس لئے لاچار جواب الجواب میں تلوار سے کام لینا پڑا۔ لیکن اب تلوار سے جواب نہیں دیا جاتا بلکہ قلم اور دلائل سے اسلام پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے چاہا ہے کہ سیف (تلوار) کا کام قلم سے لیا جائے۔ اور تحریر سے مقابلہ کرکے مخالفوں کو پست کیا جائے۔ اس لئے اب کسی کو شایاں نہیں کہ قلم کا جواب تلوار سے دینے کی کوشش کرے۔ ع گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی۔ اس وقت جو ضرورت ہے وہ یقیناً سمجھ لو سیف کی نہیں بلکہ قلم کی ہے۔ ہمارے مخالفین نے اسلام پر جو شبہات وارد کئے ہیں اور مختلف سائنسوں اور مکائد کے رو سے اللہ تعالیٰ کے سچے مذہب پر حملہ کرنا چاہا ہے۔ اس نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ میں قلمی اسلحہ پہن کر اس سائنس اور علمی ترقی کے میدان کارزار میں اتروں اور اسلام کی روحانی شجاعت اور باطنی قوت کا کرشمہ بھی دکھلاؤں۔ میں کب اس میدان کے قابل ہو سکتا تھا۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اس کی بیحد عنایت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میرے جیسے عاجز انسان کے ہاتھ سے اس کے دین کی عزت ظاہر ہو۔ میں نے ایک وقت ان اعتراضات اور حملات کو شمار کیا تھا جو اسلام پر ہمارے مخالفین نے کئے ہیں تو ان کی تعداد میرے

خیال اور اندازہ میں تین ہزار ہوئی تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تو تعداد اور بھی بڑھ گئی۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اسلام کی بنا ایسی کمزور باتوں پر ہے کہ اس پر تین ہزار اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ اعتراضات تو کوتہ اندیشوں اور نادانوں کی نظر میں اعتراض ہیں۔ مگر میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے جہاں ان اعتراضات کو شمار کیا وہاں یہ بھی غور کیا ہے کہ ان اعتراضات کی تہ میں دراصل بہت سی نادر صداقتیں موجود ہیں جو عدم بصیرت کی وجہ سے معترضین کو دکھائی نہیں دیں"

جہاد بالقرآن سے مسلمانوں میں وحدت پیدا کی

حضرت اقدس مرزا صاحب نے جہاد بالقرآن پر مسلمانوں کو لگا کر ان میں وحدت پیدا کی۔ آپ نے فرمایا کہ فقہی فروعی مسائل پر مسلمانوں کا باہم لڑنا اور جھگڑنا مسلمانوں کو کمزور اور برباد کر رہا ہے۔ اختلافی مسائل دراصل وسعت دین پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر کسی نے آمین زور سے کہہ لی یا آہستہ کہہ لی۔ رفع یدین کی یا نہ کی۔ رفع سبابہ کیا یا نہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ ان میں جھگڑنا غلطی ہے۔ یہ اختلافات ان مسائل کی وسعت پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی فروعی مسئلہ میں جس میں اختلاف آرا موجود ہے ایک طریق کو ترجیح دیتا ہے تو اس اختلاف رائے کی عزت کرنی چاہیئے اور دوسرے آدمی کو جو اس مسئلہ میں دوسرے طریق کو ترجیح دیتا ہے اس پہلے آدمی سے لڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس وسعت کو تنگی نہیں بنانا چاہیئے۔ اگر دلائل سے ایک شخص دوسرے کو اپنا ہم خیال بنا سکتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس وسعت کو تنگی میں بدل کر اس پر باہم لڑنا جھگڑنا اور مسلمانوں میں ان مسائل کی وجہ سے تفرقہ پیدا کرنا سخت غلطی ہے۔ اس وقت کفار کا حملہ اسلام اور مسلمانوں پر ہے۔ پس سب مسلمانوں کو جب وہ اصولی طور پر باہم متفق و متحد ہیں۔ دشمنان اسلام کے مقابلہ میں متحدہ محاذ قائم کرنا چاہیئے۔ اور قرآن کریم کا حربہ ہاتھ میں لیکر اس جہاد میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔ گویا مسلمانوں کی توجہ کو اندرونی فروعی اختلافات سے ہٹا کر آپ نے دشمنان اسلام کے ساتھ جہاد بالقرآن کی طرف پھیرا۔ اور ان کی قوت کو آپس کی تفرقہ بازی میں ضائع ہونے سے بچا کر دشمنان اسلام کے مقابل میں لگایا۔ کاشکہ سب مسلمانوں کا اس اصول پر عمل ہو جائے تو آج مسلمانوں سے تفرقہ مٹ کر اسلام کے بہتر دن آجائیں اور کفار کے حملے اسلام پر ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں۔ راہ تو مجدد وقت بتا گیا اب عمل کرنا مسلمانوں کا کام ہے۔

حضرت مرزا صاحب کے جہاد بالقرآن میں شغف کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ جب حضرت علامہ مولوی نور الدین مرحوم نے آپ کی بیعت کی تو عرض کی کہ سب اہل اللہ اپنے مریدوں

کو کوئی وظیفہ تزکیۂ نفس کے لئے بتاتے ہیں۔ آپ مجھے کیا وظیفہ بتاتے ہیں۔ فرمانے لگے۔ جہاد۔ مولوی صاحب حیران رہ گئے۔ عرض کی کہ کیا تلوار لیکر کافروں سے لڑوں۔ فرمایا نہیں، کافروں سے جہاد بالقرآن کرو۔ عرض کی کس طرح۔ فرمایا۔ عیسائیت کے رد میں ایک کتاب لکھو۔ مولوی صاحب یہ سن کر بھیرہ چلے گئے۔ وہاں جا کر سنا کہ کئی ایک تعلیم یافتہ مسلمان عیسائی ہونے کو تیار ہیں۔ کیونکہ وہ ایک پادری کے اعتراضات سے متاثر ہیں جو اس نے اسلام کے خلاف جمع کئے ہیں۔ مولوی صاحب اس پادری سے ملے تو اس نے اسلام پر تین سو اعتراضات لکھ کر مولوی صاحب کو دیئے۔ مولوی صاحب نے ان میں سے ڈیڑھ سو اعتراضات کے جواب لکھ کر **فصل الخطاب** کے نام سے ایک کتاب شائع فرمائی جس کو پڑھ کر وہ تمام مسلمان جو عیسائی ہونے کو تیار تھے از سر نو دل سے مسلمان ہوئے۔ اس کے بعد مولوی صاحب حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام ماجرا عرض کیا۔ حضرت اقدس بہت خوش ہوئے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا اب کیا کروں۔ فرمایا۔ جہاد۔ اب آریوں کے خلاف ایک کتاب لکھو۔ مولوی صاحب نے پھر لیکھرام کی کتاب تکذیب براہین احمدیہ کے خلاف تصدیق براہین احمدیہ لکھی جس میں پادری کے بقیہ ڈیڑھ سو اعتراضات کا جواب بھی آگیا۔ غرضیکہ جس شخص کا مقصد جہاد بالقرآن ہو اسے جہاد کا منکر قرار دینا کس قدر ظلم عظیم ہے

حضرت مرزا صاحب نے اصل اسلامی جہاد کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا

حضرت مرزا صاحب سے بڑھ کر اور کون جہاد کا شیدائی ہو سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے مسلمان زبانی دعوے جہاد کرتے رہتے ہیں۔ اور کرتے کراتے کچھ نہیں۔ اور حضرت مرزا صاحب عملی طور پر شب و روز جہاد میں مشغول تھے۔ آپ کے نزدیک جہاد کی تین قسمیں تھیں:-

(۱) **انفرادی جہاد**۔ جو انسان کو اپنے نفس سے کرنا چاہئے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت) کہ جو لوگ ہماری طلب میں جہاد یعنی جد و جہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنا رستہ دکھا دیتے ہیں۔ یہ تو تزکیہ نفس کے لئے جہاد ہوا جو ہر ایک مسلمان کو کرنا چاہیئے۔

(۲) **جہاد بالسیف**۔ جو بطور ایک جماعت کے مسلمانوں کو اس وقت کرنے کا حکم ہے جب دین کے لئے دوستائے جائیں اور ان کو یا ان کے دین کے مٹانے کیلئے دشمن تلوار سے حملہ کرے جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ (البقرہ) اور اللہ کے رستہ میں جنگ کرو ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے

نہ بڑھو۔ یہ جہاد شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

(۳) **اجتماعی جہاد**۔ جو انفرادی یا اجتماعی طور پر ہمہ وقت مسلمانوں کو کرنے کا حکم ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ ولتکن منکم اُمۃٌ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر۔ اولئک ھم المفلحون ۰ (آل عمران) اور چاہیئے کہ تم میں ہمیشہ ایک جماعت موجود رہے جو لوگوں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دیتی رہے اور نیکی کا حکم کرتی رہے اور بدی سے روکتی رہے۔ یہی لوگ ہیں جو فلاح پانیوالے ہیں۔ یہی جہاد دعوت الی الخیر جہاد بالقرآن ہے۔ جسے بحیثیت جماعت مسلمانوں کو برابر کرتے رہنے کا حکم ہے۔ جو کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں۔ اسی جہاد کی طرف حضرت مرزا صاحب نے مسلمانوں کو توجہ دلائی۔ اب جاؤ اور جاکر تمام اسلامی تاریخ کو کھنگال ڈالو۔ تم پاؤ گے کہ جب تک مسلمان اس جہاد کو کرتے رہے وہ برابر ترقی کرتے چلے گئے اور دنیا کی قومیں ان کے آگے گرتی چلی گئیں۔ لیکن جب سے اس جہاد کو چھوڑ بیٹھے وہ خود گرنے لگ گئے۔ خدا کی نصرتوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور تنزل کی طرف اُن کا رُخ ہوگیا۔ مجدد اور اس کی جماعت کا وجود بھی اسی آیت کے نیچے آتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اسی حکم کی ایک تعمیل ہے۔ پس یہی وہ جہاد بالقرآن اصل اسلامی جہاد ہے جو تمام مسلمانوں پر ہمہ وقت فرض ہے۔ اور اسی کی طرف حضرت مرزا صاحب نے مسلمانوں کو توجہ دلائی۔ اور جب مسلمانوں کو اس سے غافل پایا تو اس کام کے لئے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی اور ان سے دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا عہد لیکر اس دعوت الی الخیر کے کام پر لگا دیا۔ تعجب ہے کہ قرآن کریم کے صریح حکم کے ماتحت جماعت بنانے کا نام آج فرقہ بندی رکھا جاتا ہے اگر سب مسلمان دعوت الی الخیر کے کام پر لگ جائیں تو جماعت کا وجود امتیازی خود ہی مٹ جائے گا۔ اور اگر مسلمان اس طرف متوجہ نہ ہوں تو بہ عند کس قدر عجیب ہے کہ یہ جماعت جس نے قرآن کریم کے حکم کو اپنے وجود سے زندہ کیا اور دعوت الی الخیر کیلئے اپنی زندگیاں اور اپنے جان و مال کو وقف کر دیا۔ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ کیونکہ یہ قابل رشک امتیاز غافل مسلمانوں کو فرقہ بندی نظر آتا ہے۔ سب مسلمانوں کا زندہ ہوکر اس کے امتیاز خصوصی کو مٹانا مشکل ہے۔ اس لئے ایک کام کرنیوالی زندہ جماعت کو بھی مرجانا چاہیئے تاکہ ان کا امتیاز خصوصی مٹ کر مردگی کی وحدت برقرار رہے۔

قرآن شریف کو عام مسلمانوں میں مروج کرنے کی بنیاد رکھی

حضرت اقدس مرزا صاحب قرآن کریم کو مسلمانوں کے لئے مجاہدات اور تزکیہ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ جانتے تھے۔ اور قرآن کریم کا حربہ ہاتھ میں لیکر جہاد بالقرآن کو ہر ایک مسلمان پر فرض سمجھتے تھے۔ اس لئے آپ نے قرآن شریف کی محبت اور عظمت کو مسلمانوں کے دلوں میں بٹھانے کیلئے بڑی کوشش کی اور یہ نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ قرآن کریم کے اصلی حسن و خوبی کا علم مسلمانوں کو نہ ہو۔ پرانے مسلمان قرآن کی تلاوت محض ثواب کے لئے کر چھوڑتے تھے۔ سمجھتے سمجھاتے کچھ نہ تھے۔ نئی روشنی کے مسلمانوں کو دین اور قرآن کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ اس لئے اس کا علاج ضروری تھا۔ حضرت مرزا صاحب نے اس کے لئے دو طریق اختیار کئے ایک تو یہ کہ کتابوں، رسالوں، ٹریکٹوں کے ذریعہ تعلیم قرآنی کو عام کیا تا قرآن کی حسن و خوبی کا علم عام مسلمانوں کو ہو۔ دوسرے درس قرآن کی بنیاد اپنی جماعت میں ایسی مضبوط رکھی کہ آپ کی جماعت کی زندگی کا یہ جزو ہو گیا ہے کہ جہاں کہیں جماعت ہے وہاں درس قرآن کا بھی سلسلہ جاری ہے۔ جس کی دیکھا دیکھی غیر از جماعت لوگوں میں بھی درس قرآن کا رواج ہونے لگا ہے۔

قرآن کریم کی تفسیر میں آیات محکمات کے ماتحت متشابہات کو رکھنے کی ہدایت

قرآن کریم کی تفسیر میں جس قدر مفسرین کی طرف سے اختلاف اور غلطیاں رونما ہوئیں اُن کی بڑی وجہ قرآن کریم کی آیات محکمات و متشابہات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہوئیں۔ اس معاملہ میں حضرت اقدس مرزا صاحب کی ہدایت یہ تھی جو عین مطابق ہدایت قرآن تھی کہ متشابہ آیات کو سمجھنے کے لئے انہیں محکمات آیات کے ماتحت کرو۔ محکمات اصل ہیں اور عقاید کی بنا انہی پر ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس طرح قرآن کریم کی صحیح تعلیم سے کبھی انحراف نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وہ طریق تفسیر تھا جس کی وجہ سے آپ کی تفسیر کی معقولیت کے سامنے ہر ایک عقلمند کا سر جھک جاتا تھا۔

قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کو آپ نے غلط قرار دیا

حضرت مرزا صاحب نے صاف اعلان کر دیا کہ قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ ساری مشکل یہ ہے کہ مفسرین جب دو آیتوں میں باہم تطبیق نہ دے سکے تو انہوں نے ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیدیا۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ایسی مروی نہیں جس میں آپ نے قرآن کریم کی کسی آیت کو منسوخ قرار دیا ہو۔ اور قرآن کریم کی جس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے "ما ننسخ من ایۃٍ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا۔ وہاں قرآن کریم کی کسی آیت یا حکم کی منسوخی کا ذکر نہیں بلکہ شرائع سابقہ کی منسوخی کا ذکر ہے۔ گویا احکام قرآنی ناسخ ہیں اور شرائع سابقہ کے وہ

احکام جو ان کے مطابق نہیں منسوخ ہیں۔ اور جن آیات قرآنی میں سمجھا جاتا تھا کہ تطبیق نہیں ان میں آپ نے یا آپ کے شاگردوں نے تطبیق دیکر اس بات کو اظہر من الشمس کر دیا کہ قرآن کریم میں نہ تو کوئی آیت منسوخ ہے اور نہ کوئی قرآنی حکم قرآن سے باہر ہے جو واجب التعمیل ہے مگر منسوخ التلاوت ہے جیسا کہ بعض مولویوں کا خیال ہے اور جو نہایت غلط خیال ہے۔

قرآن کریم کی غیر مسلم اقوام میں تبلیغ اور غیر زبانوں میں تراجم

حضرت اقدس مرزا صاحب نے نہ صرف مسلمانوں میں تعلیم قرآن کو ترویج دیا بلکہ غیر مسلم اقوام میں تبلیغ کے لیئے اس پاک کتاب کے تراجم کی بنیاد رکھی۔ اس میں شک نہیں کہ بزرگان دین نے قرآن کریم کی بیش بہا خدمات کی ہیں۔ اسکی تفسیریں لکھی ہیں۔ عربی کے علاوہ اُردو اور فارسی میں ترجمے بھی کیئے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ مسلمان قوم تک محدود تھے۔ آج ضرورت تھی کہ قرآن کریم کے ذریعہ سے غیر مسلموں پر اسلام کی فتوحات حاصل ہوتیں تاکہ اسلام کا قدم دنیا میں آگے بڑھتا۔ سو اس کی بنیاد مسلمانوں میں حضرت اقدس مرزا صاحب نے رکھی جس کتاب **فتح اسلام** میں آپ نے مسیح موعود کے دعوے کا اعلان کیا ہے اسی کتاب میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرے دل میں یہ آرزو ہے کہ قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ اور تفسیر کر کے انگریزوں میں اور تمام انگریزی جاننے والی قوموں میں پہنچاؤں۔ آپ کی اس آرزو کو آپکے خدام نے تکمیل کا جامہ پہنایا اور آج آپ کی بدولت نہ صرف انگریزی میں ترجمۂ قرآن ہوا بلکہ دنیا کی اور کئی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ جیسے ڈچ، جرمنی، چینی، گورمکھی، ہندی، تامل اور آپ کی جماعت اس عظیم الشان مقصد کو اپنے سامنے رکھتی ہے کہ قرآن کریم کو دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کر کے ہر ملک کے لوگوں تک پہنچایا جائے۔

قرآن کریم کو سمجھنے کیلئے عربی زبان پڑھنے کی انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ترغیب دی

چونکہ قرآن کریم کی زبان عربی تھی اس لئے حضرت مرزا صاحب نے تعلیم یافتہ طبقہ کے مسلمانوں کو خصوصًا اور عام مسلمانوں کو عمومًا عربی پڑھنے کی ترغیب دی۔ کیونکہ بغیر اس کے قرآن کریم کے کمالات اور حسن و خوبی پر عبور ہونا مشکل تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح آجکل دنیا میں ملازمت تجارت وغیرہ کرنے کیلئے انگریزی زبان سیکھنے کی ضرورت ہے اسی طرح اپنے مذہب کو کما حقہ، سمجھنے اور اس کے ساتھ محبت اور تعلق رکھنے کے لئے ایک مسلمان کے واسطے ضروری ہے کہ وہ عربی سیکھے۔

عربی زبان کو ام الالسنہ ثابت کیا

آپ نے ۱۸۹۵ء میں یہ اعلان کر کے علمی دنیا کو حیران کر دیا کہ عربی زبان ہی اُم الالسنہ ہے۔ یعنی تمام زبانوں کی ماں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں انسان کو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے جو زبان سکھائی گئی وہ عربی تھی۔ آگے پھر جس طرح نسل انسانی دنیا میں پھیلتی گئی اور مختلف اطراف ارض میں آباد ہوتی گئی زبانوں میں بھی اختلاف ہوتا گیا۔ آپ نے ایک کتاب اس موضوع پر منن الرحمٰن کے نام سے تصنیف فرمائی اس کے اشتہار میں سے کچھ اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔ وھو ہذا۔

"واضح ہو کہ اس کتاب میں تحقیق السنہ کے رو سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں صرف قرآن شریف ایک ایسی کتاب ہے جو اس زبان میں نازل ہوئی جو **ام الالسنہ** اور الہامی اور تمام بولیوں کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ الٰہی کتاب کی تمام تر زینت اور فضیلت اسی میں ہے کہ ایسی زبان میں ہو جو خدا تعالیٰ کے منہ سے ہو اور اپنی خوبیوں میں تمام زبانوں سے بڑھی ہوئی اور اپنے نظام میں کامل ہو۔ اور جب ہم کسی زبان میں وہ کمال پاویں جس کے جمع کرنے سے انسانی طاقتیں اور بشری بناوٹیں عاجز ہوں اور وہ خوبیاں دیکھیں جو دوسری زبانیں ان سے قاصر اور محروم ہیں اور وہ خواص مشاہدہ کریں جو بجز خدا تعالیٰ کے قدیم اور صحیح علم کے کسی مخلوق کا ذہن ان کا موجد نہ ہو سکے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہ زبان خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ سو کامل اور عمیق تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ وہ **زبان عربی** ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے ان باتوں کی تحقیقات میں اپنی عمریں گزاری ہیں اور بہت کوشش کی ہے کہ اس بات کا پتہ لگاویں کہ ام الالسنہ کونسی زبان ہے مگر چونکہ ان کی کوششیں خط مستقیم پر نہیں تھیں اور نیز خدا تعالیٰ سے توفیق یافتہ نہ تھے اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اور یہ بھی وجہ تھی کہ عربی زبان کی طرف ان کی پوری توجہ بھی نہ تھی بلکہ ایک بخل تھا۔ لہٰذا وہ حقیقت شناسی سے محروم رہ گئے۔ اب مجھے خدا تعالیٰ کے مقدس اور پاک کلام قرآن شریف سے اس بات کی ہدایت ہوئی کہ وہ الہامی زبان اور ام الالسنہ جس کے لئے پارسیوں نے اپنی جگہ اور عبرانی والوں نے اپنی جگہ اور آریہ قوم نے اپنی جگہ دعوے کئے کہ انہی کی وہ زبان ہے وہ **عربی مبین** ہے۔ اور دوسرے تمام دعویدار غلطی پر اور خطا پر ہیں۔ اگرچہ ہم نے اس رائے کو سرسری طور پر ظاہر نہیں کیا بلکہ اپنی جگہ پوری تحقیقات کر لی ہے۔ اور ہزارہا الفاظ سنسکرت وغیرہ کا مقابلہ کر کے اور ہر ایک لغت کے ماہروں کی کتابوں کو شن کر اور خوب عمیق نظر ڈال کر اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ زبان عربی کے سامنے سنسکرت وغیرہ زبانوں میں کچھ بھی خوبی نہیں بلکہ عربی الفاظ کے مقابل پر ان زبانوں کے الفاظ لنگڑوں، لولوں، اندھوں، بہروں، مبروصوں، مجذوبوں کے مشابہ ہیں جو فطری نظام کو بکلی کھو بیٹھے ہیں اور کافی ذخیرہ مفردات کا اپنے ساتھ نہیں رکھتے......"

اس اشتہار میں آپ نے تمام عیسائیوں اور آریوں کو اس تحقیقات کے متعلق چیلنج کیا ہے کہ وہ اپنی اپنی مفروضہ اُمّ الالسنہ زبانوں کو عربی کے مقابلہ میں لا کر فیصلہ کریں اور اگر وہ اس معاملہ میں کامیاب ہو گئے تو پانچہزار روپے نقد بطور انعام اُن کو دیا جائیگا۔ اس کتاب میں حضرت اقدس نے عربی کے امّ الالسنہ ہونے کیلئے پانچ وجوہ دلائل و براہین سے مبرہن کر کے تحریر فرمائے ہیں:۔

"(۱) عربی کے مفردات کا نظام کامل ہے (۲) عربی اعلیٰ درجہ کی علمی وجوہ تسمیہ پر مشتمل ہے۔ جو فوق العادت ہیں (۳) عربی کا سلسلۂ اطراد مواد الفاظ اتم و اکمل ہے (۴) عربی کی تراکیب میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہیں (۵) عربی زبان انسانی ضمائر کا پورا نقشہ کھینچنے کے لئے پوری پوری طاقت اپنے اندر رکھتی ہے۔"

اس کے بعد چیلنج کیا ہے کہ یہ کمالات کسی اور زبان میں دکھائے جائیں۔ نیز اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان ہی وہ کامل اور جامع زبان ہے جو خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات اور عالم روحانیات و معاد کی اصطلاحات کو پوری طرح ادا کر سکتی ہے نہ کہ کوئی اور زبان پس اسی لئے یہ زبان خود جناب الٰہی کی طرف سے انسان کو سکھائی گئی تا وہ معرفت و توحید الٰہی کو کماحقہٗ سمجھ سکے۔

اپنے نمونہ سے جو منہاج نبوت پر تھا نبیوں کے وجود پر دلیل قائم کی

حضرت اقدس مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت کا نہ تھا بلکہ محدثیت و مجددیت کا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:۔

"نبوت کا دعویٰ نہیں بلکہ محدثیت کا دعویٰ ہے جو خدا تعالیٰ کے حکم سے کیا گیا ہے" (رسالہ فتح اسلام)

"ہم بھی مدعی نبوت پر لعنت بھیجتے ہیں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور وحیٔ نبوت نہیں بلکہ وحی ولایت جو زیر سایۂ نبوت محمدیہ اور بہ اتباع آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم اولیاء اللہ کو ملتی ہے اس کے ہم قائل ہیں۔ اور اس سے زیادہ جو شخص ہم پر الزام لگاوے وہ تقویٰ اور دیانت کو چھوڑتا ہے ...... غرض نبوت کا دعویٰ جبکہ اس طرف بھی نہیں صرف ولایت اور مجددیت کا دعویٰ ہے"

(مجموعہ اشتہارات صفحہ ۲۲۴)

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جو اولیائے اُمت منصب مجدّدیت و محدّثیت پر مامور ہوتے ہیں وہ نبیوں کے رنگ میں رنگین ہوتے ہیں اور ان کا وجود نبیوں کے وجود پر بطور دلیل اور نمونہ کے ہوتا ہے خود حضرت مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔

ولله مکالمات ومخاطبات مع اولیائه فی هٰذه الامة وانهم یعطون صبغة

الانبیاء ولیسو نبیین فی الحقیقة فان القرآن اکمل وطر الشریعة ولا یعطون الا فهم القرآن ولا یزیدون علیه ولا ینقصون منه ومن زاد او نقص فاولئک من الشیاطین الفجرة" (مواہب الرحمٰن)

ترجمہ۔ اور اللہ تعالیٰ اس اُمت میں اپنے اولیاء سے مکالمہ و مخاطبہ کرتا ہے اور ان کو نبیوں کا رنگ دیا جاتا ہے مگر درحقیقت وہ انبیا نہیں ہوتے۔ کیونکہ قرآن شریف نے شریعت کو کامل کر کے شریعت کی حاجت کو ختم کر دیا اور ان لوگوں کو سوائے فہم قرآن کے اور کچھ نہیں دیا جاتا۔ اور وہ قرآن میں نہ کچھ زیادہ کر سکتے ہیں اور نہ کم کر سکتے ہیں۔ اور جو کوئی زیادہ یا کچھ کم کرے پس وہ شیطانوں اور بدکاروں میں سے ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنی کتاب تذکرہ میں بالکل یہی بات تحریر فرماتے ہیں لکھتے ہیں:۔

"اس اصل الاصول کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ دعوت وقیام حق اور اصلاح و تربیت امم کا اصل سرچشمہ و مرکز مقام نبوت ہے۔ اور ہر عہد و دور میں اس کا جس قدر بھی ظہور ہوتا ہے وہ سب اسی مقام سے ملحق و متصل۔ اور سب کی روشنی اسی شمسی نظام وقوام عالم سے مکتسب اور مستنیر۔ اور تمام انہار فیضان و سعادت کیلئے یہی سلسبیل نبوت مخرج و منبع کا حکم رکھتی ہے۔ عینًا یشرب بها عباد اللہ یفجرونها تفجیرا۔ اور کوئی قائم حق و داعیٔ اصلاح و کاشف حقائق فوز و نصرت نہیں پا سکتا جب تک اس کا قدم منہاج نبوت پر واقع نہ ہوا ہو۔ اور اس کے تمام اعمال متأسی باسوۂ حسنہ نبوت و متبع بہ سنت و حکمت رسالت نہ ہوں۔ اور اس تأسی و تشبہ بالانبیاء میں جس داعی حق کا قدم جس حد تک پہنچتا ہے اسی حد و مقام کے مطابق کم و بیش ثمرات و برکات ظاہر و باطن حاصل ہوتے ہیں اور جس طرح وہاں اختلاف مدارج و مراتب بلحاظ حالات و مقتضیات وقت اور فضلنا بعضهم علیٰ بعض کا معاملہ واقع ہوا۔ اسی طرح متبعین و ورثاء انبیاء میں بھی فضلنا بعضهم علیٰ بعض اور اختلاف مراتب و ثمرات و مفاضلۂ حالات و برکات ظہور میں آیا۔ یہی حقیقت شیخ اکبر کی اصطلاح میں نصوص، اور بعض اصحاب اشارات کی اصطلاح میں نسبت کے لقب سے ظاہر کی گئی ہے کہ کسی اہل اللہ کا قدم تأسی و اتباع حسب استعداد و داعیات وقت کسی ایک نبی کی منہاج پر واقع ہوتا ہے اور کسی کا کسی دوسرے نبی کی منہاج پر۔ اور اس کو بہ وجہ غلبۂ مابہ الاختصاص اس نبی سے ایک خاص طرح کی نسبت

حاصل ہوجاتی ہے۔ع وللناس مایعشقون مذاھب۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ کسی کا قدم جامعیۃ فص محمدی کا تعاقب کرتا اور مقام جامعیۃ کبریٰ اور "ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے اکتساب فیضان سے ایک کیفیت بوقلموں اور جلوۂ احسن صدرنگ گوناگون پیدا کرتا ہے۔ ساری نزاع مصطلحات والفاظ کی ہے۔ حقیقت بحکم ع "عبارا تنا شتیٰ و حسنك واحدٌ" ایک ہے اور کوئی نہیں کہ پردہ برانداز ظواہر و الفاظ و رسوم ہو۔ اور نزاع صورت پرستان معنی ناآشنا کو ختم کردے ؎

برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے رامے پرستند

جب دعوت و اصطلاح اُمت کا سرچشمہ و اصل مقام نبوت ٹھیرا۔ اور تمام عوازم امور دعوت اسی سے ماخوذ اور اسی کے اسوہ سے متاسی۔ تو ضرور ہے عالم تجدید و احیاء شریعت کے بھی تمام کاروبار اسی اسلوب و نہج پر واقع ہوں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اصول و اساسات سے لیکر جزئیات و فرعیات اعمال تک ٹھیک ٹھیک اسی مقام کے حالات و منازل سے متشابہ و متعلق بلکہ الظلّ والعکس ظہور میں آئیں"۔ (تذکرہ صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۴)

جو کچھ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا وہ نہایت صحیح ہے۔ جب دنیا اس زمانہ کے قریب آگئی کہ آپس کے میل جول کی راہیں آسان ہو کر تمام دنیا ایک شہر کے حکم میں آجائے۔ اور حالت یہ تھی کہ قومیں مختلف انبیاء کے ذریعہ ادیان مختلفہ پاکر ایک دوسرے کو کافر جتنی اور نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ تو خدا نے تمام دنیا کے لئے ایک ہی نبی محمد رسول اللہ صلعم اور ایک ہی کتاب قرآن کریم بھیج کر وحدت و اخوت نسل انسانی کو قائم کیا۔ چونکہ تمام ہدایات کو جو بذریعہ وحی الٰہی نسل انسانی کو دینی ضروری تھیں قرآن کریم میں مجتمع کردیا۔ اس لئے آئندہ نہ تو کسی نئی ہدایت یعنی نبوت کی ضرورت باقی رہی اور نہ کسی ہدایت لانیوالے یعنی نبی و رسول کے آنے کی حاجت رہی اس طرح ایک طرف تو ختم نبوت ہوگئی یعنی نبوت کا کام ختم ہوگیا اور دوسری طرف وحدت نسل انسانی مکمل ہوگئی۔ کیونکہ ساری دنیا متفقہ طور پر فقط ایک نبی اور ایک کتاب کی اتباع کے لئے متکلف رہ گئی جس کی وجہ سے سب قومیں آپس میں بھائی بھائی بن گئیں۔ اور چونکہ آئندہ نبیوں کے آنے کا سلسلہ بند ہوگیا اس لئے ہر نئے نبی کے آنے پر اس کے انکار سے جو کافر بننے کا خدشہ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اور اب قیامت تک بجائے کافر بنانے کے مسلمان بنانے کا کام باقی رہ گیا لیکن باایں‌ہمہ ہر زمانہ میں بدعات مختلفہ کی اصلاح اور طرح طرح کے فلسفوں کے حملوں سے حفاظت دین اور تعلیم

کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس کیلئے وقتاً فوقتاً مصلحین اُمت کی جو ضرورت ہوتی رہتی ہے وہ ختم نہیں ہوگئی جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے فطال علیھم الامد فقست قلوبھم جب زمانہ نبوت پر ایک لمبی مدت گزر جاتی ہے تو دل سخت ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ آخری نبوت یعنی نبوت محمدیہ صلعم مختلف اوقات میں اپنے فیضان سے اپنے متبعین میں سے ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا باعث ہوتی رہے جو دین کی تجدید یعنی تمام بدعات سے پاک کر کے دین خالص انسان کے ہاتھ میں دے اور تعلیم قرآن وسنت اور تزکیۂ نفوس اس کا کام ہو اور اسلام کی حفاظت واشاعت اس کا فرض ہو۔ کیونکہ خدا کی طرف سے نئی ہدایت لانے کے علاوہ یہی وہ کام تھا جو اپنے اپنے زمانہ میں انبیا کرتے رہے اور یہ کام اب اُمت محمدیہ کے کامل افراد کے ذریعہ وقوع پذیر ہونے لگا جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ ھو سمّٰکم المسلمین من قبل وفی ھذا لیکون الرسول شھیداً علیکم وتکونوا شھداء علی الناس (الحج) اسی خدا نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس سے پہلے اور اس کتاب میں بھی نتیجہ یہ کہ رسول تمہارا پیشرو اور مقتدا ہے اور تم سارے جہان کے لوگوں کے لئے مقتدا اور پیش رو ہو۔ اور یہ طبعی امر تھا کہ یہ مصلحین وقائدین اُمت زمانہ کی ضرورتوں اور مختلف اصلاحات کے تقاضہ کی وجہ سے مختلف انبیاء سے مناسبت اور مماثلت رکھتے ہوں کیونکہ ہر ایک نبی کسی خاص ضرورت اور خاص اصلاح کی خاطر مبعوث ہُوا تھا۔ نبوت محمدیہ چونکہ تمام کمالات نبوت کی جامع ہے اس لئے وہ حسب ضرورت زمانہ اور تقاضۂ اصلاح امتی میں اسی نبی کے کمال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے جو اس اصلاح کا اہل ہوتا ہے۔ اور امتی کو اس نبی کے ساتھ ایک خاص مماثلت ومناسبت ہوتی ہے۔ یہی مطلب ہے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا کہ میری اُمت کے علماء ربانی بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے۔ اور انہی کو حدیث میں مجدد کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ کہ اس اُمت میں اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر ایک شخص کو مبعوث کرتا رہے گا جو اس اُمت کے دین کی تجدید کرتا رہے گا۔ چنانچہ حضرت مرزا صاحب کا بھی اسی مجدّدیت کا دعویٰ تھا۔ اور آپ کا مقام زمانہ اور اصلاح اور اشاعت کے تقاضہ سے مسیح ابن مریم سے اس قدر مناسبت اور مماثلت تام رکھتا تھا کہ حدیثوں میں خاص طور پر اسی مجدد کو مجازاً مسیح ابن مریم کے لقب سے یاد کیا گیا۔ جیسا کہ خود حضرت مرزا صاحب بھی فرماتے ہیں ؎

چوں کافر از ستم بپرستند مسیح را ✤ غیورئ خدا بسر فشی کرد ہمسرم

پھر فرماتے ہیں ؎

چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند ✦ مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند

چونکہ ان مجددین کا قدم منہاج نبوت پر ہوتا ہے اس لئے ان کے وجود میں انبیاء کی جھلک نظر آتی ہے وہ نبی تو نہیں ہوتے مگر نبیوں کے رنگ میں رنگین ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اقدس مرزا صاحب کا بھی قدم منہاج نبوت پر اس قدر شدت کے ساتھ پڑا تھا کہ آپ کے وجود میں انبیاء کی جھلک اور آپ کے زمانہ دعوت و تبلیغ میں زمانہ نبوت کا نقش نظر آتا تھا۔ آپ کا دعویٰ آپ کی تعلیم قرآن و سنت۔ آپ کے پاکیزہ اخلاق اور نمونہ اور آپ کا تزکیۂ نفوس فرمانا۔ آپ کا حفاظت و اشاعت اسلام کے کام میں انہماک۔ لوگوں کی مخالفت۔ اس میں آپ کا صبر اور استقامت آپ کے ہاتھ پر نشانات آسمانی اور خدا تعالیٰ کی نصرت کا کثرت سے ظہور اور بالآخر آپ کی اپنے مقاصد میں کامیابی اور مخالفوں کی ناکامی وغیرہ وغیرہ یعنی جو واقعات ہم انبیا کے قصوں میں پڑھتے آئے تھے وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس طرح انبیاء اور ان کے وجود پر ایک زندہ ایمان پیدا ہو گیا۔ اور وہ نبوت جو خدا کی ہستی پر ایک زندہ نشان ہوتی ہے اور جو ختم نبوت ہو جانے کی وجہ سے دنیا کے لئے افسانہ کا رنگ پکڑ گئی تھی۔ ظلّی رنگ میں ایک نقشہ کی طرح نظروں کے سامنے آ گئی۔ پس حضرت مرزا صاحب اگرچہ نبی نہ تھے بلکہ مجدّد تھے۔ لیکن آپ کا وجود نبیوں کے وجود پر دلیل بن کر ظاہر ہوا۔ بعض نادانوں نے اسی وجہ سے یہ دھوکا کھایا ہے کہ نعوذ باللہ آپ کا دعویٰ نبوت کا تھا۔ یہ غلط ہے اور آپ پر افترا اور بہتان ہے۔ جو شخص آنحضرت صلعم کے بعد کسی پرانے نبی کے آنے کا بھی قائل نہ ہو جیسا کہ اکثر مسلمان حضرت عیسیٰ کے آنے کے قائل ہیں وہ نئے نبی کے آنے کا کس طرح عقیدہ رکھ سکتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب کے صریح الفاظ یہ ہیں :-

"ہم آنحضرت صلعم کو خاتم النبیین مانتے ہیں اور اس پر محکم ایمان رکھتے ہیں کہ ہمارے نبی صلعم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا نیا ہو یا پرانا"

دوسری جگہ فرمایا :- "ہم بھی مدعیٔ نبوت پر لعنت بھیجتے ہیں"

تمام قوموں میں رسولوں کی بعثت کو نمایاں کیا

جو مذہب عالمگیر ہوگا اس کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیئے کہ تمام قوموں میں وہ رسولوں کا آنا مانتا ہو۔ تا اس کے قبول کرنے سے کسی قوم کو اپنے قومی رسول کی تکذیب لازم نہ آئے اور یوں بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب خدا کی جسمانی ربوبیت سورج، چاند، بارش، اناج، غلہ، پھل لباس وغیرہ کی شکل میں دنیا کی ہر ایک قوم کے

ساتھ ہمیں نظر آتی ہے تو لوگوں کی روحانی ربوبیت یعنی نبوت و رسالت کسی خاص قوم سے مختص کیوں ہو بیس قرآن کریم نے جب اسلام کو ایک عالمگیر مذہب کی شکل میں پیش کیا تو ساتھ ہی عالمگیر مذہب کے اس بنیادی اصول کی بھی تعلیم دی کہ ہر ایک قوم میں نبی و رسول آتے رہے ہیں جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے۔ وان من اُمّۃٍ الّا خلا فیھا نذیر۔ یعنی کوئی قوم نہیں جس میں ہم نے ڈرانے والا نہیں بھیجا۔ اور لکلّ اُمّۃٍ رسول کہ ہر ایک قوم میں ہم نے رسول بھیجا۔ لیکن قرآن کریم کا یہ زرّین اصول کچھ عرصہ سے مسلمانوں کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور وہ حدیث شریف میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی تعداد کو بھول کر اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ سوائے آدم اور شیث نوح اور ہود۔ صالح اور شعیب۔ لوط اور ابراہیم اور انبیائے بنی اسرائیل کے اور کوئی نبی کسی قوم اور کسی ملک میں نہیں آیا۔ حضرت مرزا صاحب نے اس زمانہ میں جب اسلام کی تمام دنیا میں اشاعت کرنی چاہی تو آپ نے بڑے زور سے اس امر کی طرف توجہ دلائی اور مسلمانوں کو یاد دلایا کہ عالمگیر مذہب ہونے کے دعوے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ مذہب اس بات کا قائل ہو کہ ہر ایک قوم میں نبی آیا ہے تا کسی قوم کے فرد کو اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنے پیغمبر یا دینی مقتدا کو جھوٹا نہ ماننا پڑے۔ مثلاً ایک عیسائی اگر مسلمان ہو تو اسے حضرت عیسیٰ کو اور اگر ایک ہندو مسلمان ہو تو اسے اپنے بزرگوں کرشن اور رام چندر وغیرہ کو جھوٹا نہ ماننا پڑے۔ برخلاف اس کے اگر ایک مسلمان عیسائی ہوگا تو اُسے حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو اور ایک مسلمان ہندو ہو جائے تو اُسے آنحضرت صلعم اور تمام انبیائے بنی اسرائیل کو نعوذ باللہ جھوٹا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ یہ قومی مذاہب تھے اور ان کے عقائد میں اپنی اپنی قوم سے باہر کسی نبی کی صداقت پر ایمان لانا ضروری نہ سمجھا جاتا تھا سوائے اس ایک بات کے کہ تمام مذاہب کے انبیاء نے آخری نبی موعود کیلئے پیشگوئی کی تھی اور اپنی اپنی قوم کو اس خاتم النبیین صلعم پر ایمان لانے کیلئے تاکید کی تھی۔ لیکن اسلام چونکہ ایک عالمگیر اور دنیا کا آخری مذہب بنکر آیا تھا اس لئے اس نے لکلّ اُمّۃٍ رسول کہکر یعنی تمام دنیا کے مذاہب کے مقتداؤں کو راستباز تسلیم کر کے اپنا دروازہ ہر ایک اہل مذہب کے لئے کھول دیا کہ وہ اپنے اپنے مذہبی مقتداؤں کو سچا مانتے ہوئے اسلام کے حلقہ میں داخل ہو سکتے ہیں اور اس نبی موعود پر ایمان لانے میں جسکی پیشین گوئی ان کے نبیوں نے کی تھی ـــــ انہیں اپنے کسی مذہبی مقتدا کو جھوٹا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ایک عالمگیر مذہب کا جو تمام دنیا کے قومی مذاہب کا موعود تھا یہی بنیادی اصول ہونا چاہیئے تھا اور یہی۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس پاکیزہ اور عالمگیر اصول کو صاف الفاظ میں ارشاد فرما کے تمام دنیا کے اہل مذاہب کو صلح اور دعوت تبلیغ کا پیغام دیا جس کی طرف حضرت مرزا صاحب نے اس زمانہ میں تمام اقوام کو توجہ دلا کر ان پر حجت تمام کر دی۔ اور یہ تبلیغی کارنامہ ہے جو حضرت مرزا صاحب سے ظہور میں آیا مگر مسلمان مولویوں نے اپنی نادانی سے اس کا مضحکہ اڑایا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عصمت انبیا کا عقیدہ حضرت اقدس مرزا صاحب عصمت انبیاء کے قائل تھے۔ مسلمانوں میں بہت سے بزرگ اس کے قائل ہو گزرے ہیں۔ اور اس پر انہوں نے محققانہ رنگ میں نظر ڈالی ہے جن میں حضرت امام رازی کا پایہ بہت بلند ہے۔ حضرت مرزا صاحب بھی اس کے قائل تھے۔ اور دیگر بزرگوں کی طرح آپ نے اور آپ کے شاگردوں نے حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت ہارون، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یونس و حضرت یوسف و دیگر انبیا کی طرف جو گناہ منسوب تھے ان کی صحیح تشریح کر کے اُن کے دامن کو پاک ثابت کیا۔ لیکن حضرت اقدس مرزا صاحب نے ایک اور بات بھی خاص طور پر اس مسئلہ میں پیدا کی وہ واستغفر لذنبك کی تفسیر میں ذنب اور استغفار کی توضیح و تشریح ہے جو اپنے رنگ میں ایک امتیاز خصوصی رکھتی ہے۔ مختصراً یوں کہ آپ نے لغت عرب سے یہ ثابت کیا کہ ذنب کے معنے نہ صرف گناہ کے ہیں بلکہ ان کمزوریوں کے بھی ہیں جن میں انسان کے مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور استغفار غفر سے ہے جس کے معنے ہیں ڈھانپ لینا، حفاظت کرنا۔ پس استغفار کے معنے ہوئے حفاظت طلب کرنا۔ گناہوں کے بدنتائج سے اور آئندہ کسی انسانی کمزوری میں مبتلا ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جانے سے۔ انبیا چونکہ معصوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے لا یسبقونہٗ بالقول وھم بامرہٖ یعملون ﴿الانبیا﴾ کہ وہ خدا کی فرمانبرداری سے اپنے قول میں قطعاً سبقت نہیں کرتے اور اس کے حکم کے ماتحت ان کا عمل ہوتا ہے اس لئے انبیا کے استغفار ذنب کے معنے فقط اس قدر ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حفاظت طلب کرتے رہتے ہیں کہ کسی بشری کمزوری میں مبتلا ہو کر وہ کسی گناہ کے مرتکب نہ ہو جائیں اور بحیثیت بشر ہونے کے ہر ایک انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمہ وقت خدا سے اپنی بشری کمزوریوں میں مبتلا ہو جانے سے حفاظت طلب کرتا رہے۔ اور جو جس قدر زیادہ استغفار کرتا ہے وہ اسی قدر لغزشوں اور بشری کمزوریوں میں مبتلا ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ پس انبیا کے استغفار کے ہرگز یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ پہلے گناہ کرتے رہے ہیں اس لئے انہیں استغفار ذنب کی ضرورت ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ انبیا کے سوا دوسرے لوگ جو عصمت کے مقام پر نہیں جب استغفار ذنب کرتے ہیں تو چونکہ وہ گناہوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اس لئے وہاں استغفار ذنب کے معنے دونو رنگ میں ہوتے ہیں یعنی پچھلے گناہوں کے بدنتائج سے حفاظت اور آئندہ بشری کمزوریوں میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے گناہوں کے ارتکاب سے حفاظت۔ لیکن انبیا جب استغفار ذنب کرتے ہیں تو اس کا

ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ نعوذ باللہ کسی گناہ کے مرتکب ہو چکے ہیں جس کے بدنتائج سے حفاظت طلب کرتے ہیں بلکہ اس استغفار ذنب کا مطلب فقط اس قدر ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حفاظت طلب کرتے رہتے ہیں اس بات سے کہ وہ کسی بشری کمزوری میں مبتلا ہو کر عصمت کے مقام سے نیچے نہ گر جائیں۔ اور جو مقام عصمت پر کھڑے ہوتے ہیں ان کے لئے بڑا ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہمہ وقت استغفار کرتے رہیں۔ ہر کہ عارف تراست ترساں تراست۔ ان کے اندر یہ تکبر نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی حفاظت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھیں۔ غرضیکہ اس امر پر حضرت اقدس مرزا صاحب نے نہایت وضاحت سے روشنی ڈال کر معترض پادریوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ آپ کی تحریرات میں تفصیل سے اس پر بحث ہے جس کا دل چاہے پڑھے اور لطف اور فائدہ اٹھائے۔

حضرت مرزا صاحب نجات کیلئے علاوہ توحید الٰہی کے حضرت محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لانا ضروری سمجھتے تھے

زمانہ کی ہوا سے متاثر ہو کر آجکل مغرب زدہ اور نیچری مسلمانوں میں یہ فیشن ہو گیا ہے کہ وہ بڑے فخر سے یہ اعلان کیا کرتے ہیں کہ نجات کیلئے فقط توحید الٰہی کو ماننے کی ضرورت ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ اور وہ اسے اپنی بڑی وسیع الخیالی گردانتے ہیں حالانکہ یہ ان کی جہالت کا نتیجہ ہے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب اس غلط عقیدہ کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے مرید ڈاکٹر عبدالحکیم خاں پٹیالوی نے جب اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ نجات کے لئے توحید الٰہی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں تو آپ نے اسے پہلے تو نرمی سے سمجھایا۔ لیکن جب وہ اپنی اس ضلالت سے باز نہ آیا اور شوخی اور گستاخی میں بڑھتا گیا تو آپ نے اسے اپنی جماعت سے خارج کر دیا۔ اور اس کے اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ایک کتاب حقیقۃ الوحی تحریر فرمائی۔ عرصہ ہوا ایک دفعہ جب پنڈت اگنی ہوتری نے جو اس وقت برہمو سماج کا ممبر تھا آپ کو خط میں لکھا کہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ آپ کیوں پڑھتے ہیں تو حضرت مرزا صاحب نے جواب میں لکھا کہ محمد رسول اللہ اس لئے پڑھتے ہیں تا لا الٰہ الا اللہ پر قائم رہیں۔ کیونکہ لا الٰہ الا اللہ دعویٰ ہے اور محمد رسول اللہ اس پر دلیل ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلعم کا وجود باوجود آپ کی پُر حکمت تعلیم، آپ کا نمونہ، آپ کے ساتھ نشانات سماوی کا ایک لشکر، اور نصرت الٰہیہ کی بارش یہ سب خدا کی ہستی اور اس کی توحید پر دلیل ہیں۔ یہ دلیل نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ انسان توحید سے گر کر دہریہ نہ بن جائے۔" خدا کی شان اگنی ہوتری سچ مچ بعد میں دہریہ بن گیا اور دیو سماج کا بانی بنا۔

خیر اس عقیدۂ شنیعہ کا رد آپ نے اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اور جس متشابہ آیت سے نیچری اپنے اس عقیدہ کی تائید کے لئے استنباط کرتے ہیں اس کی صحیح تفسیر دیگر محکمات آیات کی روشنی میں کر کے مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ اور قرآن کریم کی متعدد آیات سے اور نہایت معقول دلائل سے اس بات کو ثابت کر دیا کہ توحید الٰہی کی صحیح تعلیم اور مکمل نمونہ بغیر قرآن اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے نمونہ کے انسان نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ اس پر قائم ہو سکتا ہے۔ آپ کی دلائل عقلیہ میں سے بطور نمونہ ایک اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

"یہ بھی یاد رہے کہ خدا کے وجود کا پتہ دینے والے اور اس کے واحد لاشریک ہونے کا علم لوگوں کو سکھلانے والے صرف انبیا علیہم السلام ہیں۔ اگر یہ مقدس لوگ دنیا میں نہ آتے تو صراط مستقیم کا یقینی طور پر پانا ایک ممتنع اور محال امر تھا۔ اگرچہ زمین و آسمان پر غور کر کے اور ان کی ترتیب ابلغ اور محکم پر نظر ڈال کر ایک صحیح الفطرت اور سلیم العقل انسان دریافت کر سکتا ہے کہ اس کارخانہ پر حکمت کا بنانے والا کوئی ضرور ہونا چاہیئے لیکن اس فقرہ میں کہ ضرور ہونا چاہیئے اور اس فقرہ میں کہ واقعی وہ موجود ہے۔ بہت فرق ہے۔ واقعی وجود پر اطلاع دینے والے صرف انبیا علیہم السلام ہیں جنہوں نے ہزار ہا نشانوں اور معجزات سے دنیا پر ثابت کر دکھایا کہ وہ ذات جو مخفی در مخفی اور تمام طاقتوں کی جامع ہے درحقیقت موجود ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قدر عقل بھی کہ نظام عالم کو دیکھ کر صانع حقیقی کی ضرورت محسوس ہو یہ مرتبہ عقل بھی نبوت کی شعاعوں سے ہی مستفیض ہے ...... پس چونکہ قدیم سے اور جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے خدا کا شناخت کرنا نبی کے شناخت کرنے سے وابستہ ہے۔ اس لئے یہ خود غیر ممکن اور محال ہے کہ بجز ذریعہ نبی کے توحید مل سکے۔ نبی خدا کی صورت دیکھنے کا آئینہ ہوتا ہے اسی آئینہ کے ذریعہ سے خدا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ اپنے تئیں دنیا پر ظاہر کرنا چاہتا ہے تو نبی کو جو اس کی قدرتوں کا مظہر ہے دنیا میں بھیجتا ہے اور اپنی وحی اس پر نازل کرتا ہے۔ اور اپنی ربوبیت کی طاقتیں اس کے ذریعہ سے دکھلاتا ہے۔ تب دنیا کو پتہ لگتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ پس جن لوگوں کا وجود ضروری طور پر خدا کے قدیم قانون ازلی کے رو سے خدا شناسی کے لئے ذریعہ مقرر ہو چکا ہے۔ ان پر ایمان لانا توحید کا ایک جزو ہے۔ اور بجز اس ایمان کے توحید کامل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ بغیر ان آسمانی نشانوں اور قدرت نما عجائبات کے جو نبی دکھلاتے ہیں اور معرفت تک پہنچاتے ہیں وہ خالص توحید جو چشمۂ یقین کامل سے

پیدا ہوتی ہے میسر آسکے۔ وہی ایک قوم ہے جو خدا نما ہے جن کے ذریعہ سے وہ خدا جس کا وجود دقیق در دقیق اور مخفی در مخفی اور غیب الغیب ہے ظاہر ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ سے وہ کنز مخفی جس کا نام خدا ہے نبیوں کے ذریعہ سے ہی شناخت کیا گیا ہے۔ ورنہ وہ توحید جو خدا کے نزدیک توحید کہلاتی ہے جس پر عملی رنگ کامل طور پر چڑھا ہوا ہوتا ہے اُس کا حاصل ہونا بغیر ذریعہ نبی کے جیسا کہ خلاف عقل ہے ویسا ہی خلاف تجارب سالکین ہے۔ بعض نادانوں کو جو یہ وہم گزرتا ہے کہ گویا نجات کے لئے صرف توحید کافی ہے نبی پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ گویا وہ روح کو جسم سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں یہ وہم سراسر دلی کوری پر مبنی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جبکہ توحید حقیقی کا وجود ہی نبی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور بغیر اس کے ممتنع اور محال ہے تو وہ بغیر نبی پر ایمان لانے کے میسر کیونکر آسکتی ہے۔ اور نبی کو جو جڑھ توحید کی ہے ایمان لانے میں علیحدہ کر دیا جائے تو توحید کیونکر قائم رہے گی۔ توحید کا موجب اور توحید کا پیدا کرنے والا اور توحید کا باپ اور توحید کا سرچشمہ اور توحید کا مظہر اتم صرف نبی ہی ہوتا ہے اس کے ذریعہ سے خدا کا مخفی چہرہ نظر آتا ہے اور پتہ لگتا ہے کہ خدا ہے،۔۔۔۔ پس اس میں شک نہیں کہ توحید از خداوانی کی متاع رسول کے دامن سے ہی دنیا کو ملتی ہے۔ بغیر اس کے ہرگز نہیں مل سکتی۔ اور اس امر میں سب سے اعلیٰ نمونہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے دکھایا کہ ایک قوم جو نجاست پر بیٹھی ہوئی تھی اُن کو نجاست سے اُٹھا کر گلزار میں پہنچا دیا اور وہ جو رُوحانی بھوک اور پیاس سے مرنے لگے تھے اُن کے آگے رُوحانی اعلیٰ درجہ کی غذائیں اور شیریں شربت رکھ دیئے۔ اُن کو وحشیانہ حالت سے انسان بنایا۔ پھر معمولی انسان سے مہذب انسان بنایا۔ پھر مہذب انسان سے کامل انسان بنایا۔ اور اس قدر ان کیلئے نشان ظاہر کئے کہ ان کو خدا دکھلا دیا۔ اور ان میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ انہوں نے فرشتوں سے ہاتھ جا ملائے۔ یہ تاثیر کسی اور نبی سے اپنی اُمت کی نسبت ظہور میں نہ آئی۔ کیونکہ ان کے صحبت یاب ناقص رہے۔ پس میں ہمیشہ تعجب کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کہ یہ عربی نبی جس کا نام محمدؐ ہے (ہزار ہزار درود اور سلام اس پر) یہ کس عالی مرتبہ کا نبی ہے اس کے عالی مقام کا انتہا معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی تاثیر قدسی کا اندازہ کرنا انسان کا کام نہیں افسوس کہ جیسا حق شناخت کا ہے اس کے مرتبہ کو شناخت نہیں کیا گیا۔ وہ توحید جو دنیا سے گم ہو چکی تھی وہی ایک پہلوان ہے جو دوبارہ اسکو دُنیا میں لایا۔ اُس نے خدا سے انتہائی درجہ پر محبت کی اور انتہائی

درجہ پر بنی نوع کی ہمدردی میں اس کی جان گداز ہوئی۔ اس لئے خدا نے جو اس کے دل کے راز کا واقف تھا اسکو تمام انبیاء اور تمام **اوّلین و آخرین پر فضیلت بخشی**۔ اور اس کی مرادیں اس کی زندگی میں اس کو دیں۔ وہی ہے جو سر چشمہ ہر ایک فیض کا ہے۔ اور وہ شخص جو بغیر اقرار افاضہ اس کے کسی فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ ذریت شیطان ہے۔ کیونکہ ہر ایک فضیلت کی کنجی اس کو دی گئی ہے۔ اور ہر ایک معرفت کا خزانہ اس کو عطا کیا گیا ہے جو اس کے ذریعہ سے نہیں پاتا وہ محروم ازلی ہے۔ ہم کیا چیز ہیں اور ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہم کافر نعمت ہوں گے اگر اس بات کا اقرار نہ کریں کہ **توحید حقیقی ہم نے اسی نبی کے ذریعہ سے پائی** اور زندہ خدا کی شناخت ہمیں اسی کامل نبی کے ذریعہ سے اور اس کے نور سے ملی ہے۔ اور خدا کے مکالمات اور مخاطبات کا شرف جس سے ہم اُس کا چہرہ دیکھتے ہیں **اسی بزرگ نبی کے** ذریعہ سے ہمیں میسّر آیا ہے۔ اس آفتاب ہدایت کی شعاع دھوپ کی طرح ہم پر پڑتی ہے اور اسی وقت تک ہم منور رہ سکتے ہیں جبتک کہ ہم اس کے مقابل پر کھڑے ہیں۔ وہ لوگ جو اس غلط خیال پر جمے ہوئے ہیں کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاوے یا مرتد ہو جائے اور توحید پر قائم ہو اور خدا کو واحد لاشریک جانتا ہو وہ بھی نجات پا جائے گا اور ایمان نہ لانے یا مرتد ہونے سے اس کا کچھ بھی حرج نہ ہوگا جیسا کہ عبد الحکیم خاں کا مذہب ہے۔ ایسے لوگ درحقیقت توحید کی حقیقت سے ہی بے خبر ہیں۔ ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ یوں تو شیطان بھی خدا کو واحد لاشریک سمجھتا ہے مگر صرف واحد سمجھنے سے نجات نہیں ہو سکتی بلکہ نجات تو دو امر پر موقوف ہے (۱) ایک یہ کہ یقین کامل کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ہستی اور وحدانیت پر ایمان لاوے (۲) دوسرے یہ کہ ایسی کامل محبت حضرت احدیت جل شانہٗ کی اس کے دل میں جاگزین ہو کہ جس کے استیلا اور غلبہ کا یہ نتیجہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت عین اُس کی راحت جان ہو جس کے بغیر وہ جی ہی نہ سکے اور اس کی محبت تمام اغیار کی محبتوں کو پامال اور معدوم کر دے۔ یہی توحید حقیقی ہے کہ بجز متابعت ہمارے سید و مولیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔" (حقیقۃ الوحی)

اس کے بعد آپ نے اس بات کو نہایت زبردست دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ توحید حقیقی کیوں بغیر متابعت ہمارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مفصل بحث

کتاب مذکور میں موجود ہے اور قابل دید ہے۔

آپ نے ثابت کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلعم جامع کمالات انبیاء اور افضل الرسل ہیں

حضرت اقدس مرزا صاحب کا بڑا زور اس بات پر تھا کہ جو کمالات تمام دنیا کے مختلف نبیوں کو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت زمانہ اور ضرورت قومی ملتے رہے وہ سب کمالات اکمل اور اتم اور مجموعی طور پر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیئے جیسا کہ آپ اپنی کتاب چشمۂ مسیحی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اب یہ بھی جاننا چاہیئے کہ یہ کمالات متفرقہ اس اُمت میں جمع کرنے کا کیوں وعدہ دیا گیا۔ اس میں بھید یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات متفرقہ ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فبھداھم اقتدہ یعنی تمام نبیوں کو جو ہدایتیں ملی تھیں اُن سب کا اقتدا کر۔ پس ظاہر ہے کہ جو شخص ان تمام متفرق ہدایتوں کو اپنے اندر جمع کرے گا اس کا وجود ایک جامع وجود ہو جائے گا اور تمام نبیوں سے وہ افضل ہو گا۔"

اگرچہ ایمان کے رنگ میں بہت سے مسلمان یہی عقیدہ رکھتے چلے آئے تھے۔ اور آج سے بہت عرصہ پہلے کہنے والے نے یہ شعر کہا تھا

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لیکن اندر ہی اندر اعتقاداً اور عملاً ہمارے علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دیگر انبیا کو طرح طرح سے فضیلت دے رکھی تھی کہیں یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ قیامت میں جب اللہ تعالیٰ جلوہ فرما ہو گا تو سوائے حضرت موسیٰ کے سب بیہوش ہو کر گر جائیں گے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ صرف حضرت موسیٰ خدا کو برابر دیکھتے رہیں گے اور بیہوش نہ ہوں گے۔ یہ بھی مانتے تھے کہ ہزارہا جادوگروں کا جادو حضرت موسیٰ کے سامنے تو دب گیا مگر ایک معمولی سی جادوگرنی کا جادو محمد رسول اللہ صلعم پر چل گیا۔ کہیں جن و پری کو حضرت سلیمان کے ماتحت کر کے ان کے تخت کو ہوا میں اُڑاتے تھے۔ کہیں حضرت خضر کو بقائے دوام کا تاج پہنا رکھا تھا کہیں یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کے سوا اور کسی بشر کی ولادت مس شیطان سے پاک نہیں۔ اور حضرت عیسیٰ کو تو اس قدر فضیلتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دے رکھی تھیں جن کا کوئی شمار ہی نہیں۔ ان کا پرندوں کا خلق کرنا۔ اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا بخشنا۔ مُردوں کو زندہ کرنا۔ عالم الغیب ہونا۔ گہوارہ میں دعویٔ نبوت کرنا۔ آسمان پر بجسدہ العنصری چڑھ کر آج تک الآن کما کان کی شان سے بغیر تغیر کے

زندہ چلے آنا۔ اور اخیر میں اُمت محمدیہ کے غرق ہوتے ہوئے بیڑہ کو انہی کا پار لگانا یہ سب باتیں حضرت عیسیٰ میں تو مانی جاتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سب امور سے خالی سمجھتے تھے۔ غرضکہ کہاں تک بیان کیا جائے اس معاملہ میں تو ہمارے علما نے عیسائی پادریوں کے بھی کان کترو دیئے تھے۔ اور مختلف انبیا کو آنحضرت صلعم پر طرح طرح سے فضیلتیں دے رکھی تھیں۔ اور بعض نے تو یہاں تک غضب کر دیا تھا کہ نہایت لغو اور جھوٹی روایتوں کی بنا پر بعض کمزوریاں تک نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رکھی تھیں۔ پس حضرت اقدس مرزا صاحب کا یہ کس قدر عظیم الشان کارنامہ ہے کہ آپ نے ان تمام لغو روایات کا قلع قمع کر کے دکھا دیا۔ اور ان تمام بے سروپا باتوں کی حقیقت کو طشت از بام کر کے مختلف انبیا کی آنحضرت صلعم پر فرضی فضیلتوں کا خاتمہ کر دیا اور کھول کر دکھا دیا کہ ہر ایک خوبی اور ہر ایک انعام جو کسی نبی کو خدا کی طرف سے ملا ہے وہ بوجہ احسن اور اتم اور اکمل ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے اور یہ زبانی خوش عقیدگی کے رنگ میں نہیں فرمایا بلکہ صفحوں کے صفحے ان پر لکھ کر ان امور کو پایۂ ثبوت تک پہنچا کر دکھا دیا۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں جس کا دل چاہے آپ کی تحریریں پڑھ لے۔ پھر آنحضرت صلعم کی شان کے متعلق جو کچھ معترضین کے جواب میں لکھا وہ اپالوجی یعنی معذرت کے رنگ میں نہیں لکھا کہ آنحضرت صلعم کی بعض باتوں کے لئے کوئی عذر تلاش کرنے بیٹھ گئے یا الزامی رنگ کا جواب دیکر پیچھا چھڑا لیا نہیں بلکہ جو کچھ قرآن اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے ان کو ایسی صحیح اور معقول شکل میں پیش کیا کہ نہ صرف یہ کہ وہ تمام اعتراضات اُڑ گئے بلکہ ہر وہ بات جسے معترضین نے محل اعتراض بنا رکھا تھا بہترین خلق ثابت ہوئی۔

آپ آنحضرت صلعم کو سچے دل سے تمام اخلاق فاضلہ کا جامع اور صداقت کا آفتاب مانتے تھے۔ اور آپ کی راستبازی کو اس قدر ظاہر و باہر اور غیروں کی تصدیق سے بے نیاز سمجھتے تھے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے آپ کو خط لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی ویدوں میں بھی ہے تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلعم تو صداقت کے آفتاب ہیں۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب"۔ آپ کی صداقت کے نشانات تو اسقدر بیّن ہیں کہ آپکی ذات ویدوں کی تصدیق سے مطلقاً بے نیاز ہے۔ البتہ ویدوں میں اگر یہ پیشگوئی ہے تو ماننا پڑے گا کہ کم سے کم اتنا حصہ ویدوں کا جو آنحضرت صلعم کی پیشگوئی پر مشتمل ہے ضرور منجانب اللہ ہے۔ پس اس سے فائدہ ویدوں کو پہنچا نہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ محمد رسول اللہ صلعم کی اپنی زندگی ہی آپ کی صداقت پر ایسی دلیل واضح ہے کہ وہ کسی غیر کی تصدیق کی محتاج نہیں۔ البتہ آپ کی تصدیق کرنے والے کو اس سے نفع

پہنچ جاتا ہے کہ اسے اپنے بیان میں سچا ماننا پڑتا ہے۔ یہ آپ ہی کا شعر ہے کہ ؎

اگر خواہی دلیلے عاشقش باش — محمد ہست برہانِ محمدؐ

حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے افضل الرسل ہونے پر حضرت مرزا صاحب کی کثرت سے تحریریں موجود ہیں یہاں دو تحریریں بطور نمونہ نقل کرتا ہوں:۔

قل انّ صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہٗ وبذٰلک امرت وانا اوّل المسلمین ...... یعنی ان کو کہدے کہ میری نماز اور میری پرستش اور میری جدوجہد اور میری قربانیاں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کیلئے اور اس کی راہ میں ہے۔ وہی خدا جو تمام عالموں کا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں اوّل المسلمین ہوں۔ یعنی دنیا کی ابتدا سے اس کے اخیر تک میرے جیسا اور کوئی کامل انسان نہیں جو ایسا اعلیٰ درجہ کا فنا فی اللہ ہو..... اس آیت میں ان نادان موحدوں کا رد ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیا پر فضلیت کلی ثابت نہیں "۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۶۴)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام اخلاق فاضلہ کا جامع ہے جو نبیوں میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا انک لعلیٰ خلق عظیم (تو خلق عظیم پر ہے) اور عظیم کے لفظ کے ساتھ جس کی تعریف کی جائے وہ عرب کے محاورے میں اس چیز کے انتہائی کمال کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس آیت کا مفہوم ہے کہ جہاں تک اخلاق فاضلہ اور شمائل حسنہ نفس انسانی کو حاصل ہو سکتے ہیں وہ تمام اخلاق کاملہ تامہ نفس محمدیؐ میں موجود ہیں۔ سو یہ تعریف ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے جس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور اسی کی طرف اشارہ ہے جو دوسری جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا وکان فضل اللہ علیک عظیماً یعنی تیرے پر خدا کا سب سے زیادہ فضل ہے اور کوئی نبی تیرے مرتبہ تک نہیں پہنچا"۔ براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۸)

اور بات بھی سچ یہی ہے۔ وقتی اور قومی نبیوں سے اس نبی کی شان بہت بڑھ کر ہونی چاہیئے جو کل زمانوں اور کل قوموں کے لئے آیا۔ ضرور تھا کہ اس نبی میں وہ تمام کمالات بوجہ اتم واحسن جمع کر دیئے جاتے جو الگ الگ متفرق طور پر مختلف نبیوں کو ملے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو افضل الرسل حضرت اقدس مرزا صاحب محض خوش عقیدگی کے رنگ میں نہیں مانتے تھے بلکہ اس کو دلائل و براہین سے آپ نے ہمیشہ ثابت کیا۔ آپ کوئی بات بلا دلیل نہیں مانا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت نبی کریم صلعم کی تعریف میں جب کبھی کوئی نظم کہی اس میں بھی محض شعر و شاعری اور خد و خال کی تعریف پر انحصار نہیں رکھا۔ بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی جو بھی خوبی پیش کی دلائل کے ساتھ پیش کی۔ اور ثبوت بھی پیش کی ایک امر واقع پیش کیا۔ بطور نمونہ ایک نظم کے چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں ؎

چوں زمن آید ثنائے سرورِ عالی تبار ... عاجز از مدحش زمین و آسمان و ہر دو دار
آں مقامِ قرب کو دارد بدلدارِ قدیم ... کس نداند شانِ آں از واصلانِ کردگار
آں عنایت ہا کہ محبوبِ ازل دارد بدو ... کس بخوابے ہم ندیدہ مثلِ آن اندر دیار
سرورِ خاصانِ حق شاہِ گروہِ عاشقاں ... آنکہ روحش کرد طے ہر منزلِ وصلِ نگار
آں مبارک پے کہ آمد ذات با آیاتِ او ... رحمتے زاں ذاتِ عالم پرور و پروردگار
آنکہ دارد قربِ خاص اندر جنابِ پاکِ حق ... آنکہ شانِ او نفہمد کس ز خاصانِ کبار
احمدِ آخر زماں کو اولیں را جائے فخر ... آخریں را مقتدا و ملجا و کہف و حصار
ہست درگاہِ بزرگش کشتیٔ عالم پناہ ... کس نگردد روز محشر جز بپناہش رستگار
از ہمہ چیزے فزوں تر در ہمہ نوعِ کمال ... آسمانہا پیش اوجِ ہمتِ او ذرہ وار
مظہرِ نورے کہ پنہاں بود از عہدِ ازل ... مطلعِ شمسے کہ بود از ابتدا در استتار
عبدِ بزمِ آسمان و حجۃ اللہ بر زمیں ... ذاتِ خالق را نشانے بس بزرگ و استوار
ہر رگ و ہر ذرہ وجودش خانۂ یارِ ازل ... ہر دم و ہر ذرہ اش پُر از جمال و ستدار
حسن روئے او بہ از صد آفتاب و ماہتاب ... خاکِ کوئے او بہ از صد نافۂ مشکِ تتار
ہست او از عقل و فکر و وہم مردم دور تر ... کے مجالِ فکر تا آں بحرِ ناپیدا کنار
روحِ او در گفتنِ قولِ بلیٰ اول کسے ... آدمِ توحید و پیش از آدمش پیوندِ یار
جانِ خود دادن پئے خلقِ خدا در فطرتش ... جاں نثارِ خستہ جاناں بیدلاں را غمگسار
اندراں وقتیکہ دنیا پُر ز شرک و کفر بود ... ہیچکس را خوں نہ شد دل جز دلِ آں شہریار
ہیچکس از خبثِ شرک و رجسِ بت آگہ نہ شد ... ایں خبر شد جانِ احمد را کہ بود از عشق زار
کس چہ میداند کزاں نالہ ہا باشد خبر ... کاں شفیعے کرد از بہر جہاں در کنجِ غار

من نمی دانم چہ دردے بود اندوہ و غمے — کاندراں عالمے درآوردش حزین و دلفگار
نے ز تاریکی توحش نے ز تنہائی ہراس — نے ز مردن غم نہ خوفِ کثردم و نے بیم مار
کشتۂ قوم و فدائے خلق و قربانِ جہاں — نے بجسم خویش میلش نے بہ نفس خویش کار
نعرہ ہا پر دردمے زد از پئے خلقِ خدا — شد تضرع کار او پیش خدا لیل و نہار
سخت شورے بر فلک افتاد زاں عجز و دعا — قدسیاں را نیز شد چشم از غم آں اشکبار
آخر از عجز و مناجات و تضرع کردنش — شد نگارہ لطفِ حق بر عالمِ تاریک تار
در جہاں از معصیت ہا بود طوفانِ عظیم — بود خلق از شرک و عصیاں کور و کر در ہر دیار
ہمچو وقتِ نوح دنیا بود پُر از ہر فساد — ہیچ دل خالی نہ بود از ظلمت و گرد و غبار
مر شیاطین را تسلط بود بر ہر روح و نفس — پس تجلّی کرد بر رُخِ محمد کردگار
منّتِ او بر ہمہ سرخ و سیاہ ثابت است — آنکہ بہر نوعِ انساں کرد جاں خود نثار
راغب اندر رحمتت یا رحمۃ اللہ آمدیم — اے کہ چوں ما پر درِ تو صد ہزار امیدوار
زندہ آں شخصے کہ نوشد جرعۂ از چشمہ ات — زیرک آں مردے کہ کردست اتباعت اختیار
بے تو ہرگز دولتِ عرفاں نمی یابد کسے — گرچہ میرد در ریاضت ہا و جہد بے شمار

حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو ہر پہلو سے خاتم الانبیا اور زندہ نبی ثابت کیا

حضرت اقدس مرزا صاحب اس بات پر بڑا زور دیتے تھے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کامل طور پر خاتم الانبیا ہیں اور زندہ نبی ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ختم نبوت ان معنوں میں تو سب مسلمان مانتے چلے آئے تھے کہ آپ آخری نبی ہیں لیکن اس میں کئی نقص باقی تھے جن کا تدارک حضرت مرزا صاحب نے ایسا کیا کہ ختم نبوت ہر پہلو سے مکمل ہو گئی۔

(۱) پہلا نقص تو یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام علماء حضرت عیسیٰ کے آسمان سے نزول کے قائل تھے۔ ہاں وہی حضرت عیسیٰ جنہیں قرآن نے نبی و رسول بتایا ہے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک پرانے نبی کے واپس دنیا میں آ کر چالیس سال نبوت کرنے کے قائل تھے۔ یہ بڑا بھاری نقص تھا کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ آنحضرت صلعم کا فیضان نبوت قیامت تک جاری اور زندہ نہ رہ سکا۔ اور درمیان میں آ کر ختم اور مردہ ہو جانے کی وجہ سے خدا کو حضرت عیسیٰ کو دوبارہ بھیجنا پڑا اور پھر آخری نبی حضرت عیسیٰ ہوئے نہ کہ آنحضرت صلعم حضرت اقدس مرزا صاحب نے یہ ثابت کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلعم ہی آخری نبی ہیں ولا غیر۔

اور آپ کی نبوت کا دامن قیامت تک دراز ہے اور آپ کے بعد کسی پرانے یا نئے نبی کو قدم دھرنے کی جگہ نہیں۔ کیونکہ آپ کی نبوت زندہ اور اس کا فیضان نبوت قیامت تک جاری ہے اور حضرت عیسیٰ کبھی کے مر چکے اور سرینگر میں دفن ہو چکے۔ اور مرے ہوئے واپس اس دنیا میں نہیں آیا کرتے۔

(۲) دوسرا نقص یہ تھا کہ مسلمان آنحضرت صلعم کو آخری نبی مانتے تو تھے لیکن اس دعوے کو انہوں نے تشفی بخش دلائل سے مدلّل نہ کیا ہوا تھا۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اس پر ایسے پُرزور دلائل دیئے کہ آنحضرت صلعم کا آخری نبی ہونا بالکل واضح ہو گیا۔ حضرت اقدس نے مختلف طریق سے ختم نبوت پر دلائل قائم کئے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:۔

الف۔ حضرت محمد رسول اللہ صلعم جو خدا کی کتاب قرآن کریم لائے اس نے ہدایت اور شریعت الٰہی کو جو نوع انسان کے لئے مقدر تھی تکمیل پر پہنچا دیا جس کے بعد کسی شریعت اور ہدایت کی ضرورت باقی نہ رہی۔ لہذا کسی اور نبی کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔

ب۔ آنحضرت صلعم نے اپنے نمونہ سے تمام کمالات انسانی کو جو وقتاً فوقتاً نبیوں کے ذریعہ سے علیحدہ علیحدہ ظہور میں آتے رہے اپنے وجود میں تکمیل کے انتہائی نقطہ پر پہنچا کر اپنے بعد نبیوں کی ضرورت کو ختم کر دیا۔ جیسا کہ حضرت مرزا صاحب کا یہ شعر بھی ظاہر کرتا ہے

ختم شد بر ذاتِ پاکش ہر کمال لاجرم شد ختم ہر پیغمبرے

ج۔ محمد رسول اللہ صلعم کی لائی ہوئی کتاب اور شریعت اور آپ کے کامل نمونہ کی حفاظت منجانب اللہ ایسے کامل طریق پر ہوئی کہ کسی نئی شریعت یا نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہی۔

د۔ محمد رسول اللہ صلعم زندہ نبی ہیں یعنی آپ کا فیضان نبوت قیامت تک جاری ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے فیضان نبوت سے آپ کے متبعین آج بھی خدا سے تعلّق پکڑتے اور اس کی معرفت و محبّت اور قرب اور شرف مکالمہ و مخاطبہ سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں جو عین مقصد نبوت تھا۔ تو اب کسی نئے نبی اور اس کے فیضان کی ضرورت باقی نہ رہی۔ وغیرہ وغیرہ

(۳) تیسرا نقص یہ تھا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آنحضرت صلعم خاتم الانبیا یعنی آخری نبی ہیں اور آپ کا فیضان نبوت قیامت تک جاری ہے لیکن دوسری قوموں میں جو نبی آئے اُن کے

فیضان کے بند ہو جانے کا کیا ثبوت ہے۔ اور اگر اُن کا فیضان بھی جاری ہے تو پھر ہر ایک قوم کا آخری نبی اپنی قوم کیلئے خاتم الانبیا ٹھیرا۔ یہی وجہ تھی جو اس بات پر حضرت اقدس مرزا صاحب نے بڑا زور دیا کہ "اب صرف حضرت محمد رسول اللہ صلعم ہی تمام دنیا کے لئے واحد زندہ نبی ہیں۔ کیونکہ صرف آپ ہی کا فیضان نبوت جاری ہے اور باقی سب نبیوں کے فیضان ختم ہو چکے۔ چنانچہ اسلام کے سوا اب کوئی دین ایسا نہیں جس میں تعلق باللہ رکھنے والے لوگ پیدا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ختم نبوت کے اس پہلو کی آپ کے ہاتھوں سے بہ وجہ احسن تکمیل ہوئی۔ کیونکہ آپ نے بڑے زور اور بڑی تحدّی کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ تمام نبیوں کے فیضان ختم ہو چکے اور تمام قوموں کے لئے صرف آنحضرت صلعم ہی خاتم الانبیاء یعنی زندہ اور آخری نبی ہیں جن کی قوت قدسی اور فیضان نبوت آج بھی جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گا۔ اور آپ کی بعثت کے بعد فقط اُمت محمدیہ ہی وہ امت ہے جس میں حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی اتباع کی برکت اور طفیل سے ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو خدا کا قرب حاصل کرتے اور خدا کے کلام سے مشرف ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اس زمانہ میں اس بات کا زندہ ثبوت میرا وجود ہے کہ میں نے آنحضرت صلعم کی اتباع کے فیضان سے خدا کے قرب کو پایا اور مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ کا شرف حاصل کیا۔ اگر اور مذہبوں میں کوئی رُوحانی زندگی اور فیضان نبوت باقی ہے تو وہ میرے مقابلہ میں ایسے وجودوں کو پیش کریں جنہوں نے ان مذاہب کی پیروی سے خدا کا قرب حاصل کیا ہو اور اس کے مکالمہ ومخاطبہ سے مشرف ہوئے ہوں۔ لیکن وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آج اسلام کے سوا کوئی زندہ مذہب نہیں۔ اور محمد رسول اللہ صلعم کے سوا اب کوئی زندہ نبی نہیں جس کا فیضان نبوت جاری ہو" چنانچہ تمام مذاہب عالم کو چیلنج دیتے ہوئے ایک نظم میں کیا خوب فرماتے ہیں:۔ ؎

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے	کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے
کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلائے	یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے
ہم نے اسلام کو خود تجربہ کرکے دیکھا	نور ہے نور اُٹھو دیکھو سنایا ہم نے
اور دینوں کو جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا	کوئی دکھلائے اگر حق کو چھپایا ہم نے
تھک گئے ہم تو انہی باتوں کو کہتے کہتے	ہر طرف دعوتوں کا تیر چلایا ہم نے

آزمائش کے لئے کوئی نہ آیا ہر چند | ہر مخالف کو مقابل پہ بلایا ہم نے
آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے | لو تمہیں طَور تسلی کا بتایا ہم نے
آج ان نوروں کا اک زور ہے اس عاجز میں | دل کو ان نوروں کا ہر رنگ دلایا ہم نے

مصطفٰے پر ترا بیحد ہو سلام اور رحمت
اُس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے

شعروں میں ہی نہیں۔ کتابوں میں، اشتہاروں میں یہی چیلنج بڑے زوروں سے آپ ہمیشہ دیتے رہے اور کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کے مقابلہ پر آئے۔ جن لوگوں نے اس معاملہ میں لاہور کے بشپ لیفرائے کی شکست اور سراسیمگی دیکھی ہے وہ اس نظارہ کو بھول نہیں سکتے جس کا ذکر میں اسی کتاب کے حصہ اوّل میں مفصّل لکھ چکا ہوں۔ مختصریوں کہ لاہور کے بشپ لیفرائے نے مسلمانوں کو "زندہ رسول" پر مناظرہ کیلئے چیلنج دیا تھا۔ لاہور کے غیر احمدی مسلمانوں نے پہلے تو مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کو اس مناظرہ کے لئے بلایا۔ لیکن جب وہ ٹال گئے تو فہمیدہ طبقہ نے یہ سمجھ لیا کہ حضرت عیسٰی کو آسمان پر زندہ بٹھا کر اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو خاک میں مدفون کر کے ہم ایک عیسائی پادری کا اس مسئلہ میں مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان سب نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ مناظرہ کے دن جب بشپ موصوف کے مقابلہ میں حضرت اقدس مرزا صاحب کا لیکچر "زندہ رسول" پر پڑھا گیا جس کا ملخص یہ تھا کہ "زندہ نبی اور رسول" فقط حضرت محمد رسول اللہ صلعم ہیں کیونکہ زندہ نبی وہ ہوتا ہے جس کے فیوض و برکات زندہ ہوں اور جس کی اتباع سے آج بھی لوگ خدا کے قرب کو حاصل کرتے اور اس سے واصل ہوتے ہوں۔ اور جس کی زندہ مثال اس زمانہ میں مَیں خود ہوں جس کا جی چاہے آزمالے۔ برعکس اس کے حضرت عیسٰی نہ صرف مرچکے بلکہ ان کے فیوض و برکات بھی منقطع ہو چکیں۔ اگر نہیں تو میرے مقابلہ میں کسی ایسے عیسائی کو پیش کرو جس نے حضرت عیسٰی کی اتباع سے خدا کا قرب حاصل کیا ہو۔ لیکن تم کسی کو پیش نہیں کر سکتے کیونکہ حضرت عیسٰی کی نبوت وقتی اور قومی تھی اور اس کا وقت گزر چکا اور فیضان ختم ہو چکا۔ پس کوئی زندہ نبی سوائے حضرت محمد رسول اللہ کے نہیں جس کا فیضانِ نبوت آج بھی جاری ہو۔

یہ لیکچر جو دلائل اور تحدّی سے پُر تھا جب بشپ موصوف نے سُنا تو اُس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر بیٹھ گیا۔ بعد میں حضرت اقدس مرزا صاحب نے اُسے دوبارہ "معصوم نبی اور زندہ رسول" پر مناظرہ کے لئے بڑا زبردست چیلنج دیا مگر اس نے راہ فرار اختیار کی۔

اور صرف وہی نہیں کسی مذہب کے بھی پیرو اور عالم کو یہ جرأت نہیں کہ اس امر میں آپ کا مقابلہ کرتا۔
غرضیکہ آنحضرت صلعم کے ختم نبوت کے اس پہلو کو حضرت اقدس مرزا صاحب نے نہایت نمایاں کر کے دکھایا کہ نہ صرف بعثت کے رُو سے آپ آخری نبی ہیں اور آپ پر تمام کمالات نبوت ختم ہو چکے بلکہ فیضان نبوت کے رُو سے بھی آپ آخری اور اکیلے زندہ نبی ہیں۔ تمام گزشتہ نبیوں کی نبوتیں اب ختم ہیں۔ فقط آپ ہی کی نبوت ہے جو اکیلی تمام قوموں اور تمام زمانوں کے لئے زندہ نبوت ہے جس کی تعلیم ابدی اور جس کا فیضان زندہ ہے۔ اور جو کچھ مراتب قرب الٰہی اور شرف مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ اب مل سکتا ہے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیضان نبوت سے ہی مل سکتا ہے ولا غیر۔ اپنی کتاب کشتی نوح میں کس زور سے یہی اعلان فرماتے ہیں۔
ارشاد ہوتا ہے :-

"نوع انسان کیلئے روئے زمین پر اب کوئی کتاب نہیں مگر قرآن۔ اور آدم زادوں کے لئے اب کوئی رسول اور شفیع نہیں مگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سو تم کوشش کرو کہ سچی محبت اس جاہ و جلال کے نبی کے ساتھ رکھو۔ اور اس کے غیر کو اس پر کسی نوع کی بڑائی مت دو تا آسمان پر تم نجات یافتہ لکھے جاؤ۔ اور یاد رکھو کہ نجات وہ چیز نہیں جو مرنے کے بعد ظاہر ہوگی۔ بلکہ حقیقی نجات وہ ہے کہ اسی دنیا میں اپنی روشنی دکھلاتی ہے۔ نجات یافتہ کون ہے؟ وہ جو یقین رکھتا ہے جو خدا سچ ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اور تمام مخلوق میں درمیانی شفیع ہے۔ اور آسمان کے نیچے نہ اس کے ہم مرتبہ کوئی اور رسول ہے اور نہ قرآن کے ہم مرتبہ کوئی اور کتاب ہے۔ اور کسی کے لئے خدا نے نہ چاہا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے۔ مگر یہ برگزیدہ نبی ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اور اس کے ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے خدا نے یہ بنیاد ڈالی کہ اس کے افاضۂ تشریعی اور روحانی کو قیامت تک جاری رکھا۔ اور آخر کار اس کی رُوحانی فیض رسانی سے اس مسیح موعود کو دنیا میں بھیجا۔"

یہ وہ باتیں تھیں جو حضرت اقدس مرزا صاحب کے علم کلام سے مخصوص تھیں۔ آنحضرت صلعم کے خاتم الانبیا اور زندہ نبی ہونے پر پُر زور تحدیاں وہی شخص کرسکتا ہے جو خود صاحب حال ہو اور جس کی اپنی بصیرت کی آنکھ روشن ہو۔ اور یقین اور معرفت کے تمام مراتب طے کر چکا ہو۔ ایک مولوی یا فلاسفر کا یہ کام نہیں یہ وہ خاص وجود ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تائید و تصدیق کے لئے خود کھڑا کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ جو انہیں شناخت کرتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر خدمت دین میں حصہ لیتا ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کی ختم نبوت کے لئے غیرت

حضرت مرزا صاحب کو حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی ختم نبوت کیلئے اس قدر غیرت تھی کہ آپ ان تمام اوراد و وظائف کو جو سنت رسول اللہ سے ثابت نہیں اور بد قسمتی سے آجکل مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں آنحضرت صلعم کی ختم نبوت کے منافی سمجھتے تھے۔ فتاویٰ احمدیہ صفحہ ۱۹۱ پر حضرت مرزا صاحب کا یہ فتویٰ قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"یقیناً یاد رکھو کہ کوئی شخص سچا مسلمان نہیں ہو سکتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع نہیں بن سکتا۔ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیّین یقین نہ کرے اور جب تک ان محدثات سے الگ نہیں ہوتا اور اپنے قول اور فعل سے آپ کو خاتم النبیین نہیں مانتا۔ سعدی نے کیا اچھا کہا ہے۔ ؎ بزہد وورع کوش وصدق وصفا۔ ولیکن میفزائے بر مصطفٰے ہمارا مدعا جس کیلئے خدا تعالیٰ نے ہمارے دل میں جوش ڈالا ہے یہی ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قائم کی جائے جو ابدالآباد کیلئے خدا نے قائم کی ہے۔ اور تمام جھوٹی نبوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے جو ان لوگوں نے اپنی بدعتوں کے ذریعہ قائم کی ہیں۔ ان ساری گدیوں کو دیکھ لو اور عملی طور پر مشاہدہ کرو کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ہم ایمان لائے ہیں یا یہ لوگ۔ یہ ظلم اور شرارت کی بات ہے کہ ختم نبوت سے خدا تعالیٰ کا اتنا ہی منشا قرار دیا جائے کہ منہ سے ہی خاتم النبیین مانو اور کرتوتیں وہی کرو جو تم خود پسند کرو۔ اور اپنی ایک الگ شریعت بنا لو۔ بغدادی نماز، معکوس نماز ایجاد کی ہوئی ہیں۔ کیا قرآن شریف یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں اس کا کہیں پتہ لگتا ہے؟ اور ایسا ہی یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کہنا اس کا ثبوت بھی کہیں قرآن شریف سے ملتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تو شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وجود بھی نہ تھا۔ پھر یہ کس نے بتایا تھا۔ شرم کرو۔ کیا شریعت اسلام کی پابندی اور التزام اسی کا نام ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کرو کیا ان باتوں کو مان کر اور ایسے عمل رکھ کر تم اس قابل ہو کہ مجھے الزام دو کہ میں نے خاتم النبیین کی مہر کو توڑا ہے۔ اگر تم اپنی مساجد میں بدعات کو دخل نہ دیتے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی نبوت پر ایمان لا کر آپ کے طرز عمل اور نقش قدم کو اپنا امام بنا کر چلتے تو پھر میرے آنے ہی کی کیا ضرورت ہوتی۔ تمہاری ان بدعتوں اور نئی نبوتوں نے ہی خدا تعالیٰ کی غیرت کو تحریک دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر میں ایک شخص کو مبعوث کرے جو ان جھوٹی نبوتوں کے بت کو توڑ کر نیست و نابود کر دے۔ پس اسی کام کے لئے خدا نے مجھے مامور کر کے

بھیجا ہے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ غوث علی پانی پتی کے ہاں شاکت مت کا ایک منتر رکھا ہوا ہے جس کا وظیفہ کیا جاتا ہے۔ ان گدی نشینوں کو سجدہ کرنا یا ان کے مکانات کا طواف کرنا یہ بالکل ان بدعتیوں کی معمولی اور عام باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری اس جماعت کو اسلئے قائم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت اور عزت کو دوبارہ قائم کریں۔ ایک شخص جو کسی کا عاشق کہلاتا ہے اگر اس جیسے ہزاروں ہوں تو اس کے عشق و محبت کی خصوصیت کیا ہے۔ تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عشق میں اگر فنا ہیں جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تو یہ کیا بات ہے کہ ہزاروں قبروں اور مزاروں کی پرستش کرتے ہیں۔"

شفاعت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی حضرت اقدس مرزا صاحب نے سرمہ چشم آریہ اور اپنی دیگر کتب میں جو شفاعت کے متعلق وقتاً فوقتاً بحث کی ہے اس سے جو مَیں نے سمجھا اور استنباط کیا ہے وہ یہاں عرض کر دیتا ہوں۔ شفاعت کا مسئلہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ اسلام کی اصل تعلیم تو یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے افعال کا ذمہ وار نہیں ہو سکتا۔ نہ ایک کے اعمال کی ذمہ واری دوسرے کو عمل سے عہدہ برآ کر سکتی ہے۔ شفاعت بظاہر اس کے خلاف نظر آتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اختلاف کوئی نہیں حضرت اقدس مرزا صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت خوبصورتی سے صاف کیا ہے۔ آپ کا ارشاد یہ تھا کہ شفاعت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جس کی سفارش چل گئی وہ گناہ کی سزا سے بچ گیا۔ بلکہ اس کے معنے لغت میں رُوحانی جوڑ کے ہیں۔ پس شفاعت کے معنے یہ ہوئے کہ کسی پاک انسان کے ساتھ رُوحانی جوڑ کی وجہ سے انسان کو فائدہ اور فیض پہنچا اور یہ دو طریق پر ہوتا ہے۔ (۱) ایک تو دنیا میں اعمال کے ارتکاب کے وقت تزکیہ کی شکل میں۔ (۲) دوسرے آخرت میں نتائج اعمال کے ملنے کے وقت عفو کی شکل میں۔

(۱) دنیا میں کسی پاک انسان کے ساتھ رُوحانی جوڑ کی وجہ سے جو نفع پہنچتا ہے وہ ارتکاب اعمال کے وقت تزکیہ کی شکل میں پہنچتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کے ایک بڑے نل کے ساتھ اگر کوئی اپنا نلکہ لگائے تو پانی اس نلکہ میں آنے لگتا ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلعم کا وجود باجود ایک بڑے نل کی طرح ہے جس میں جناب الٰہی کے فیضان وحدت و معرفت کے چشمہ سے رُوحانی زندگی کا پانی آرہا ہے۔ جو شخص اپنی رُوح کے نلکہ کو روحانی پانی کے اس بڑے نل سے جوڑ لیتا ہے وہ اس پانی سے فیضیاب اور سیراب ہو جاتا ہے یا یوں سمجھو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود باجود بجلی کی ایک بڑی تار کی طرح ہے جو جناب الٰہی کے فیضان کی بجلی سے بھری ہوئی ہے جو شخص اس روحانی بجلی کے تار سے اپنی تار کو جوڑ لیتا ہے وہ اس

تجلی سے مستفیض ہو کر روشن ہو جاتا ہے۔ اور اس جوڑ کا جو طریقہ قرآن کریم نے بتایا ہے وہ ایک ہی ہے اور وہ ہے:۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ یغفر لکم ذنوبکمؕ واللہ غفور الرحیم (آل عمران) کہدے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور تمہارے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا۔ اور اللہ مغفرت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے۔ اس آیت سے صاف نظر آتا ہے کہ محبت الٰہی کے حصول اور مغفرت ذنوب کا باعث جس چیز کو بتایا ہے وہ صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ یعنی قرآن کریم کی ہدایات کے مطابق آنحضرت صلعم کی اتباع۔ جو شخص آپ صلعم کی اتباع کرتا ہے وہ نہ صرف اُن راہوں پر گامزن ہوتا ہے جو محبت اور قرب الٰہی کی راہیں ہیں بلکہ اس کے گذشتہ گناہوں کی مغفرت بھی ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی اصلاح ہوتی جاتی ہے اور آئندہ وہ گناہوں اور کمزوریوں میں پڑنے سے بچ جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے اور اس طرح وہ اس روحانی جوڑ سے فائدہ اُٹھاتا ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کے ساتھ اُس نے جوڑا تھا۔ اور اسی کا نام وہ شفاعت ہے جو اس دنیا میں انسان کو حاصل ہوتی ہے اور جس سے فائدہ اٹھا کر انسان فیضان الٰہی سے مستفیض ہو کر تزکیہ و تقویٰ کا وارث ہوتا ہے۔

(۲) آخرت میں شفاعت کے معنے ہیں نتائج اعمال کے وقت کسی پاک وجود کے ساتھ رُوحانی جوڑ کی وجہ سے فائدہ اٹھانا عفو کی شکل میں۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ کسی پاک وجود کے ساتھ روحانی جوڑ پیدا کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے اس کی اتباع۔ پس آخرت میں اسی شخص کا رُوحانی جوڑ کسی پاک وجود کے ساتھ نمایاں ہوگا جو اس پاک وجود کی اتباع کرتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی دعا مذکور ہے کہ فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفورٌ رحیم۔ جو شخص میری اتباع کرتا ہے وہ مجھ سے ہے اور جو شخص میری نافرمانی کرتا ہے پھر تو مغفرت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے۔ گویا اپنا تعلق فقط اس شخص سے جتایا ہے جو آپ کی اتباع کرتا ہے۔ یعنی کسی پاک وجود سے اگر رُوحانی جوڑ ہو سکتا ہے تو فقط اس کی اتباع سے ہو سکتا ہے و لاغیر۔ پس قیامت میں جہاں جسمانی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے اور کوئی جسمانی رشتہ اور تعلق وہاں کام نہ آئے گا۔ وہاں رُوحانی تعلقات اور جوڑ ہویدا ہو جائیں گے۔ اور یہی وہ رُوحانی جوڑ ہوں گے جو بعض حالات میں مغفرت ذنوب کا باعث ہو جائیں گے۔ اس مغفرت ذنوب کی کیفیت یوں ہے کہ جس طرح انسان کے کسی عضو کو جس کا تعلق

جسم سے ہے اگر کوئی تکلیف پہنچائی جائے تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ اور اگر وہی عضو قطع شدہ ہو تو چاہے اُسے آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو جسم انسانی کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر ایک شخص نے اپنی اتباع سے کسی نبی یا پاک وجود کے ساتھ رُوحانی جوڑ پیدا کر لیا ہے تو اگر اُس سے کچھ فروگزاشت ہو گئی ہے جس کے بدلہ میں وہ کسی قدر عذاب کا مستوجب ہو چکا ہے تو اس تکلیف کو ضرور ہے کہ اس پاک انسان کا قلب بھی محسوس کرے جس سے اُس کا رُوحانی جوڑ ہے۔ دنیا میں روز ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر ایک بچہ کو کوئی طمانچہ مارے تو ماں باپ کے دل کو کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ وجہ یہی کہ بچّہ سے اس کے والدین کو ایک فطرتی جوڑ ہے اگرچہ وہ جوڑ فقط اس جسم اور مادہ تک ہی محدود ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اپنی اتباع سے کسی رسول کے ساتھ اگر رُوحانی جوڑ پیدا کر چکا ہے تو بوجہ اس جوڑ کے قیامت میں اس کی کسی خطا پر اسے سزا ملنے کے وقت اس کے متبوع رسول کا قلب بھی ضرور اس تکلیف کو محسوس کرے گا۔ ایسی حالت میں سب سے پہلے موقعہ پر جو اُس رسول کو کسی مستحق انسان کی معافی کیلئے درخواست کرنے کا اگر دیا جائے گا تو وہ ضرور ایسے شخص کی معافی کیلئے درخواست کرے گا۔ اسی کا نام شفاعت ہے۔ پھر جتنا جس کا تعلق زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اُس کی تکلیف زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کسی انسان کی اُنگلی اگر خراب ہو کر کاٹنے کے قابل ہو جائے تو وہ اپنا ہاتھ بچانے کے لئے اُنگلی کٹوا دیگا کیونکہ ہاتھ کا جوڑ جسم انسانی کے ساتھ زیادہ قابلقدر ہے۔ اور اگر بازو خراب ہو کر کاٹنے کے قابل ہو جائے تو وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے بازو کٹوا دیگا۔ کیونکہ زندگی کا جسم سے جوڑ بہت زیادہ قیمتی اور قابل قدر ہے۔ یہی حال رُوحانی جوڑ کا ہے۔ جس شخص نے جس قدر زیادہ اتباع کی ہے وہ اسی قدر زیادہ شفاعت کے نیچے ہے یعنی اس کی تکلیف کا اسی قدر اس رسول کو زیادہ احساس ہوگا۔ اور اگر رسول کو کسی انسان کی معافی کیلئے درخواست کرنے کا موقعہ دیا جائے گا تو وہ اس شخص کیلئے معافی طلب کرنے کو جس نے اتباع زیادہ کی ہے مقدم کرے گا اور ترجیح دیگا۔ اس شخص پر جس نے اتباع میں کمی کی ہے۔ پس جو شخص جس قدر زیادہ متبع ہے وہ اسی قدر شفاعت کے نیچے ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ رسول کی عمداً نافرمانی کرنیوالے سرکش لوگ شفاعت کے مستحق ہیں۔ وجہ یہ کہ رسول کو ایسے لوگوں سے جب کوئی جوڑ ہی نہیں تو ان کی مغفرت کیلئے اُس کے دل میں درد بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ویسے خدا تعالیٰ جسے چاہے مغفرت کردے۔ لیکن شفاعت رُوحانی جوڑ

کو چاہتی ہے اور وہ اتباع سے پیدا ہوتا ہے۔ جس شخص میں اتباع رسول نہیں اُس کا اُس رسول سے جوڑ بھی نہیں پس اُس کی شفاعت کیسی؟

آخرت میں شفاعت کرنے کے کچھ آداب بھی ہیں۔ اول تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دعا میں اور شفاعت کرنے میں ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ دعا عام ہے۔ ہر ایک شخص کو خواہ وہ گنہگار ہے یا نیکوکار خدا کے سامنے اپنی عرض معروض کرنے کی عام اجازت ہے کوئی روک نہیں کوئی تخصیص نہیں۔ لیکن شفاعت کرنا جو بجائے خود ایک دعا ہی ہے اپنے اندر ایک خصوصیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس میں شفاعت کرنیوالا گنہگار کے لئے اپنے وجود کو جناب الٰہی میں پیش کر کے سفارش کرتا ہے کہ میری خاطر اس کی خطا کو معاف کر دیا جائے۔ یہی وہ بات ہے جس کی وجہ سے شفاعت بلا اذن اسلام میں جائز نہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ من ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہ کہ کون ہے وہ جو خدا کے حضور میں شفاعت کرے بغیر اس کے اذن یعنی اجازت کے۔ شفاعت بغیر اذن کے اس لئے جائز نہیں کہ بندہ کی خواہ وہ کتنا ہی مقرب کیوں نہ ہو یہ مجال نہیں کہ وہ خدا کے سامنے اپنے وجود کو اس رنگ میں پیش کر کے سفارش کرے کہ میری خاطر فلاں شخص کو معاف کر دیا جائے۔ یہ خدا کی صفت غنی عن العالمین کے خلاف ہے۔ وہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اس کو کسی کی پروا یا ضرورت نہیں۔ اور اپنے وجود کو پیش کرنیوالا اور اپنی خاطر کوئی کام کرانیوالا گویا اپنی اہمیت کو خدا کے سامنے جتاتا ہے۔ یہ وہ بات ہے جس سے خدا کی ذات پاک ہے اُسے کسی مخلوق کی پروا نہیں۔ کسی بندہ کی یہ شان نہیں کہ وہ خدا کو کہے کہ اگر میری رضامندی مطلوب ہے تو فلاں شخص کو معاف کر دو۔ وہ صمد ہے جس کے معنی ہیں کہ سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس کے ساتھ تعلق کی بندہ کو ضرورت ہے نہ کہ خدا کو۔ خدا کی یہ شان ہے کہ بندہ اس کی رضامندی کو ڈھونڈتا ہے۔ خدا کو بندہ کی رضامندی ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ پس بندہ کی یہ شان نہیں کہ وہ بغیر اجازت کے خدا کے حضور شفاعت کرے۔ ہاں بالاذن یعنی اجازت کے ساتھ شفاعت جائز ہے۔ اور وہ فقط عفو کی ایک قسم اور عزت افزائی کی ایک شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت اور حکمت اور عدل اور رحم کو مدنظر رکھتے ہوئے جب کسی بندہ کو معاف کرتے میں مضائقہ نہ سمجھے گا اور اس کا رحم اس امر کا متقاضی ہو گا کہ اس بندہ کو معاف کر دیا جائے تو جس رسول سے اس کا روحانی جوڑ ہو گا اسے اجازت دی جائیگی کہ اگر تم اس کی سفارش کرو

تو ہم تمہاری خاطر اس بندہ کو معاف کر دیں گے۔ اس وقت رسول کو جو معافی کے لئے درخواست کرنے کا موقعہ ملے گا تو وہ اپنے ان متبعین کیلئے جنہوں نے اپنی اتباع سے اُس رسول کے ساتھ روحانی طور پر جوڑ اور تعلق قائم کیا ہوا ہے مگر بعض لغزشوں اور فروگزاشتوں کی وجہ سے زیر عتاب اور مستوجب عذاب ہو گئے ہیں جناب الٰہی میں سفارش کرے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی خاطر ان کی خطاؤں سے درگزر کرے گا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے شفاعت درحقیقت عفو اور مغفرت الٰہی کی ایک شکل باقی رہ جاتی ہے اور اُس سے فقط اس بندہ کی عزت افزائی مدنظر معلوم ہوتی ہے جس کی خاطر ایک گنہگار کو معافی دی جاتی ہے۔ پس آخرت میں یہی وہ شفاعت بالاذن ہے جو اسلام میں جائز ہے۔ اور اسی کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے۔ یومئذٍ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولاً (طٰہٰ)

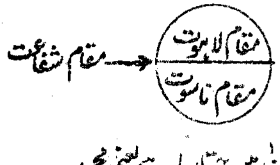
اور اس دن کوئی شفاعت کام نہ آئے گی مگر جس کو رحمان اجازت دے اور اس کا بولنا پسند فرمائے۔ اور صالح اور مقرب انسانوں کی طرح ملائکہ بھی شفاعت کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ انہی کی شفاعت کریں گے جن کے ساتھ ان کا روحانی جوڑ ہوگا۔ اور وہ انہی لوگوں سے ہو سکتا ہے جو ملائکہ کی نیکی کی تحریکوں سے متاثر ہو کر ان کی تحریکوں کو قبول کرتے اور اعمال صالحہ بجالاتے تھے۔

شفاعت کرنیوالوں میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو قرآن کریم نے تمام مقربین انسانوں اور ملائکہ کے مقامات سے بلند اور کامل تر بتایا ہے۔ اور کھول کر دکھایا ہے کہ ساری دنیا کی شفاعت کے لئے اگر کوئی انسان کامل موزون ہو سکتا ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ نے اُس مقام شفاعت کبریٰ کو حاصل کر لیا ہے جو اور کسی انسان کو اوّلین و آخرین میں سے نصیب نہیں ہوا۔

یہاں مَیں حضرت اقدس مرزا صاحب کے اصل الفاظ نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

"کامل اور حقیقی شفیع وہی ہو سکتا ہے جس میں یہ دو صفتیں موجود ہوں (۱) اوّل یہ کہ خدا تعالیٰ سے تعلق شدید ہو (۲) دوم یہ کہ مخلوق سے بھی محبت اور ہمدردی کا تعلق بدرجۂ کمال ہو۔ تو بلاشبہ ایسا شخص ان لوگوں کے لئے جو ایسے شخص سے روحانی جوڑ رکھتے ہیں اور عمداً نافرمانیوں کی وجہ سے اُس سے تعلق نہیں توڑتے۔ دلی جوش سے شفاعت کرے گا۔ اور وہ شفاعت اس کی منظور کی جائے گی۔ کیونکہ جس شخص کی فطرت کو یہ دو تعلق

بدرجۂ کمال عطا کئے گئے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت تامہ کی وجہ سے فیضان الٰہیہ کو کھینچے اور پھر مخلوق کی محبت تامہ کی وجہ سے وہ فیض ان تک پہنچائے ایسے شفیع کیلئے ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ سے ایک ایسا گہرا تعلق ہو کہ گویا خدا اس کے دل میں اُترا ہُوا ہو اور اس کی تمام انسانیت مر کر بال بال میں لاہوتی تجلّی پیدا ہو گئی ہو اور اس کی رُوح پانی کی طرح گداز ہو کر خدا کی طرف بہ نکلی ہو۔ اور اس طرح پر خدائی قرب کے انتہائی نقطہ پر جا پہنچی ہو۔ پھر اسی طرح شفیع کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس کیلئے وہ شفاعت کرنا چاہتا ہے اس کی ہمدردی میں اُس کا دل ہاتھ سے نکلا جاتا ہو ایسا کہ عنقریب اُس پر غشی طاری ہو گی اور گویا شدت قلق سے اس کے اعضا اس سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں اور اس کے حواس منتشر ہیں اور اس کی ہمدردی نے اسے ایسے مقام پر پہنچایا ہو کہ جو باپ سے بڑھ کر اور ماں سے بڑھ کر ہے۔ پس جب یہ دونو حالتیں اس میں پیدا ہو جائیں گی تو وہ ایسا ہو جائے گا کہ گویا وہ ایک طرف سے لاہوت کے مقام سے جفت ہے اور دوسری طرف ناسوت کے مقام سے۔ تب دونو پلّے میزان کے اس میں مساوی ہوں گے یعنی وہ مظہر لاہوت کامل بھی ہوگا اور مظہر ناسوت کامل بھی اور بطور برزخ دونو حالتوں میں واقع ہوگا۔ اس طرح :-



اس مقام شفاعت کو دنیٰ فتدلّٰی فکان قاب قوسین اَو ادنیٰ میں جتلایا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلعم خدا کی طرف چڑھا اور جہاں تک استعداد انسانی سے ممکن ہے خدا تعالیٰ سے نزدیک ہُوا اور قرب کے تمام کمالات کو طے کیا اور لاہوتی مقام سے پُورا حصّہ لیا۔ اور پھر ناسوتی مقام کی طرف کامل رجوع کیا یعنی عبودیت کے انتہائی نقطہ تک اپنے تئیں پہنچایا۔ اور بشریت کے پاک لوازم یعنی بنی نوع کی ہمدردی اور محبت سے جو ناسوتی کمال کہلاتا ہے پورا حصّہ لیا۔ لہذا ایک طرف خدا تعالیٰ کی محبت میں کمال تام حاصل کیا اور دوسری طرف کامل طور پر بنی نوع سے قریب ہُوا اس لئے دونو طرف کے مساوی قرب کی وجہ سے ایسا ہو گیا جیسے دو قوسوں میں ایک تر ہوتا ہے اور یہی مقام شفاعت کبریٰ کا ہے۔ اور یہی وہ نقطہ انتہائی کمالات انسانی کا ہے جس پر تمام نوع انسانی میں سے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے اس لئے آپ تمام دنیا کے لئے شفیع کامل ٹھیرے۔"

جنت اور جہنم کے مسئلہ پر روشنی ڈالی

حضرت اقدس مرزا صاحب نہ تو جنت اور جہنم کو عام مولویوں کی طرح

کوئی مادی چیزیں سمجھتے تھے اور نہ معتزلہ اور نیچریوں کی طرح محض تخیل اور باطنی کیفیت بتاتے تھے۔
۱۸۹۶ء میں آپ نے جلسۂ اعظم تحقیق مذاہب میں اپنے لیکچر میں جنت اور جہنم پر پوری وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس خوبی کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کیا کہ بڑے بڑے فلاسفر اور اہل علم عش عش کر اُٹھے جس کسی کا دل چاہے اسے پڑھ کر لطف اُٹھائے۔"اسلام اور اس کی فلاسفی" کے نام سے کتاب کی شکل میں موجود ہے۔ آپ نے بتلایا کہ جنت اور جہنم نہ تو کوئی مادی جگہوں کا نام ہے اور نہ محض باطنی کیفیت اس سے مراد ہے۔ بلکہ وہ ایک زندگی ہے جو انسان اسی دنیا میں اپنے ایمان اور اعمال سے بناتا ہے۔ اور جو اس دنیا میں تو انسان کے قلب سے شروع ہوتی ہے مگر آخرت میں جہاں اس دنیا کا تمام باطن اور عالم روحانیات کی تمام کیفیات ظاہر میں متبدل ہو جائینگی وہاں انسان کی جہنمی یا جنتی زندگی بھی ظاہر میں متبدل ہو کر انسان کے دکھ اور عذاب یا راحت و مسرت کا باعث بن جائے گی۔ جس طرح اگلا عالم جسے عالم آخرت کہا جاتا ہے موجودہ عالم کے لئے بطور نتیجہ کے ہوگا۔ اسی طرح جہنم اور جنت بھی انسان کے ایمان اور اعمال کے لئے بطور نتیجہ کے ہوں گے۔ قرآن کریم میں جہنم کے بارے میں یہ آیت خوب روشنی ڈالتی ہے۔ وما ادرٰلک ماالحطمۃ ہ نار اللہ الموقدۃ ہ التی تطلع علی الافئدۃ ہ انہا علیہم مؤصدۃ ہ فی عمد ممددۃ ہ (الھمزۃ) اور تجھے کیا خبر ہے کہ حطمہ یعنی جہنم کیا ہے۔ وہ اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر طلوع یا روشن ہوتی ہے۔ وہ بڑے بڑے ستونوں کی شکل میں اُنہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی یعنی انسان جو حرص اور شہوت، غضب اور حسد کے جذبات کے ماتحت ارتکاب اعمال بد کرتا ہے۔ وہ ایک آگ ہوتی ہے جو اس دنیا میں تو انسان کے قلب سے شروع ہوتی ہے جو مرکز ہے انسان کے ارادوں اور نیتوں اور جذبات اور احساسات کا لیکن آخرت میں وہ آگ کے ستونوں کی شکل میں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی۔ جس طرح دنیا میں وہ شخص جو جذبات کا غلام بن جاتا ہے جذبات کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک لالچی انسان روپے کے لالچ کے گرداب میں ایسا پھنستا ہے کہ اس سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لالچ کی آگ اُسے چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہے۔ ایک شہوت پرست انسان اپنے اعمال بد میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ وہ ایک آگ ہوتی ہے جس سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ آگ جو قلب سے نکل کر اسے درحقیقت اسی دنیا میں ہی گھیرے ہوئے ہوتی ہے اور ظاہر آنکھ سے نظر نہیں آتی آخرت میں ظاہر میں نظر آئے گی۔ اور وہ حقیقت جسے انسان کی آنکھ اس دنیا میں دیکھ نہ سکی فقط قلب میں محسوس کی تھی۔

وہاں ظاہر نظر سے دیکھے گا۔ کیونکہ وہاں ہر ایک باطن ظاہر ہوگا۔ اسی طرح ایک مومن جو سچا ایمان رکھتا اور اعمال صالحہ بجالاتا ہے اس کے لئے خدا نے فرمایا ولمن خاف مقام ربّہ جنّتٰن (الرحمٰن) کہ جو اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اس کے لئے دو جنت ہیں یعنی ایک اس دنیا میں اور دوسری آخرت میں۔ اس دنیا میں تو وہ جنت قلب میں محسوس ہوتی ہے جو ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مگر آخرت میں وہی جنت جو باطن میں تھی ظاہر میں نظر آئے گی۔ ایمان باغ کی شکل میں اور اعمال صالحہ نہروں کی شکل میں نظر آئیں گے۔ اور اس کا احساس خود جنتیوں کو بھی ہوگا کہ یہ نعمائے جنت ہمارے ایمان اور اعمال کا نتیجہ ہے جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے وبشر الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت انّ لهم جنّٰتٍ تجری من تحتها الانهٰر کلّما رزقوا منها من ثمرةٍ رزقًا قالوا هٰذا الّذی رزقنا من قبل واتوا به متشابهاً (البقرہ) ان لوگوں کو خوشخبری دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں جب کبھی ان کو ان میں سے کوئی پھل بطور رزق دیا جائیگا تو وہ کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا اور انہیں ملتا جلتا رزق دیا جائے گا۔ اس آیت میں صاف صاف فرمادیا کہ ایمان کا تمثل باغ کی شکل میں اور اعمال صالحہ کا تمثل نہروں کی شکل میں ہوگا اور دنیا میں راحت اور لذت جو ایک مومن سچے ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجہ میں اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے وہ آخرت میں پھل کی شکل میں جب اسے دی جائیگی تو اس پھل کا مزہ اور لذت چکھ کر وہ محسوس کرے گا کہ یہ تو وہی پھل ہے جو میں نے اس سے قبل دنیا میں چکھا تھا۔ وہ پھل اپنے مزہ میں اس قلبی لذت سے اسقدر ملتا جلتا ہوگا کہ مومن جنت میں اس پھل کو چکھتے ہی محسوس کریگا کہ یہ تو وہی پھل ہے جسے میں اس سے پہلے چکھ چکا ہوں۔ جو مزہ اس نے دنیا میں باطنی رنگ میں چکھا تھا وہی مزہ آج وہ ظاہری طور پر چکھے گا۔ غرضکہ ساری بحث بہت لطیف اور علم کا ایک سمندر ہے۔ حضرت مرزا صاحب حشر اجساد کے قائل تھے مگر اس کی کیفیت اور تفصیل کو حوالہ بخدا کرتے تھے۔ بہرحال وہ کوئی ایسا جسم ہوگا جو ہمارے ایمان اور اعمال سے مناسبت رکھتا ہوگا۔ اور مادی قیود اور فنا و تغیر سے آزاد ہوگا۔

جہنم کی سزا دائمی نہیں

یہ معتزلہ اور خوارج کا مخفی اثر تھا جو مسلمان مولویوں نے عام طور پر یہ عقیدہ پھیلا رکھا تھا کہ کفار کے لئے جہنم کی سزا دائمی ہے۔ جو کافر جہنم میں داخل ہوگا خدا اسے کبھی جہنم سے باہر نہیں نکالے گا۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اس غلط عقیدہ کی اصلاح کی اور قرآن اور حدیث سے یہ ثابت کیا کہ جہنم کی سزا دائمی نہیں۔ ایسی حدیثیں پیش کیں جن میں صریح طور پر مذکور تھا کہ جہنم پر

ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی شخص نہ ہو گا اور صاف طور پر یہ بھی ذکر تھا کہ خدا اپنے ہاتھ سے جہنمیوں کو جہنم سے باہر نکالے گا۔ قرآن کریم میں جہنم کی سزا کے لئے آیا ہے جزاءً وفاقاً کہ جہنم کی سزا اعمال کے مطابق ہوگی۔ جب اعمال محدود ہیں تو اس کی سزا غیر محدود نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ ومن جاء بالسیئۃ فلا یجزیٰ الا مثلھا وھم لا یظلمون ؐ (الانعام) جو بد اعمال لائے گا پس اُسے بدلہ نہیں دیا جائیگا مگر اسی کی مثل اور اُن پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ گویا محدود اعمال کا بدلہ اگر اسی کی مانند محدود نہ ہو تو وہ تو ظلم بن جائے گا۔ اس لئے اعمال حسنہ کا بدلہ جو جنت ہے اسے جزاءً وفاقاً نہیں کہا بلکہ اس کے لئے فرمایا جزاءً من ربک عطاءً حساباً ؐ تیرے رب کی طرف سے بدلہ ہے عطائے کافی یعنی نیکی کا بدلہ محض بدلہ ہونے کی حیثیت سے تو محدود ہی ہونا چاہئے لیکن اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عطا عمل کرنیوالے کے اجر کو کافی ووافی کرے گی جو کبھی منقطع نہ ہو گی۔ اسی کو دوسری جگہ عطاءً غیر مجذوذ فرمایا کہ ایسی بخشش جو کبھی منقطع نہ ہو گی۔ پس جنت کا دائمی اور اس کی نعماء کا غیر منقطع ہونا اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کا فضل ہے۔ محدود اعمال کا بدلہ نہیں۔ بدلہ کی کمی کو اللہ تعالیٰ کی بخشش پورا اور غیر محدود کرے گی لیکن بد اعمالی کا بدلہ اگر اسکی مثل سے بڑھ جائیگا تو وہ ظلم ہو جائیگا۔ اسی لئے خدا نے اس کے لئے جزاءً وفاقاً فرمایا۔ کہ بدی کا بدلہ اس کے مطابق دیا جائے گا۔ پس جب بدی کی سزا محدود ہے تو وہ حدیث سچی ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہو گا۔ قرآن کریم میں جو ابد کا لفظ کہیں جہنم کیلئے بھی آگیا ہے تو اس کے معنے ہیں دہر طویل یعنی لمبا زمانہ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ایسا زمانہ جو کبھی منقطع نہ ہو۔ ابد کے یہ معنے عربی زبان میں نہ تھے۔ اسی لئے اس کی جمع آباد آتی ہے۔ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں جب یونانی فلسفہ کو عربوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو اصطلاحی طور پر ابد کے لفظ کو غیر منقطع زمانہ کے لئے استعمال کرنے لگ گئے۔ ورنہ زبان عربی میں اس کے یہ معنے نہ تھے۔ پس ابد کا لفظ اگر جہنم کے لئے قرآن میں کہیں آگیا تو اس کے معنے سوائے لمبے زمانہ کے اور کچھ نہیں۔ دوسری جگہ جہنم کی مدت کو احقاباً کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ اور حقب ایک برس سے اسی برس تک کے زمانہ پر بولا جاتا ہے۔ تو زمانہ تو خود ہی محدود ہو گیا اور جہنم کی سزا دائمی نہ رہی۔

بعض شرعی مسائل کے متعلق آپ کا فیصلہ

حضرت اقدس مرزا صاحب نے بعض متنازعہ فیہ شرعی مسائل میں جو بطور حکم کے اپنا مذہب پیش کیا ہے وہ عین مطابق قرآن وسنت ہے تفصیل تو آپ کی کتب

میں ہے لیکن بطور نمونہ چند مسائل پر آپ کا مذہب مختصراً اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں :۔

(۱) کثیر الازدواجی کے متعلق آپ نے قرآن وسنت سے ثابت کیا کہ یہ بطور علاج کے ہے نہ کہ بطور اصول کے۔ ایک سے زیادہ بیوی بعض ضروریات شرعی کے ماتحت عدل و انصاف کی شرط کے ساتھ بطور علاج کے ہے۔ مثلاً جنگ کی حالتوں میں جب مردوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور بہت سی عورتیں بیوہ اور بہت سے بچے یتیم رہ جاتے ہیں اور ان کی جائز طریق پر پرورش ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض وقت اولاد کی خاطر یا بعض اور ضروریات شرعی کی خاطر نکاح ثانی کرنا پڑتا ہے۔ بلا ضرورت اور بغیر عدل کے نکاح ثانی جائز نہیں۔

(۲) طلاق۔ آپ تین طلاقوں کو یکدم دینا ناجائز سمجھتے تھے۔ تین طہر یا تین ماہ ایک طلاق کی عدت تھی نہ کہ تین طلاقوں کی۔ خلع کو عورت کا حق سمجھتے تھے جو بعض صورتوں میں نا اتفاقی کی شادی کو ختم کرنے کیلئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔

(۳) مسئلہ میراث۔ ترکہ میں آپ قرآن کریم کے ماتحت لڑکی کو حصہ دینا ضروری سمجھتے تھے خواہ متوفی زمیندار ہو یا غیر زمیندار۔

(۴) سود کو آپ حرام سمجھتے تھے خواہ ساہوکار کا ہو یا بینک کا ہو۔ قرضہ کا ہو یا تجارت کا ہو البتہ آپ نے جب یہ سنا کہ بینک میں روپیہ رکھ کر اگر سود نہ لو تو بینک والے اس سود کو پادریوں کے فنڈ میں بھیج دیتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ روپیہ بجائے اس کے کہ اشاعت مسیحیت اور تخریب اسلام میں خرچ ہو کیوں نہ حفاظت و اشاعت اسلام میں خرچ ہو۔ اس لئے حکم دیا کہ بینک سے سود لیکر اشاعت اسلام میں خرچ کر دیا جائے۔ مگر اپنے اوپر نہ خرچ کیا جائے۔

(۵) غلامی۔ آپ کے نزدیک ابتدائے زمانہ نبوی میں غلاموں اور لونڈیوں کا وجود جو جاہلیت کے زمانہ سے چلے آتے تھے اور جنگوں میں قیدیوں کے رنگ میں آجاتے تھے وقتی تھا۔ انہیں یکدم چھوڑا نہ جا سکتا تھا کیونکہ ان کا گھر تھا نہ گھاٹ۔ آخر وہ کہاں جاتے اور کیا کرتے۔ اس لئے ایک خاص وقت کے لئے اگر ان کا وجود لابد تھا تو اس کے یہ معنے نہیں کہ ہمیشہ کے لئے ان کا وجود اسلام کیلئے لازم سمجھا جائے۔ اسلام نے دنیا میں آکر ہر ایک شخص کو خواہ وہ غلام تھا یا آزاد مرد تھا یا عورت ہر ایک نوع کی غلامی سے آزادی اور حریت کا عالمگیر پیغام دیا۔ اسلام نے لونڈیوں اور غلاموں کی آزادی کو سب سے بڑھ کر ثواب کا کام قرار دیا۔ اگر کوئی غلام یا لونڈی مکاتبت کے ذریعہ آزادی چاہے تو اس کے مالک کو حکم دیا کہ

اسے مالی امداد دیکر اس کے اس مقصد کی تکمیل کرے۔ حکومت کے بیت المال میں ایک فنڈ غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کیلئے علیحدہ قائم کیا۔ آزاد کو غلام بنانا گناہ قرار دیا۔ اگر جنگ میں کوئی قید ہو کر آجائے تو جنگ کے بعد فدیہ لیکر یا احسان رکھ کر چھوڑ دینے کا حکم دیا پس اسلام حریت کا علم بردار ہے نہ کہ غلامی کا۔

(۶) حضرت مرزا صاحب اسلامی حکومت میں جمہوریت اور مشاورت کے قائل تھے شخصی حکومت کو آپ پسند نہ کرتے تھے۔ اسی لئے آپ نے اپنی وصیت میں اپنا جانشین انجمن کو بنایا نہ کہ کسی شخص واحد کو۔

(۷) پردہ۔ حضرت مرزا صاحب عورتوں کا چہرہ (یعنی آنکھیں۔ ناک اور منہ) اور دونوں ہاتھوں کا کھلا رہنا اور اپنے کام کاج اور دیگر ضرورتوں کے لئے باہر نکلنا جائز سمجھتے تھے۔ البتہ اپنی زینت اور سنگار کو غیر محرم مردوں سے چھپانا ضروری سمجھتے تھے اور ان سے بلا ضرورت ملنے جلنے کو ناجائز خیال کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہ مرد و عورت کی مخلوط پارٹیاں ناجائز ہیں۔

(۸) مرتد کا قتل۔ بدقسمتی سے مسلمان مولویوں نے مرتد کو قتل کرنا اصول اسلامی بنا رکھا ہے۔ حضرت مرزا صاحب قرآن وحدیث کے رُو سے مرتد کو اس کے ارتداد کی وجہ سے قتل کرنا ناجائز سمجھتے تھے قرآن کریم میں صاف لفظوں میں آتا ہے۔ ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والآخرۃ (البقرہ) اور جو تم میں سے اپنے دین سے مرتد ہو جائے پھر وہ اس حالت میں مرجائے کہ وہ کافر ہی ہے تو اس کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت گئے۔ یہاں مرتد کے اپنی موت سے مرنے کا ذکر ہے اس کے قتل کرنے کا کوئی حکم نہیں۔ بلکہ ارتداد کے بعد اُسے پھر ایمان لانے کے لئے بھی موقعہ دیا گیا ہے۔ البتہ اگر ایمان نہ لائے اور اپنی موت سے مرجائے تو پھر اس کے اعمال ضائع ہو جانے کا وعید ہے۔ قتل کرنے کا کہیں حکم نہیں۔ اسی طرح متعدد آیات قرآنی ہیں جن میں مرتد کے دوبارہ ایمان لانے اور کفر کرنے کا ذکر ہے قتل کرنے کا کہیں ذکر نہیں۔ زمانۂ نبوی میں اگر ایک دفعہ بعض مرتدین کو قتل کیا گیا تو ان کے ارتداد کی وجہ سے انہیں قتل نہیں کیا گیا بلکہ بطور قصاص کے قتل کیا کیونکہ وہ ناحق مسلمانوں کو قتل کرکے اور اونٹ لیکر بھاگ گئے تھے۔ یا جنگ کے موقعہ پر اگر کوئی شخص مرتد ہو کر کفار میں جا ملتا جو اس وقت اسلام کی تباہی پر تلے ہوئے تھے اور برسرپیکار تھے تو ایسے موقعہ پر اس قسم کے شخص کو واجب القتل سمجھنا نہ صرف اسلام میں

بلکہ ہر ایک مہذب گورنمنٹ کے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ ورنہ وہ تو دشمن کے لئے ففتھ کالم بن کر سخت نقصان پہنچائے گا۔ اس لئے فقہانے بھی حراب یعنی جنگ کے موقعہ پر جنگ کرنیوالے کے مرتد ہو جانے پر قتل کا فتویٰ دیا ہے۔ کیونکہ وہ تو اب دشمن سے جا ملیگا اور تمام خفیہ حالات سے اُسے باخبر کر دے گا۔ پس محض ارتداد کسی مرتد کیلئے وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ قرآن تو صاف لفظوں میں لا اکراہ فی الدّین فرما کر دین میں کسی قسم کے جبر اور زبردستی کو قطعاً منع فرماتا ہے۔

اشاعت اسلام کیلئے ایمان کو ثریا سے واپس لانا ضروری تھا

اسلام کی صداقت کو روحانی سائنس کے رنگ میں مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت کیا

اشاعت اسلام میں مسلمانوں میں جس قدر تساہل اور غفلت پیدا ہوئی وہ درحقیقت اُن کے اپنے ایمان کی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ جب مذہب کی طرف سے میلان طبع ہٹ گیا اور مسلمان کہلانا محض ایک رسمی یا اسمی چیز رہ گیا ہو تو اسلام کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی مسلمانوں کو کہاں جرأت ہو سکتی تھی۔ اُنہوں نے اپنی نجات اسی میں دیکھی کہ سائنسدان دنیا اور غیر مذاہب کے سامنے مذہب کا نام تک نہ لو۔ تا اس طرح پردہ ڈھنکا رہے اور ہمیں مسلمان کہلانے کی شرمندگی سے سابقہ نہ پڑے۔ کیونکہ وہ مذہب کو ایسی غیر مصدقہ سی چیز سمجھنے لگے جو اُسی وقت تک دلوں میں قائم رہ سکتی ہے جب تک اُس پر خوش عقیدگی کا رنگ چڑھا رہے۔ جہاں معقولیت اور دلائل سے سابقہ پڑا اور مذہب گیا۔ بالخصوص اسلام جو ان کے نزدیک اپنی اشاعت کے لئے تلوار اور جبر و اکراہ کا مرہون منت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت پر سے کھویا ہوا ایمان جو ثریا کو چلا گیا تھا واپس لایا جاوے اور مسلمانوں کو سچا مسلمان بنایا جائے جیسا کہ حضرت مرزا صاحب کو یہ شعر الہام ہوا تھا۔ چو دور خسروی آغاز کردند ٭ مسلماں را مسلماں باز کردند

حدیث شریف میں یہ پیشگوئی تھی کہ لوکان الایمان معلقًا بالثریا لناله رجل من ابناء فارس کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا جائے گا تو ابناء فارس میں سے ایک فارسی النسل شخص واپس لے آئیگا۔ حضرت مرزا صاحب پر بھی یہ حدیث الہامًا نازل ہوئی تھی اور آپ کو بتایا گیا تھا کہ آپ ہی وہ مرد فارسی النسل ہیں جس کے ذریعہ ایمان کا ثریا سے واپس آنا مقدر تھا۔ میں مجدد اعظم حصہ اول میں یہ ثابت کر آیا ہوں کہ حضرت مرزا صاحب فارسی النسل تھے اور ایمان کو ثریا سے واپس لانا انکے کارناموں سے ظاہر ہے۔ ایمان کو ثریا سے

واپس لانے سے یہی مراد ہو سکتی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب دہریت اور مادہ پرستی اور مذاہب باطلہ کا ایسا زور ہو گا کہ خدا اور اسلام پر ایمان دنیا سے اُٹھ جائے گا اور ثریا کو چڑھ جائے گا اُس وقت ایک مرد فارسی النسل جو اس زمانہ کا مجدّد اور مصلح ربّانی ہی ہو سکتا ہے دلائل و براہین اور نشانات سماویہ سے اس ایمان کو واپس لائے گا۔ اور یہ حضرت اقدس مرزا صاحب کے ہاتھ سے بوجہ احسن پورا ہوا۔ آپ نے نہ صرف خدا سے علم پا کر ایسے ایسے زبردست دلائل اور براہین خدا کی ہستی اور اسلام کی صداقت پر قرآن مجید میں سے نکال کر پیش کئے کہ بڑے بڑے دہریوں اور مخالفین اسلام کے قلوب اس کے سامنے جُھک گئے جن پر آپ کی تصنیفات شاہد عدل ہیں۔ بلکہ آپ نے اس مادہ پرست دنیا میں بڑی جرأت سے یہ اعلان کیا کہ اسلام محض چند عقائد یا کسی فلسفہ کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ایک روحانی سائنس ہے۔ اگر مادی سائنس کی صداقت مشاہدہ اور تجربہ سے مستحکم اور استوار سمجھی جاتی ہے تو یہ رُوحانی سائنس بھی جو اسلام پیش کرتا ہے مشاہدہ اور تجربہ سے مستحکم اور استوار ہے۔ اور مَیں اس زمانہ میں اس رُوحانی سائنس کا عالم اور ماہر ہوں کیونکہ اس میں صاحب مشاہدہ اور صاحب تجربہ ہوں۔ جس کا جی چاہے میرے پاس آکر تسلی کرے اور ان تمام نشانات آسمانی اور استجابت دعا اور نصرت الٰہیہ کا نظارہ کرے جو روحانی سائنس پر یقین پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس دعوت کو آپ نے بار بار پبلک کے سامنے پیش کیا۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ مَیں آپ کی نظم میں سے چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

اے مزوّر گر بیائی سوئے ما | وز وفا رخت افگنی در کوئے ما
وز سر صدق و ثبات و غمخوری | روزگارے در حضورِ ما بری
عالمے بینی ز ربّانی نشان | سوئے رحمان خلق و عالم را کشاں
گر خلافِ واقعہ گفتم سخن | راضیم گر تو سرم بُرّی ز تن
راضیم گر خلق بر دارم کشند | از سر کیں با صد آزارم کشند
راضیم گر باشدم ایں کیفرے | خوں رواں بر خاک افتادہ سرے
راضیم گر مال و جاں و تن رود | وانچہ از قسم بلا بر من رود
لیک گر تو زیں سخن پیچی سرے | بر تو ہم نفرین ربِّ اکبرے

زیں سخن ہا ہر کہ رُو گرداں بُود
آں نہ مردے رہزن مرداں بُود

اسلام کو زندہ مذہب ثابت کیا | بات بھی سچ ہے کہ کھویا ہؤا ایمان تبھی واپس آسکتا ہے جب مذہب کا
رُوحانی پہلو عملی تجربوں اور مشاہدوں سے مبرہن ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مذہب میں
جب تک زندگی نہ ہو اور اُس پر عمل کر کے اس کے ثمرات اور نتائج اسی دنیا میں حسب استعداد
حالی طور پر تجربہ اور مشاہدہ میں نہ آجائیں موجودہ زمانہ میں جبکہ دنیا بیکار باتوں میں اپنا وقت ضائع
نہیں کرنا چاہتی وہ مذہب کبھی سرسبز نہیں ہو سکتا۔ آخر کیوں ایک قسم کی طرزِ زندگی کو چھوڑ کر دوسری
اختیار کی جائے جب تک کہ اس کے ثمرات و نتائج اس دنیا میں بھی ہم محسوس نہ کریں محض آخرت
کے وعدے تسلی نہیں دے سکتے۔ اور آخرت کے متعلق تو سارے مذہب کلّ حزبٍ بما لدیھم
فرحون کے مطابق بڑے بڑے وعدے دیا کرتے ہیں۔ بالخصوص عیسائی مذہب جو کفارہ کا
دل خوش کن عقیدہ سکھا کر بہتوں کی گمراہی کا موجب بنا ہؤا ہے۔ پس حضرت مرزا صاحب کا بڑا زور
اس بات پر تھا کہ اسلام محض آخرت میں ہی ثمرات و نتائج کے وعدے نہیں دیتا بلکہ اسکی ہدایات
پر عمل کر کے انسان اسی دنیا میں ان ثمرات کو حالی رنگ میں محسوس کرنے لگتا ہے جن کا اسلام وعدہ
کرتا ہے۔ مثلاً زندہ خدا کا ہر وقت احساس اور اس کی معرفت اور محبت، اخلاق فاضلہ اور تقویٰ
و طہارت جو اس تعلق باللہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی زندگی کا مطمع نظر محض رضائے الٰہی
ہو جاتا ہے اس لئے اس کے اعمال خالصۃً للہ ہوتے ہیں۔ کوئی نفسانیت درمیان میں نہیں ہوتی
استجابت دعا اور اس کے ساتھ نشانات آسمانی اور نصرت الٰہیہ کا ظہور جو انسان کو یقین اور عرفان
کے منازل طے کرانے کا موجب ہوتا ہے اسی کا نام زندہ مذہب ہوتا ہے کہ وہ اعمال کے ثمرات
دم نقد عطا کرے محض آخرت کے وعدوں پر ہی نہ ٹال دے۔ پس اسلام کے زندہ مذہب ہونے
اور اس کی صداقت پر سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ وہ اگر آخرت میں حسنات کا وعدہ دیتا ہے
تو اس دنیا میں بھی حسنات کا وعدہ دیتا ہے۔ دنیا کے حسنات دنیا کا مال اور حکومت نہیں بلکہ
وہ ہے زندہ خدا کو پالینا جس نے یہ پالیا اس نے مذہب کی غرض و غایت کو پالیا۔ کیونکہ سچے مذہب
کی غرض و غایت یہی ہؤا کرتی ہے جس کیلئے وہ آتا ہے یہی وہ دنیا کے حسنات ہیں جن سے آخرت
کے حسنات پیدا ہوتے ہیں اور جو آخرت کے حسنات کے وعدہ کی صداقت پر بطور دلیل کے ہوتے ہیں

حضرت اقدس مرزا صاحب نے بار بار اس امر کا اعلان کیا کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے
اور اسلام کے سوا آج کوئی مذہب ایسا موجود نہیں کہ وہ زندہ ہو یعنی جس کی بتائی ہوئی راہوں پر
چل کر انسان زندہ خدا کو پالے۔ اگر کسی کو دعویٰ ہے تو میرے مقابل پر آئے۔ مگر یاد رکھو کہ کوئی مدعی

سامنے نہیں آسکتا کیونکہ ان کے مذہب مر چکے۔ فقط اسلام ہی ایک زندہ مذہب ہے اور اس کا زندہ گواہ میں ہوں کہ میں نے اس کی اتباع کر کے زندہ خدا کو پالیا اور ان تمام ثمرات کو دم نقد پایا جن کا قرآن میں وعدہ ہے پس میں صاحب تجربہ ومشاہدہ ہوں جس کا جی چاہے میرے پاس آکر اپنی تسلی کرلے۔ میں بطور نمونہ آپ کی ایک تحریر آپ کی کتاب ضمیمہ انجام آتھم میں سے یہاں نقل کرتا ہوں اس میں تمام مخالفین ومنکرین اسلام کو عموماً اور عیسائیوں کو خصوصاً خطاب کرتے ہوئے اسلام کے زندہ مذہب ہونے کا کس قدر پُرشوکت اعلان فرماتے ہیں۔ وھوہٰذا:-

"بالآخر میں پھر ایک طالبِ حق کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ دینِ حق کے نشان اور اسلام کی سچائی کے آسمانی گواہ جن سے ہمارے نابینا علماء بے خبر ہیں وہ مجھ کو عطا کئے گئے ہیں۔ مجھے بھیجا گیا ہے تا میں ثابت کروں کہ ایک اسلام ہی ہے جو زندہ مذہب ہے۔ اور وہ کرامات مجھے عطا کئے گئے ہیں جن کے مقابلہ سے تمام غیر مذاہب اور ہمارے اندرونی اندھے مخالف بھی عاجز ہیں۔ میں ہر ایک مخالف کو دکھلا سکتا ہوں کہ قرآن شریف اپنی تعلیموں اور اپنے علوم حکمیہ اور اپنے معارف دقیقہ اور بلاغت کاملہ کے رُو سے معجزہ ہے۔ موسیٰ کے معجزہ سے بڑھ کر۔ اور عیسیٰ کے معجزات سے صدہا درجہ زیادہ۔ میں بار بار کہتا ہوں اور بلند آواز سے کہتا ہوں کہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت رکھنا اور سچی تابعداری اختیار کرنا انسان کو صاحبِ کرامات بنا دیتا ہے۔ اور اسی کامل انسان پر علوم غیبیہ کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اور دنیا میں کسی مذہب والا رُوحانی برکات میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں اس میں صاحب تجربہ ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بجز اسلام تمام مذہب مُردے، اُن کے خدا مردے۔ اور خود وہ تمام پیرو مردے ہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق ہو جانا بجز اسلام قبول کرنے کے ہرگز ممکن نہیں۔

اے نادانو! تمہیں مردہ پرستی میں کیا مزہ ہے؟ اور مردار کھانے میں کیا لذت؟!!! آؤ میں تمہیں بتلاؤں کہ زندہ خدا کہاں ہے اور کس قوم کے ساتھ ہے۔ اسلام اس وقت موسیٰ کا طُور ہے جہاں خدا بول رہا ہے۔ وہ خدا جو نبیوں کے ساتھ کلام کرتا تھا۔ اور پھر چپ ہو گیا۔ آج وہ ایک مسلمان کے دل میں کلام کر رہا ہے۔ کیا تم میں سے کسی کو شوق نہیں؟ کہ اس بات کو پرکھے۔ پھر اگر حق کو پاوے تو قبول کر لیوے۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کیا ایک مردہ کفن میں لپٹا ہوا؟ پھر کیا ہے ایک مشتِ خاک؟ کیا یہ

مردہ خدا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تمہیں کچھ جواب دے سکتا ہے؟ ذرا آؤ! ہاں لعنت ہے تم پر اگر نہ آؤ۔ اور اس سڑے گلے مردہ کا میرے خدا کے ساتھ مقابلہ نہ کرو۔

دیکھو میں تمہیں کہتا ہوں چالیس دن نہیں گزریں گے کہ وہ بعض آسمانی نشانات سے تمہیں شرمندہ کرے گا۔ ناپاک ہیں وہ دل جو سچے ارادے سے نہیں آزماتے۔ اور پھر انکار کرتے ہیں۔ اور پلید ہیں وہ طبیعتیں جو شرارت کی طرف جاتی ہیں نہ طلب حق کی طرف۔

او میرے مخالف مولویو! اگر تم کو شک ہو تو آؤ چند روز میری صحبت میں رہو۔ اگر خدا کے نشان نہ دیکھو تو مجھے پکڑو۔ اور جس طرح چاہو تکذیب سے پیش آؤ۔ میں اتمام حجت کر چکا۔ اب جبتک تم اس حجت کو نہ توڑو تمہارے پاس کوئی جواب نہیں۔ خدا کے نشان بارش کی طرح برس رہے ہیں۔ کیا تم میں سے کوئی نہیں؟ جو سچا دل لیکر میرے پاس آوے۔ کیا ایک بھی نہیں؟ دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اُسے قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اسے قبول کرے گا۔ اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دیگا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ ۲۲۔ جنوری ۱۸۹۷ء

(ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۶۱-۶۲-۶۳)

اسلام کے زندہ مذہب ہونے کا ثبوت نشانات آسمانی کے ذریعہ

جیسا کہ اُوپر کے اعلان سے ظاہر ہے حضرت اقدس مرزا صاحب نے اسلام کے منجانب اللہ اور زندہ مذہب ہونے پر نشانات آسمانی کو بار بار پیش کیا ہے۔ کیونکہ جس مذہب کی صداقت اور زندگی کی تائید خدا کی طرف سے نشانات سماوی اور نصرت الٰہیہ کے ذریعہ نہیں ہوتی وہ کبھی زندہ مذہب نہیں ہو سکتا۔ حضرت اقدس کے ان پیش کردہ نشانات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) ایک تو وہ نشانات جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ظاہر ہوئے۔ اور آج بھی آپ کے فرمودہ کے مطابق ظاہر ہو رہے ہیں اور وہ اس طرح کہ آپ کی ارشاد کردہ پیشگوئیاں جو اس آخری زمانہ کے متعلق تھیں نہایت صفائی سے پوری ہو رہی ہیں اور اس طرح ایمان کو تازہ کر رہی ہیں اور آپ کے خدا کی طرف سے مخبر صادق ہونے پر گواہی دے رہی ہیں۔

(۲) دوسرے وہ نشانات جو آپ کی اتباع کے طفیل سے آپ کے متبعین کامل کو دیئے جاتے ہیں۔ اور اس آخری زمانہ میں مجدد وقت حضرت مرزا غلام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر جن کا ظہور اس کثرت سے ہوا کہ اسلام کے زندہ مذہب ہونے پر دن چڑھ گیا۔

(۱) نشانات آسمانی جو حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی اس آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیوں کے رنگ میں ظاہر ہوئے

حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی روحانی استعداد اس قدر بلند اور کشفی قوت اس قدر زبردست تھی کہ اس آخری زمانہ کے حالات اور کیفیات کو آپ کے قلب کی نظر اور کشفی آنکھ نے آج سے تیرہ سو برس پہلے اس صفائی سے دیکھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اور ایک مومن کے ایمان میں جان پڑ جاتی ہے۔ مثلاً آخری زمانہ میں دجال اور یاجوج و ماجوج کا خروج مسیح موعود کی آمد اور اس کے ساتھ اور صدہا نشانات جن کی تفصیل احادیث میں موجود ہے ایسی پیشگوئیاں ہیں جو آج پوری ہو کر ۔ ۔ ۔ ازدیاد ایمان اور انشراح صدر کا موجب ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے علما کا تعصب اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ لفظ پرستی کرتے ہوئے رویا اور کشوف کے معاملات کو ظاہر طور پر لفظاً لفظاً پورا ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ پیشگوئیوں میں ایک پہلو اخفا کا ہوتا ہے جو اپنے وقت پر کھلتا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ رویا و کشوف تعبیر طلب ہوتے ہیں۔ انہیں قرآن کریم میں حضرت یوسف کی رویا کا پتہ ہے جس میں آپ نے سورج اور چاند اور ستاروں کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی تعبیر یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ بنا وے گا۔ انہیں قرآن کریم میں اس بادشاہ کی رویا کا بھی پتہ ہے جس میں اس نے دیکھا تھا کہ سات دبلی گائیں سات موٹی گائیوں کو کھا گئی ہیں۔ اور اس کی تعبیر یہ تھی کہ سات فراوانی کے سال ہوں گے اور سات قحط کے سال ہوں گے اور فراوانی کے سالوں کا اندوختہ قحط کے سالوں میں کھایا جائے گا۔ اسی طرح انہیں احادیث کی مختلف رویا اور ان کی تعبیروں کا بھی پتہ ہے۔ مثلاً حضرت نبی کریم صلعم نے اپنے ہاتھوں میں دو کنگن دیکھے جو آپ کے پھونک مارنے سے اڑ گئے۔ اور اس کی تعبیر یہ تھی کہ مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذاب مدعی نبوت پیدا ہوئے اور آپ کی توجہ روحانی سے وہ فنا ہو گئے۔ پھر حضرت نبی کریم صلعم نے رویا میں دیکھا کہ آپ کے بعد سب سے پہلے آپ کی وہ زوجہ محترمہ وفات پا کر آپ سے آملیں گی جس کے سب سے لمبے ہاتھ ہیں۔ آپ کے سامنے آپ کی بیبیوں نے ہاتھ ناپے اور سب سے لمبے ہاتھ حضرت سودہ کے نکلے۔ آپ نے ہاتھ ناپنے سے منع نہیں کیا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد جب سب سے پہلے حضرت زینب بنت جحش فوت ہوئیں تو پتہ لگا کہ سب سے لمبے ہاتھوں والی سے مراد تھی سخاوت اور فیاضی میں سب سے بڑھ کر۔ حضرت نبی کریم صلعم نے اپنی زندگی میں اس کی کوئی تعبیر نہیں کی کیونکہ آپ جانتے تھے کہ وقت پر اس کی صحیح تعبیر کا پتہ لگے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ہمارے مولویوں کو یہ بھی پتہ ہے کہ دجال کے متعلق آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ وہ کانا ہو گا۔

اس کے ماتھے پر ک۔ ف۔ ر لکھا ہوا ہوگا۔ اس کے ساتھ جنت اور نار ہوگا وغیرہ وغیرہ اور بایں ہمہ صحابہ نے ابن صیاد کو وہی دجال معہود سمجھ لیا۔ اور حضرت عمرؓ نے اس کے دجال ہونے پر قسم بھی کھالی۔ اور آنحضرت صلعم نے قطعًا یہ نہیں فرمایا کہ وہ علامات لفظًا لفظًا اس میں کہاں موجود ہیں جو میں نے دجال کی بیان کی ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اگر یہ وہی دجال معہود ہے تو اس کا ہلاک کرنیوالا تو مسیح موعود ہے کیونکہ آپ پر رویا میں یہی ظاہر ہوا تھا جس سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام پیشگوئیوں میں جو دجال کے متعلق ہیں استعارہ اور مجاز بہت ہے۔ اور آنحضرت صلعم خود اور آپ کے صحابہ بھی ان کو مجاز اور استعارات ہی سمجھتے تھے ورنہ ابن صیاد کو دجال کس طرح قرار دیدیتے۔ غرضیکہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے ہمارے مولویوں نے جب حضرت مرزا صاحب نے ان تمام پیشگوئیوں کی تعبیر و تفسیر ایسی صاف اور واضح اور معقول کی جس سے ان پیشگوئیوں کی صداقت پر دن چڑھ گیا اور اندر سے روح بول اٹھی کہ یہ حق ہے محض تعصب سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس میں حضرت مرزا صاحب کی تائید اور تصدیق ہوتی تھی اور یہ انہیں منظور نہ تھا۔ اس انکار کی وجہ یہ ہے کہ انہی پیشگوئیوں کے ساتھ وابستہ مسیح موعود کی آمد کی پیشگوئی تھی۔ اگر دجال اور یاجوج ماجوج کی پیشگوئیوں کو پورا ہوتے قبول کرلیں تو پھر وہ آنیوالا مسیح موعود کہاں گیا جس کی پیشگوئی اس قدر تواتر سے احادیث صحیحہ میں موجود ہے مشکل یہ آپڑی کہ حضرت مرزا صاحب نے قرآن کریم کی تیس آیات اور احادیث صحیحہ سے مسیح کی وفات اسقدر واضح طور پر ثابت کر کے دکھادی کہ اس کا ان مولویوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا مفصل بحث آپ کی کتب میں موجود ہے۔ میں یہاں فقط ایک آیت اور ایک حدیث بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں :۔ سورۃ المائدہ میں حضرت عیسٰی سے اللہ تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں کہ ءانت قلت للناس اتخذونی و اُمّی الٰھین من دون اللہ کیا تونے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوائے دو معبود بنالو یعنی سوال حضرت عیسٰی کی اُمت کے باطل عقیدہ کے متعلق تھا جس کے رُو سے اُنہوں نے حضرت عیسٰی کو خدا بنا لیا۔ حضرت عیسٰی جواب دیتے ہیں۔ وکنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم اور میں ان پر یعنی اپنے پیروؤں پر گواہ تھا جب تک میں ان میں موجود رہا۔ پھر جب تونے مجھے وفات دیدی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا۔ یعنی جب تک میں اُن میں رہا ان کا عقیدہ نہیں بگڑا پھر جب تونے مجھ کو وفات دیدی تو تجھ کو ہی خبر ہے کہ انہوں نے کیا عقیدہ بنالیا۔ اس آیت سے بالصراحت ثابت ہے کہ جب تک حضرت عیسٰی علیہ السلام فوت نہیں ہوگئے اس وقت تک ان کی خدائی کا

عقیدہ بھی نہیں بنا پس ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کو خدا بنانے کا عقیدہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد گھڑا گیا۔ آپ کی زندگی میں نہیں گھڑا گیا۔ اور توفّی کے معنے لغت عرب میں جب خدا فاعل ہو اور ذی روح مفعول ہو سوائے قبض روح کے اور کوئی دوسرے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ حضرت مرزا صاحب نے ایک اشتہار تمام علمائے ہند و عرب و مصر و روم و شام کے نام دیا تھا کہ جو شخص قرآن یا حدیث یا لغت عرب سے توفّی کے معنے جب خدا فاعل اور ذی روح مفعول ہو سوائے قبض روح کے کچھ اور دکھا دے تو اسے پانسو روپے انعام دیا جائے گا۔ اس چیلنج پر کسی عربی کے فاضل کو جرأت نہ ہوئی کہ مقابل پر آتا۔ کیونکہ توفّی کے معنے مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ کچھ اور ہوتے ہی نہیں۔ خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی معنوں میں توفّی کو بلکہ آیت فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم کو اپنے اوپر چسپاں کر کے اس معنی کو واضح کر کے دکھلایا ہے بخاری کتاب التفسیر میں حدیث صحیح موجود ہے کہ جب رسول اللہ صلعم کے سامنے بعض اُمت کے لوگ دوزخ کی طرف لیجائے جائیں گے اور آپ کو وجہ دریافت کرنے پر ان کے گمراہی کے عقائد و اعمال کی خبر دی جائیگی تو آپ فرماتے ہیں کہ فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم یعنی مَیں بھی وہی کہوں گا جو خدا کے نیک بندے (یعنی حضرت عیسیٰ) نے کہا تھا کہ جب تک مَیں ان میں رہا مَیں ان پر گواہ تھا پھر جب تو نے مجھ کو وفات دیدی تو تو اُن پر نگہبان تھا یعنی تجھ کو ہی خبر ہے کہ ان لوگوں نے کیا عقیدہ بنا لیا۔

غرضکہ اسی قسم کی تیس آیات اور متعدد احادیث صحیحہ سے حضرت مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ کی وفات ثابت کر کے دکھا دی اور قرآن کریم کی آیات انھم لا یرجعون اور فیمسك التی قضی علیھا الموت سے کہ جو مر جاتے ہیں وہ اس دنیا میں واپس نہیں آتے اور جن پر موت وارد ہو جاتی ہے خدا ان کو عالم برزخ میں روک لیتا ہے اور واپس اس دنیا میں نہیں بھیجتا۔ یہ بھی ثابت کر کے دکھا دیا کہ مرے ہوئے واپس نہیں آتے تو پھر ان پیشگوئیوں کا حل جن میں آخری زمانہ میں مسیح کی آمد کا ذکر تھا اس سے بہتر ممکن نہ تھا جو حضرت مرزا صاحب نے کر کے دکھایا۔ آپ نے بخاری کی احادیث میں جہاں مسیح کی آمد کا ذکر ہے مسیح کی نسبت صاف لفظوں میں اماکم منکم دکھا کر بتایا کہ حدیث مذکور تو صاف طور پر فرماتی ہے کہ اے اُمتی لوگو آنے والا مسیح تمہارا امام ہوگا اور وہ تم ہی میں سے ایک ہوگا۔ ایک اور حدیث پیش کی جو مسلم میں ہے جس میں آنیوالے مسیح کی نسبت امّکم منکم مذکور ہے یعنی اے اُمتی لوگو وہ تم میں سے ہی ایک ہوگا اور تمہاری امامت کرے گا۔ جس سے معلوم ہوا کہ آنیوالا مسیح موعود

محض ایک اُمتی ہوگا اور مسلمانوں کا ایک امام ہوگا جس کو کسی مناسبت سے مجازی طور پر ابن مریم یا مسیح کا نام دیا گیا ہے۔ اور حدیث سے یہ مسلّم ہے کہ اس اُمت میں ہر صدی کے سر پر اللہ تعالیٰ ایک مجدّد کو کھڑا کرتا رہے گا۔ پس حضرت مرزا صاحب کا دعویٰ یہ تھا کہ چودھویں صدی کے سر پر مجھے خدا نے مجدّد کے منصب پر مبعوث کیا ہے۔ اور میرا نام بطور مجازہ استعارہ ابن مریم خدا نے اس وجہ سے رکھا ہے کہ مجھے مسیح ابن مریم سے روحانی مناسبت ہے اور مجھے مسیحی قوم کے غلط عقائد کے استیصال اور ان میں اشاعت اسلام کے کام کے لئے خدا نے کھڑا کیا ہے۔ جیسا کہ آپ کے اس شعر سے بھی ظاہر ہوتا ہے ؎

مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند ٭ چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند

غرضکہ آپ نے متعدد احادیث صحیحہ اور آیات قرآنی سے اپنی صداقت پر ایسے روشن دلائل دیئے اور وہ تمام پیشگوئیاں جو آنحضرت صلعم نے اس آخری زمانہ کے متعلق فرمائی تھیں انہیں ایسی وضاحت سے پورا ہوتا دکھایا کہ ایک قلب سلیم کو ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ مگر تعصب کا بُرا ہو محض مرزا صاحب کو جھوٹا ماننے کے لئے ہمارے علما نے ان تمام روشن دلائل اور پیشگوئیوں کے پورا ہونے کی طرف سے آنکھیں بند کریں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پہلے مَیں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن پیشگوئیوں کا ذکر کرتا ہوں جن کے بالوضاحت پورا ہو جانے کے بارے میں کسی کو کلام نہیں۔ جامع ترمذی کتاب اشراط الساعۃ میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے جب:۔

(۱) ٹھہرائی جائیں گی غنیمتیں دولت یعنی جنگوں کے بعد حاصل شدہ مال غنیمت کو بجائے پبلک کا مال سمجھنے کے اپنا ذاتی مال سمجھ کر حکام مجا اپنے مصرف میں لائیں گے۔

(۲) امانتوں کو غنیمت سمجھا جاوے گا۔ یعنی لوگ امانتوں کو لوٹ سمجھ لیں گے اور امانتوں کی کوئی پاسداری نہ ہوگی۔ ہر قسم کی امانت کو لوٹ سمجھ کر اس میں خیانت اور اس پر قبضہ کرنے کی کوشش ہوگی۔

(۳) اور زکوٰۃ کو چٹی سمجھا جائے گا۔

(۴) اور جبکہ علم سیکھا جاوے گا واسطے غیر دین کے۔ یعنی علم محض دنیا اور حب جاہ کے لئے سیکھا جاویگا جو علم دین بھی حاصل کریں گے اُن کا مقصد بھی دنیا ہی ہوگا خالص دین نہیں۔

(۵) اور فرمانبرداری کریگا مرد اپنی بیوی کی (اگرچہ وہ خلاف شریعت ہی کیوں نہ ہو) اور خلاف کرے گا اپنی ماں کا (اگرچہ اس کا ارشاد مطابق شریعت ہی کیوں نہ ہو)

(۶) اور ایک شخص اپنے دوست کو زیادہ مقرب سمجھے گا۔ اور دور رکھے گا اپنے باپ کو یعنی باپ سے

نفرت اور دوری اور دوستوں سے قرب اور پیار جیسا کہ آجکل کی سوسائٹی کا رنگ ہے۔

(۷) اور بلند ہونگی آوازیں مسجدوں میں یعنی مسجدوں میں دنگہ و فساد اور ذرا سے اختلافات پر رونما ہوگا۔

(۸) اور قبیلہ کی سرداری فاسق یعنی بدکار آدمی کرے گا۔ اور قوم کا رئیس وہ ہوگا جو ان میں سب سے زیادہ کمینہ ہوگا۔ اور تعظیم کیا جائے گا مرد اس کی بُرائی کے ڈر کی وجہ سے یعنی کسی قبیلہ کی سرداری کے وقت یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ وہ متقی اور شریف ہو۔ بلکہ ایک بدکار اور کمینہ شخص قوم کی سیادت کرے گا اور اس کی شرارت اور طاقت کے ڈر سے لوگ اسے اپنا سردار بنالیں گے۔ یعنی لوگوں میں اتنی جرأت نہ ہوگی کہ کسی شخص کی شرارت اور کمینہ پن اور فسق و فجور کی وجہ سے اُسے ذلیل سمجھیں اور اس کا مقاطعہ کریں بلکہ اس کی شرارت کے ڈر سے اسے اپنا سردار بنالیں گے۔

(۹) اور ظاہر ہوں گی گانے والیاں اور باجے بجانیوالے اور پی جائیں گی شرابیں۔ جیسا کہ آج کل فیشن ہے۔

(۱۰) اور لعنت کہیں گے پچھلے اس اُمت کے اگلوں کو۔ جیسے شیعہ اور خوارج لعنتیں کرتے ہیں یا مغرب زدہ لوگ اگلے مسلمانوں کو بیوقوف اور ناداں سمجھتے ہیں۔ پس ان حالات کے ظاہر ہونے کے بعد منتظر رہو سرخ ہواؤں اور بڑے زلزلوں اور زمین میں دھنس جانے یا ذلیل ہوجانے اور مسخ صورت ہوجانے اور پتھر برسنے کے یعنی طرح طرح کے سماوی وارضی عذابوں کے لئے جو قرب قیامت کے لئے بطور نشانوں کے ہوں گے اور اس طرح یکے بعد دیگرے ان کا نزول ہوگا۔

جیسے جواہر وغیرہ کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے دانے پیہم گرنے لگ جائیں۔

اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا کہ وہ زمانہ کچھ ایسی رواداری کا زمانہ ہوگا کہ ایک ہی چھت کے تلے باپ کا بیٹے سے اور بیٹے کا باپ سے اور بھائی کا بھائی سے مذہب جدا ہوگا۔ عورتیں کچھ اس قسم کا لباس پہنیں گی جو لباس پہنکر بھی برہنہ نظر آئیں گی۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ عورتیں تجارت کریں گی اور منبروں پر چڑھ کر تلقین مذہب کریں گی اور مرد عورتوں کا شعار اختیار کریں گے۔ اور دنیا کے پیشوں میں ایک پیشہ جھوٹی شہادت دینا بھی ہوگا۔ کیا اس سے بہتر نقشہ موجودہ زمانہ کا پیش کیا جاسکتا ہے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے حضرت مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے کھینچا گیا۔

آجکل کے علما کے چوٹی کے عالم مولانا ابوالکلام آزاد اس زمانہ میں آنحضرت صلعم کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا ذکر کس خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

اُن ساری باتوں میں سے ایک ایک بات پوری ہو چکی۔ "بدأ الاسلام غریبًا وسیعود کما بدأ"، کا دورِ غربت کب کا شروع ہو چکا اور وہ سب کچھ ہو چکا جس کا حال اس حدیث کی شرح میں پڑھ چکے ہیں۔ اب انتظار کرنے والوں کے لئے بجز انتظارِ غفلت کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ یہودیوں کی مغضوبیت، نصاریٰ کی ضلالت، مشرکین کی بت پرستی، ائمہ مضلین کی کثرت، دجاجلہ، فتن وزعات، بدعت کا احاطہ، اقتدا بغیر سنت، اہتدا بغیر ھدی الانبیاء، تفرق وتمذھب مثل یہود، اور غلو واطرا مثل نصاریٰ، فتنۂ شبہات یونان اور فتنۂ شہوات عجم، فتنۂ تماثیل عبدۃ الاصنام، اور فتنۂ قبور عاکفین کنائس۔ ان میں سے کوئی نحوست اور بلا کی ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں پر نہ چھا چکی ہو۔ اور کوئی گمراہی نہیں جو اپنے کامل سے کامل اور شدید سے شدید درجہ تک اس امت میں بھی نہ پھیل چکی ہو۔ اہل کتاب نے گمراہی کے جتنے قدم اٹھائے تھے گن گن کر مسلمانوں نے وہ سب اُٹھائے "حتیٰ لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ" (یعنی اگر وہ گوہ کے بل میں بھی گھسے ہوں گے تو تم بھی اس میں گھسو گے۔ ناقل) کا وقت بھی گزر چکا اور آج ہم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ وہ وقت بھی کب کا آ چکا کہ "تلحق قبائل من اُمتی بالمشرکین" اور "حتیٰ تعبد من اُمتی الاوثان"۔ اور "حتیٰ تعبد اللات والعزّیٰ" ہماری جانیں اور ہماری روحیں اس صادق مصدوق پر قربان کہ واقعی اور سچ مچ مسلمان مشرکوں سے ملحق ہو گئے۔ اور دین توحید کا دعویٰ کرنے والوں نے بت پرستی کی ساری ادائیں اور چالیں اختیار کر لیں۔ اور جس لات اور عزّیٰ کی پوجا سے دنیا کو نجات دلائی گئی تھی اس کی پوجا پھر سے شروع ہو گئی "فعل قوم من حیث بدأتم" ہم اپنی آنکھوں سے اُن فتنوں کو "کقطع اللیل المظلم" تھے دیکھ رہے ہیں۔ فی الحقیقت ایسا ہی ہو رہا ہے کہ رات کو ایک انسان ایمان لیکر سوتا ہے اور صبح نہیں ہوتی مگر ایمان کھو چکا ہے "یبیع دینه بعرض من الدنیا" اپنے دین کو بیچ دیتا ہے دنیا کی پونجی کے لئے۔ ناقل) حضرت حذیفہ نے ان فتنوں کا حال کہا تھا کہ "کالحصیر عوداً عوداً" مسلمانوں کے دلوں کے لئے فتنوں کی ایسی بھرمار ہو گی جیسے چٹائی بُنتے وقت ریشے پے در پے آتے ہیں۔ سو ان فتنوں کی بارش بھی ہر طرف ہو چکی اور ہو رہی ہے۔ وہ وقت بھی گزر چکا جب مومنوں کو کہنا تھا "ھذہ مھلکتی"۔ اب تو وہ فتنہ درپیش ہے جس کے سامنے تمام فتنے مات ہو گئے۔

"فیقول المومن ھذہ ھذہ" کا عالم ہو رہا ہے۔ وہ بھی تو کب کا ہو چکا کہ "تتداعی علیکم کما تتداعی الاکلة الی قصعتها" دنیا کی ساری قومیں اکٹھی ہو کر تم پر چڑھ دوڑیں گی

اور تم کو ہلاک کرنے کے لئے باہم ایک دوسرے کو اس طرح بلائیں گی جیسے بھوکے کھانے کی قاب پر ایک دوسرے کو دعوت دیں۔ تو کیا یہ پکار اب تک بلند نہیں ہوئی؟ اور کیا ایک قوم نے دوسری قوم کو بلانے کے لئے ٹھیک ٹھیک اسی طرح نہیں چیخا جس طرح بھوکے گدھ لاش دیکھ کر شور مچایا کرتے ہیں؟ ہماری ہزار جانیں اور لاکھوں روحیں اُس زبان حق پر قربان جس نے فرمایا تھا "بل انتم یومئذٍ کثیر" تم اس وقت تعداد میں کم نہ ہوگے۔ لیکن لیقذفن فی قلوبکم الوھن" تمہارے دلوں میں وھن پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کوڑے کرکٹ کی طرح بہ جاؤگے۔ پھر وھن کے معنے بتلائے حُب الدنیا وکراھت الموت"..... پھر کس قدر عقل سے کورے اور بصیرت سے محروم ہیں وہ بندگان غفلت جو ان روایتوں کو پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ کسی ایسے آنیوالے زمانہ کی نسبت ہیں جو قیامت سے چند برس پہلے دنیا پر آئے گا۔ اور ابھی اس کی آمد کا ہم کو صدیوں انتظار کرنا چاہئے"

(تذکرہ صفحہ ۲۶۴ - ۲۶۵ - ۲۶۶)

اس کے بعد مولانا موصوف علمائے زمانہ کو ملامت کرتے ہیں کہ تم آنحضرت صلعم کی ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا اب تک انتظار کرتے چلے جاؤگے حالانکہ وہ سب پوری ہو چکیں اور تمہارے سامنے وہ سارا نقشہ موجود ہے جو آج سے تیرہ سو (۱۳۰۰) برس پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھینچ کر دکھلایا تھا۔ اس ملامت کرنے کے بعد دو چار فقروں میں کلمۂ حق کس خوبصورتی سے اُن کے قلم سے نکلا ہے فرماتے ہیں:۔

"سبحان اللہ اس صادق و مصدوق کا ارشاد کس طرح حرف بحرف پورا ہو رہا ہے۔ یہ نزلش جہل و انتظار غفلت بھی تو عین اس پیشینگوئی کا ظہور ہے کہ لتتبعن سنن من کان قبلکم اور یاتی علےٰ اُمتی ما اتی علےٰ بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل" میری امت بھی وہ سب کچھ کرے گی جو یہودیوں نے کیا۔ یہی تو پوری پوری یہودیت ہے کہ پیشینگوئیوں پر پیشینگوئیاں ظاہر اور پوری ہوتی جاتی تھیں مگر یہودیوں کا انتظار ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ کہتے تھے کہ ابھی وہ وقت کہاں آیا؟ حتیٰ کہ آجتک مسیح کے ظہور اور اسرائیل کی آخری پادشاہت کا انتظار کر رہے ہیں۔

فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیرٌ منھم فٰسقون" (تذکرہ صفحہ ۲۶۸)

جناب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے کیسی سچی اور پکی بات کہی کہ یہودیوں نے بھی یہی غلطی کی تھی کہ پیشگوئیوں پر پیشگوئیاں پوری ہوتی دیکھتے تھے اور یہی کہتے چلے جاتے تھے کہ اب تک پوری نہیں ہوئیں فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیر منھم فٰسقون کے ماتحت لمبا زمانہ گزر جانے پر ان میں فسق و فجور پیدا ہو چکے تھا جو کسی مسیح کی آمد کی خبر دے رہا تھا چنانچہ وہ سلسلہ حضرت عیسیٰ کے وجود میں ان کے

پاس آیا مگر وہ ظاہری بادشاہت کے شیدائی مسیح کی روحانی بادشاہی پر راضی نہ ہوئے اور اس کا انکار کر گئے ۔ اور مزہ یہ ہے کہ انکار کی سزا میں طرح طرح کی ذلّت و نکبت کا شکار ہو گئے ۔ لیکن ابھی تک انتظار کئے چلے جا رہے ہیں ۔ اور مسیح کے ظہور کے منتظر چلے آتے ہیں ۔ یہی حالت آج مسلمانوں کی ہے کہ مسلمان علما آنحضرت صلعم کی پیشین گوئیوں پر پیشگوئیاں پوری ہوتی دیکھ رہے ہیں لیکن ابھی انتظار کئے چلے جا رہے ہیں ۔ ان کی اصلاح کے لئے بھی وہ وعدہ کا مسیح آیا ۔ لیکن یہ ظاہری تخت و سلطنت کے شیدائی اس کی رُوحانی بادشاہت سے انکار کر گئے ۔ مولانا ابو الکلام آزاد اسی کتاب تذکرہ میں کس قدر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو اس موعود "مرد کار اور صاحب عزیمت" مجدد وقت کی جستجو کو اپنا نصب العین بنانا چاہئے ۔ لکھتے ہیں :-

> "مقام عزیمت و دعوت" اور "احیاء تجدید اُمت کی نسبت جو بلا قصد زبان قلم پر آگیا تو اگرچہ اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہ تھا لیکن زیادہ تر یہ خیال باعث ہوا کہ شاید ان حالات و وقائع کا مطالعہ اصحاب اصلاح و استعداد کے لئے کچھ سودمند علم و عمل ہو ..... کسی کے قلب بصیرتؐ دیدۂ اعتبار کو ان مجددین ملت اور مصلحین حق کے اتباع و تشبہ کی توفیق ملے ۔ شاید کوئی مردِ کار او صاحب عزم وقت کی پکار پر لبیک کہے اور زمانہ کی طلب و جستجو کا سراغ بنے ۔ آج اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور ڈھونڈھ ہے تو صرف اسی کی ..... (تذکرہ صفحہ ۲۵۰)

کاش کوئی مولانا موصوف کے ارشاد کے مطابق اس "مرد کار اور صاحب عزم مجدد وقت" کی تلاش کرے اور اسے پالے ۔ مولانا کے نزدیک کام ہے تو یہی ہے ۔ اور تلاش ہونی چاہئے تو اُسی کی ۔ وقت کی پکار پر مجدد زمانہ نے لبیک کہی اور حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ کے وجود میں اس کا ظہور ہوا اور عین وقت پر ہوا ۔ لیکن جو روک مسیح اسرائیلی کو قبول کرنے میں پیدا ہوئی تھی وہی اس مسیح محمدی مجدد وقت کو قبول کرنے میں واقع ہوئی یعنی وہ سلطنت ظاہری لیکر نہ آیا بلکہ سلطنت روحانی کا مدعی تھا ۔ اور اس کی آجکل کی مادی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی ۔ لیکن مادہ پرستی کے مرض کا علاج اسی امر میں مضمر تھا کہ اُمت محمدیہ کا نقطۂ نظر مادی ترقیات سے ہٹا کر خدا پرستی اور روحانی ترقیات کی طرف پھیرا جاتا ۔ تا دجال کا اثر اور اپنا احساس کمتری دل و دماغ سے دُور ہو کر قوم کا قدم صراط مستقیم پر پڑتا ۔ مادی دنیا کی یہ ایک بیماری تھی جس کی اصلاح ضروری تھی ۔ اور اسی بیماری کے لئے ایک مصلح کی ضرورت تھی جو عین وقت پر آیا ۔ اور صحیح طریق علاج کا لیکر آیا ۔ محض سلطنت دلانے اور حکومت کے غلبہ کے لئے نپولین یا ہٹلر کی ضرورت ہوا کرتی ہے لیکن قوم میں خدا پرستی اور قرآن کی حکومت کو قلوب پر قائم کرنے کے لئے ایک

برگزیدہ الٰہی مصلح ربّانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

قاعدہ ہے کہ جس قدر کوئی وقت نازک ہوتا ہے اور ضلالت و تاریکی زیادہ ہوتی ہے اسی قدر عظیم الشان صاحب علم و حکمت و فضیلت مجدّد اور مصلح کا ظہور ہوتا ہے۔ وقت کی نزاکت اور قحط الرجال کی حالت خود جناب مولانا ابو الکلام آزاد کی قلم سے سنو۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ حکایتیں (یعنی گزشتہ مجددوں کے زمانہ کی تاریکیوں کے حالات۔ناقل) ان عہدوں کی تھیں جو موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں گویا عہد اقبال تھے۔ موجودہ وقت اور اس کی تاریکیوں کو دیکھو اور پھر ہر طرف روشنی اور روشنی دکھلانے والوں کی نایابی پر ماتم کرو۔ خدمت گزاروں کی پکار اور ہر طرف مزدوری کی ڈھونڈھ ہے (یعنی خدمت دین کے لئے۔ناقل) مگر مزدور کہیں نہیں ملتے آج ایک مٹی کے ڈھیرے اور گری ہوئی دیوار پر ایک اینٹ رکھ دینے کے معاوضہ میں اشرفیوں اور ہیروں کی قیمت مل رہی ہے کیونکہ کام کرنیوالے جتنے کم ہوں گے اتنی ہی کام کی مزدوری بھی بڑھ جائے گی۔ خزانہ سعادت لُٹنے کے لئے کھل چکا اور شرف و مراتب کا دروازہ ہر راہرو کے لئے باز۔ کون ہے جو اس کے خزانوں کو لوٹتا اور اس دولت و کامرانی سے مالا مال ہوتا ہے جس کے لئے نہیں معلوم اچھے وقتوں میں کیسے کیسے ارباب طلب بیقراریوں کے آنسو بہا چکے ہیں اور آرزوؤں سے بھری ہوئی دعائیں مانگ چکے ہیں۔" (تذکرہ صفحہ ۲۵۰۔۲۵۱)

وہ لوگ جو خاکسار مؤلف سے پوچھتے ہیں کہ تم نے حضرت مرزا غلام احمد کو مجدّد اعظم کس طرح لکھ دیا میں کہتا ہوں وہ مولانا ابو الکلام آزاد صاحب کی مذکورہ بالا تحریر کو پڑھیں اور انصاف سے کہیں کہ کیا جس قدر زیادہ ظلمت ہوگی اسی قدر زیادہ تیز روشنی والے لیمپ کی ضرورت نہ ہوگی۔ مادہ پرستی اور لامذہبی دہریت اور فسق و فجور کا جس قدر زور اور فلسفہ و سائنس کا جس قدر زبردست مطالبہ اس زمانہ میں ہے کیا گزشتہ زمانہ میں کوئی عہد مجدّد اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بلکہ مولانا موصوف کا یہ قول بالکل حق ہے کہ اس زمانہ کی تاریکیوں کے مقابلہ میں گزشتہ مجدّدین کا زمانہ عہد اقبال کہا جاسکتا ہے۔ اور پھر جو کچھ خاکسار مؤلف نے حضرت مرزا صاحب کی خدمات دینیہ مختصراً بیان کی ہیں کیا اس کا عشر عشیر بھی گزشتہ مجددین میں سے کسی نے کرکے دکھائیں۔ ان کے کاموں کی تحقیر کرنا میرا مقصد نہیں بلکہ میں ان سب بزرگوں کے کاموں کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ ان کی خدمات جناب الٰہی میں مقبول ہیں۔ لیکن ان صاحبوں کے مقابل میں حضرت مرزا صاحب کے بارے میں میری قلم سے جو مجدّد اعظم کا لقب لکھا گیا تو جن لوگوں کو یہ برا لگا اُن سے میری یہ درخواست ہے کہ انصاف سے ایک ایک مجدّد کو لیں اور ان کے کاموں کا موازنہ حضرت

مرزا صاحب کی خدمات سے کریں۔ ان بزرگوں کے سامنے کسی ایک مذہب کا مقابلہ یا ملت کی ایک دو غلطیوں کی اصلاح ہوتی تھی اور یہاں تمام مذاہب عالم کا دنگل لگا ہوا ہے جہاں خدا کا پہلوان مرزا غلام احمد ہمیں چومکھی جنگ لڑتا نظر آتا ہے۔ اور یورپ کے متکبر اور فرعون بے سامان دہریوں اور فلسفیوں کے سامنے کس دھڑلے سے خدا کی ہستی اور وحی الٰہی اور تمام رُوحانی امور کو پیش کرتا اور انہیں دلائل سے ثابت کرتا۔ اور کس دلیری سے ان معاملات میں اپنے مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتا ہے کہ اس کی نظیر بلکہ عشر عشیر مجدّدین اور اولیائے اُمت کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے امت محمدیہ جب اپنی سلطنت اور سیاسی وقار کھو کر اور دجال یورپ سے مرعوب ہو کر ترقی اسلام سے مایوس ہو چکی تھی۔ اس وقت جس مجدد زمانہ نے یہ اعلان کیا کہ میں خدا کی طرف سے امت محمدیہ کے لئے پیغام لایا ہوں کہ اگرچہ ظاہری سلطنت اسلام کی چلی گئی مگر تمام ادیان عالم پر اس کے روحانی غلبہ کا وقت آگیا۔ اور پھر وہ اس پیغام اور اپنے کاموں سے مسلمانوں کی اس مایوسی کو اُمید سے بدل دیتا ہے تو کیا اس کا فقط یہی ایک کارنامہ اس کی کرسی کو تمام مجدّدین کی کرسیوں سے بلند مقام پر نہیں پہنچا دیتا !!!!۔ خدا کے لئے تعصب کی عینک اُتار کر انصاف کی نظر سے دیکھو۔ آخر مرنا ہے اور خدا کو جواب دینا ہے۔

پھر اتنا ہی نہیں جبکہ مسلمانوں کی سیاسی مغلوبیت نے ہر ایک باطل کے پرستار اور تمام مذاہب ضلالت کے پیروؤں کو یہ جرأت دلا دی تھی کہ اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات سے حملہ آور ہوں اور مسلمان علماء پرانے یونانی منطق کو لئے نئے مغربی فلسفہ کے سامنے پنبہ بدہان ہو کر رہ گئے تھے۔ اور نئے سے نئے اعتراضات و وساوس سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا قدم صراط مستقیم سے متزلزل ہو چکا تھا۔ اس وقت حضرت اقدس مرزا صاحب نے اپنی تحریروں سے اسلام کی صداقت کو اس طرح روشن اور محکم دلائل سے واضح کر کے دکھایا اور مذاہب باطلہ پر اسقدر زور آور اور کارگر حملے کئے کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور ان میں نئے سرے سے ایمان اور اتنی جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ اسلام کو دیگر اقوام کے سامنے پیش کر سکیں اور اپنے مذہب کی صداقت کو غیروں سے منوا سکیں۔ اور ایسا ہوا کہ تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی صداقت اور غلبہ ایک بدیہی امر بن کر سامنے نظر آنے لگا۔ پھر خود اسلام کے اندر تمام فرقہائے ضالہ کا رد اور اسلام کے تمام مشکل مسائل کا حل اس خوبصورتی سے کیا کہ اس سے بڑھکر ممکن نہیں۔ اور وہ اصلاح و تجدید آپ کے ہاتھوں سے ظہور پذیر ہوئی جس کی نظیر زمانہ گزشتہ کے کسی مجدد میں نہیں ملتی۔ تو پھر یہ خاکسار مؤلف آپ کو مجدد اعظم کے لقب سے یاد نہ کرے تو کیا کرے۔

اب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیشگوئیوں کو لیتا ہوں جو آخری زمانہ کے

متعلق تھیں اور جو اس زمانہ میں نہایت صفائی سے پوری ہوئیں۔ مگر جن کے پورا ہونے کا اقرار ہمارے علماء اس وجہ سے نہیں کرتے کہ انہی پیشگوئیوں سے وابستہ مسیح موعود کی آمد کی پیشگوئی بھی ہے جس کا حل سوائے حضرت مرزا صاحب کو مجدد اور مسیح موعود ماننے کے اور دوسرا کوئی نظر نہیں آتا کیونکہ جب علامات سب پوری ہو چکیں تو وہ موعود کہاں ہے۔ اور جن بزرگوں نے ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا اقرار کیا ہے وہ افسوس ہے کہ جس موعود امام کے لئے وہ پیشگوئیاں بطور علامات کے تھیں اس کا ذکر کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

(۱) واذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت (التکویر) جب سورج جو سرچشمہ نور آسمانی ہے لپیٹ دیا جائے گا۔ اور ستارے جو اس آسمانی نور سے منور ہیں جھڑ جائیں گے۔ یہ اس آخری زمانہ کی بے دینی کا نقشہ نہایت خوبصورت استعارہ میں کھینچا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت نبی کریم صلعم کو سراجاً منیراً یعنی نور دینے والا آفتاب فرمایا ہے یعنی آپ کا وجود سرچشمہ نور آسمانی ہے جس سے وہ نور آسمانی جو خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا یعنی نور قرآن نکل کر تمام مستعد طبائع کو منور کر گیا اور کر رہا ہے۔ اور ایسی طبائع اور افراد کاملہ اس آسمانی نور سے منور ہو کر روحانی آسمان کے ستارے بن کر چمکتے ہیں اور بمنزلہ نجوم کے ہوتے ہیں جیسا کہ خود حضرت نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ اصحابی کالنجوم۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ پس جو بھی اس نور آسمانی سے منور ہوتا ہے خواہ وہ صحابہ ہوں یا امت محمدیہ کے صلحا اور اولیا اور علمائے ربانی ہوں ۔ سب روحانی آسمان کے ستارے ہیں۔ پس یہاں زمانہ موجودہ کی بے دینی و مادیت کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ فرمایا کہ اس زمانہ میں سرچشمہ نور آسمانی لپیٹ لیا جائے گا۔ یعنی قرآن کا علم اور عمل اُٹھ جائے گا اور بے دینی اور ضلالت کی تاریکی پھیل جائے گی۔ جیسا کہ کثرت سے احادیث اس امر کی تائید میں موجود ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے اندر سے علم قرآن کا اُٹھ جانا اور ظاہر پرستی اور رسمی اسلام کا باقی رہ جانا۔ مسلمانوں کا یہود و نصاریٰ کی اتباع اور ذلت ایمان کا ثریا پر اُٹھ جانا اور علم دین کا نہ رہنا۔ مذہب سے شغف رکھنے والوں کی کمی۔ مسلمانوں کا ایک دوسرے کی تکفیر کرنا۔ علما کی ظاہر پرستی اور دنیا پرستی وغیرہ وغیرہ۔

اور اس نور آسمانی سے منور افراد اور صلحا یا تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں گے یا اگر ہونگے بھی تو ان میں وہ نور آسمانی نہ ہو گا یا ہو گا تو بہت مدھم۔ کیا اس سے بڑھ کر صحیح نقشہ موجودہ زمانہ کی مذہبی حالت کا کھینچا جا سکتا ہے ،

(۲) اب مادی ترقیات کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ تمدن و تہذیب مادی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ شہروں اور قصبوں کے درمیانی فاصلے مٹ جائیں یا کم ہو جائیں اور درمیانی روکیں اُٹھ جائیں۔ اور ایسے ذرائع پیدا ہو جائیں جن سے آمد و رفت آسان ہو جائے اور وقت بچ جائے اور لوگ ایک دوسرے کے علم اور تبادلہ خیالات سے فائدہ اُٹھا کر علمی اور صنعتی اور حرفتی ترقی کر سکیں اور باہمی تجارت سے فائدہ اُٹھا کر مالی ترقی سے حصّہ لے سکیں۔ چنانچہ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے ان چیزوں کو لیکر جو باہمی میل جول میں روک ہوتی ہیں اور جن کے دُور ہونے سے ترقی کا دَور شروع ہوتا ہے۔ قرآن کریم انہیں چار حصوں میں تقسیم فرماتا ہے:۔

(۱) ایک تو خشکی میں پہاڑوں کی موجودگی (۲) دوم فاصلہ کی طوالت (۳) سوم جہالت و وحشت (۴) چہارم مختلف ملکوں کے درمیان سمندر کا حائل ہونا۔ اس ترقی مادیت کے زمانہ میں ان روکوں کے دُور ہونے کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔ واذا الجبال سیرت ۝ واذا العشار عطلت ۝ واذا الوحوش حشرت ۝ واذا البحار سجرت ۝ (التکویر) **ترجمہ** "اور جب پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے اور اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور وحشی اکٹھے کئے جائیں گے اور سمندر پاٹ دیئے جائیں گے۔" انسان خشکی میں آبادی بنا کر رہتا ہے اور مختلف اقوام کے باہمی میل جول میں جو چیز سب سے بڑی روک ہے وہ پہاڑ ہیں۔ فرمایا یہ پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے۔ دیکھ لو دنیا بھر کے پہاڑ کس طرح اڑا دیئے گئے۔ ان میں سڑکیں بن گئیں۔ ریلیں بن گئیں۔ سرنگیں نکل گئیں۔ کونسی بلندی پہاڑ کی ہے جس پر یہ یاجوج ماجوج یعنی یورپین اقوام نہیں پھر گئیں۔ گویا ان کے لئے کوئی پہاڑ پہاڑ نہ رہا بلکہ پہاڑ تو ان کی سیرگاہیں بن گئیں۔ غرضکہ ملکوں، شہروں اور قریوں کے باہمی میل جول میں سب سے بڑی روک پہاڑ کالعدم ہو کر رہ گئے۔ فاصلہ کم کرنے کے لئے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ زمین کو سکیڑ دیا جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سواریاں اتنی تیز رفتار نکل آئیں کہ زمین کا فاصلہ عملی طور پر کم ہو جائے کیونکہ فاصلہ کا اندازہ وقت سے ہوتا ہے۔ سفر میں جتنا وقت کم خرچ ہوگا اتنا ہی فاصلہ گھٹا ہوا سمجھا جائے گا۔ پس ارشاد ہوا کہ واذا العشار عطلت۔ جب اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی۔ پرانے زمانہ میں بڑے بڑے لمبے فاصلے اور دشوار گزار میدان اور ریگستان میں جہاں پیدل اور سوار کا گزر نہ ہو سکتا تھا۔ سب سے بہتر سواری مسافر اور بار برداری کے لئے اونٹ سمجھا جاتا تھا۔ بالخصوص اونٹنیاں جو نر اونٹ کی نسبت زیادہ تیز رفتار اور لمبے سے لمبا فاصلہ طے کرنے کے لئے نہایت کارآمد ہوا کرتی تھیں

جہاں گھوڑا اور گاڑی کام نہ آسکتا تھا وہاں اونٹنیاں کام آتی تھیں۔ جن پہاڑوں اور ریگستانوں میں نہ سڑک، نہ پانی۔ نہ چارہ نہ آبادی۔ وہاں سوائے اونٹوں کے کوئی چیز کام نہیں آسکتی تھی فرمایا کہ وقت آتا ہے کہ یہ سب چیزیں بیکار ہو جائیں گی اور ایسی سواریاں تیز رفتار مسافروں اور بار برداری کے لئے نکل آئیں گی کہ اونٹنیاں بیکار ہو کر رہ جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ریلوں اور موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں کے نکل آنے سے اونٹنیاں بیکار ہو گئیں۔ جہاں اونٹ چلتے تھے اور جو فاصلے اونٹنیوں کے سوا اور کسی طرح طے کرنا ناممکن تھا وہ اب ریلوں اور کاروں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔ جن کی تیز رفتاری نے وقت کو بچا کر فاصلہ کو کالعدم کر دیا۔ آج عرب اور عراق، شام اور مصر، شمالی افریقہ اور ایران اور لائل پور اور سرگودھا، منٹگمری اور راجپوتانہ کے ریگستانوں میں اونٹنیوں کی جگہ موٹر کاریں اور ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں اور ہوائی جہاز اُڑتے پھرتے ہیں۔ حدیث شریف میں بھی ہے لیترکن القلاص فلا یسعٰی علیھا۔ اونٹ ترک کر دیئے جائیں گے اور اُن پر سواری کرنا چھوڑ دیا جائے گا۔

الغرض پہاڑوں کے اُڑ جانے اور سڑکیں بن جانے اور ایسی تیز رفتار سواریوں کے نکل آنے سے جن کے ذریعہ بڑے سے بڑا فاصلہ آسانی سے اور بہت جلد طے ہو سکے۔ اور ہر ایک دشوار گزار منزل کو طے کر لینا چشم زدن کا معاملہ رہ جائے ظاہر ہے کہ قوموں کا باہمی ارتباط و اختلاط بڑھے گا اور تمدن و تہذیب ان ملکوں اور قوموں تک پہنچ جائے گی جو دور دراز مقامات میں پڑی ہوئی تھیں۔ اور یہ وجہ اپنی جہالت کے جانوروں کی طرح وحشی اور جنگلی ہونے کا حکم رکھتی تھیں ضرور تھا کہ اس میل جول سے ان کی وحشت اور جہالت دور ہوتی اور وہ متمدن اقوام سے مل کر تمدن و تہذیب سے حصہ لیتے۔ قرآن کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا کہ:- واذا الوحوش حشرت لا یعنی وحشی اقوام جو جنگلوں اور پہاڑوں میں خانہ بدوش رہا کرتی تھیں وہ متمدن و مہذب بن جائیں گی اور بستیوں اور شہروں میں جمع ہو کر آباد ہوں گی۔ افریقہ یا ایشیا جنگلی اور وحشی اقوام کو چھوڑ دو قرآن کے نزول کے زمانہ میں خود یورپ کیا تھا محض وحشی اقوام کا مسکن تھا۔ آج ذرا اس کے تمدن پر نظر ڈالو اور پھر اذا الوحوش حشرت پر غور کرو لذت آجاتی ہے۔ غرضیکہ وحشی اقوام کی جس جس طرح جہالت و وحشت دور ہوتی گئی تمدن و تہذیب کی منازل طے ہوتی گئیں۔ وحوش سے مراد وحشی جانور بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اس صورت میں ان کو جمع دو طریق پر کیا جاتا ہے ایک تو چڑیا خانہ

کی شکل میں جیسے زُو کہتے ہیں دوسرے سرکس میں۔ جہاں ان وحشی جانوروں کو ایسا سدھایا جاتا ہے کہ وہ محیر العقول کام کرتے ہیں۔ گویا انسان کی عقل اسقدر ترقی کر جائیگی کہ وہ وحشی جانوروں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق جمع کرے گی اور ان سے کام لے گی۔ لیکن یہ تمدن و تہذیب مکمل نہ ہو سکتی تھی جب تک نہ صرف شہر اور بستیاں بلکہ ملک اور براعظم آپس میں اس طرح نہ مل جائیں کہ تمام دنیا ایک شہر کا حکم رکھے۔ اور ایک ملک کا مال تجارت دوسرے ملک میں جائے اور ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ جائیں اور آپس میں ملیں جلیں۔ اور ایک دوسرے کے علم و حکمت صنعت و حرفت تجارت اور تمدن سے فائدہ اٹھا کر ہر ایک رنگ میں ترقی کریں پس ضرور تھا کہ اس کے لئے سمندر کا درمیانی حجاب بھی اٹھا دیا جاتا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ واذا البحار سجرت ۵ جب سمندر پاٹ جائیں گے یعنی دریا اور سمندر جو ان براعظموں اور ملکوں کے درمیان حائل ہیں پاٹ جائیں گے یعنی ان کا وجود کالعدم ہو جائے گا۔ دریاؤں پر جا بجا پل بندھ جائیں گے۔ اور سمندر میں ایسی سواریاں اور جہاز نکل آئیں گے۔ اور اس کثرت سے ان کی آمد و رفت ہوگی کہ سمندر عملی طور پر پاٹ کر ایک معمولی گزرگاہ اور شاہراہ کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ دیکھ لو ایشیا اور یورپ افریقہ اور امریکہ۔ آسٹریلیا اور مختلف جزائر ایک شہر کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کثرت سے عالیشان اور راحت بخش جہازوں کی آمد و رفت ہے کہ آجکل بحری سفر خشکی کے سفر سے زیادہ آرام دہ ہے۔ اور ہوائی جہازوں نے تو سمندر کو بالکل ہی کالعدم کر دیا۔

(۳) واذا النفوس زوجت (التکویر) اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔ یہ پیشگوئی کس صفائی سے پوری ہو رہی ہے۔ دنیا کا کونسا خطہ ہے جہاں کے لوگ دنیا میں سفر نہ کرتے ہوں۔ اور آپس میں ملتے جلتے ... جب ہر طرح کی روکیں اٹھ گئیں اور فاصلے مٹ گئے تو ایک دنیا ہے کہ آپس میں مل رہی ہے اور ایک دوسرے سے نفع اٹھا رہی ہے اور ایک دوسرے کے علم اور خیالات سے مستفیض اور باہمی تجارت سے نفع اٹھا رہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ مادی تہذیب و تمدّن اپنے معراج پر پہنچ گیا۔

(۴) واذا الموءدۃ سئلت ۵ بای ذنب قتلت ۵ (التکویر) اور جب زندہ درگور کی ہوئی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ پر وہ قتل کی گئی۔

قرآن کریم فرماتا ہے اس باہمی میل جول اور مذکورہ بالا تمدن اور تعلیم و تعلم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عقل

انسانی اسقدر ترقی کر جائے گی کہ عورت کی عزت اور حقوق کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ گویا قوموں کی تہذیب و تمدن کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب اس میں عورت کی عزت اور حقوق کا احساس پیدا ہو جائے۔ وحشی اور غیر مہذب اقوام میں عورت کی کوئی عزت نہ تھی بلکہ وہ باعث ننگ و عار سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے عرب میں زمانۂ جاہلیت میں غیرت و شرافت کا تقاضہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتے تھے۔ ہندوستان میں راجپوتوں میں بھی یہی تقاضائے غیرت و شرافت سمجھا جاتا تھا۔ مگر عرب میں حالت بہت بدتر تھی کہ لڑکی کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی قوت قدسی نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزوں کا زبردست قانون بھی مکمل طور پر ہندوستان میں نہ کر سکا۔ اس آیت زیر بحث کے نزول پر یک قلم تمام عرب سے دختر کشی مٹ گئی۔ اور اتنا ہی نہیں کہ فقط دختر کشی کی رسم مٹ گئی بلکہ حق تو یہ ہے کہ اسلام سے قبل عورت عملی طور پر زندہ درگور تھی۔ نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ اس کے کوئی حقوق تھے نہ اسے کوئی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ مرد کی ایک ذلیل سے ذلیل لونڈی اور بیجان اسباب کی طرح ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر عورت کی زندہ درگور حالت ممکن نہیں۔ قرآن نے آ کر عورت کو اس قبر سے نکالا اسے آزاد کر کے مرد کے برابر لا کھڑا کر دیا۔ اس کی عزت اور اس کے حقوق قائم کر دیئے۔ اس کی تعیلم و تربیت کے لئے احکام دیئے۔ لیکن با ایں ہمہ اس وقت قوموں کے باہمی تعلقات قائم نہ ہوئے تھے اور ان تمام غیر مہذب اقوام اور ممالک میں جہاں اسلام کا اثر نہ پہنچا تھا جن میں سے یورپ بھی تھا اور ہندوستان بھی۔ عورت اسی طرح زندہ درگور چلی آتی تھی اس لئے قرآن کریم نے پیشگوئی فرمائی کہ جب قوموں میں آپس میں میل جول بڑھیگا اور تمدن و تہذیب ترقی کرے گا تو پھر اسلام کے اثر سے یورپ کی مسیحی اقوام اور ہندوستان کے ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم اقوام میں عام طور پر عورت کی عزت اور حقوق کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ اور ان قوموں میں بھی جو مسلم نہیں ہیں دختر کشی قانوناً بند ہو جائے گی۔ اور عورت اپنی زندہ درگور حالت سے باہر نکل آئے گی۔ اور ایسے بل اور قانون پاس کئے جائیں گے جن سے ان غیر مسلم عورتوں کی حالت کی اصلاح ہو اور ان کے حقوق تسلیم کئے جائیں۔

(۵) واذا الصحف نشرت ۞ (التکویر) اور جب صحیفے پھیلا دیئے جائیں گے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہوگا جب علم و حکمت کا دنیا میں بڑا چرچا ہوگا۔ اور اخبارات اور ٹریکٹ رسالے اور کتابیں بڑی کثرت سے دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ایک ملک کی

خبریں اور ایک قوم کا علم دوسرے ملک یا قوموں کو پہنچایا جائے۔ اور دنیا میں باہم ایک دوسرے کے خیالات. علم اور سائنس و حکمت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم اس علمی زمانہ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے کہ اس علم و حکمت کی نشر و اشاعت کے زمانہ میں خدا بھی اپنے علم پر سے پردہ اٹھاوے گا۔ فرماتا ہے ا۔

(۶) واذا السّماء کشطت ۵ؐ اور جب آسمان کا پردہ اُتار لیا جائے گا۔

آسمان کا پردہ اُتارنے سے یہ مراد ہے کہ آسمانی علوم اور اسرار پر سے پردہ اُٹھایا جائے گا یعنی آسمانی علوم اور باطنی حقائق کے اسرار و غوامض منکشف کئے جائیں گے۔ اور قاعدہ ہے کہ ہمیشہ کسی مرد با خدا کے قلب صافی پر یہ انکشاف ہوا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اس علمی خزانہ سے اہل دنیا کو مالامال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ مقدر تھا جس کے متعلق آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا جائے گا تو ایک شخص ابنائے فارس میں سے اُسے واپس لے آئے گا۔ اور یہ پیشگوئی مجدد وقت حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ کے وجود میں پوری ہوئی کہ جب سرچشمۂ نور آسمانی لپیٹ لیا گیا اور علم قرآن دُنیا سے اُٹھ گیا اور علمائے ربانی قریبًا معدوم ہو گئے اور جو علما موجود تھے ان میں سے اکثر میں نور آسمانی نہ رہا۔ تو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت کی اس نشر و اشاعت کے زمانہ میں ایک بندہ کو جو حضرت محمد رسول اللہ صلعم کا خادم اور غلام تھا اور آپ کی روحانیت سے مستفیض تھا کھڑا کیا جس کے ذریعہ آسمانی علوم سے پردہ اُٹھایا گیا۔ اور جس کے زور قلم اور فیض روحانی سے دینی علوم کا ایک سمندر بہ نکلا جس نے اسلام کو دنیا بھر کے ادیان پر غالب کر کے دکھا دیا اور جو بے دینی اور دہریت کی رَو کے سامنے سد سکندری بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آسمانی علوم اور اسرار و غوامض پر سے ایسا پردہ اٹھایا کہ دنیا حیران و ششدر رہ گئی۔ اور مذہب کو اس طرح ایک روحانی سائنس بنا کر پیش کیا کہ فطرت سلیم رکھنے والے عقلمندوں کے قلوب اس کے زبردست دلائل کے سامنے جُھک گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ایام میں جب دنیا تہذیب و ترقی کے معراج پر پہنچ چکی تھی ایک شخص کو خاص طور پر خدمت دین کے لئے کھڑا کرنا اور اس کے ذریعہ علوم آسمانی پر سے پردہ اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ تہذیب و تمدن اور علوم و حکمت کے اس معراج کے باوجود انسان کو آسمانی علوم اور اس کے معلم کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی وجہ پیشگوئی کے رنگ میں بیان فرماتے ہیں:۔

(۷) واذا الجحیم سعرت ۵ؐ (التکویر) اور جب جہنم بھڑکایا جائے گا۔

یعنی باوجود اس قدر مادی تہذیب و تمدن کے عروج کے انسان خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی کی غلامی سے آزاد نہ ہوگا بلکہ ان مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی کی آگ میں بھی مزید ہیجان پیدا ہوتا جائے گا۔ گویا وہ جہنم جس کی آگ انسان کے قلب پر بھڑکتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ جہنم کی نسبت مذکور ہے کہ نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (الھمزہ) کہ وہ اللہ کی طرف سے روشن کی ہوئی آگ ہر جو دلوں پر بھڑکتی ہے۔ وہ جہنم کی آگ اور زیادہ بھڑکیگی۔ پس دیکھ لو کہ دنیوی علوم کی ترقیاں اور مادی کمالات نہ ترقیات انسان کو نفس اور شیطان کی غلامی سے آزاد نہ کرسکے۔ اور نہ صرف زر پرستی اور شہوت پرستی نے عیاشی اور شراب خوری۔ زناکاری اور قمار بازی۔ سود خوری اور ہر قسم افعال شنیعہ کے مظاہروں سے جہنم کو بھڑکایا۔ بلکہ غضب اور حسد نے بھی جنگوں کی خطرناک صورت میں اس جہنم کو ایسا نمایاں کرکے دکھایا کہ اذا الجحیم سعرت کا نظارہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

(۸) واذا الجنۃ ازلفت ۝ (التکویر) اور جب جنت نزدیک کردی جائے گی۔

پھر فرمایا کہ یہی وقت ہوگا کہ جب نیکی اور خدمت دین بہت قابل قدر چیز ہوگی اور تھوڑے عمل سے بہت ثواب ملے گا گویا یہی معنے جنت نزدیک ہونے کے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب دنیا میں فسق و فجور اور گمراہی و ضلالت اور بے دینی و غفلت کا زور ہو۔ اس وقت خدا کے رستہ میں نیکی اور خدا تعالیٰ کے حکموں کی اطاعت جس قدر ثواب رکھتی ہے اس قدر دوسرے وقت میں ثواب نہیں رکھتی۔ چنانچہ خود حضرت نبی کریم صلعم نے اس زمانہ دہریت کی نسبت ارشاد فرمایا ہے کہ اس وقت خدا کے حضور میں ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہوگا۔ وجہ یہ کہ بیدینی کے زمانہ میں دینداری ایک قابل قدر چیز ہوگی۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب جنت نزدیک کردی جاتی ہے اور تھوڑے سے عمل سے بہت سا ثواب انسان حاصل کرلیتا ہے۔

(۹) دوسری جگہ قرآن کریم میں اس آخری زمانہ کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔ واذا البحار فجرت ۝ واذا القبور بعثرت ۝ (الانفطار)

واذا البحار فجرت اور جب دریاؤں کو کاٹ کر نہریں نکال دی جائیں گی اور زراعت اور اس کی آبپاشی ایک سائنس بن جائے گی۔

واذا القبور بعثرت۔ اور جب قبروں کو کھولا جائے گا۔ یہ اس زمانہ میں دو رنگ میں ظہور آیا۔ ایک تو زمین کے دفینے نکالے گئے اور طرح طرح کی دھات اور خام پیداوار مثلاً سونا

اور چاندی، لوہا اور ایلومینیم اور کرومیم اور پیٹرول وغیرہ وغیرہ جو زمین میں دفن تھے باہر نکالے گئے جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن کریم فرماتا ہے واخرجت الارض اثقالھا (الزلزال) کہ زمین اپنے خزانے باہر نکال دے گی۔ اور دوسرے پرانی قبروں کو کھولا گیا اور ان میں سے لاشیں اور طرح طرح کے عجائبات ان کے ساتھ برآمد ہوئے۔ مثلاً ملک مصر میں مختلف فراعنہ مصر کے مقابر کھولے گئے اور ان میں سے ممیاں (حنوط شدہ لاشیں) برآمد ہوئیں اور طرح طرح کی عجیب چیزیں ان کے ساتھ نکلیں جن میں سے اس فرعون مصر کی بھی لاش تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کر کے سمندر میں غرق ہوا تھا۔ اور اس کی لاش کا نکلنا قرآن کریم کی صداقت کا ایک زبردست نشان ہے۔ کیونکہ جب فرعون نہایت تکبر اور سرکشی کے ساتھ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کا تعاقب کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوا تو آخری وقت ڈوبتے ہوئے کہنے لگا امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنو اسرائیل وانا من المسلمین ○ ترجمہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس خدا کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لاتے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ تو جواب میں جناب الٰہی کا یہ ارشاد ہے کہ آلئٰن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین ○ فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک ایۃ ط وان کثیرا من الناس عن ایٰتنا لغٰفلون ○ (یونس) ترجمہ۔ کیا اب ایسے وقت میں ایمان؟ اور تیرا حال تو یہ تھا کہ اس سے پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا۔ اور تو مفسدوں میں سے تھا۔ پس آج تیرے بدن کو ہم نجات دیں گے (یعنی پانی میں تہ نشین یا ضائع ہونے سے بچالیں گے) اس غرض سے کہ جو لوگ تیرے بعد آنیوالے ہیں اُن کے لئے وہ نشان ہو۔ اور بے شک بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں" خدا کی شان اس فرعون کی لاش کو سمندر نے باہر پھینک دیا اور وہ ممی بنا کر دفن کی گئی لیکن اس کا ذکر کسی کتاب میں موجود نہیں۔ نہ بائبل میں۔ نہ کسی تاریخی کتاب میں خواہ وہ مصریوں کی لکھی ہوئی تھی یا غیر مصریوں کی۔ آج سے تیرہ سو سال قبل قرآن کریم نے ایک اُمی کی زبان سے اس بات کا اعلان کیا کہ اس کے جسم کو خدا تعالیٰ نے ضائع ہونے سے بچالیا تا کہ وہ پچھلوں کے لئے خدا کی باتوں پر بطور نشان کے ہو۔ چنانچہ تھوڑا عرصہ ہوا کہ اس فرعون کی لاش مصر میں ایک مقبرہ میں سے نکالی گئی اور وہ قاہرہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اور قرآن کی صداقت پر بطور نشان کے ہے۔ کیونکہ اس بات کا علم کہ اس کا بدن ضائع نہ ہوا بلکہ بچالیا گیا کسی انسان کو نہ تھا۔ خدا نے اپنے علم سے یہ دنیا میں اعلان کیا اور وہ اس زمانہ میں سچا ثابت ہو کر

قرآنی وحی کے منجانب اللہ ہونے پر بطور نشان کے ہُوا۔ اور لوگوں کے خدا کے نشانوں سے بے خبر ہونے میں اس بات کا اشارہ تھا کہ قرآن کے نزول کے وقت اس نشان کا کسی انسان کو علم نہ تھا۔ یہ نشان اس آخری زمانہ دہریت و مادہ پرستی کیلئے مقدر تھا۔ آج تمام محققین کو بعد تحقیق کے یہ مسلم ہے کہ یہ وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کا تعاقب کرتا ہُوا سمندر میں غرق ہُوا تھا۔

(۱۰) اس آخری زمانہ کے لئے ایک اور امر بطور نشان کے قرآن کریم میں مذکور ہے۔ رب المشرقین و رب المغربین ہ فبای الاء ربکما تکذبٰن ہ مرج البحرین یلتقین بینھما برزخ لا یبغیٰن ہ فبای الاء ربکما تکذبٰن ہ (الرحمٰن) "دو مشرقوں کا رب اور دو مغربوں کا رب پس اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ دو سمندر آپس میں مل کر بہیں گے ان کے درمیان بھی ایک پردہ ہے جس سے آگے نہیں گزر سکتے۔ پس اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

موجودہ زمانہ میں بھی دو مشرق اور دو مغرب ہی گنے جاتے ہیں۔ یعنی مشرق قریب اور مشرق بعید۔ اور مغرب قریب اور مغرب بعید۔ مشرق قریب یعنی مغربی ایشیا اور مغرب قریب یعنی یورپ کے سمندروں میں جو پردہ حائل تھا وہ خاکنائے سویز کا تھا جب اس کو کاٹ کر نہر سویز نکالی گئی تو دونو طرف کے سمندر مل کر بہنے لگے۔ اسی طرح مشرق بعید یعنی جاپان اور بحرالکاہل اور مغرب بعید یعنی امریکہ اور بحر ظلمات کے سمندروں کے درمیان جو پردہ حائل تھا وہ خاکنائے پانامہ کا تھا جب اسے کاٹ کر نہر پانامہ نکالی گئی تو دونو طرف کے سمندر مل کر بہنے لگے۔ اس زمانہ کے لئے قرآن کریم کی یہ پیشگوئی بطور ایک نشان کے ہے۔

(۱۱) دابۃ الارض کا خروج۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔ واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بایاتنا لا یوقنون ہ (النمل) ترجمہ "اور جب قول ان پر واقع ہو جائے گا ہم ان کے لئے زمین سے ایک دابہ نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا اس لئے کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے"۔ اس آیت میں ذکر ہے کہ جب لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین نہیں رہے گا یعنی دنیا میں دہریت اور مادہ پرستی پھیل جائیگی اور خود مسلمانوں میں دنیا پرستی اور غفلت اور بے دینی پھیل جائیگی اور ان پر قول واقع ہو جائیگا یعنی اللہ تعالیٰ کی کوئی بات جو عقوبت یا عذاب سے تعلق رکھتی ہے ان کے حق میں پوری ہو جائے گی یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اور اس کے قانون کے ماتحت مستوجب سزا ٹھیر جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے ایک دابہ زمین سے نکالے گا جو ان سے باتیں کرے گا

یا انہیں زخمی کرے گا (تکلیم کے دو معنے ہیں باتیں کرنا اور زخمی کرنا) اب غور طلب امر یہ ہے کہ دابۃ الارض سے کیا مراد ہے۔ روایات اس کے متعلق اس قدر ہیں کہ روح المعانی میں متعدد روایات دیکر یہ قول نقل کیا ہے کہ دابۃ الارض کے متعلق اس قدر مختلف روایات ہیں اور وہ ایک دوسرے سے اس قدر متضاد اور مخالف ہیں کہ سب کی سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ پس جب روایات کی یہ حالت ہو تو ان کی بنا پر یہ کہنا کہ دابۃ الارض کیا چیز ہے نہایت مشکل اور غیر یقینی امر ہے۔ اس مشکل کو خود قرآن کریم حل فرما دیتا ہے اس لئے کہ وہ اسے ایسا دابہ یا جاندار قرار دیتا ہے جو لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اور کلام کرنا انسان سے خاص ہے۔ اور دوسرا کوئی جانور کلام نہیں کرتا۔ پس کلام کرنے کی تخصیص یہاں اسی وجہ سے ہے کہ تا اس بات کو واضح کر دیا جائے کہ وہ انسان ہو گا۔ اور تکلیم کے دوسرے معنے زخمی کرنے کے مدنظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کا کلام کرنا ایسے طریق پر ہو گا کہ مسلمانوں کے دلوں کو زخمی کرے گا۔ کیونکہ کلام کا زخم دل پر لگتا ہے۔ یعنی وہ طرح طرح سے ناپاک اعتراضات اسلام اور بانیٔ اسلام پر کرکے مسلمانوں کے دلوں کو زخمی کریں گے۔ اور ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دکھ ہو سکتا ہے۔ پس وہ روایات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں جن میں یہ آتا ہے کہ دابہ انسان ہو گا۔ اور قرآن کریم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ ایک اور دابۃ الارض کا ذکر ہے جس نے حضرت سلیمان کی سلطنت کو تباہ کر دیا۔ یعنی اُن کا ناخلف بیٹا دیکھو السبا-۱۴۔ پس دابۃ الارض سے مراد ایسا انسان ہوا جو بالکل اسباب ارضی پر گرا ہوا ہے اور خدا کی طرف اس کی نظر نہیں اُٹھتی۔ دیکھو فاطر ۴۵- ولو یؤاخذ اللّٰہ الناس بما کسبوا ما ترک علیٰ ظھرھا من دابۃ۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے عمل کی وجہ سے پکڑے تو زمین پر کسی دابہ کو باقی نہ چھوڑے۔ اب صاف معلوم ہوتا ہے کہ دابہ سے مراد وہی لوگ ہیں جو زمین پر اس قدر جُھک گئے ہیں کہ ان کی نظر خدا کی طرف اُٹھتی ہی نہیں ورنہ انسانوں کے ظلم کی وجہ سے دوسرے جاندار نہیں ہلاک ہو سکتے نہ نیک انسان ہلاک ہو سکتے ہیں۔ پھر دابۃ الارض کے ایک یا کئی ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ جنس پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ ہر شہر سے دابہ نکلے گا۔ اور اسی کے مطابق حضرت ابن عباس کا ایک قول ہے کہ دابۃ الارض کے خروج کے وقت جس طرح اہل مشرق اسے دیکھیں گے اسی طرح اہل مغرب بھی اسے دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر پھیلی ہوئی

قومیں ہیں جو مشرق و مغرب میں یکساں پھیل جائیں گی۔ اور مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو آیات اللہ پر وہ یقین نہ رہے گا جو انسان کے اندر قوت عمل پیدا کرتا ہے اور اس لئے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بھی چھوڑ دیں گے تو ان کے لئے بطور سزا ایک ایسی مخلوق نکل پڑے گی جو بالکل زمین پر جھکی ہوئی ہوگی جیسے موجودہ عیسائی قومیں ہیں جن کے متعلق خود قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے۔ الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا (الکہف ۱۰۴) یعنی ان کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی تک ہی ختم ہو جائیں گی۔ اور تکلمھم کے دوسرے معنی زخمی کرنے کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام مسلمانوں کے دلوں کو زخمی کرے گا۔ یعنی وہ طرح طرح کے ناپاک اعتراضات اسلام پر کرنیوالے ہوں گے۔ اور مختلف رنگوں میں مسلمانوں کو ان سے نقصان پہنچے گا جن سے مسلمانوں کے دلوں کو زخم لگے گا۔ یہاں دابۃ من الارض کی بجائے کھلم کھلا زمین پر گرے ہوئے انسان کے الفاظ اس لئے نہیں استعمال کئے کہ دابۃ من الارض میں جامعیت بمنے سے [illegible] وہ انسان بھی شامل ہیں جو زمین پر گرے ہوئے ہوں اور جن کی نگاہ خدا کی طرف اٹھتی ہی نہ ہو۔ وہاں وہ تمام کیڑے اور اسباب مادی بھی شامل ہیں جو زمین کی پیداوار ہیں جن سے طاعون اور وبائیں پھیلتی اور جنگوں کی تباہیاں آتی ہیں۔ بالخصوص طاعون کا کیڑا جو زمین میں پرورش پاتا اور پسو کے کاٹنے سے انسانی جسم میں داخل ہو کر اس کی ہلاکت کا موجب ہوتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں پر آج وہ قومیں مسلط ہیں جو زمین پر گری ہوئی ہیں اور خدا کی طرف جن کی نظریں اٹھتی ہی نہیں۔ اور جن کے کلام سے مسلمانوں کے دل زخمی ہوئے اور طاعون اور وباؤں اور جنگوں کی بلاؤں کا کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

(۱۲) مسیح موعود کے زمانہ میں طاعون کا پھیلنا۔ جیسا کہ ایک تو مذکورہ بالا آیت دابۃ من الارض سے بھی ظاہر ہے۔ دوسرے حدیث میں بھی ہے۔ دیکھو صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الفتن صفحہ ۲۰۷ مصری۔ باب ذکر صفت الدجال میں حدیث آتی ہے جس میں مسیح موعود اور اس کے اصحاب کے مخالفوں کے بارے میں یہ الفاظ مذکور ہیں۔ فیرسل اللہ علیھم النغف فی رقابھم فیصبحون فرسی کموت نفس واحد۔ خدا تعالیٰ ان کی گردنوں میں ایک پھوڑا نکالیگا پس ایک چیرے پھاڑے ہوئے شخص کی موت کی طرح ہو جائیں گے یعنی اس سے موت بہت جلد واقع ہوگی جیسے ایک چیرا پھاڑا شخص جلدی مر جاتا ہے۔ جس طاعون میں گلے میں گلٹی اور پھوڑا نکلے اس سے موت بہت جلد واقع ہوتی ہے۔ پھر طاعون جس طرح

حضرت مرزا صاحب کے زمانہ میں پھیلی اور آپ کے مخالفوں پر جو تباہی اس سے وارد ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

(۱۳) **حج کا روکا جانا**۔ اسی زمانہ میں طاعون کی وجہ سے حجاز گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان کے حاجیوں کو روکا گیا۔ پھر جنگ عظیم کے درمیان میں حج روکا گیا۔

(۱۴) **ستارہ ذوالسنین کا نکلنا**۔ اقترب الساعۃ میں نعیم بن حماد سے مروی ہے کہ مہدی معہود کے زمانہ میں ستارہ ذوالسنین طلوع ہوگا۔ کتاب آثار محشر میں بھی دو دندانہ والی شاخ کے ستارہ کے طلوع کو علامات مہدی میں سے قرار دیا ہے۔ حجج الکرامہ میں نعیم بن کعب سے روایت ہے کہ مہدی کے خروج سے قبل ستارہ ذوالسنین طلوع ہوگا۔ حضرت مجدد الف ثانی صاحب نے بھی مکتوب شصت و ہفتم میں لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ مہدی کے زمانہ میں مشرق میں ستارہ ذوالسنین نکلے گا چنانچہ یہ ستارہ ۱۸۸۲ء میں طلوع ہوا۔ دیکھو اخبار "روزگار" مدراس مجریہ ۲۰۔ دسمبر ۱۸۸۲ء۔ اور خاکسار مؤلف نے بھی بچپن میں بمقام دھرم سالہ اس ستارہ کو دیکھا تھا۔ یہ وہی ستارہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے وقت طلوع ہوا تھا۔

(۱۵) **مشرق میں ایک بہت بڑی آگ کا نمودار ہونا**۔

کتاب حدیث الغاشیہ مصنفہ نواب صدیق حسن خاں میں حسین ابن علی سے مروی ہے کہ مہدی کے آنے سے قبل مشرق سے ایک بہت بڑی آگ نکلے گی۔ اسی طرح کتاب اقترب الساعۃ صفحہ ۰۵ پر محمد بن علی الباقر سے مروی ہے کہ مہدی کے زمانہ میں مشرق سے ایک بڑی آگ نکلے گی۔ یہ علامت سنہ ۱۳۰۱ہجری مطابق ۱۸۸۳ء میں یہ پیشگوئی بڑی صفائی سے پوری ہوئی۔ چنانچہ اخبار "روزگار" مدراس مجریہ ۲۲۔ ستمبر ۱۸۸۳ء میں اس کے حالات شائع ہوئے۔ اسی آگ کی کیفیت کو جو انگریزی کے ایک رسالہ سے ترجمہ شدہ ہے اور پیغام صلح ۲۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہے یہاں درج کر دینا امید ہے کہ بہتوں کی ترقی ایمان کا موجب ہوگا۔ لکھا ہے:

"جاوا اور سماٹرا کے درمیان جو سمندر کا ٹکڑا ہے اسے آبنائے سنڈا کہتے ہیں۔ اس آبنائے میں بعض چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی ہیں ان میں سے ایک کا نام کریکاٹو آ ہے۔ اس میں ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جو اس جزیرے کے نام پر موسوم ہے۔ دو سو سال تک یہ آتش فشاں پہاڑ ایسا خاموش رہا گویا اس میں اب آتش فشاں مادہ ختم ہو چکا ہے۔ مگر ۶۔ اگست

۱۸۸۳ء کو دوپہر کے وقت ایک بجے کے قریب وہ یک بیک پھوٹ پڑا۔ اس وقت ایک انگریزی جہاز چارلس بل قریباً دس میل کے فاصلہ پر تھا۔ اس کے ملاحوں نے ایک دہشتناک آواز سنی اور ساتھ ہی وہ کیا دیکھتے ہیں کہ کریکاٹوآ کا سارا رقبہ جو قریباً ۹ میل وسیع تھا آسمان کی طرف اڑا اور اس تیزی کے ساتھ گیا جس طرح کہ ہوائی آسمان میں جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک بہت بڑے قوالے کی دھار کی صورت میں زمین سے آسمان کی طرف بہت بڑی بڑی چٹانوں کے ٹکڑے اڑنے شروع ہوئے جن کے ساتھ آگ کی بڑی بڑی لپٹوں والے شعلے اور لہردار دھوئیں کی گھٹائیں تھیں۔ ان پتھروں، شعلوں اور دھوئیں کی اونچائی ۱۷ میل تک اندازہ کی گئی۔ تمام مشرقی آسمان پر گھٹا ٹوپ دھواں چھا گیا جس میں بجلی دمبدم کوندتی ہوئی نظر آتی تھی اس کے چند لحظہ بعد کسی چیز کے پھٹنے کی آواز آئی جو نہایت مہیب اور کانوں کو پھاڑنے والی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہزار بار بڑی توپیں بیک وقت داغی جا رہی ہیں۔ یہ خوفناک آوازیں ایک لمبے عرصہ تک جاری رہیں۔ اس کے بعد اس انگریزی جہاز پر جو دس میل کے فاصلہ پر تھا پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ یہ پتھر جو بارش کی صورت میں گر رہے تھے انسانی سر کے برابر تھے۔ پھر جھانواں پتھر کی ایک تہ ۵ فیٹ گہری پانی کی سطح پر جم گئی جس میں جہاز چلانا مشکل ہو گیا یہ بمباری دم بدم بڑھتی جا رہی تھی یہاں تک کہ ۵ بجے کے قریب جاوا اور سماٹرا میں ہر انسان یوں محسوس کرنے لگا کہ گویا ان کے کان کے پردے شق ہونے کو ہیں۔ مغربی آسٹریلیا وہاں سے ۲۲۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں توپوں کے مسلسل دغنے کی آواز سن کر لوگ متحیر تھے۔ تین ہزار میل کے فاصلہ پر ایک جزیرہ راڈرگس نامی تھا۔ وہاں کے پولیس افسر نے رپورٹ کی کہ گولہ باری کی آواز سنی گئی ہے۔ یہ جزیرہ اتنے فاصلہ پر ہے کہ وہاں آواز پہنچنے میں چار گھنٹے کا وقفہ درکار ہے مگر یہ آواز وہاں تک جا پہنچی۔ یہ مہیب آواز دوسری صبح تک جاری رہی جس کے ساتھ بہت بڑی گڑگڑاہٹ تھی۔ اور آخر کو چار بڑے جھٹکے دار رعد کی کڑکوں کے ساتھ یہ ختم ہوئی۔ جہاں تک انسانی تاریخ میں آتش فشاں پہاڑ یا کسی اور کڑک اور مہیب آواز کا ذکر ہے اس میں اس دھماکے کی نظیر نہیں ملتی۔ اسی طرح جس قدر راکھ یا اور مادہ اس آتش فشاں پہاڑ نے اگلا وہ بھی اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ مثلاً اس دھماکے کی وجہ سے جوار بھاٹے کی جو صورت ارد گرد کے سمندری علاقہ میں پیدا ہوئی اس کا صرف اسی امر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پانی کی لہر ۱۲۰ فیٹ اونچی ساحلی علاقہ پر یکایک آ گری جس کی وجہ سے ۳۶ ہزار صرف انسانی جانیں تلف

ہوئیں۔ اور اس تندی اور طوفانی کیفیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ ۸ ہزار میل سے کچھ زائد تک صلہ پر افریقہ کے جنوب میں کیپ ٹاؤن کے پاس بھی اس لہر کا دھکا پہنچا لیکن وہاں وہ ۲۷ فیٹ کے بجائے صرف ڈیڑھ فیٹ اونچی رہ گئی تھی۔ علاوہ ازیں جو مٹی اور راکھ اس پہاڑ سے نکل کر آسمان تک پہنچی اس کی اونچائی کا اندازہ ۲۰ میل تک کیا جاتا ہے۔ مگر چوڑائی کے لحاظ سے یہ دنیا کے بہت وسیع حصہ تک پھیل گئی۔ ساری سردی کے موسم میں صبح و شام تمام دنیا میں طلوع و غروب آفتاب کے وقت ایک خاص قسم کی روشنی کا نظارہ دکھائی دیتا رہا بلکہ بعض دفعہ لندن اور امریکہ کے بعض علاقوں میں اور یورپ کے بعض حصوں میں لوگوں کو شبہ ہوا کہ ان کے قرب وجوار میں کہیں بہت بڑی آگ لگ گئی ہے۔ اور آگ بجھانے والے انجن اس دھوکے میں ادھر اُدھر دوڑتے رہے۔ یہ حالت سات آٹھ ماہ تک جاری رہی اور جب تک نیا موسم بہار شروع نہ ہوا آسمان کی صورت ایک غیر معمولی حالت میں رہی۔"

خاکسار مؤلف اس وقت انبالہ چھاؤنی میں تھا۔ بغیر کسی امر کے شام کو شفق کی سرخی اس قدر تیز ہوتی تھی کہ جیسے آسمان میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آسمان کی اس قدر غیر معمولی اور تیز سرخی کو لوگ اکٹھے ہو کر دیکھا کرتے تھے اور اس سے آثار قیامت سمجھ کر توبہ و استغفار کیا کرتے تھے۔

(۱۶) حدیث میں رمضان میں کسوف و خسوف کا جمع ہونا مہدی کے زمانہ کا نشان بتایا گیا تھا چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے اور امام بیہقی نے بھی اسی قسم کی روایت کا ذکر کیا ہے اور وہ روایت یہ ہے۔ ان لمھدینا اٰیتین لم تکونا منذ خلق السمٰوات والارض ینکسف القمر لاوّل لیلۃٍ من رمضان وتنکسف الشمس فی النصف منہ۔ کہ بیشک ہمارے مہدی کے لئے دو نشان ہیں جو کبھی کسی دوسرے کے لئے نہیں ہوئے جب سے کہ آسمان و زمین پیدا کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ رمضان میں چاند گرہن اس کی پہلی رات میں ہوگا اور اسی مہینہ میں سورج گرہن اس کے درمیان کے دن میں ہوگا۔" یعنی جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے کسی اور مدعی کے لئے یہ نشان ظاہر نہیں ہوا کہ ایک ہی رمضان کے مہینہ کے اندر ان تاریخوں میں کسوف و خسوف ہوا ہو۔ رمضان میں "خسوف یعنی چاند گرہن پہلی رات میں اور کسوف یعنی سورج گرہن اس کے درمیان کے دن میں" کا مطلب سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ علم ہیئت کے رُو سے یہ ایک مسلّم امر ہے کہ چاند گرہن ہمیشہ چاند کے مہینہ کی ۱۳-۱۴-۱۵ تاریخوں میں سے کسی ایک دن میں ہوتا ہے اور سورج گرہن ہمیشہ

چاند کے مہینے کی ۲۷-۲۸-۲۹ تاریخوں میں سے کسی ایک دن میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ٹھیک اسی طرح ہوا جس طرح حدیث مذکور میں پیشگوئی تھی کہ ۱۸۹۴ئہ میں مارچ اور اپریل کے مہینہ میں رمضان کا مہینہ پڑا۔ اور رمضان کے مہینے میں چاند گرہن کی راتوں میں سے پہلی رات میں یعنی ۱۳۔ رمضان کو چاند گرہن ہوا۔ اور سورج گرہن کے دنوں میں درمیان کے دن یعنی ۲۸۔ رمضان کو سورج گرہن ہوا۔ بعض مخالفوں نے یہ کج بحثی شروع کی کہ چاند گرہن رمضان کی پہلی تاریخ کو ہونا چاہیئے تھا۔ اور سورج گرہن رمضان کی ۱۵ تاریخ کو ہونا چاہیئے تھا۔ حالانکہ ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ رمضان کی پہلی تاریخ کو جو چاند نکلے گا وہ عربی زبان میں قمر نہیں کہلا سکتا وہ ھلال کہلائیگا بلکہ عرب میں پہلی تین تاریخوں تک چاند ہلال کہلاتا ہے۔ اس کے بعد قمر کہلاتا ہے۔ پیشگوئی میں قمر کا لفظ موجود ہے۔ دراصل علم ہیئت کی ناواقفی کی وجہ سے ان مخالف مولویوں نے اپنی ناوانی کا ثبوت دیا۔ ورنہ جب تک سورج اور چاند مقابل سمتوں میں نہ ہوں اور درمیان میں زمین آکر اس کا سایہ چاند پر نہ پڑے چاند گرہن نہیں ہو سکتا۔ اور یہ پہلی تاریخ کو ناممکن الوقوع ہے۔ اسی طرح ۱۵ تاریخ کو چاند سورج کے مقابل سمت میں ہوتا ہے۔ جب تک سورج اور چاند ایک ہی سمت میں نہ ہوں چاند سورج اور زمین کے درمیان میں آکر سورج گرہن نہیں پیدا کر سکتا۔ خدا کی شان اگلے سال ۱۸۹۵ئہ میں رمضان کے مہینہ کی انہی تاریخوں میں امریکہ میں چاند گرہن سورج گرہن ہوا۔ تا مشرقی اور مغربی دنیا دونوں پر حجت تمام ہو۔

(۱۷) دجّال اور یاجوج ماجوج کا خروج[۱]

یاجوج اور ماجوج اور دجال کے خروج کی پیشگوئی مسلمانوں میں نہایت مشہور اور اس قدر تواتر سے مروی ہے کہ اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے متعلق غلط فہمیاں بہت سی تھیں۔ حدیثوں میں جو کچھ دجال اور یاجوج ماجوج کی نسبت پیشگوئیاں ہیں وہ سب کی سب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے کشوف یا رویا ہیں اور وہ مختلف نظارے ہیں جو آپ کو باطن کی آنکھ سے مختلف اوقات میں دکھائے گئے۔ اب ظاہر ہے کہ کشوف یا رویا ہمیشہ تعبیر طلب ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے کہ بادشاہ مصر نے سات موٹی گائیں اور سات دبلی گائیں رویا میں دیکھیں جن سے مراد سات خوشحالی کے سال اور سات قحط کے سال تھے۔ اسی طرح آنحضرت صلعم نے رویا میں دیکھا کہ آپ کے بعد سب سے پہلے آپ کی وہ

[۱] دجال اور یاجوج و ماجوج کے بارے میں میں نے مولانا محمد علی صاحب کی کتاب تحریک احمدیت میں سے زیادہ تر لیا ہے۔ مؤلف

بی بی وفات پائیں گی جن کے سب سے زیادہ لمبے ہاتھ ہیں۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے سب بیبیوں نے ہاتھ ناپے اور آپ نے منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ حضرت سودہؓ کے ہاتھ سب سے لمبے نکلے۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد جب سب سے پہلے حضرت زینب بنت جحش کا انتقال ہوا تو پتہ لگا کہ لمبے ہاتھوں والی سے مراد تھی سب سے زیادہ سخاوت کرنیوالی۔ اسی طرح دجال اور یاجوج و ماجوج کی پیشگوئیاں بھی تعبیر طلب ہیں اور اُن میں مجاز اور استعارہ بہت ہے جیسا کہ اکثر کشوف اور رویا میں ہوتا ہے۔ ان کو ظاہر الفاظ میں پُورا ہوتے دیکھنے کی توقع غلطی ہے۔ حضرت نبی کریم صلعم اور آپ کے صحابہ بھی دجال کی پیشگوئی کو ظاہر الفاظ میں پُورا ہوتے دیکھنے کے منتظر نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بعض صحابہ نے ابن صیاد کو دجال سمجھ لیا اور آنحضرت صلعم کے سامنے حضرت عمر نے اس امر پر قسم کھالی تو حضرت نبی کریم صلعم نے منع نہیں فرمایا۔ حالانکہ ابن صیاد میں دجال کی علامات میں سے کوئی بھی علامت ظاہر الفاظ میں پوری نہیں اُترتی تھی۔

دجال کی اصل حقیقت دجال کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک تو لغت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ دجال دجل سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہیں ڈھانک لینا۔ لسان العرب میں ہے کہ دجال اس لئے نام رکھا گیا کہ وہ جھوٹ سے حق کو ڈھانک لیگا۔ یعنی اس پر پردہ ڈالے گا یا اپنی جماعتوں کی کثرت سے زمین کو ڈھانک لے گا یا لوگوں پر اپنے کفر کا پردہ ڈال دیگا۔ اور لغت میں اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ ایسا گروہ جو تجارت کے لئے اپنا سامان اٹھائے پھرے۔ گویا زمین کو اپنے سامان تجارت سے ڈھانک دے۔ اور یہ بھی لغت میں ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے اس کے خلاف ظاہر کرتا ہے۔ یعنی دل کی بات کو ڈھانک لیتا ہے یہ تو وہ صفات ہیں جن سے دجال کو شناخت کیا جا سکتا ہے اب اس کے تعین کے لئے آنحضرت صلعم کے ارشاد کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ صحیح احادیث میں ہے کہ دجال کے فتنہ سے بچنے کے لئے سورہ کہف کی پہلی دس آیات اور پچھلی دس آیات کو پڑھا کرو۔ قرآن کریم کی آیات کو جنتر منتر کی طرح پڑھنا تو خلاف منشائے اسلام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اس فتنہ دجال سے بچنے کے لئے کوئی ہدایت ہوگی۔ سو ہم جب پہلی دس آیات کو پڑھتے ہیں تو اس میں مسیحیت کے فتنہ کا ذکر ہے اور آخری دس آیات کو پڑھتے ہیں تو انہی مسیحی اقوام کی انسان پرستی کے ساتھ انکی دنیا پرستی اور مادی ترقیات کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے عیسائیت کے غلبہ کو ہی فتنۂ دجال قرار دیا ہے۔ بالفاظ دیگر جس چیز کو حدیث میں فتنۂ دجال کے نام سے بیان کیا گیا ہے

قرآن نے اسے فتنۂ مسیحیت کہا ہے۔ اور اس بات کی اُس حدیث سے اور بھی تصدیق ہوتی ہے جس میں دجال کے مسیحی گرجے سے نکلنے کا ذکر ہے۔

یاجوج ماجوج کی اصل حقیقت یاجوج ماجوج اجّ یا اجیج سے ہے۔ اور اجیج آگ کے شعلہ مارنے یا بھڑکنے کو کہتے ہیں اور اجّ کے معنے تیز چلنے کے ہیں۔ پس یاجوج ماجوج ان قوموں کے صفاتی نام ہوئے جو آگ سے کام لیتے ہیں اور نہایت تیزی سے سفر طے کرتے ہیں۔ مثلاً ریلوے انجنوں اور ہوائی جہازوں وغیرہ سے یا آگ سے مشینوں اور کارخانوں کو چلاتے اور جنگ و جدل کرتے ہیں اور یہ صفات یورپین اقوام کی ظاہر ہے۔

بائیبل میں یاجوج ماجوج کا ذکر کھلے الفاظ میں ہے جن سے ان کی تعین میں کوئی بھی شبہ نہیں رہ جاتا۔ حزقیل باب ۳۸ میں ہے:۔

"خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل یاماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور ٹوبال کا سردار ہے۔ اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور ٹوبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں پھر تجھے پھرا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا"

یہاں جوج کا ذکر صریح الفاظ میں ہے (یہ وہی جوج ہے جسے قرآن کریم میں یاجوج کہا گیا ہے) کہ وہ روس اور مسک اور ٹوبال کا سردار ہے۔ روس ملک کا نام ہے اور مسک اور ٹوبال دریا ہیں۔ مسک پر ماسکو اور ٹوبال پر ٹوبالسک روس کے مشہور شہر ہیں۔ ماسکو یورپی روس کا دارالسلطنت ہے اور ٹوبالسک ایشیائی روس کا دارالسلطنت ہے۔ پس ان میں ایک یعنی یاجوج تو روس ہے اور روس اسلافی قوم کا مسکن ہے۔ اور دوسرا ماجوج اسی سرزمین کا رہنے والا بتایا گیا یعنی یورپ کے ہی دونو رہنے والے ہیں۔ یورپ کی ساری آبادی دو بڑے حصوں پر منقسم ہے یعنی ایک سلافی اقوام اور دوسری ٹیوٹن اقوام جن میں انگریز اور جرمن وغیرہ آجاتے ہیں۔ پس یاجوج یورپ کی مشرقی اور جنوبی اقوام کا نام ہے اور ماجوج یورپ کی وسطی اور مغربی اقوام کا نام ہے۔ اور یہ بھی ظاہر امر ہے کہ ابتدائی مسکن ان سب اقوام کا ایک ہی تھا۔ ممکن ہے کہ یاجوج اور ماجوج ان دو اقوام کے مورث اعلیٰ کے نام یا خطاب ہوں اور اس پر شہادت یہ بھی ہے کہ یاجوج اور ماجوج کے مجسمے بہت پرانے زمانہ سے لنڈن میں گلڈ ہال کے سامنے نصب ہوئے چلے آتے ہیں جن کا لارڈ میرس ڈے کی تقریب پر پرانے زمانہ میں جلوس بھی نکالا جاتا رہا ہے۔ پس ایک طرف بائیبل کے بیان سے اور دوسری طرف

مجسوں کی اس تاریخی شہادت سے یہ بات قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ یاجوج ماجوج کوئی فرضی نام نہیں بلکہ اقوام یورپ کے ہی دو ٹکڑوں کے دو نام ہیں اور ان دونو ناموں میں سارا یورپ آجاتا ہے۔ اس شہادت کے بعد قرآن کریم کے اس بیان کی کہ حتیٰ اذا فتحت یاجوج و ماجوج وھم من کل حدب ینسلون (الانبیا) آخری زمانہ میں یاجوج و ماجوج ہر ایک بلندی پر سے اُترتے ہوئے آجائیں گے ایک ہی معنے ہوسکتے ہیں وہ یہ کہ یورپ کا تسلط تمام دنیا پر ہوجائے گا۔ بلکہ کل حدب کا لفظ استعمال فرما کر یہ بھی بتا دیا کہ یہ تسلط صرف ملکوں اور جسموں پر ہی نہ ہوگا بلکہ خیالات اور علوم پر بھی ہوگا۔ کیونکہ حدب کے اندر یہ امور بھی آجاتے ہیں۔ اور یورپ کا دنیا کے ممالک اور دنیا کے عام خیالات پر تسلط الفاظ قرآن کی صداقت کا کھلا گواہ ہے تو جو امر اس وقت اسلام کی کمزوری اور مغلوبیت ظاہری کا سامان ہوگیا ہے خود وہی اسلام کی صداقت کی بھی بیّن دلیل ہے۔

دجال اور یاجوج و ماجوج ایک ہیں سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے ذکر میں جہاں یاجوج ماجوج کا ذکر آتا ہے ان کا ذکر تفصیل سے کرتے ہوئے قرآن کریم نے آگے ہی ان کے عقائد کا ذکر ان الفاظ میں شروع کیا ہے کہ افحسب الذین کفروا ان یتخذوا عبادی من دونی اولیآء کہ کیا کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ انہوں نے میرے سوا میرے بندوں کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور حدیث شریف کے رو سے سورۂ کہف کی ان آخری دس آیات میں دجال کے عقائد اور فتنہ کا ذکر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جن آیات قرآنی میں یاجوج ماجوج کے پُرفتن عقائد کا ذکر ہے وہی آیات حدیث شریف کی تصریح کے رُو سے دجال کے عقائد اور فتنوں کے بارے میں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دجال اور یاجوج و ماجوج ایک ہی قوم کے دو مختلف حیثیتوں سے دو نام ہیں۔ یاجوج ماجوج ان کی سلطنت اور قوت اور دنیوی شوکت اور ان کے آگ سے کام لینے اور تیز رفتاری کی وجہ سے ان کا نام رکھا گیا ہے۔ تو دجال ان کے مذہبی عقائد کی وجہ سے ان کا دوسرا نام ہے کہ مسیحیت کے گمراہ کن اور غالیانہ عقائد اور مادہ پرستی اور دہریت کے باطل پروپاگنڈے سے انہوں نے جھوٹ سے حق کو ڈھانک لیا اور اس معاملہ میں انہوں نے طرح طرح کے دجل سے کام لیکر دنیا کو گمراہ کیا۔ اور ان کی یہی دجالی حقیقت ہے۔ جس سے مومنین کو بہت ڈرایا گیا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے امت کو بار بار دجال کے فتنے سے ڈرایا اور کسی فتنہ پر جو اسلام کو پیش آنے والا تھا اتنا زور نہیں دیا جتنا زور دجال کے فتنہ پر دیا۔

دجال سے مراد فرد واحد نہیں بلکہ مراد ایک قوم ہے کچھ شک نہیں کہ بعض احادیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

دجّال کوئی فردِ واحد ہوگا جس کی ایک آنکھ ہوگی۔ اور جس کے ماتھے پر ک ف ر لکھا ہوا ہوگا۔ اور جس کے ساتھ ساتھ ایک گدھا اور آگ اور نہر ہوگی۔ لیکن ان احادیث کو اگر قرآن کریم کی روشنی میں پڑھا جائے تو کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ دجّال ایک فردِ واحد کا نام نہیں بلکہ یہ درحقیقت اس قوم یا ان قوموں کی تصویر ہے جن پر یہ احادیث صادق آتی ہیں۔ قرآن کریم نے قطعیت کے ساتھ دجال کو عیسائی اقوام قرار دیا ہے۔ اور پھر یاجوج ماجوج اور دجّال کو ایک ہی قرار دیا ہے کیونکہ دونو کے فتنے اور عقائد کا ذکر اکٹھا کیا ہے اور یاجوج ماجوج کے اقوام یورپ ہونے پر بائیبل کی صریح شہادت موجود ہے تو پھر دجال اور اور عیسائی اقوام یورپ کے ایک ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا اور احادیث کی شہادت سے بھی اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ فتنہ دجال غلبۂ مسیحیت و مادیت ہی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں جس طرح روم اور فارس وغیرہ کا بحیثیت ایک قوم کے ذکر ہے۔ اسی طرح دجال کا بھی بحیثیت ایک قوم کے ذکر ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "تم (یعنی مسلمان) عرب سے جنگ کروگے تو اللہ تعالیٰ اُسے فتح کر دیگا۔ پھر فارس سے جنگ کروگے تو اللہ تعالیٰ اُسے فتح کر دیگا۔ پھر روم سے جنگ کروگے تو اللہ تعالیٰ اسے فتح کر دیگا۔ پھر دجال سے جنگ کروگے تو اللہ تعالیٰ اُسے فتح کر دیگا۔ اب یہاں جس طرح عرب فارس اور روم اقوام ہیں دجال کو بھی ایک قوم یا اقوام بتلایا گیا ہے۔ رہا یہ امر کہ احادیث میں جو دجال کا ذکر فردِ واحد کی طرح ہے اور اس کا حلیہ بھی دیا ہے تو اس سے اس کے ایک قوم یا بعض اقوام ہونے میں کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا یہ پیشگوئیاں نبی کریم صلعم کے کشوف ہیں۔ اور کشف اور رویا میں جب ایک قوم دکھائی جائیگی تو ایک فردِ واحد کے طور پر ہی دکھائی جائے گی کیونکہ کشف اور رویا میں ایک چیز متمثل ہو کر یعنی کوئی شکل اختیار کر کے سامنے آتی ہے۔ اس لیے جب کسی قوم کو سامنے لایا جائے گا تو ایک انسان کی صورت میں متمثل کر کے ہی لایا جائے گا۔ بالخصوص جب ایک قوم کی بعض نمایاں خصوصیات کو سامنے لانا مقصود ہو۔ اور ذکرِ دجّال میں عیسائیت اور مادہ پرستی کے غلبہ کی نمایاں خصوصیات کو ہی سامنے لانا مقصود تھا تو اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ ان خصوصیات کو ایک فردِ واحد کے رنگ میں دکھا دیا جائے۔

دجّال کا حلیہ حضرت نبی کریم صلعم کی ان پیشگوئیوں میں یہ کس قدر کمال ہے کہ آج جو کچھ ہمیں یورپ کا خدوخال ان آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ اس خدوخال کو دجّال کے حلیہ میں بیان کر دیا ہے صحیح بخاری میں جو مختلف احادیث ہیں ان سب کو پڑھ کر دجّال کا جو حلیہ پیش نظر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جسم کے لحاظ سے قوی الجثہ[1]۔ رنگ کے لحاظ سے سفید[2] اور روشن رنگت والا۔ سر[3] کے بال چھوٹے اور گھنگریالے۔ یہ تینوں باتیں اہل یورپ کے ظاہری خدوخال پر نہایت صفائی سے صادق آتی ہیں۔ اور اب تو

ان کی عورتیں بھی بال چھوٹے اور مصنوعی طور پر گھنگریالے بنانے لگی ہیں۔ یہ تو ہوا جسمانی حلیہ۔ اب روحانی حلیہ ملاحظہ ہو۔ اس کے متعلق دو باتیں حدیثوں میں نہایت صفائی سے بیان ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دجال کی دائیں آنکھ کانی ہوگی۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی پیشانی پر ک۔ ف۔ ر لکھا ہوگا۔ میں نے اسے رُوحانی خد و خال اس لئے کہا کہ اگرچہ جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ دجال جسے کشف یا رویا میں دیکھا گیا وہ ایک قوم کا نمائندہ ہے تو ظاہر ہے کہ ساری قوم ظاہر معنوں سے کانی نہیں ہوسکتی۔ اور دوسری علامت ک۔ ف۔ ر کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ اس لکھے ہوئے کو فقط مومن ہی پڑھ سکیں گے خواہ وہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ۔ پس صرف مومنوں کا اُس کو پڑھنا اور ناخواندہ مومن کا بھی اسے پڑھ لینا بتلاتا ہے کہ وہ تحریر الفاظ میں لکھی ہوئی نہ ہوگی۔ پس یہ تحریر ایسی ہوگی کہ اس کے حال سے نظر آئے گی یعنی دجال کا کفر ایسا عیاں ہوگا کہ ہر ایک مومن اس کو معلوم کرے گا۔ کسی چیز کے ماتھے پر لکھے ہونے سے مراد یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ چیز بالکل عیاں اور ظاہر ہو۔ اور کافر کے کفر کو خود کافر نے کیا پڑھنا ہے اسے تو مومن ہی پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح دجال کا کانا ہونا روحانی طور پر ہی اس کا کانا ہونا ہی کافی ہے حدیث میں اگر یہ لکھا ہے کہ اس کی دائیں آنکھ کانی ہوگی تو وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی دوسری آنکھ ایسی چمک رہی ہوگی گویا کہ وہ ایک روشن ستارہ ہے یعنی دائیں آنکھ تو بالکل ماری ہوئی ہوگی اور بائیں آنکھ حد سے زیادہ روشن ہوگی حضرت اقدس مرزا صاحب نے اس کی یہ توجیہ فرمائی کہ انسان کی دو آنکھیں ہوتی ہیں ایک دینی اور روحانی امور کو دیکھتی ہے اور دوسری جسمانی اور مادی امور کو دیکھتی ہے۔ چونکہ دین اور روحانیت اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں اور جسمانی اور مادی امور ادنیٰ مرتبہ رکھتے ہیں اس لئے دائیں آنکھ کے نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ دجال کی توجہ دینی اور روحانی امور کی طرف سے مٹی ہوئی ہوگی۔ اور یہی حالت آج اقوام یورپ کی ہے اور بائیں آنکھ روشن ستارہ کی طرح تیز سے مراد ہے کہ ان کی ساری توجہ جسمانی اور مادی امور کی طرف ہوگی۔ اور اس میں ان کی ترقی بے نظیر ہوگی۔ مادی اور جسمانی امور میں وہ ایسی باتوں کو دیکھ سکیں گے جن کو اور لوگ نہیں دیکھتے۔ مگر ان کی روحانی اور دینی آنکھ بالکل ماری ہوئی ہوگی۔

دجال کے بارہ نشانات مختلف احادیث کے پڑھنے سے جو مشکوٰۃ اور کنز العمال میں ہیں یہ بارہ نشانات ایسے ہیں جن کا دجال کے ساتھ ساتھ ظہور ہوگا۔

(۱) دجال کی جنت اور دوزخ ایک بہت بڑی علامت دجال کی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ بہشت اور دوزخ ہوں گے۔ اگر حدیث میں ایک جگہ دجال کے ساتھ جنت اور نار کا ذکر ہے

تو دوسری جگہ ماء (پانی) اور نار ہے یعنی جنت کی بجائے پانی کا ذکر کیا ہے۔ اور کہیں نہر اور نار آیا ہے۔ اور کہیں دو نہروں کا ذکر ہے ایک پانی کی نہر اور دوسری آگ کی نہر۔ پھر اس پانی کی نہر کی دوسری حدیث میں یوں شرح فرمائی ہے کہ اس کے ساتھ روٹیوں کے پہاڑ اور پانی کی نہریں ہوں گی۔ اور کہیں جنت و نار کی جگہ ہے دو پہاڑ۔ ایک پہاڑ میں درخت اور پھل اور پانی ہوگا اور ایک میں دھواں اور آگ۔ تو جو جنت ہے وہی کبھی نہر ہے۔ اور کبھی پہاڑ۔ اور جو نار ہے وہ کبھی نار ہے اور کبھی پہاڑ۔ تو ظاہر ہے کہ ان الفاظ سے مراد نہ سچ مچ کی پانی اور جنت کی نہریں اور پہاڑ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ یہ سب الفاظ بطور مجاز و استعارہ کے استعمال ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اکثر کشف و رویا میں دکھایا جاتا ہے۔ مراد اوّل سے سامان معیشت اور عیش و عشرت کے سامانوں کی فراوانی۔ اور دوسرے سے ان چیزوں سے محرومی ہے۔ جو شخص اس کے ساتھ ہولیگا وہ اوّل میں شریک ہوگا اور جو اس کی مخالفت کرے گا اس پر دجّال سامان معیشت کو بھی تنگ کر دیگا۔ اور ان چیزوں کے ساتھ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کے قبضہ میں ہوں گے۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس کی تشریح موجود ہے کہ "زمین کی نہریں اور اس کے پھل اس کے لئے مسخّر کر دیئے گئے ہوں گے"۔ پس ان سب الفاظ سے یہ مراد ہے کہ دنیا کی زندگی کے اور عیش و عشرت کے ہر قسم کے سامان اس کے قبضہ میں ہوں گے وہ جن کو چاہے یہ سامان دیدے اور جن سے چاہے چھین لے۔ عیش کے سامانوں کی فراوانی دجّال کی جنت ہے اور ان سے محرومی دجّال کا جہنم ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص دجّال کی جنت میں گیا وہ گمراہ ہوگیا۔ آخرت میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔ اور جو شخص دجّال کے جہنم میں گیا وہ بچ گیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص دجّال کی جنت یعنی دنیا کی زندگی کے عیش و عشرت یعنی ناچ و رنگ تماشے تھیٹر اور سینما، عورتوں مردوں کی مخلوط پارٹیوں، شراب، زنا، جوئے میں منہمک ہوگا۔ اسے خدا کب یاد آئے گا۔ اور آخرت اور روحانیت کا اس میں کیا حصّہ ہوگا۔ انہی چیزوں سے محرومی دجّال اور اس کے متبعین کی نظر میں جہنم ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو جو ان کے اس لطف زندگی میں شریک نہیں ہوتے زندہ بلکہ انسان بھی نہیں سمجھتے۔ لیکن وہی شخص ہوگا جو بچ گیا۔

(۲) دجّال کی تیز رفتاری زمین، پانی اور ہوا میں اس کی سواریاں

جب حضرت نبی کریم صلعم سے دریافت کیا گیا کہ دجّال کس قدر تیز چلے گا تو فرمایا کہ بادل جیسے ہوا اڑائے لئے جا رہی ہو۔

اللہ الصمد۔ آج دجّال کی تیز رفتار سواریوں۔ ریل اور موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں پر یہ الفاظ کیسے صادق آتے ہیں۔ آج ان کے ہوائی جہاز خود ہوا کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام نے فرمایا کہ "زمین اس کے لئے لپیٹ دی جائے گی" یعنی وہ زمین پر اس قدر تیز چلے گا کہ معلوم ہوگا کہ زمین لپیٹ لی گئی ہے۔ پھر ہوا میں اس کے چلنے کا ذکر ان الفاظ میں ہے "وہ بادلوں کو اپنے دائیں ہاتھ سے لے لیگا" یعنی بادلوں کے اندر چلتا پھرے گا۔ پھر اور بھی تصریح فرمائی "وہ زمین اور آسمان کے درمیان اُچھلتا پھرے گا" اور اس قدر تیز چلے گا کہ سورج پر اس کے ڈوبنے سے پہلے سبقت لے جائے گا" آج انگلستان سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اٹلی میں دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ اور غروب آفتاب سے پہلے پھر انگلستان میں واپس پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اس کی سواری کا ٹخنوں تک سمندر میں چلنا اور دھوئیں کا پہاڑ اس کے آگے آگے ہونا یہ دخانی جہاز نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اس کی سواری کو گدھے سے جو تشبیہ دی ہے اس میں اشارہ یہ ہے کہ اسے اپنی سواری پر کامل تصرّف ہوگا جیسے انسان کو اپنے گدھے پر قدرت ہوتی ہے کہ وہ اس سے سواری اور بار برداری کا کام لیتا ہے۔ آجکل ریل اور جہازوں کی سیٹی کی آواز بھی گدھے کے رینگنے کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس کے کانوں کے درمیان ستر باع کا فاصلہ ہونا بھی استعارہ ہے یعنی انجن کے ڈرائیور اور گارڈ کے درمیان جو ٹیلیفون لگا ہوتا ہے ان کے درمیان ٹرین کی لمبائی عام طور پر ستر باع ہی ہوتی ہے۔ یعنی ڈرائیور اور گارڈ کے ٹیلیفون کو استعارہ کے رنگ میں کان فرمایا۔ پھر دجال کی سواری یعنی ریل کے ساتھ ساتھ روٹیوں کا چلنا کیا ٹرین کے ساتھ ریسٹورنٹ کار کا نقشہ نہیں ہے۔ اس کے آگے دھوئیں کا پہاڑ ہونا اور اس کا دن کو بھی چلنا اور رات کو بھی چلنا اور لوگوں کو سواری کے لئے بلانا کیا صاف نقشہ ان باتوں کا نہیں ہے جو روزہم ریل اور اس کے اسٹیشنوں پر دیکھتے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سواری کرایہ کشی کے لئے بھی ہوگی نیز رویا یا کشوف میں گدھا کسی کی سواری میں نظر آنا یہ تعبیر بھی رکھتا ہے کہ اس کی سلطنت اور غلبہ دنیا پر بڑی وسعت کے ساتھ ہوگا۔

(۳) ویرانوں کو زرخیز بنانا مشکوٰۃ میں روایت ہے کہ "دجال ویرانے پر گزرے گا اور اسے کہے گا کہ اپنے خزانے نکال دے تو اس کے خزانے اس کے پیچھے اس طرح چلیں گے جس طرح شہد کی مکھیاں اپنی بڑی مکھی کے پیچھے چلتی ہیں" یہ پیشگوئی کس قدر صفائی سے پوری ہوئی۔ دنیا کا کونسا ویرانہ ہے جہاں سے دجال نے خزانہ پیدا نہیں کیا۔ جہاں کوئی خزانہ زمین کے نیچے مخفی ہے خواہ وہ سونا چاندی ہو یا کوئی اور قیمتی دھات ہو۔ تیل اور پیٹرول ہو یا کوئلہ اور فولاد ہو۔ دجال جس ویرانے سے گزرتا ہے ان سب خزانوں کا اپنے آلات کے ذریعہ سے پتہ لگاتا ہے پھر انہیں وہاں سے نکال کر اپنے تصرّف

میں لے آتا ہے۔ علاوہ ازیں بڑے بڑے دشت اور بیابانوں اور بنجر اور ویرانوں میں نہریں اور پانی پہنچا کر وہاں سے اس قدر پیداوار حاصل کی ہے کہ ویرانوں کو یکسر مالا مال ہو گیا۔ جہاں دجال کا قدم پڑا ہے وہیں زمین کے خزانے نکل آئے ہیں۔ اس کی معدنیات اس کی پیداوار اس کے پھل یہ سب زمین کے خزانے ہیں اور پھر یہ دجّال کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں یعنی اُن سے فائدہ بالآخر انہی یورپ کی اقوام کو پہنچتا ہے۔ اور باقی کل دنیا کے لوگ ان کیلئے بمنزلہ مزدور کے رہ گئے ہیں۔

(۴) دجال کے ساتھیوں کی خوشحالی اور اس کی مخالفت کرنیوالوں کے مصائب

کنز العمال اور مشکوٰۃ میں مختلف حدیثیں ہیں جن میں صاف طور پر مذکور ہے کہ جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے یعنی اس کے مذہب کو اختیار کریں گے ان کو خوب کھانے کو ملے گا کیونکہ دجال کے ساتھ روٹیوں کے پہاڑ ہوں گے فمن اتبعه اطعمه واکفره جو اس کی اتباع کرے گا ان کو خوب کھلائے پلائے گا۔ مگر انہیں کافر بھی بنا دے گا۔ جیسا کہ آجکل اس ملک ہندوستان میں ہی چوہڑے، چمار اور دیگر نیچ اقوام کے لوگ جو اس ملک میں ذلیل ترین زندگیاں بسر کرتے تھے آج امیر بنے ہوئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی دولت میں سے اگر کچھ حصہ ملتا ہے تو انہی لوگوں کو ملتا ہے۔ دجّال کا مذہب اختیار کرتے ہی ان کے لئے تنخواہیں اور وظیفے لگ جاتے ہیں اور ان کے لئے روزی کا سامان ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگ انہی کے ساتھ کے سخت مشقت اور تکلیف میں ہوتے ہیں۔ وہ صاحب بہادر بن جاتے ہیں۔ یہ چوہڑے چمار رہ جاتے ہیں۔ پھر فرمایا ایسے لوگ بھی ہوں گے یقولون انا لنصحبه وانا لنعلم انه کافر ولکنا نصحبه ناکل من طعامه۔ وہ کہیں گے کہ ہم باوجود اس بات کو جاننے کے کہ وہ کافر ہے اس لئے اس کی رفاقت اختیار کرتے ہیں تاکہ اس کے کھانے میں سے کھائیں۔ گویا یہ ان پیٹ کے بندوں کا ذکر ہے جو محض روٹیوں کی خاطر اپنے مذہب، اپنے ضمیر، اپنے ملک کی اغراض کو دجّال کے ہاتھ بیچتے ہیں۔

(۵) دجال کا گذشتہ ارواح سے ملاقات اور باتیں کروانا

دجال یہ کرتب بھی دکھائے گا کہ کس طرح فوت شدہ ارواح سے ملاقات اور بات چیت ہو سکتی ہے۔ ویبعث معه الشیاطین علی صورة من قد مات من الاباء والاخوان (کنز العمال) یعنی کسی کا باپ فوت ہو گیا۔ کسی کا بھائی مر گیا ہے تو شیاطین اس کے ساتھ ہوں گے جو ان کی صورت اختیار کر کے آجاتے ہیں اور وہ باتیں بھی کر جاتے ہیں۔ یہ یورپ کے اسپریچوئلزم کا نقشہ ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے مخبر صادق نے کھینچا ہے۔ یورپ کے اسپریچوئلزم کے اندر کسی حقیقت کے ہونے کا مجھے انکار نہیں۔ مگر اس میں

کیا شک ہے کہ ان میں چالاک لوگ اپنی چالاکیوں سے لوگوں کو دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔ اور وہ شیاطین مختلف صورتوں میں آکر لوگوں کے باپ اور بھائی بن کر باتیں بھی کر جاتے ہیں۔

(۶) دجال کی پشت پر یہودیوں کی طاقت

حضرت نبی کریم صلعم کی یہ پیشگوئی نہایت زبردست شہادت ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح آنے والے واقعات کو تفصیلاً دکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ دجال یہودی ہوگا۔ بلکہ صاف لفظوں میں یہ فرما کر کہ دجال کا مقام گرجا گھر ہے بتا دیا کہ وہ عیسائی ہوگا۔ خود قرآن کریم نے دجال کا پتہ ان الفاظ میں بتایا کہ وینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولدا۔ ان لوگوں کو ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے یعنی دجال عیسائی اقوام کا دوسرا نام ہے۔ پھر یہودیوں کو جو عداوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی وہ ظاہر ہے یہاں تک کہ آپ کی مقدس والدہ پر نہایت ناپاک الزام لگایا خود حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا گو خدا نے انہیں صلیبی موت سے بچا لیا۔ پھر عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان جو عداوت ہے وہ والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الیٰ یوم القیٰمۃ سے ظاہر ہے کہ قیامت تک یہود اور عیسائی میں عداوت اور دشمنی ہم نے ڈال دی ہے۔ چنانچہ یہودی حضرت نبی کریم صلعم کے زمانہ میں اور اس سے قبل عیسائیوں کے ہاتھوں سے ہمیشہ دکھ اٹھاتے رہے اور اس کے بعد بھی مدت تک دکھ اٹھاتے رہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں معہٗ سبعون الف یھودی اس کے ساتھ ستر ہزار یہودی ہوں گے (عربی زبان میں ستر ہزار سے مراد کثرت ہوا کرتی ہے) پھر فرماتے ہیں یخرج الدجال عدو اللہ ومعہٗ جنود من الیھود۔ اللہ کا دشمن دجال خروج کرے گا اور اس کے ساتھ یہودیوں کے لشکر ہوں گے۔ قرآن کریم نے جیسا کہ فرمایا تھا کہ وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الیٰ یوم القیٰمۃ ہمیشہ عیسائیت یہودیت پر غالب ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے اور اس زمانہ کے عجیب ترین واقعات میں سے یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی عیسائی حکومتیں یہودیوں کے بل بوتے پر چل رہی ہیں اور بڑی بڑی سلطنتوں کے وزرا یہودیوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کے ہاتھ میں روپیہ ہے اور وہ روپے سے حکومتوں کو امداد دیتے ہیں اور اس لئے یورپ کی طاقتوں کو جس قدر یہودیوں کی خاطر منظور ہے وہ اور کسی کی نہیں۔ اور فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے کی وجہ بھی یہودیوں کا قرضہ ہی تھا جس کے ماتحت انگریزی

گورنمنٹ دبی ہوئی تھی۔ یورپ کی جنگیں بھی انہی یہودیوں کے روپوں سے چلتی ہیں خواہ اُن سے قرضہ لیکر یا انہیں لُوٹ کر۔

(۷) عورتوں پر دجال کا اثر | یہ خبر بھی صاف الفاظ میں دی گئی ہے کہ دجال کا اثر عورتوں پر بھی ہوگا جیسا کہ فرمایا کہ "سب سے پیچھے عورتیں اس کی طرف نکلیں گی۔ یہاں تک کہ ایک شخص اپنی ماں اور اپنی بیٹی اور اپنی بہن اور اپنی پھوپھی کی طرف آئے گا پھر اسے مضبوط باندھ دے گا اس ڈر سے کہ اس کی طرف نکل نہ جائے" (کنز العمال جلد ۷) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کی تہذیب میں عورتوں کے لئے زبردست کشش ہوگی۔ یورپ نے جو طرح طرح کے فیشن اور زیب و زینت کے سامان اور عورتوں اور مردوں کے باہم مخلوط جلسے اور ناچ اور رنگ اور گاتے اور بجانے اور کھانے اور پینے کی پارٹیاں اور تھیئٹر اور سینما نکالے ہیں ان چیزوں نے طبائع میں ان باتوں کی طرف ایک زبردست میلان پیدا کر دیا ہے۔ اور یورپ میں جو فواحش ہو رہے ہیں ان کی طرف سے طبائع میں تنفر کم ہو رہا ہے اور زنا اور زنا کے مبادی کو اب نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور مردوں میں یہ میلان پیدا ہوتے ہوتے آخر عورتیں بھی اس سے متاثر ہونے لگی ہیں۔ کیا سچے الفاظ تھے جو آج سے ۱۳۰۰ سال پیشتر مخبر صادق نے فرمائے۔ "اٰخر من یخرج الیہ النساء۔ سب سے پیچھے عورتیں اُس کی طرف نکلیں گی۔ عورتوں کی طبعی حیا نے ایک مدت تک دجالیت کے ان فتنوں کا مقابلہ کیا مگر وہ بھی اس کے اثر کے نیچے آگئیں۔ اور گو ابھی وہ حالت نہیں جو مغربی اقوام یورپ میں ہو چکی ہے۔ لیکن بہت بیبیاں ہیں جنہوں نے اسلامی حیاداری کو خیرباد کہہ کر بالکل مغربی نیم برہنہ لباس اختیار کر لیا ہے اور کلبوں اور مردوں اور عورتوں کے مخلوط ناچوں اور پارٹیوں میں شامل ہونا شروع کر دیا ہے۔ اور اگر اثر دجالیت اسی طرح غالب آتا گیا اور اسلامی تہذیب کی جگہ مغربی تہذیب لیتی گئی تو ایک دن وہی حالت مرد اور عورت کے تعلقات کی ہمارے ملک میں بھی ہو جائے گی جو آج یورپ میں ہے کہ زناکاری اور اس کے مبادی سے نفرت باقی نہ رہے گی۔

(۸) دجال اور اولاد زنا | مرد اور عورت کے تعلقات میں یورپ نے جو غلطی کھائی ہے اس کا کھلا اثر حرامی بچوں کی کثرت ہے جن سے آج یورپ اور امریکہ کے تمام بڑے بڑے شہر بھرے پڑے ہیں۔ اس کا انکشاف بھی قلب مبارک نبوی پر ہوا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ "الا ان الدجال اکثر اشیاعہ واتباعہ الیہود واولاد الزنا۔ یعنی سُن رکھو کہ دجال کا اکثر گروہ اور اس کی پیروی کرنے والے یہودی اور حرامی بچے ہوں گے۔ ان حرامی بچوں کی کثرت پر نظر کرتے ہوئے آخر یورپ میں یہ قانون پاس

ہو چکا ہے کہ زانی اور زانیہ کبھی بھی شادی کر لیں تو ان کی اولاد حرامی بچے نہیں کہلائے گی۔ شادی سے قبل اگر حمل ہو جائے تو شادی کے بعد وہ حرامی بچہ نہیں کہلائے گا۔ جنگ کے دوران میں جو فوجی سپاہیوں کے ذریعہ حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں وہ جنگ کے بچوں کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض ممالک مثلاً جرمنی میں مضبوط و توانا جرمنوں سے زنا کے ذریعہ بچے پیدا کروائے جاتے ہیں تاکہ آئندہ نسل توانا پیدا ہو اور قوم کی تعداد کم نہ ہونے پائے۔ اور جنگ کے دوران میں جہاں بیوہ بیوں کی ضرورت ہے کہ اُن سے روپیہ لیکر کام چلایا جائے وہاں حرامی بچوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ جنگ میں ہلاک ہو جانے کی وجہ سے قوم کی تعداد کم نہ ہو جائے۔

(۹) عورتوں کا مردوں سے اور مردوں کا عورتوں سے مشابہت پیدا کرنا

دجال کے زمانہ کی یہ خصوصیت کہ عورتیں مردوں سے مشابہت اختیار کر لیں گی اور مرد عورتوں سے مشابہت اختیار کرینگے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے سمجھ میں بھی نہ آسکتی تھی۔ مگر آج یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے۔ کہ عورتوں نے مردانہ فیشن کے بالوں کا کٹوانا۔ مردانہ لباس کوٹ پتلون نکر وغیرہ پہننا اور مردانہ شغل اور کھیلیں اختیار کر لئے ہیں۔ اور مردوں نے داڑھی مونچھ کا صفایا کر کے پوڈر اور سرخی چہروں پر لگا کر عورتوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وقت مرد اور عورت میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ نظارے خدا کی طرف سے حضرت نبی کریم صلعم کو دکھائے نہیں گئے۔ کوئی انسانی قیاس اس طرف نہ جا سکتا تھا حضرت نبی کریم صلعم کا یہ ارشاد کس قدر ایمان کو تازہ کرتا ہے کہ تشبھن بالرّجال و تشبہ الرّجال بالنساء (کنز العمال) کہ عورتیں مردوں سے مشابہت اختیار کر لیں گی اور مرد عورتوں سے مشابہت اختیار کر لیں گے۔

(۱۰) علاج امراض میں دجال کا کمال

مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان اقوام کی خوبیوں اور ان کے عیوب سب کو روشن کر دیا ہے چنانچہ ایک پیشگوئی یہ بھی فرمائی کہ یہ لوگ علاج امراض میں کمال کر دکھائیں گے۔ فرماتے ہیں۔ انہ یبری الاکمہ والابرص یحی الموتیٰ۔ کہ وہ اندھے اور کوڑھیوں کا علاج کرے گا اور مُردوں کو زندہ کرے گا۔ مُردوں کے زندہ کرنے سے یہی مراد ہے کہ ایسے ایسے مریض جو کالمیت ہوں گے اس کے علاج سے شفا پا جائیں گے۔ گویا ایسے ایسے عجیب غریب علاج اور اپریشن ایجاد کرے گا کہ مردے اس سے زندہ ہو جائیں گے یعنی جن مریضوں کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو سکتی تھی وہ شفا پا جائیں گے۔ اور آنکھوں کے اپریشنوں سے ہزارہا اندھوں کا شفا پا جانا اور طرح طرح کے علاجوں سے کوڑھیوں کا چنگا ہونا تو ظاہر ہے۔

(۱۱) دجال کی وسوسہ اندازی گو اوپر جو کچھ بیان ہوا اس سے ظاہر ہے کہ دجال تلوار کے زور سے یا جبر سے کسی کو گمراہ نہیں کرے گا۔ بلکہ طرح طرح کے لالچ دیکر اور دنیا کی زیب زینت اور دنیا کے عیش کے سامان دکھا کر لوگوں کو باطل کی طرف بلائے گا اور اپنے تصرفات بیچر اور اپنے علوم سے لوگوں پر تصرف حاصل کرے گا لیکن آنحضرت صلعم نے اس بات کو اور بھی صاف کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ دجال کا سب سے بڑا ہتھیار وسوسہ اندازی ہے۔ فرماتے ہیں۔ من سمع بالدجال فلینأ عنه فواللہ ان الرجل لیاتیه وھو یحسب انهٗ مومن فیتبعه مما یبعث به من الشبهات (کنز العمال) "جو شخص دجال کے متعلق سنے وہ اس سے الگ رہے۔ خدا کی قسم ایک شخص اس کے پاس آئے گا اور وہ گمان کرتا ہوگا کہ وہ مومن ہے۔ پھر وہ اس کا پیرو ہو جائے گا ان شبہات کی وجہ سے جو وہ اس کے دل میں ڈالے گا۔" اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر وسوسہ اندازی سے کام یورپین اقوام نے لیا ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسی کو موجودہ زمانہ میں پروپاگنڈا کہا جاتا ہے۔ ایسی ایسی باریک راہوں سے وسوسہ اندازی کرتے ہیں کہ دوسرے انسان کا وہم و گمان بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان کے خیالات درست یا غلط ہو سکتے ہیں۔ مگر ان اقوام نے تعلیمی کورس ایسے رکھے ہیں کہ ان کو اس بات کی بھی پروا نہیں کہ ان باتوں سے خود عیسائیت پر بھی زد پڑتی ہے۔ بلکہ ان کی اصل غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنے مذہب اور اپنے عقائد پر قائم نہ رہے۔ اس لئے باوجود مذہبًا خدا کی ہستی کے قائل ہونے کے خدا کی ہستی کے متعلق بھی وساوس پیدا کرنا ان کا کام ہے۔ اسی طرح وحی و رسالت اور حیات مابعد الموت پر مختلف پیرایوں میں شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات ایک خیال کی یا ایک شخص کی تعریف بھی کریں گے تا کہ پڑھنے والا یہ خیال کرے کہ یہ بڑے انصاف پسند ہیں مگر اسی تعریف کے اندر نیش زنی بھی کر دیں گے کہ انسان کے دل سے ایک عقیدہ یا ایک برگزیدہ انسان کا احترام بالکل اُٹھ جائے۔ حق سے پھیرنے کے لئے ان کی یہ وسوسہ اندازیاں ان اقوام کا سب سے بڑا دجل ہے۔ جس کی وجہ سے مذہبًا ان کا نام دجال رکھا گیا۔

(۱۲) دجال کا ظہور اور غلبہ کل رُوئے زمین پر ہوگا دجال کی صفات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کل رُوئے زمین پر پھر نکلے گا جیسا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا لا یبقی شیٔ من الارض الا وطئه وظھر علیه الا مکة ومدینة (کنز العمال) کہ مکہ اور مدینہ کے سوا زمین کا کوئی حصہ نہ رہ جائیگا جس کو وہ پامال نہ کرے گا اور اس پر غالب نہ آجائے گا۔ اور پھر دجال کی زبان سے یہ الفاظ بھی حدیث

میں مذکور ہیں کہ جب مجھے نکلنے کی اجازت ہوگی تو کوئی ایسی انسانی بستی نہ ہوگی جہاں میں نہ داخل ہونگا (کنز العمال) ان الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دجال ایک آدمی کا نام نہیں بلکہ ایک بہت بڑے گروہ کا نام ہے جس کے افراد ہر جگہ پہنچ جائیں اور ان بستیوں پر قابض ہو جائیں۔ یہ پیشگوئی کہ دجال روئے زمین کی ساری انسانی بستیوں میں پھر نکلیگا اور ساری زمین پر غالب آجائے گا آج صراحت کے ساتھ یورپ کی اقوام میں ہماری آنکھوں کے سامنے پوری ہو رہی ہے۔ کونسی بستی ہے جہاں دجال پھر نہیں نکلا۔ صحراؤں اور جنگلوں میں چھوٹے اور بڑے جزائر میں پہاڑوں اور وادیوں میں کونسا مقام باقی رہ گیا ہے جہاں دجال کا گزر نہیں ہوا۔ اور مکہ اور مدینہ کا استثنا بھی کس قدر تعجب خیز ہے۔ دجال کا اثر تمام عرب پر پڑا لیکن مکہ اور مدینہ سے اس کا اعراض انسانی سمجھ سے باہر ہے کہ کونسی طاقت ہے جس نے ان دو جنگی نقطۂ نظر سے غیر محفوظ شہروں کو دجال کے گزر سے محفوظ رکھا ہوا ہے جو بات انسان کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتی آج ہم اپنی آنکھوں سے پوری ہوتی دیکھ رہے ہیں۔ اور جو انسان ان پیشگوئیوں پر نظر ڈالے گا اور اس زمانہ کے واقعات کو دیکھے گا اس کا سر بے اختیار آنحضرت صلعم کی قوت کشفی کے سامنے جھک جائے گا اور وہ پکار اٹھے گا کہ یہ انسانی قیاس اور تخیل کی باتیں نہیں بلکہ علم غیب کا زبردست انکشاف ہے جو خدا نے اپنے رسول پر کیا۔

دجال کی شناخت ایک خاص آدمی نے کرنی تھی

یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک طرف احادیث میں دجال کے ایسے کھلے نشان بتائے گئے ہیں کہ موٹے سے موٹی عقل کا آدمی بھی اکی شناخت کرے۔ دوسری طرف یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کثرت سے اس کے فتنے میں آجائیں گے۔ اگر یہ ساری باتیں کہ دجال کی دائیں آنکھ بیٹھی ہوئی ہوگی اور اس کی بائیں آنکھ ستارہ کی طرح چمک رہی ہوگی اور اس کے ماتھے پر ک۔ ف۔ ر لکھا ہوا ہوگا اور اس کے ساتھ ایک عجیب الخلقت گدھا ہوگا جس کے دونوں کانوں کے درمیان ستر باع کا فاصلہ ہوگا اور اس کے ساتھ روٹیوں کا پہاڑ ہوگا اور اس کے ساتھ پانی کی نہر ہوگی وغیرہ وغیرہ اپنے ظاہری معنوں میں پوری ہونی تھیں تو دجال کے دجال ہونے میں کسی کو شبہ نہ ہو سکتا تھا۔ پھر اس کے کیا معنے ہیں کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مومنوں میں سے ایک خاص آدمی ہوگا جو اس دجال کو پہچان لے گا اور لوگوں میں اعلان کرے گا کہ واقعی یہی دجال ہے جس سے رسول اللہ صلعم نے ڈرایا تھا۔ فیقول رجل من المؤمنین لانطلقن الی ھذا الرجل فلانظرن اھو الذی انذرنا رسول اللہ صلعم ام لا۔ مومنوں میں سے ایک شخص کہے گا کہ میں اس کی طرف جاتا ہوں اور میں دیکھوں گا کہ کیا یہی وہ ہے جس سے

رسول اللہ صلعم نے ڈرایا تھا۔ پھر اس کے کیا معنے کہ وہ اسے دیکھ کر پہچان لے گا۔ ثم نادیٰ فی الناس ھذا الدجال الذی ذکرہٗ رسول اللہ صلعم یعنی پھر وہ لوگوں میں منادی کرے گا کہ یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا۔ اگر دجال نے ظاہر الفاظ کے رنگ میں ہی ظاہر ہونا تھا تو اس کی اپنی ہیئت کذائی جو حدیث میں بیان شدہ ہے بجائے خود ایسی منادی ہے کہ کسی ایک شخص کے اس کو شناخت کرنے اور اس کے دجال ہونے کی منادی کرنے کی ضرورت کو باقی نہیں چھوڑتی۔ پس اس سے صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ نشانات جو دجال کے ہیں ظاہری الفاظ میں پورے ہونے والے نہ تھے بلکہ بطور مجاز اور استعارہ کے تھے اور فقط ایک شخص پر یہ حقیقت منکشف ہونے والی تھی جو سب سے پہلے اسے شناخت کرکے لوگوں کو اطلاع دینے والا تھا کہ یہی وہ دجال معہود ہے۔

ھذا الدجال الذی ذکرہٗ رسول اللہ صلعم کس نے کہا؟

کس قدر عجیب بات ہے کہ دجال کی حقیقت کا یہ انکشاف کہ یہی اقوام یورپ ہیں جو دجال اور یاجوج ماجوج کی پیشگوئی کے مصداق ہیں۔ ایک گاؤں کے رہنے والے زاہد گوشہ نشین مرزا غلام احمد قادیانی پر ہوتا ہے جو دنیا کے حالات سے بہت ہی کم خبر رکھتا ہے۔ آج سے پچاس سال پیشتر جب تمام دنیا اس بات سے بے خبر پڑی تھی کہ دجال اور یاجوج ماجوج کون ہیں اور کسی کا وہم بھی اس طرف نہ جاسکتا تھا کہ وہ اقوام جو اس وقت دنیا پر پورا تسلط رکھتی تھیں اور اس ملک ہندوستان میں بھی ان کی حکومت تھی وہی دجال اور یاجوج ماجوج کی پیشگوئی کی مصداق ہیں۔ بلکہ تمام قلوب پر ایک ہی خیال مسلط تھا کہ دجال ایک کانے عجیب الخلقت انسان کا نام ہے جس کے ساتھ ایک عجیب الخلقت گدھا اور دوسری عجیب عجیب چیزیں ہوں گی۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت مرزا غلام احمد اس صدی کے مجدد کے قلب صافی پر اس عظیم الشان حقیقت کو ظاہر کیا کہ دجال اور یاجوج ماجوج یہی عیسائی اقوام ہیں جو دنیا پر پورا تسلط حاصل کرچکی ہیں۔ اور جن کی دنیا کی آنکھ حد درجہ کی تیز اور دین کی آنکھ بالکل اندھی ہے۔ اور جس بات کے کہنے کی کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی جرأت نہ کرسکتا تھا اس کا اعلان بے دھڑک قادیان کے ایک گوشہ نشین زاہد نے کیا۔ ساری دنیا کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے۔ حکومت کی پروا بھی نہ کرتے ہوئے، اور اس زمانہ میں جو پادریوں کا اثر حکام پر تھا اس کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے، ظاہر پرست علماء اسلام کے فتووں کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے آپ نے ۱۸۹۱ء میں اپنی کتاب ازالہ اوہام میں ھذا

الدجال الذی ذکرہ رسول اللہ صلعم کی آواز بلند کی۔ لوگ دجال کو دیکھتے تھے مگر نہ سمجھتے تھے کہ یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے۔ سب سے پہلے آپ نے اسے شناخت کیا اور لوگوں کو خبردار کیا کہ یہی دجال ہے۔

اقرب أمتی منی درجة

اس آواز کا جو قادیان سے اٹھی اور ان قوموں کے خلاف اٹھی جو دنیا میں اپنی حکومت کی وجہ سے اپنے آپ کو خدائی کے مرتبہ پر سمجھ رہی تھیں۔ پہلا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف مسلمانوں نے اپنے معتقدات کے خلاف اسے سمجھ کر اس کی مخالفت میں پورا زور لگایا اور دوسری طرف پادریوں نے اپنے اوپر اسے ایک خطرناک حملہ سمجھ کر اس آواز کے اٹھانیوالے کو پورے زور سے دبانا چاہا۔ یہاں تک کہ اقدام قتل کا مقدمہ اس پر کرکے اسے مروانے کی کوشش بھی کی۔ اور اس مقدمہ میں عیسائی آریہ اور مسلمان تینوں گروہ مل گئے۔ مگر اس مرد خدا نے کسی کی پروا نہ کی اور مخالفت کے اس طوفان عظیم میں وہ ایک پہاڑ کی طرح کھڑا رہا مگر حق بڑی زبردست چیز ہے اور وہ دلوں پر اپنا اثر کرکے رہتا ہے۔ اس ساری مخالفت کے باوجود دجال کے ساتھ مسلمانوں کے ایک گروہ کے مل جانے کے باوجود۔ یہود کے گروہ کی جگہ ہنود کے گروہ کے مل جانے کے باوجود وہ بات جو اللہ تعالیٰ نے امام وقت کے قلب پر ظاہر فرمائی تھی روز بروز قبولیت حاصل کرتی گئی۔ یہاں تک کہ آج قریبًا تمام فہمیدہ طبقہ مسلمانوں کا اس بات کا کھلے طور پر قائل ہے کہ وہ دجال اور یاجوج ماجوج جن کا ذکر احادیث نبوی میں ہے وہ یورپ اور امریکہ کی اقوام ہی ہیں۔ یہی خدائی تصرف کا دعوی رکھنے والی اقوام ہیں۔ اور خر دجال بھی یہی ان کی ریل وغیرہ ہے۔ مسلم اخبارات میں اب اس کا ذکر کسی عجیب بات کے طور پر نہیں آتا بلکہ ایک امر متعارف اور مسلّم کے طور پر آتا ہے۔ گویا سب لوگ دجال اور یاجوج ماجوج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ دجال کی شناخت سب سے پہلے کس نے کی اور یہ کس نے آواز بلند کی کہ یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلعم نے کیا تھا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اس آواز کا سب سے پہلے بلند کرنے والا جس کے متعلق حدیثوں میں آتا ہے کہ وہ دجال کو شناخت کرکے یہ آواز بلند کرے گا کہ یا ایھا الناس ھذا الدجال الذی ذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کہ اے لوگو یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلعم نے کیا) حضرت مرزا صاحب کے سوا اور کوئی نہیں۔ ہاں اس حدیث کی مصداق ایک ہی آواز تھی جو دنیا میں سب سے پہلے اٹھی۔ اور وہ وہی ندا ہے جو امام وقت مجدد دوران مسیح موعود حضرت مرزا غلام احمد قادیانی نے سب سے پہلے اس زمانہ میں بلند کی۔ اور اسی

کی گونج آج ہر فہمیدہ مسلمان کے دل سے اُٹھ رہی ہے۔ تو خوب یاد رکھئے کہ پھر اس مرد صادق کے متعلق جو کچھ حدیث میں آیا ہے وہ بھی درست ہے اور وہ یہ ہے کہ ھٰذا الرجل اقرب امتی منی درجۃً۔ میری اُمت میں سے یہ شخص مرتبہ میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ ھٰذا اعظم الناس شھادۃ عند رب العالمین۔ جہانوں کے پروردگار کے نزدیک یہ سب سے بڑھ کر شہادت کے مرتبہ والا ہے۔ اور فی الواقعہ دنیا کو دجال کے عظیم الشان فتنہ سے خبردار کرنے کی شہادت دنیا میں سب سے بڑی شہادت ہے جو اس اُمت میں سے کوئی شخص ادا کر سکتا ہے۔ بات تو صاف ہے کہ جس شخص نے اس امت کو دجال کا پتہ بتایا اس کے سوائے کسی اور مسیح موعود کا انتظار کرنا بے سود ہے۔ اور انتظار کے معنی ہی کیا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جو اقرب اُمتی منی درجۃ کا مصداق ہے وہی اس اُمت کا مسیح ہونا چاہیئے۔ ہاں صحابہ کی بے نظیر قربانیاں اور اُن کے مراتب قرب کو جو درجہ حاصل ہے وہ الگ ہے۔

قتل دجال اور مسیح موعود اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت مرزا صاحب ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے دجال کا پتہ بتایا اور ھٰذا الدجال الذی ذکرہ رسول اللہ صلعم کی آواز بلند کی۔ لیکن بعض قلوب میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسیح موعود کے متعلق یہ بھی تو حدیث میں آیا ہے کہ وہ دجال کو قتل کرے گا۔ پس حضرت مرزا صاحب نے دجال کو کہاں قتل کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب دجال ایک فرد واحد کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد اقوام یورپ ہیں تو قتل دجال نے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ وہ تمام اقوام یورپ کو قتل کر دے گا۔ اور قتل کر دینے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ مسیح موعود انہیں تبلیغ کر کے مسلمان کرے۔ ساری کی ساری اقوام کو قتل کر دے یہ تو خلاف اسلام بھی ہے۔ بلکہ قرآن کریم سے تو یہ ثابت ہے کہ یہ عیسائی اقوام قیامت تک باقی رہیں گی۔ جیسا کہ فرمایا کہ جاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الٰی یوم القیامۃ یعنی حضرت عیسٰی کے پیروان کے منکروں پر قیامت تک غالب رہیں گے جس سے لازم آتا ہے۔ کہ آپ کے پیرو اور منکر دونو قیامت تک موجود رہیں گے۔ دوسرے حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ذاب کما یذوب الملح فی الماء (مشکوٰۃ) کہ دجال خود بخود اس طرح پگھل جائے گا جس طرح پانی میں نمک پگھل جاتا ہے۔ یہاں قتل کی نفی ہو گئی۔ تیسرے جب یہ امر ثابت شدہ ہے کہ دجال اور یاجوج ماجوج ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ دجال اس کا نام بلحاظ اس کے دجل اور فریب دہی کے ہے۔ اور یاجوج ماجوج اس کا نام بلحاظ اس کی قوت اور حکومت کے ہے۔

تو پھر اگر مسیح موعود دجال کو قتل کریگا تو ضرور ہے کہ اس کے ساتھ ہی یاجوج و ماجوج بھی قتل ہو جائیں۔ کیونکہ وہ تو ایک ہی قوم ہے جس کے مختلف حیثیتوں سے دو نام ہیں۔ لیکن حدیثوں میں اس کے خلاف ہے جیسا کہ فرمایا فیوحی الی المسیح انی قد اخرجت عباداً الی لا یستطیع قتلھم الا انا (کنز العمال جلد ۷) یعنی میں نے کچھ اپنے بندے نکالے ہیں جن کے قتل کرنے پر میرے سوائے کوئی قادر نہیں۔ دوسری حدیث میں یوں ہے کہ ان سے جنگ کرنے کی کسی کو طاقت نہیں۔ اب دیکھو دجال کو تو مسیح موعود قتل کرسکتا ہے مگر یاجوج و ماجوج کو قتل کرنے یا ان سے جنگ کرنے کی طاقت کسی کو نہیں انہیں تو خدا کے سوا کوئی انسانی طاقت قتل نہیں کرسکتی۔ ان سب باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں قتل دجال سے کوئی مجازی قتل مراد ہے نہ کہ حقیقی۔ جس طرح دجال کی پیشگوئی میں تمام استعارے اور مجاز بھرے پڑے ہیں اسی طرح اس کا قتل بھی مجازی طور پر ہے۔ پس قتل دجال سے یہ مراد ہے کہ ان اقوام کے مذہبی فتنوں اور دجل کا علاج تو مسیح موعود کرے گا لیکن ان کی حکومت کا مقابلہ وہ نہیں کرسکتا۔ اور وہ کیا سوائے خدا کے کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ ان کیلئے تو قرآن کریم میں یوں آیا ہے: وترکنا بعضھم یومئذٍ یموج فی بعض یعنی ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر موج کی طرح گریں یعنی وہ خود ہی آپس میں لڑکر ایک دوسرے کو تباہ کریں گے۔ پس یاجوج ماجوج کا مقابلہ نہ کرسکنے اور دجال کو قتل کرنے کے یہی معنے ہیں کہ ان اقوام کے مذہبی فتنوں کا مسیح موعود دلائل اور براہین سے علاج کرے گا اور ان کا بڑا حصہ اس کی روحانیت اور دلائل سے اسلام قبول کرے گا جیسا کہ حدیث میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ تطلع الشمس من مغربھا یعنی مغرب سے صداقت اسلام کا آفتاب طلوع ہوگا۔ اور ممکن ہے احادیث میں جو ذکر آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے دجال کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اس میں بھی یہی اشارہ ہو کہ وہ بالآخر مسلمان ہو جائے گا۔ احادیث کو اگر غور سے پڑھا جائے تو یہ توجیہ جو قتل دجال کی اوپر کی گئی ہے اس کی مزید شہادت خود آنحضرت صلعم سے بھی ثابت ہے۔ متعدد احادیث میں آتا ہے۔ یخرج وانا فیکم فانا حجیجہ وان یخرج ولست فیکم فامرء حجیج نفسہ (کنز العمال جلد ۷) اگر وہ نکلے اور میں تمہارے درمیان ہوں تو میں اس سے بحث کرکے اسے مغلوب کرونگا اور اگر وہ نکلے اور میں تمہارے درمیان نہ ہوں تو ہر شخص اپنی ذات سے اس سے بحث کرے۔ اسی طرح متعدد احادیث میں آیا ہے جن سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر خود رسول اللہ صلعم کے سامنے بھی دجال ہوتا تو آپ اس پر بذریعہ دلائل اتمام حجت کرتے۔ تو کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم تو اس سے دلائل سے بحث کریں اور حضرت عیسیٰ بحث

کا نام نہ لیں بلکہ اسے قتل کر دیں۔ اگر فی الواقع دجال قابل قتل تھا تو اگر آنحضرت صلعم کے سامنے وہ نکلتا تو چاہیئے تھا کہ آپ بھی اُسے قتل کر دیتے یا کروا دیتے۔ اور اگر آپ اس کے قتل کرنے کا نام نہیں لیتے بلکہ اسے دلائل اور براہین سے مغلوب کرنے کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور آئندہ ہر مسلمان کو اسی امر کی تاکید فرماتے ہیں تو یہی کام مسیح موعود کا بھی ہونا چاہیئے۔ وہ آنحضرت صلعم سے تجاوز نہیں کر سکتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی کے دجال کو قتل کرنے سے وہی مراد ہے جو آنحضرت صلعم کے حجیج ہونے سے مراد ہے یعنی مراد اس سے یہی ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ سے مغلوب کریں گے یا اس کی شر سے لوگوں کو محفوظ کر دیں گے یا اس کی دعوت کا ابطال کر دینگے کیونکہ اس پر غلبہ یہی ہے کہ اس کی دعوت کو باطل کیا جائے اور اس کے شر سے لوگوں کو بچایا جائے لفظ قتل کے یہ معنے لغت عرب میں آتے ہیں۔ چنانچہ نہایہ میں جو لغت حدیث کی کتاب ہے لکھا ہے کہ حدیث ثقیفہ میں قتل اللہ سعدا کے معنے ہیں دفع اللہ شرہٗ اللہ تعالیٰ اس کے شر کو دور کرے۔ اور رجال دو خلیفوں کی بیعت کے ذکر میں ہے۔ فاقتلوا الاٰخر۔ وہاں اسکے یہی معنے کئے گئے ہیں کہ ابطلوا دعوتہ کہ اسکی دعوت کو باطل کر دو۔ پس جب لفظ قتل دیگر احادیث میں ابطال دعوت یا دفع شر کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور قتل دجال سے مراد سچ مچ ساری عیسائی اقوام کا قتل نہیں تو لازماً اس سے مراد وہی دوسرے معنے لئے جائیں گے جن میں یہ لفظ حدیث میں استعمال ہوا ہے اور جس کو اہل لغت نے تسلیم کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جب آنحضرت صلعم نے اپنی نسبت یہ فرمادیا کہ اگر آپ خروج دجال کے وقت زندہ ہوں تو آپ اسے بذریعہ دلائل مغلوب کرینگے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ زندہ نہ ہوں تو ہر مسلمان اپنی طرف سے یہی کام کرے تو پھر حضرت عیسٰی کے قتل دجال سے کوئی اور معنے مراد لینا احادیث کی صراحت کے خلاف ہے! اور قرآن کریم بھی مذہبی رنگ میں کسی کو قتل اور ہلاک کرنا اسی بات کو قرار دیتا ہے۔ کہ وہ دلائل و براہین سے ہلاک ہو۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ لیھلک من ھلک عن بینۃ و یحییٰ من حیّ عن بینۃ (الانفال) تاکہ جو شخص ہلاک ہو وہ دلیل اور برہان کے ذریعہ ہلاک ہو۔ اور جو زندہ ہو وہ دلائل اور براہین سے زندہ ہو یعنی کوئی مذہب اور دعوت تلوار سے ہلاک نہیں ہو سکتی بلکہ دلیل اور برہان سے ہلاک ہوا کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ بعض سیاست کے دلدادہ لوگوں کے سامنے اگر کسی مذہب کے دلائل اور براہین سے غالب آنے کا نام لیا جائے تو اس بات کو وہ بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گویا آج دجال کی مادیت کا اثر خود ان لوگوں پر اس قدر ہے کہ اگر دجال پر بذریعہ دلائل غلبہ کا نام لیا جائے تو وہ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ منہ کی باتوں سے بھی کبھی کوئی غلبہ دنیا میں حاصل ہوا ہے؟

لیکن اگر وہ مسلمان ہیں تو ان کے دلوں میں رسول اللہ صلعم کے ان الفاظ کی عزت ہونی چاہئے کہ ان یخرج وانا فیکم فانا حجیجہ آپ خود بھی اگر زندہ ہوتے تو دجال کو بذریعہ دلائل ہی مغلوب کرتے۔ خود قرآن کریم کے مذکورہ بالا ارشاد کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کسی مذہبی اور اعتقادی فتنہ کی ہلاکت دلائل سے ہی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کسی دوسرے کے لئے ہم قتل دجال سے اور کچھ مراد نہیں لے سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض وقت انبیا یا مصلحین کو سیاست بھی عطا فرماتا ہے مگر سیاست نبوت کے ساتھ لازم نہیں۔ کثیر تعداد نبیوں کی ایسی ہی دنیا میں گزری ہے جن کے ساتھ کوئی سیاست نہ تھی۔ اور مذہبی فتنوں کی اصلاح سیاست سے نہیں دلائل سے ہی ہوا کرتی ہے خود رسول اللہ صلعم کو تو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی عطا فرمائی تھی لیکن آپ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اگر میری زندگی میں دجال کا ظہور ہو تو میں اُسے بذریعہ دلائل مغلوب کرونگا اور حضرت مسیح کے متعلق تو بائیبل اور تاریخ اور خود قرآن کریم کی شہادت موجود ہے کہ آپ کو نبوت کے ساتھ سیاست یا بادشاہت نہیں دی گئی تھی اور پہلے نزول میں آپ نے جو کچھ کیا دلائل اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے ہی کیا تو دوسرے نزول میں یعنی ان کے مثیل میں سیاست اور بادشاہت کو کیوں لازم گردانا جاتا ہے۔ یہ ایک صداقت ہے کہ دلائل اور براہین اپنی جگہ قوت رکھتے ہیں جو دلوں کو فتح کرتے ہیں اور ان کی قوت مادی طاقتوں پر ہی غالب آجاتی ہے۔ اسلام بھی جب غالب آیا تو اپنی رُوحانی قوت اور اپنی حقانیت کے دلائل و براہین سے ہی غالب آیا۔ اسلام کے غالب آنے کے لئے کسی تلوار کی ضرورت نہ تھی۔ تلوار کی ضرورت مسلمانوں کو فقط اپنی حفاظت کے لئے پیش آئی جب انہیں نیست و نابود کرنے کے لئے تلوار اُٹھائی گئی۔

کیونکر حضرت مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود کو دجال پر غلبہ حاصل ہوا

حضرت اقدس مرزا صاحب نے جو کچھ کیا اس کو عام مولویانہ بحثوں کی طرح ایک بحث سمجھنا واقعات کو نظر انداز کرنا ہے۔ جو کچھ آپ سے پیشتر علما کرتے تھے اور جو کچھ آپ نے کیا ان دونو کا نام اگر کوئی چاہے تو بحث یا مناظرہ رکھ لے مگر ان دونو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ علماء کی عام ذہنیت حضرت مرزا صاحب کے ظہور سے پیشتر اس حد تک تھی کہ خفیف سے خفیف باتوں اور فروعی جھگڑوں پر ان کی ساری قوت صرف ہوتی تھی۔ اور اعدائے اسلام کے مقابلہ کا وہ نام بھی نہ جانتے تھے الا ماشاء اللہ۔ کوئی دو چار مستثنیات ہوں تو وہ الگ بات ہے۔ اور بات بھی موٹی ہے کہ جس قوم کی قوت باہمی جھگڑوں پر برباد ہوگی وہ دشمن کا مقابلہ کیا کرے گی۔ حضرت مرزا صاحب کی نظر ان جھگڑوں سے بہت

بلند تھی۔ وہ فروعی اختلافات کی پرواتک بھی نہ کرتے تھے۔ بلکہ اپنے ہوش کے زمانہ سے آپ کو ایک ہی جنون تھا اور وہ جنون اعدائے اسلام کے مقابلہ کا تھا۔ اس لئے آپ نے اپنی ساری قوت اسی کام پر لگائی کہ اعدائے اسلام کا مقابلہ کیا جائے خواہ وہ عیسائی پادری ہوں یا اُن کے نقش قدم پر چلنے والے آریہ سماجی ہوں خواہ کوئی اور ہوں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے بڑھ کر مقابلہ آپ کے مدنظر عیسائی مذہب کا تھا۔ اور اسی کام پر بالخصوص آپ نے اپنی جماعت کو لگایا۔ آج بھی لوگ اس کی وجہ دریافت کرتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب کی جماعت کا زیادہ رُخ یورپ میں تبلیغ اسلام پر کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دجال کا مقابلہ یا کسر صلیب آپ کا سب سے بڑا کام تھا۔ آپ نے اپنی تحریروں میں بار بار ذکر فرمایا اور آپ کے دل کی تڑپ یہ تھی کہ یورپ میں تبلیغ اسلام ہو کیونکہ یہی دجّال پر اصل غلبہ ہے۔ اور دجال کی دجالیت کو قتل کرنے کا یہی سامان ہے۔ آپ کو یقین تھا کہ قرآن کریم کے تراجم اور اسلامی لٹریچر اگر آپ کے یا آپ کے شاگردوں کے ذریعہ یورپ میں پہنچا دیا گیا تو آفتاب اسلام کی ضیا پاشی اور قرآن کریم کے دلائل و اصول کے اثر سے یہ دجال پانی میں نمک کی طرح پگھل جائے گا۔ عیسائی مذہب پر اتمام حجّت کے لئے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص ہتھیار دیئے گئے تھے۔ ان میں بالخصوص قابل ذکر وفات مسیح کا ہتھیار ہے جس سے عیسائیت کا بت پاش پاش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عیسائیت کا سارا دارومدار ہی اس بات پر ہے کہ حضرت مسیح زندہ آسمان پر ہیں آپ نے اس کی بجائے زمین پر ان کی قبر کا پتہ بتایا۔

اس وسوسہ کا جواب کہ کیوں نہ آپ کی زندگی میں ہی دجال ایسا مغلوب ہو گیا کہ وہ دنیا کو بہکانے کا کام چھوڑ دیتا یہ ہے کہ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دنیا کی مذہبی اصلاح کے کام ایک دن میں نہیں ہؤا کرتے۔ یوں تو یہ آیت حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور آپ ہی کے بارے میں تھی کہ ھو الّذی ارسل رسولہٗ بالھدٰی ودین الحق لیظھرہٗ علی الدّین کلّہ۔ کہ اسی خدا نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے۔ لیکن یہ غلبہ کہ تمام دنیا کے مذاہب پر اسلام غالب آجائے کیا رسول اللہ صلعم کی زندگی میں اپنے کمال کو پہنچ گیا؟ نہیں۔ بلکہ اس کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اور ساڑھے تیرہ سو سال میں برابر اسی غلبہ کا نظارہ ہمیں نظر آرہا ہے۔ آپ کی زندگی میں عرب کا کثیر حصّہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ پھر آپ کے بعد جس جس ملک میں

اسلام یا مسلمان جاتے ہیں وہاں کے مذاہب اور قوموں سے برابر خراج وصول کرتے ہیں یعنی ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ایشیا اور افریقہ تک محدود رہتا ہے۔ یورپ میں اسلام جاتا تو ہے لیکن چونکہ یہ دجال سے مقابلہ تھا اور اس کی بنیاد مسیح موعود کے ہاتھ سے رکھی جانی مقدر تھی۔ اس لئے یورپ میں اسلام کو وہ تبلیغی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جو ایشیا اور افریقہ میں ہوئی۔

حضرت مسیح موعودؑ کی دجال کے مقابلہ میں کامیابی

حضرت مسیح موعود مرزا غلام احمد قادیانی کی کامیابی دجال کے مقابلہ میں کئی رنگ میں ہے:۔

(۱) سب سے پہلے دجال کا جو فتنہ مشرقی و مغربی ممالک ہر دو جگہ میں اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا رہا تھا۔ وہ آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات پر طرح طرح کے بہتانات تراشنا اور آپ کو بدترین الفاظ سے یاد کرنا تھا۔ اس کا سدباب اگر کیا تو وہ حضرت مسیح موعود نے ہی کیا۔ نہ صرف یہ کہ ان بہتانات کی اصل حقیقت کو طشت ازبام کرکے جھوٹوں کو ان کے گھر تک پہنچا دیا بلکہ جب عیسائی آنحضرت صلعم کو نعوذ باللہ بُرا کہنے میں حد سے گزر گئے تو آپ نے غیرت ایمانی سے مجبور ہو کر عیسائیوں کے سامنے یسوع مسیح کی اس تصویر کو پیش کیا جو ان کی اناجیل اور اپنی کتابوں میں دکھائی گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں کو سمجھ آگئی کہ مسلمانوں کو ان کے ایسے کلمات سے جو وہ آنحضرت صلعم کی شان میں لکھتے اور بولتے ہیں کس قدر رنج پہنچتا ہے اور انہوں نے اپنا طریق عمل بہت حد تک تبدیل کر لیا۔

(۲) پھر ایک اور رنگ میں عیسائیت کے فتنہ کا سدباب اس طرح پر ہوا کہ وہ لٹریچر جو حضرت مسیح موعود نے اور آپ کے متبعین نے پیدا کیا اور جس میں اسلام یا آنحضرت صلعم کی صحیح تصویر دکھائی گئی ہے یا جس میں عیسائیت کے اصول باعلانی تردید کی گئی ہے۔ وہ جسقدر پھیل رہا ہے اسی قدر مسلمان عیسائیت یا دجالیت کے اثر سے محفوظ ہو رہے ہیں اور یقیناً مسلمانوں میں عیسائیت کی ترقی کی رفتار جو آج سے چالیس سال پیشتر تھی دسویں حصہ سے بھی کم رہ گئی ہے۔ یہ لٹریچر ہندوستان اور ا یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر مختلف ممالک میں پھیل رہا ہے۔

(۳) ان سب سے بڑھ کر بات جس نے دجالیت کے فتنہ کو روکا ہے وہ مرکز دجال یعنی یورپ

کے اندر تبلیغ اسلام کے مرکز قائم کرنا اور یورپین زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم اور اسلامی لٹریچر کا پھیلانا ہے۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں کہ وہ دجال جو مغرب سے نکل کر مشرق میں فتنہ پیدا کرنے آیا تھا اس کے گھر میں جا کر اسلام کا جھنڈا نصب کر دیا گیا۔ اور سینکڑوں نہیں ہزاروں تک ان لوگوں کی تعداد پہنچ چکی ہے جو علی الاعلان مسلمان ہو گئے ہیں اور باقی کے خیالات بھی اسلام کے متعلق پلٹا کھا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ خواجہ کمال الدین مرحوم نے انگلستان میں اہل علم انگریزوں کے ایک بہت بڑے مجمع میں اسلام پر لیکچر دیا۔ تو لیکچر کے اختتام پر پریذیڈنٹ نے جو ایک بڑا فاضل انگریز تھا کہا کہ "جو مذہب خواجہ صاحب نے بیان کیا ہے یہ وہی مذہب ہے جو میرے دل میں ہے" اس پر سامعین میں سے ایک انگریز نے اٹھ کر کہا کہ "صرف آپ کے ہی دل کا مذہب نہیں بلکہ اس مجمع میں ہم میں سے کون ہے جس کے دل کا یہ مذہب نہیں" وہ جو آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ آخر زمانہ میں آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا اسی امر کی طرف اشارہ تھا۔ اس سے مراد صداقت اسلام کا ہی آفتاب تھا جس نے پہلے مشرق کو روشن کیا اور اب مغرب میں پہنچ رہا ہے گویا وہاں سے طلوع ہو کر از سر نو دنیا کو روشن کرے گا۔

الغرض حضرت مسیح موعودؑ مرزا صاحب کے اس کام کو حقارت کی نظر سے دیکھنا سخت غلطی ہے یہ ایک بیج ہے جو آپ نے ڈالا ہے اور ایسے مصلحین کا کام بیج ڈالنا ہی ہوتا ہے جو ان کے پیچھے نشو ونما پاتا رہتا ہے۔ اس بیج کی ترقی کے آثار اس سے ظاہر ہیں کہ یورپ کے بہترین دماغ آج خود بخود اسلامی اصولوں کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ اور جو اصول دنیوی ترقی کے یورپ نے لئے ہیں وہ بھی فی الحقیقت اسلام سے ہی لئے ہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ باقی ہر قسم کی باتوں کا تجربہ کر کے آخر کار یورپ کو سمجھ آ جائے کہ اسلام میں ہی اس کی نجات ہے۔ اس امر کو حضرت اقدس مرزا صاحب آج سے قریباً چالیس برس پیشتر کس صفائی سے بطور پیشگوئی نظم فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

آسماں پر دعوت حق کیلئے اک جوش ہے
ہو رہا ہے نیک طبعوں پر فرشتوں کا اُتار

آ رہا ہے اس طرف احرار یورپ کا مزاج
نبض پھر چلنے لگی مُردوں کی ناگہ زندہ وار

کہتے ہیں تثلیث کو اب اہل دانش الوداع
پھر ہوئے ہیں چشمۂ توحید پر از جاں نثار

باغ میں ملت کے ہے کوئی گل رعنا کھلا
آئی ہے باد صبا گلزار سے مستانہ وار

آ رہی ہے اب تو خوشبو میرے یوسف کی مجھے
گو کہو دیوانہ میں کرتا ہوں اُس کا انتظار

یہاں آپ نے اسلام کی ترقی کو اپنا یوسف قرار دیا ہے جس کیلئے آپ حضرت یعقوب کی طرح بیقرار تھے۔ پس آج اس مقصدِ عظیم کو حاصل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس امام وقت کے جھنڈے کے نیچے جسے خدا نے اس زمانہ میں اسلام کا پیغام مغربی ممالک میں پہنچانے کے لئے کھڑا کیا ہے۔ مسلمان قوم اپنی متحدہ طاقت سے اس کام کو اپنا سب سے پہلا نصب العین قرار دے کر اس پر اپنی پوری قوت صرف کرے۔

(۱۸) مسیح موعود کی آمد کی پیشگوئی کا پورا ہونا۔

مذکورہ بالا تمام پیشگوئیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں ان کے ساتھ ساتھ بالالتزام مسیح کی آمد کا ذکر ہے اور اس قدر تواتر سے ہے کہ اس کی طرف سے اعراض کرنا تواتر کا انکار ٹھیر جاتا ہے۔ اور اس کا ماننا اس لئے بھی لازم آجاتا ہے کہ اس کے ساتھ کی پیشگوئیاں کثیر تعداد میں اس زمانہ میں نہایت صفائی سے پوری ہو کر اپنی صداقت پر واقعات کی مہر لگا گئیں اور واقعات سے انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قرآن کریم سے ثابت ہے اور یہ بھی آیات محکمات سے ثابت ہے کہ مر کر کوئی اس دنیا میں واپس نہیں آتا۔ تو ظاہر ہے کہ پھر وہ مسیح ابن مریم تو نہیں آسکتے جو انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے اور اپنی طبعی موت سے مر چکے۔ اور ویسے بھی ختم نبوت کسی نبی کے آنے سے مانع ہے۔ پس حضرت اقدس مرزا صاحب نے ان سب باتوں کی طرف توجہ دلا کر اس مشکل کو یوں حل فرمایا کہ حدیث مجدد انّ اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علیٰ راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا کہ اس اُمت میں اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر ایک شخص کو مبعوث فرماتا رہے گا جو دین کی تجدید کرتا رہے گا کے ماتحت اس اُمت میں جو بھی آئے گا وہ مجدد آئے گا اور ایک مجدد کو عیسیٰ ابن مریم سے مماثلت کی وجہ سے ابن مریم کا نام بطور مجاز کے دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مثیل پر اصل کا نام بطور مجاز و استعارہ کے بولنا مسلّم ہے۔ اور اس خیال کی تائید و تصدیق بخاری کی اس متفق علیہ حدیث سے بالصراحت ہوتی ہے کہ کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم۔ یعنی تمہیں کس قدر تعجب ہوگا جب ابن مریم تم میں نازل ہوگا اور وہ تمہارا امام ہوگا اور تمہیں میں سے ایک ہوگا۔ یہاں صاف طور پر فرمایا کہ اے امتی لوگو تمہیں کس قدر تعجب ہوگا جب ابن مریم تم میں مبعوث ہوگا اور وہ تمہیں میں سے ایک ہوگا یعنی وہ ایک امتی شخص ہوگا اور تمہارا امام ہوگا۔ گویا امت میں سے ہی ایک مجدد پر ابن مریم کا لفظ بطور مجاز بولا گیا ہے۔ نہ کہ کوئی باہر سے یا آسمان سے آئے گا۔ یہاں نزول

کے لفظ سے دعوےٰ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نزول کا لفظ بہت وسیع المعانی ہے۔ قرآن شریف میں آتا ہے انزلنا الانعام کہ ہم نے چار پائے نازل کئے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پیدا کئے اس کے یہ معنے نہیں کہ آسمان سے اتارے۔ اسی طرح قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے قد انزلنا الیکم ذکرا رسولاً کہ ہم نے تمہاری طرف نازل کیا نصیحت کرنے والا رسول۔ یہاں سب مفسرین کو مسلّم ہے کہ انزلنا کے معنے بعثنا ہے یعنی ہم نے مبعوث کیا کوئی یہ نہیں مانتا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان سے نازل ہوئے تھے پس یہاں بھی ابن مریم کے لئے نزول کا لفظ بعثت کے معنوں میں ہے۔

پس ظاہر ہے کہ ان احادیث میں جن میں ابن مریم کے آنے کا ذکر ہے یہ نام بعض خاص وجوہات سے اسی اُمت کے ایک مجدد کو دیا گیا جس کا اس آخری زمانہ میں عیسائی اقوام میں تبلیغ اسلام کیلئے آنا مقدر تھا۔ اسی کی طرف حضرت مرزا صاحب نے اس شعر میں اشارہ فرمایا ہے کہ ؎

چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند + مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند

حضرت مرزا صاحب نے اپنے مثیل مسیح یا مجازی طور پر ابن مریم ہونے پر نہایت کثرت سے دلائل دیئے ہیں اور اپنی تائید میں نشانات آسمانی پیش کئے ہیں جو آپ کی کتب میں درج ہیں ان میں سے کچھ میں مجدد اعظم حصہ اول میں درج بھی کر چکا ہوں۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اگر زیادہ تفصیل دیکھنی منظور ہو تو حضرت اقدس مرزا صاحب کی کتب ملاحظہ ہوں۔ مجھے یہاں بتانا تو یہ ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے مسیح موعود کی حیثیت سے مبعوث ہونے سے اس تمام نقشہ کی تکمیل ہو گئی جو حضرت محمد رسول اللہ صلعم نے اس آخری زمانہ کا کھینچا تھا۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فقط اسلام کے ہی بارے میں نہیں بلکہ کل دنیا پر آنے والے واقعات کا نظارہ تیرہ سو سال پیشتر دکھایا گیا۔ اور آپ نے ان تمام واقعات کو بطور پیشگوئی بیان فرما دیا جو احادیث میں موجود ہیں۔ اسی طرح مسیح موعود کا ظہور بھی انہی آنے والے واقعات کی ایک کڑی ہے۔ جس طرح وہ سب باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر گواہ کا کام دیتی ہیں۔ مسیح موعود کا ظہور بھی آنحضرت صلعم کی صداقت پر ایک گواہ کا کام دیتا ہے۔ یہ تمام واقعات جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں مسیح موعود کے ظہور کے ساتھ وابستہ تھے اور مسیح موعود کا ظہور ان سے وابستہ تھا۔ جس طرح یہ ناممکن تھا کہ مسیح موعود آجاتا اور باقی واقعات ظہور میں نہ آئے ہوتے اسی طرح یہ ناممکن ہے کہ وہ سب واقعات تو ظہور پذیر ہو جائیں اور مسیح موعود نہ آئے۔ بر طبق کشوف نبوی یہ دونو باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ ہاں اگر وہ چار واقعات ان میں سے

ظاہر ہوئے ہوتے اور کثیر حصہ کے متعلق ابھی حالت انتظار ہوتی تو پھر بیشک مسیح موعود کے ظہور کو بھی حالت انتظار میں رکھا جا سکتا تھا مگر وہ تمام کے تمام واقعات تو ظاہر ہو جائیں اور ان سب کے لئے جو امر بمنزلہ رُوح کے ہے یعنی مسیح موعود کا ظہور (کیونکہ بربنائے صراحت حدیث اس کے ظہور سے دین اسلام کا غلبہ دوسرے ادیان پر وابستہ ہے اور اسلام کی ان تمام مشکلات کا وہ ایک ہی علاج ہے) وہ معرض وقوع میں نہ آئے اسے عقل انسانی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اگر یاجوج ماجوج اپنی پوری قوت کے ساتھ ساری دنیا پر مسلط ہو چکے ہیں۔ ساری دنیا کی دولت اور طاقت ان کے قبضہ میں آچکی ہے۔ اگر دجّال مخلوق خدا کو گمراہی کے گڑھے میں دھڑا دھڑ گرا رہا ہے۔ اگر مسلمانوں میں سے علم قرآن اُٹھ چکا ہے۔ اگر وہ باہم جھگڑوں اور فروعی اختلافات میں پڑ کر ایک دوسرے کی تکفیر اور ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہیں۔ اگر ان کے علما لفظ پرستی میں پڑ کر حقیقت سے غافل ہو رہے ہیں۔ اگر ایمان ثریا پر اُٹھ چکا ہے۔ اگر وہ تمام نشانات ارضی و سماوی پورے ہو چکے ہیں جن کا ذکر میں اُوپر کر آیا ہوں۔ اگر مصائب کا پورا ہجوم اسلام پر ہو چکا ہے تو کیا یہ خدائے حکیم کا کام ہو سکتا ہے کہ مصائب تو سب کے سب آجائیں اور جو کچھ ان مصائب کا علاج بتایا تھا اس کو وہ روک رکھے؟ یہ ناممکن ہے۔ بلکہ اگر ذرا بھی غور سے دیکھا جائے تو مسیح موعود کا ظہور ان جملہ امور سے زیادہ صاف اور واضح ہے۔ کیونکہ اس بات کو بتانے والا کہ یہ واقعات جو دنیا میں ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہو رہے ہیں آنحضرت صلعم کے کشوف کی تعبیر اور آپ کی پیشگوئیوں کو پُورا کرنے والے ہیں۔ خود مسیح موعود ہی ہے۔ یہ کس قدر عجیب ہے کہ ان تمام واقعات پر باوجودیکہ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھے اور ہم ان کو دیکھ رہے تھے ان تمام احادیث پر جن میں ان واقعات کا ذکر برنگ پیشگوئی تھا حالانکہ ہم دن رات ان کو پڑھتے رہتے تھے ایک تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ نہ دنیا کے دوربینوں کی نگاہیں وہاں تک پہنچ سکیں۔ نہ علما کی نظر نے کچھ کام کیا۔ نہ سجّادہ نشینوں کی رُوحانی بصیرت اس پردہ کے اندر جا سکی۔ سب باتوں کو چھوڑ کر کیا یہی ایک دلیل حضرت مرزا صاحب کو مسیح موعود ثابت نہیں کرتی کہ آپ کی نگاہ تیز کے سامنے سب پردے پھٹ گئے۔ ساری تاریکیاں پاش پاش ہو گئیں اور آفتاب نصف النہار کی طرح رسول اللہ صلعم کی صداقت روشن ہو گئی۔ اگر حضرت مرزا صاحب نہ آئے ہوتے تو یہ تمام باتیں اب بھی اسی طرح تاریکی کے پردے میں ہوتیں۔ اس پردے کو اٹھا دینے سے آنحضرت صلعم کی تمام پیشگوئیاں جو آخری زمانہ کے متعلق تھیں پُوری ہوتی ہوئی صاف نظر آگئیں جن سے ایک مسلمان کے ایمان میں

جان پڑجاتی ہے اور مرتی ہوئی اُمیدوں میں نئی زندگی آجاتی ہے۔ اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لئے قلوب میں ایک زبردست اُمنگ پیدا ہوجاتی ہے۔ جو لوگ حضرت مرزا صاحب کی مخالفت کرتے ہوئے تعصب سے دل کو یوں سمجھا لیتے ہیں کہ یہ پیشگوئیاں محض رطب و یابس ہیں جو قابل توجہ نہیں وہ تواتر کا انکار کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح احادیث سے امان اُٹھ جائے گا اور مذہب اسلام کا ایک بڑا حصّہ مفلوج ہوکر رہ جائے گا۔ وہ احادیث کے ایک بڑے مجموعہ کو جن میں نہایت اعلیٰ پایہ کی صحیح احادیث بھی ہیں محض ضد سے دریا بُرد کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان احادیث کا درست ہونا نہ صرف تواتر سے ثابت ہے بلکہ اس زمانہ میں وہ سب پیشگوئیاں وقوع میں آکر اپنی صداقت پر مہر لگاچکی ہیں جیسا کہ مَیں اُوپر دکھاچکا ہوں۔ واقعات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو رد کرنا ایک حقیقت کو رد کرنا ہے۔ ان کو رد کرنا ان تمام نشانات آسمانی کو رد کرنا ہے جن سے آج اسلام کی تائید ہوتی ہے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کے منجانب اللہ مخبر صادق ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ جن سے اسلام کی صداقت پر ایمان تازہ ہوکر ایک مسلمان کے قلب کے اندر خدا اور رسولؐ کی اطاعت اور اشاعت اسلام کے لئے قربانی و ایثار کا جذبہ اور رُوح پیدا ہوتی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ مسلمانوں کی قوت عملی اور جذبۂ ایثار کی کمزوری اس ایمانی کمزوری کا نتیجہ ہے جو زمانۂ نبوی سے دُوری کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے اور آیت قرآنی فطال علیھم الامد فقست قلوبھم کے مطابق مدت دراز گزر جانے کی وجہ سے دلوں کی زمین سخت ہوگئی ہے۔ اگر اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور تیرہ سو برس قبل کے عربوں تک کیلئے اس کی زندگی محدود نہ تھی بلکہ اس کی فیض روحانیت کا دامن قیامت تک دراز ہے تو آنحضرت صلعم کی رسالت کی تصدیق اور آپ کے لائے ہوئے مذہب کی تائید کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مادہ پرستی کے زمانہ میں بھی تازہ بتازہ نشانات آسمانی کی بارش نازل ہوکر مسلمانوں کے مردہ ایمانوں میں زندگی کی رُوح پیدا کرنے اور قلوب کی سخت زمین کو نرم کرنے۔ یہ اس زمانہ کی مادہ پرستی اور دہریت یا دوسرے لفظوں میں دجالیت کا اثر ہے کہ تعصب کا پردہ آنکھوں پر ڈال کر یا مغربی مادی تعلیم سے متأثر ہوکر انسان صریح نشانات سماوی اور ان تمام پیشگوئیوں کے پورا ہونے سے انکار کرنے جو آنحضرت صلعم کی رسالت کی تائید و تصدیق میں ظاہر ہورہے ہیں۔ غیر مسلم قوموں کا انکار تو غالباً اس وجہ سے ہے کہ ان کے سامنے یہ تمام باتیں پیش نہیں کی گئیں ورنہ بالکل اغلب ہے کہ ان میں سے بہت سی ایسی سعید روحیں ہوں

جو ان صداقتوں کو معلوم کرنے کے بعد حق کو انشراح صدر سے قبول کرلیں۔ جیسا کہ آجکل ہمارے مبلغین کا تجربہ ہے جو انگلستان اور جرمنی میں اشاعت اسلام کرنے کیلئے جاچکے ہیں۔ وہاں کثرت سے لوگ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر مذہب میں صداقت ہے اور تعلق باللہ ایک حقیقت الامر ہے تو کوئی ایسا شخص بھی تم میں ہے جو اس معاملہ میں صاحب تجربہ و مشاہدہ ہو۔ کیونکہ کسی چیز پر ہزار دلائل دو مگر وہ یقین اور عرفان نہیں پیدا ہو سکتا جو مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ آج غیر اس مشاہدہ اور تجربہ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور مذہبی صداقتوں کا اسے معیار سمجھتے ہیں مگر ہمارے مسلمان مادیت اور دجالیت سے اسقدر مرعوب ہیں اور ان میں احساس کمتری اس درجہ پیدا ہو چکا ہے کہ ان کے سامنے اگر ان پیشگوئیوں کا ذکر کردیا جائے جو آج سے تیرہ سو سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلیں اور آج نہایت صفائی سے پوری ہو کر مذہب کی تائید اور آپ کی صداقت پر بطور نشان کے ظاہر ہوئی ہیں یا یہ ذکر کردیا جائے کہ آج بھی قرآن اور سنت رسول اللہ صلعم کی پیروی سے انسان زندہ خدا سے تعلق پیدا کرسکتا ہے اور خدا اپنے بندوں کی سنتا ہے اور انہیں جواب دیتا اور اپنے مکالمات اور اخبار غیبیہ سے ان کو مشرف فرماتا ہے تو مادیت سے مرعوب شدہ مسلمانوں پر یہ باتیں گراں گزرتی ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی باتیں عقلمندوں کی مجلس میں ایک مذاق اور دل لگی کا موجب ہیں حالانکہ وہ شخص جو مشاہدہ اور تجربہ کی طرف توجہ نہیں کرتا وہ جاہل ہے عقلمند نہیں۔ وہ کبر نفس میں گرفتار ہے اور قلب سلیم نہیں رکھتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ایسے مسلمان گزشتہ انبیاء اور اولیا کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں۔ آج وہ بزرگ موجود ہوتے تو یہ ان کی تصدیق کرتے یا تکذیب؟ خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں لیکن گزشتہ نبیوں پر ان کا ایمان آخر کن دلائل پر مبنی ہے۔ کیا محض فلسفی دلائل کوئی تسلی بخش ایمان اور یقین پیدا کرسکتے ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ ان کے بزرگوں نے گزشتہ انبیاء اور اولیاء امت کو علاوہ دلائل کے اُن نشانات آسمانی اور تائیدات الٰہیہ کی بنا پر مانا تھا جو ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہوئے۔ تو آج دلائل فلسفہ کے ساتھ ساتھ نشانات آسمانی اور تائیدات الٰہیہ کو کیوں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحب اگر اسلام کی تائید میں محض دلائل فلسفیہ سے کام لیتے تو ٹھیک تھا۔ یہ الہامات اور نشانات سماویہ کا جھگڑا کیوں نکال مارا۔ حالانکہ حضرت مرزا صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ آپ نے زندہ خدا کا پتہ دیا۔ تعلق باللہ کو اپنے

تجربہ اور مشاہدہ سے ایک حقیقت ثابت کر کے دکھایا۔ اسی مادیت کے زمانہ میں اپنے رُوحانی تجربوں سے انسان کے اندر ایک زندہ ایمان پیدا کرنے کا سامان مہیا کیا۔ اور دوسرے مذاہب کی طرح جو بوجہ اپنی فیض رسانی کے معدوم ہو جانے کے مردہ ہو چکے ہیں۔ اسلام کو ایک مردہ مذہب کی حیثیت میں نہ رہنے دیا۔ بلکہ اسلام کو ایک زندہ مذہب اور اس کے پیش کردہ خدا کو ایک زندہ خدا اور اس کے نبی کو ایک زندہ نبی اور اس کی کتاب کو ایک زندہ کتاب اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ثابت کر کے اس معاملہ میں تمام دنیا کو چیلنج کیا کہ اگر تمہارے مذہبوں میں کوئی زندگی ہے تو میرے مقابل پر آؤ۔ اور اپنے مذاہب کی روحانی فیض رسانی کو تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر ثابت کرو۔ اور اس چیلنج کا بار بار ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا۔ ان میں سے بعض میں نقل بھی کر چکا ہوں۔ بطور نمونہ کے ایک یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ حضرت مرزا صاحب اپنی کتاب تریاق القلوب کے صفحہ ۵ و ۶ و ۷ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک وہ زمانہ تھا کہ انجیل کے واعظ بازاروں اور گلیوں اور کوچوں میں نہایت دریدہ دہنی سے اور سراسر افترا سے ہمارے سید و مولیٰ خاتم الانبیاء اور افضل الرسل والاصفیاء اور سید المعصومین والاتقیاء حضرت محبوب جناب احدیت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ قابل شرم جھوٹ بولا کرتے تھے کہ گویا آنجناب سے کوئی پیشگوئی یا معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ اور اب یہ زمانہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے علاوہ ان ہزارہا معجزات کے جو ہمارے سرور و مولیٰ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور پذیر ہوئے اور قرآن شریف اور احادیث میں اس کثرت سے مذکور ہیں جو اعلیٰ درجہ کے تواتر پر ہیں۔ تازہ بتازہ صدہا نشان ایسے ظاہر فرمائے ہیں کہ کسی مخالف اور منکر کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ ہم نہایت نرمی اور انکسار سے ہر ایک عیسائی صاحب اور دوسرے مخالفوں کو کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ در حقیقت یہ بات سچ ہو کہ ہر ایک مذہب جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو کر اپنی سچائی پر قائم ہوتا ہے اس کیلئے ضرور ہے کہ ہمیشہ اس میں ایسے انسان پیدا ہوتے رہیں کہ جو اپنے پیشوا اور ہادی اور رسول کے نائب ہو کر یہ ثابت کریں کہ وہ نبی اپنی روحانی برکات کے لحاظ سے زندہ ہے فوت نہیں ہوا۔ کیونکہ ضرور ہے کہ وہ نبی جس کی پیروی کی جاوے جس کو شفیع اور منجی سمجھا جائے وہ اپنے روحانی برکات کے لحاظ سے ہمیشہ زندہ ہو اور عزت اور رفعت اور جلال کے آسمان پر اپنے چمکتے ہوئے چہرہ کے ساتھ ایسا ابدی طور پر مقیم ہو اور خدائے ازلی ابدی حیّ و قیّوم ذوالاقتدار کے

دائیں طرف بیٹھنا اس کا ایسے پُر زور آلٰہی نوروں سے ثابت ہو کہ اس سے کامل محبت رکھنا اور اس کی کامل پیروی کرنا لازمی طور پر اس نتیجہ کو پیدا کرتا ہو کہ پیروی کرنیوالا رُوح القدس اور آسمانی برکات کا انعام پائے اور اپنے پیارے نبی کے نوروں سے نور حاصل کر کے اپنے زمانہ کی تاریکی کو دُور کرے اور مستعد لوگوں کو خدا کی ہستی پر وہ پختہ اور کامل اور درخشاں اور تاباں یقین بخشے جس سے گناہ کی تمام خواہشیں اور سفلی زندگی کے تمام جذبات جل جاتے ہیں۔ یہی ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ نبی زندہ اور آسمان پر ہے۔ سو ہم اپنے خدائے پاک ذوالجلال کا کیا کیا شکر کریں کہ اس نے اپنے پیارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پیروی کی توفیق دیکر اور پھر اس محبت اور پیروی کے رُوحانی فیضوں سے جو سچا تقویٰ اور سچے آسمانی نشان ہیں کامل حصہ عطا فرما کر ہم پر ثابت کر دیا کہ وہ ہمارا پیارا برگزیدہ نبی فوت نہیں ہوا بلکہ وہ بلند تر آسمان پر اپنے ملیک مقتدر کے دائیں طرف بزرگی اور جلال کے تخت پر بیٹھا ہے۔ اللّٰھم صلّ علیہ وبارک وسلّم۔ ان اللّٰہ وملٰئکتہ یصلّون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ اب ہمیں کوئی جواب دے کہ روئے زمین پر یہ زندگی کس نبی کے لئے بجز ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت ہے؟ کیا حضرت موسیٰ کے لئے؟ ہرگز نہیں۔ کیا حضرت داؤد کے لئے؟ ہرگز نہیں۔ کیا حضرت مسیح علیہ السلام کے لئے؟ ہرگز نہیں۔ کیا راجہ رام چندر یا راجہ کرشن کے لئے؟ ہرگز نہیں کیا وید کے ان رشیوں کے لئے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے دلوں پر وید کا پرکاش ہوا تھا؟ ہرگز نہیں۔ جسمانی زندگی کا ذکر بے سود ہے۔ اور حقیقی اور روحانی اور فیض رساں زندگی وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی زندگی کے مشابہ ہو کر نور اور یقین کے کرشمے نازل کرتی ہو ورنہ جسمانی وجود کے ساتھ ایک لمبی عمر پانا اگر فرض بھی کر لیں اور فرض کے طور پر مان بھی لیں کہ ایسی عمر کسی کو دی گئی ہے تو کچھ بھی جائے فخر نہیں۔ مصر کی بعض پرانی عمارتیں ہزارہا برس سے چلی آتی ہیں اور بابل کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں جن میں اُلّو بولتے ہیں۔ اور اس ملک میں اجودھیا اور بندرابن بھی پرانے زمانہ کی آبادیاں ہیں اور اٹلی اور یونان میں بھی ایسی قدیم عمارتیں پائی جاتی ہیں تو کیا اس جسمانی طور پر لمبی عمر پانے سے یہ تمام چیزیں اس جلال اور بزرگی سے حصہ لے سکتی ہیں جو روحانی زندگی کی وجہ سے خدا کے مقدس لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ ہو گیا ہے کہ اس روحانی زندگی کا ثبوت صرف

ہمارے نبی علیہ السّلام کی ذات بابرکات میں پایا جاتا ہے۔ خدا کی ہزاروں رحمتیں اس کے شامل حال رہیں۔ افسوس کہ عیسائیوں کو کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی روحانی زندگی ثابت کریں اور صرف اس لمبی عمر پر خوش ہوں جس میں اینٹ اور پتھر بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ بے سود ہے وہ زندگی جو نفع رساں نہیں۔ اور لاحاصل ہے وہ بقا جس میں فیض نہیں۔ دنیا میں صرف دو زندگیاں قابل تعریف ہیں (۱) ایک وہ زندگی جو خود خدائے حی و قیوم مبدأ فیض کی زندگی ہے (۲) دوسری وہ زندگی جو فیض بخش اور خدانما ہو۔ سو آؤ ہم دکھلاتے ہیں کہ وہ زندگی صرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے جس پر ہر ایک زمانہ میں آسمان گواہی دیتا رہا ہے اور اب بھی دیتا ہے۔ اور یاد رکھو کہ جس میں فیاضانہ زندگی نہیں وہ مردہ ہے نہ زندہ۔ اور مَیں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کا نام لیکر جھوٹ بولنا سخت بدذاتی ہے کہ خدا نے مجھے میرے بزرگ واجب الاطاعت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی دائمی زندگی اور پورے جلال اور کمال کا یہ ثبوت دیا ہے کہ مَیں نے اُس کی پیروی سے اور اس کی محبت سے آسمانی نشانوں کو اپنے اوپر اُترتے ہوئے اور دل کو یقین کے نور سے پُر ہوتے ہوئے پایا۔ اور اس قدر نشان غیبی دیکھے کہ اُن کھلے کھلے نوروں کے ذریعہ سے مَیں نے اپنے خدا کو دیکھ لیا ہے۔ خدا کے عظیم الشان نشان بارش کی طرح میرے پر اُتر رہے ہیں۔ اور غیب کی باتیں میرے پر کھل رہی ہیں۔ ہزارہا دعائیں اب تک قبول ہو چکی ہیں۔ اور تین ہزار سے زیادہ نشان ظاہر ہو چکا ہے۔ ہزارہا معزز اور متقی اور نیک بخت آدمی اور ہر قوم کے لوگ میرے نشانوں کے گواہ ہیں اور تم خود گواہ ہو۔ اور مجھے اس خدا کی قسم ہے جس نے مجھے بھیجا ہے کہ اگر کوئی سخت دل عیسائی یا ہندو یا آریہ میرے ان گزشتہ نشانوں سے جو روز روشن کی طرح نمایاں ہیں انکار بھی کرے اور مسلمان ہونے کے لئے کوئی نشان چاہے اور اس بارے میں بغیر کسی بیہودہ حجت بازی کے جس میں بدنیتی کی بُو پائی جائے سادہ طور پر یہ اقرار بذریعہ کسی اخبار کے شائع کرے کہ وہ کسی نشان کے دیکھنے سے گو کوئی نشان ہو لیکن انسانی طاقتوں سے باہر ہو اسلام کو قبول کرے گا تو مَیں امید رکھتا ہوں کہ ابھی ایک سال پورا نہ ہوگا کہ وہ نشان کو دیکھ لے گا کیونکہ مَیں اُس زندگی میں سے نور لیتا ہوں جو میرے نبی متبوع کو ملی ہے۔ کوئی نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ اب اگر عیسائیوں میں کوئی طالب حق ہے

یا ہندوؤں اور آریوں میں سے سچائی کا متلاشی ہے تو میدان میں نکلے اور اگر اپنے کو سچا سمجھتا ہے تو بالمقابل نشان دکھلانے کے لئے کھڑا ہو جائے لیکن میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ ہرگز ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ بدنیتی سے پیچ در پیچ شرطیں لگا کر بات کو ٹال دیں گے کیونکہ ان کا مذہب مردہ ہے اور کوئی ان کے لئے زندہ فیض رساں موجود نہیں جس سے وہ روحانی فیض پا سکیں۔ اور نشانوں کے ساتھ چمکتی ہوئی زندگی حاصل کر سکیں۔

اے تمام وہ لوگو جو زمین پر رہتے ہو! اور اے تمام وہ انسانی روحو جو مشرق اور مغرب میں آباد ہو! میں پورے زور کے ساتھ آپ کو اس طرف دعوت کرتا ہوں کہ اب زمین پر سچا مذہب صرف اسلام ہے۔ اور سچا خدا بھی وہی خدا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے اور ہمیشہ کی روحانی زندگی والا نبی اور جلال اور تقدس کے تخت پر بیٹھنے والا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کی روحانی زندگی اور پاک جلال کا ہمیں یہ ثبوت ملا ہے کہ اس کی پیروی اور محبت سے ہم روح القدس اور خدا کے مکالمہ اور آسمانی نشانوں کے انعام پاتے ہیں۔"

(۳) اب میں اُن نشانات آسمانی کو لیتا ہوں جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی طفیل حضرت مرزا صاحب کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ درحقیقت تو یہ بھی نشانات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہیں کیونکہ آپ کی اتباع کے طفیل اور آپ کے دین کی تائید کے لئے ظہور میں آئے۔ اور ان ثمرات اور انعامات الٰہیہ کو ظاہر کرتے ہیں جو آپ کی اتباع سے آپ کے متبعین کامل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ اور اسلام کے زندہ مذہب پر بطور گواہ دلالت کرتے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب نے تریاق القلوب میں اس چیلنج کے بعد جسے میں ابھی اُوپر نقل کر چکا ہوں متعدد نشانات سماوی جو آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے اسی کتاب تریاق القلوب میں تحریر فرمائے ہیں اور اسی طرح بہت سے نشانات اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں درج فرمائے ہیں۔ میں یہاں فقط آپ کی چند پولٹیکل پیشگوئیاں درج کرتا ہوں اس لئے کہ اس زمانہ میں سیاست سے خاص دلچسپی ہے۔ اور نشانات پڑھنا چاہیں تو حضرت اقدس کی کتب میں ملاحظہ فرماویں۔ اُمید ہے کہ طالبان حق ان نشانات کو سرسری طور پر نظر انداز نہ کر دیں گے۔ اور اس آیت کا مصداق نہ بنیں گے جس میں آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بلکہ ہر زمانہ میں نشان نمائی کے وقت اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی اس غفلت اور اعراض کا نقشہ کھینچا ہے اور وہ یہ ہے کاین من

"ایامن آیۃ فی السمٰوات والارض یمرّون علیھا وھم عنھا معرضون (یوسف) یعنی آسمانوں اور زمین میں کس قدر نشانات ظاہر ہو رہے ہیں مگر لوگ ان سے اعراض کرتے ہوئے یعنی منہ پھیرے ہوئے گزر جاتے ہیں اور توجہ نہیں کرتے۔

۱- پیشگوئی ۱۵ تقسیم بنگالہ کے متعلق پیشگوئی

ہندوستان کے وائسرائوں میں سے لارڈ کرزن کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہ مضبوط ارادہ اور زبردست پالیسی کا آدمی تھا۔ اس نے ہندوستان میں مختلف اصلاحات کی تھیں جن میں سے ایک تقسیم بنگالہ بھی تھی۔ اُس نے بنگالہ کو بہت وسیع صوبہ خیال کر کے یا کسی اَور مصلحت سے اکتوبر ۱۹۰۵ء میں اُسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا (۱) ایک مشرقی بنگال اور آسام جس کا صدر مقام ڈھاکہ قرار دیا گیا (۲) دوسرے مغربی بنگال جس میں بہار اور اُڑیسہ شامل تھے! اس کا صدر مقام حسب دستور کلکتہ رہا۔ اس تقسیم کو ہندو بنگالیوں نے بہت بُرا سمجھا کیونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کثرت سے تھی۔ اور اس تقسیم سے وہ ایک اسلامی صوبہ بن گیا۔ اور یہ ہندوؤں کو ناگوار تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے خلاف سخت ایجی ٹیشن کی۔ اخباروں میں دھواں دھار مضمون لکھے گئے۔ جلسوں میں آتش بار تقریریں کی گئیں۔ مظاہرے کئے گئے یہانتک کہ خفیہ طور پر بم بنائے گئے اور انگریزوں پر اور ٹرینوں پر پھینکے گئے۔ قتل و غارت اور بلوے کئے گئے۔ غرضکہ ہر طرح کے جائز و ناجائز طریقے مخالفت کے استعمال کئے گئے مگر گورنمنٹ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اور لارڈ کرزن کے آہنی ارادوں اور عزم میں ذرا بھی تو فرق نہیں آیا۔ اور ہندو بنگالیوں کی تمام سعی جائز و ناجائز اور دھمکیاں اور قتل و غارت سب بیکار چلی گئیں اور آخر سارا جوش و خروش سوڈا واٹر کے اُبال کی طرح بیٹھ کر رہ گیا۔ لارڈ کرزن ۱۹۰۵ء میں چلا گیا۔ اس کی جگہ لارڈ منٹو وائسرائے ہو کر آیا جو نہایت زیرک انسان تھا۔ اس زمانہ میں سر جان مارلے سکرٹری آف اسٹیٹ تھے جو نہایت بیدار مغز اور سیاست کے ماہر تھے۔ ان دو تو دانا حاکموں نے ہندوستان کی ترقی کے لئے بہت کچھ اصلاحات کیں لیکن تقسیم بنگالہ کے متعلق کچھ نہ کیا بلکہ اس حکم کو اور مضبوط کیا۔ اسی زمانہ میں جب تقسیم بنگالہ ایک مستقل اور مستحکم صورت اختیار کر چکی تھی اور اس کے مخالف مایوس ہو کر خاموش ہو چکے تھے۔ یکایک حضرت مرزا غلام احمد صاحب کو عالم الغیب خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا "بنگالہ کی نسبت جو حکم جاری کیا گیا تھا اب ان کی دلجوئی ہوگی"۔ اس وقت یہ الہام سن کر لوگوں کو تعجب ہوا کہ سب کچھ ہو چکا۔ نرمی و سختی سبھی کچھ ہو کر معاملہ ختم ہو چکا اب اس الہام کا کیا مطلب۔

وقت گزرتا گیا اور کسی قسم کی کوئی دلجوئی نظر نہ آئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں لارڈ منٹو چلا گیا اور لارڈ ہارڈنگ ویسرائے ہو کر آ گئے۔ اور سنہ ۱۹۱۱ء کے تاجپوشی کے جلسہ کی دہلی میں تیاریاں ہونے لگیں۔ لارڈ ہارڈنگ نے از خود ہی ایک تحریک سکرٹری آف اسٹیٹ کو کی جس میں تقسیم بنگالہ کے مسئلہ کو از سر نو اٹھا کر تحریر کیا۔ کہ بنگالیوں کی دلجوئی کے لئے ضروری ہے کہ تقسیم بنگالہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ اور اس کے اعلان کے لئے بہترین موقعہ دربار دہلی کا ہے۔ یہ امر طالب حق کے لئے کس قدر ازدیاد ایمان کا موجب ہو جاتا ہے کہ لارڈ ہارڈنگ ویسرائے ہند صاف اور صریح الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اہم تجویز جو ہمارے زیر نظر ہے اس کا ایک بھاری مقصد اہل بنگالہ کی دلجوئی ہے۔ یعنی اس تجویز سے وائسرائے ہند اس زخم پر مرہم لگانا چاہتے تھے جو تقسیم بنگالہ نے اہل بنگال کے دل پر لگا رکھا تھا۔ اور ان کے نزدیک دربار دہلی سے بہتر موقعہ اس دلجوئی کے لئے نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اصل عبارت انگریزی میں سے بھی امر متعلقہ کی نسبت چند فقرے نقل کر دیتا ہوں۔ وہو ہذا:-

"While its removal from Bengal is an essential feature of the scheme we have in view for allaying the ill feeling aroused by the partition of Bengal..... The Bengalis might not of course be favourably disposed to the proposal of it stood alone .... but as we hope presently to show they should be reconciled to the change by other features of our scheme which we specially design to give satisfaction to the Bengali sentiments."

خدا کی شان کوئی شہنشاہ انگلستان آج تک ہندوستان نہ آیا تھا۔ مگر جارج پنجم اور ان کی ملکہ چھ ہزار میل کی مسافت طے کر کے ہندوستان آتے ہیں اور دہلی میں ۱۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ایک بڑا شاہی دربار لگتا ہے۔ اور تمام راجاؤں اور نوابوں اور سرداروں اور اکابرین قوم اور افسران سول و ملٹری کے ہزارہا کے مجمع میں شہنشاہ ہند و انگلستان خدا کے منہ کی باتوں کو پورا کرتا ہے۔ اور تقسیم بنگالہ کے حکم کو منسوخ کر کے بنگالیوں کی دلجوئی کرتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب بیچاروں کو تو پالیٹکس کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ اور انہیں تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ تقسیم بنگالہ کے متعلق کیا ہوا اور کیا

ہو رہا ہے۔ یہ الہام ان کے لئے بھی ایک معمہ تھا۔ لوگ بھی سن کر اس کے ناممکن ہونے پر یقین کئے بیٹھے تھے۔ پھر اس الہام کے بعد چھ برس کا لمبا عرصہ گزر جاتا ہے اور بات رفت گزشت ہو جاتی ہے تقسیم بنگالہ ایک مستحکم حکم بن جاتا ہے کہ یکایک از خود لارڈ ہارڈنگ کی طرف سے یہ تحریک اُٹھتی ہے اور شہنشاہ انگلستان ہندوستان آکر تقسیم بنگالہ کے حکم کی منسوخی کا بھرے دربار میں اعلان کر کے بنگالیوں کی دلجوئی کرتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے وہ علم غیب جو کسی غور و فکر یا اٹکل بازی کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی جناب سے بذریعہ الہام کسی مقرب الٰہی بندہ کے قلب پر نزول فرماتا ہے۔ جس کے لئے کوئی اسباب ظاہری نظر نہیں آتے اور اہل دنیا اسے ناممکن سمجھ کر اس پر تمسخر کرتے ہیں۔ لیکن آخر وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا نے فرمایا تھا۔

۲۔ جاپان کی نسبت پیشگوئی

حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے زمانہ میں طاقتوں کا مرکز مغرب تھا۔ تمام بڑی بڑی سلطنتیں یورپ اور امریکہ میں تھیں جو تمام دنیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ اور جو پاورس (Powers) یعنی طاقتیں کہلاتی تھیں۔ ان میں خاص طور پر صوبجات متحدہ[۱] امریکہ۔ انگلستان[۲]۔ فرانس[۳]۔ جرمنی[۴] اٹلی[۵] اور روس[۶] طاقتوں کے نام سے موسوم تھے۔ جن کی قوت حکومت کے آگے مشرق و مغرب تھرا رہا تھا۔ جاپان مشرق میں ایک گمنام سی سلطنت تھی۔ چھوٹا سا ایک ملک جو چند جزیروں پر مشتمل تھا اور جزیرے بھی آتش فشاں۔ رات دن زلزلوں کا گھر۔ جاپان کے متصل ہی چین کا ملک تھا۔ تھا تو وسیع ملک مگر سلطنت نہایت کمزور تھی۔ نتیجہ یہ کہ تمام مغربی طاقتیں اس پر یوں آکے بیٹھی ہوئی تھیں جیسے لاشہ کو نوچنے کے لئے گدھ بیٹھے ہوں۔ انہی حالات کے ماتحت حضرت مرزا صاحب کو الہام ہوا "ایک مشرقی طاقت اور کوریا کی نازک حالت"۔ اس وقت مشرق میں کوئی طاقت نہ تھی۔ طاقت جس کا مترادف انگریزی زبان میں لفظ پاور (Power) ہے کسی ایسے ملک یا قوم پر بولا جاتا ہے کہ جس کی پولٹیکل اہمیت کو دنیا کی دوسری طاقتور قومیں تسلیم کر لیں پس مشرق میں کوئی سلطنت ایسی باقی نہ رہی تھی جس کی پولٹیکل اہمیت کو مغربی طاقتیں تسلیم کر لیں۔ گویا لفظ طاقت مشرق سے منتقل ہو کر مغرب کے حصہ میں چلا گیا تھا۔ اور حضرت مرزا صاحب کو غالباً یہ بھی پتہ نہ تھا کہ کوریا کس ملک کا نام ہے۔ فقط جغرافیہ دان جانتے ہیں کہ یہ ایک جزیرہ نما ہے جو جاپان کے عین سامنے ہے اور اس وقت سلطنت چین کے ماتحت تھا۔ روس کا اثر بڑھ رہا تھا اور وہ کوریا پر قبضہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کی سلطنت کے ساتھ لگتا تھا۔ جاپان اُس پر رُوس

کے قبضہ کو اپنی موت سمجھتا تھا۔ اس الہام کے عرصہ بعد آخر ۱۹۰۵ء میں جاپان اس کوریا کے بارے میں روس سے دست و گریبان ہو گیا۔ اور کوریا کے ملک میں جاپان اور روس کے درمیان ایک قیامت خیز جنگ ہوئی اور قتل و غارت سے کوریا کی حالت نہایت نازک ہو گئی۔ اس وقت سیاست دان لوگ روس اور جاپان کا مقابلہ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ دونوں میں کوئی نسبت نہ تھی۔ لیکن خدا کے علم غیب کو بندہ کا علم کہاں پہنچ سکتا ہے۔ آخر دنیا اس بات سے حیران رہ گئی کہ روس باوجود اپنے تمام ساز و سامان اور قوت و طاقت کے جاپان سے مار کھا گیا۔ اس کا مایۂ ناز بحر بالٹک کا جنگی بیڑہ جاپان کے سمندر میں غرق ہو گیا اور کوریا پر جاپان کا قبضہ ہو گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جاپان کو مغرب نے ایک مشرقی طاقت تسلیم کر لیا۔ اس کی دوستی کو اپنے لئے ضروری سمجھا اور وہ دن اور آج کا دن یہ مشرقی طاقت جس کی ابتدا کوریا کی نازک حالت سے ہوئی تھی بڑھتی ہی گئی۔ مانچوریا پر اس کا قبضہ ہوا۔ اور اب تو چین کے ایک بڑے حصہ پر ہے۔ سیام، انام، جاوا، سماٹرا، بورنیو، سیلبیز، فلپائن وغیرہ بحرالکاہل کے جزائر پر جاپان کے قابض ہو جانے سے اس مشرقی طاقت سے مغرب کی طاقتیں بھی خوفزدہ ہو چکی ہیں۔ اسے کہتے ہیں خدا کا علم غیب۔ مرزا صاحب بیچارے جاپان کی گمنام حکومت پر اپنی سمجھ سے مشرقی طاقت کا فتویٰ کہاں لگا سکتے تھے اور وہ کیا جان سکتے تھے کہ کوریا کی حالت نازک ہو کر اس مشرقی طاقت کی بنیاد رکھی جائیگی۔ انسان کی آنکھ اس زمانہ میں جاپان کی اس محیر العقول طاقت کو کہاں دیکھ سکتی تھی۔ یہ خدا ہی کا علم غیب تھا جس پر غور کر کے انسان کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔

۳۔ افغانستان کے متعلق پیشگوئیاں

حضرت اقدس مرزا صاحب کے زمانہ میں افغانستان کا والی امیر کابل کہلاتا تھا اور افغانستان کی سلطنت ریاست کابل کہلاتی تھی۔ امیر حبیب اللہ خاں اس وقت امیر کابل تھا۔ افغانستان کے علاقہ سے بھی بعض مسلمانوں نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی بیعت کی تھی۔ حضرت اقدس مرزا صاحب کو اس ملک کے متعلق الہام کے ذریعہ بہت پہلے ایک واقعہ کی بطور پیشگوئی خبر دی گئی تھی جو آپ نے براہین احمدیہ میں درج فرمائی تھی۔ وہ تھی وان لم یعصمک الناس یعصمک اللہ من عندہ..... شاتان تذبحان وکل من علیھا فان الخ یعنی اگرچہ لوگ تجھے قتل ہونے سے نہ بچائیں لیکن خدا تجھے بچائے گا...... اور دو بکریاں ذبح کی جائیں گی اور ہر ایک جو زمین پر ہے آخر فنا ہوگا"۔ یعنی میں تجھے تو ضرور لوگوں کے ہاتھ سے قتل ہونے سے بچاؤں گا مگر تیری جماعت میں سے دو بکریاں

ذبح کی جائیں گی۔ یہ خدا تعالیٰ کے الہامات کا ایک محاورہ ہے کہ بیگناہ اور معصوم کو بکرے یا بکری سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور کبھی گائے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس الہام کے بہت عرصہ بعد امیر عبدالرحمان خاں کے زمانہ میں ایک شخص عبدالرحمان افغانستان کے علاقہ سے قادیان آکر حضرت مرزا صاحب کی بیعت سے مشرف ہو کر واپس افغانستان گیا اور وہاں مولویوں کے کفر کے فتووں کا شکار ہو کر شہید کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کو امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں محض اس امر کی پاداش میں کہ انہوں نے حضرت مرزا صاحب کی بیعت کر لی تھی نہایت بیرحمی کے ساتھ سنگسار کیا گیا جس سے حضرت اقدس کو سخت رنج ہوا ۱۹۰۳ء میں تذکرۃ الشہادتین میں آپ کی قلم سے جو الفاظ نکلے ہیں وہ قابل غور ہیں۔ اور ایک زبردست پیشگوئی پر مشتمل ہیں۔ فرماتے ہیں :-

"اور کابل کی زمین دیکھ لیگی کہ یہ خون کیسے کیسے پھل لائے گا۔ یہ خون کبھی ضائع نہیں جائیگا پہلے اس سے غریب عبدالرحمان میری جماعت کا ظلم سے مارا گیا اور خدا چپ رہا مگر اس خون پر وہ چپ نہیں رہے گا اور بڑے بڑے نتائج ظاہر ہوں گے۔ چنانچہ سُنا گیا ہے کہ جب شہید مرحوم کو ہزاروں پتھروں سے قتل کیا گیا تو انہیں دنوں میں سخت ہیضہ کابل میں پھوٹ پڑا اور بڑے بڑے ریاست کے نامی اس کا شکار ہو گئے۔ اور بعض امیر کے رشتہ دار اور عزیز بھی اس جہان سے رخصت ہوئے۔ مگر ابھی کیا ہے یہ خون بڑی بیرحمی کے ساتھ کیا گیا ہے اور آسمانوں کے نیچے ایسے خون کی اس زمانہ میں نظیر نہیں ملے گی۔ ہائے اس نادان امیر نے کیا کیا کہ ایسے معصوم شخص کو کمال بیدردی سے قتل کر کے اپنے تئیں تباہ کر لیا۔ اے کابل کی زمین تو گواہ رہ کہ تیرے پر سخت جرم کا ارتکاب کیا گیا۔ اے بدقسمت زمین تو خدا کی نظر سے گر گئی کہ تو اس ظلم عظیم کی جگہ ہے"

امیر حبیب اللہ خاں نے اس قتل سے جس طرح "اپنے تئیں تباہ کیا" اس کی داستان یہ ہے کہ وہ خود اپنے بھائی نصراللہ خاں کی سازش سے قتل ہوا۔ پھر نصراللہ خاں جس کا صاحبزادہ عبداللطیف مرحوم کے قتل میں سب سے زیادہ ہاتھ تھا خود قید خانہ میں ڈالا گیا اور آخر کار وہیں قتل کیا گیا۔ پھر امیر حبیب اللہ خاں مقتول کا خاندان جس طرح بچہ سقہ کے ہاتھوں تباہ اور ہلاک ہوا اور اس کی ناموس برباد ہوئی وہ نہایت دردناک داستان ہے۔ اور پتھر چلانے والے قاضیوں اور ملانوں پر جو تباہی اور ہلاکت انقلاب افغانستان کے زمانہ میں آئی وہ سخت عبرتناک ہے۔ پنجابی ڈاکٹر

عبدالغنی جو مباحثہ میں ثالث تھا اور جس کی مخالفت اور شرارت نے اس واقعہ میں بہت بڑا کام کیا تھا اس کی گورنمنٹ کابل کے خلاف باغیانہ سازش کا راز افشا ہوا اور وہ قید خانہ میں ڈالا گیا جہاں وہ ایک عرصہ تک طرح طرح کی اذیتیں سہتا رہا اور آخر کار کسی طرح بھاگ کر جان بچائی اور بحال تباہ ہندوستان واپس آیا۔ لیکن ابھی یہیں تک بس نہیں ہوا۔ ۱۵۔ اپریل ۱۹۰۵ء کو حضرت اقدس مرزا صاحب کو الہام ہوا "ریاست کابل میں قریب پچاسی ہزار کے آدمی مرینگے" اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح یہ پچاسی ہزار آدمی مریں گے۔ کیونکہ اس وقت کابل میں کسی قسم کا فتنہ و فساد نہ تھا بلکہ ہر طرح امن و امان تھا۔ ساتھ ہی یکم جنوری ۱۹۰۶ء کو حضرت اقدس کو ایک اور الہام ہوا کہ "تین بکرے ذبح کئے جائیں گے" جس سے معلوم ہوا کہ ابھی آپ کے مریدوں میں سے کابل کے مذبح پر تین کی اور قربانی چڑھے گی۔ آخر ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا وقت آیا اور امان اللہ خاں بادشاہ افغانستان کے زمانہ میں ۱۹۲۴ء میں حضرت مرزا صاحب کے تین اور مریدوں کو ان کی احمدیت کی وجہ سے سنگسار کیا گیا جن کے نام تھے مولوی نعمت اللہ خاں۔ مولوی عبدالحکیم۔ مولوی نور علی۔ اس خون کے بعد خدا کی غیرت حرکت میں آئی اور ریاست کابل میں قریب پچاسی ہزار آدمی کے مرنے کا وقت آگیا۔ چنانچہ ایک معمولی بازاری آدمی بچہ سقہ اپنے ہمراہیوں سمیت تعرگمنامی سے اُٹھ کر افغانستان کے تخت پر ایسی آسانی سے قابض ہو گیا کہ عقل انسانی اس نیرنگئ زمانہ پر حیران رہ گئی۔ وہ ایک عذاب کے فرشتہ کی طرح کابل کی سرزمین پر مسلط ہوا جس کی وجہ سے امان اللہ خاں اور اس کی بیوی اور اس کے اعزا و اقربا افغانستان سے بھاگ کر جلاوطن ہو گئے۔ اور سلطنت ہی اس خاندان سے نکل گئی۔ اور ریاست کابل میں جو خونریزی اور تباہی و ہلاکت رونما ہوئی وہ نہیں ختم ہوئی جب تک اس ملک میں قریب پچاسی ہزار آدمی مر نہیں لئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت مرزا صاحب کی ایک اور پیشگوئی کے پورا ہونے کی تمہید شروع ہوئی۔ ۳ مئی ۱۹۰۵ء کو حضرت مرزا صاحب کا یہ الہام شائع ہوا تھا کہ "آہ۔ نادر شاہ کہاں گیا" اس وقت سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون نادر شاہ ہے جس کی موت ایک قومی ماتم کے رنگ میں ہو گی جیسا کہ الہام سے ظاہر ہے۔ لیکن آخر واقعات نے بتلایا کہ اس کا تعلق بھی اسی انقلاب افغانستان سے وابستہ تھا۔ جب بچہ سقہ افغانستان پر مسلط تھا۔ اور تمام ملک میں ہلاکت و بربادی کا دَور دورہ تھا۔ اُس وقت افغانستان کے لوگوں نے نادر خاں کی طرف توجہ کی۔ نادر خاں کا خاندان امیر عبدالرحمان کے زیر عتاب آ کر ۲۰ برس جلاوطن رہا تھا۔ آخر امیر حبیب اللہ خاں نے وعدۂ معافی دے کر اس

خاندان کو کابل واپس بلا لیا ۔ ۱۹۰۳ء میں نادرخاں فوج میں بھرتی ہوا اور امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں جرنیلی کے عہدہ پر فائز المرام ہوا ۔ ٹل کے مقام پر افغانستان کی تیسری لڑائی میں جنرل نادرخاں نے انگریزوں کی فوج کو شکست دی اور افغانستان کو کامل آزادی نصیب ہوئی اور امیر کابل بادشاہ افغانستان کہلانے لگا ۔ یعنی امیر امان اللہ خاں اب شاہ امان اللہ خاں کہلانے لگا ۔ اور نادرخاں وزیر جنگ قرار پایا ۔ مگر ۱۹۲۳ء میں نادرخاں بعض وجوہات سے افغانستان کو چھوڑ کر یورپ چلا گیا ۔ اس کی صحت خراب ہو رہی تھی ۔ اور جن دنوں بچہ سقہ امان اللہ خاں پر چڑھ کر آیا ہے نادرخاں فرانس میں بستر علالت پر پڑا ہوا تھا ۔ آخر افغانستان کے لوگوں کی دعوت پر وہ فرانس سے چل پڑا اور ہندوستان میں سے ہو کر جب پشاور پہنچا تو وہ پھر بیمار پڑ گیا ۔ اور افغانستان میں داخل نہ ہو سکا ۔ اس تاخیر ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدد نہ پہنچ سکی اور بچہ سقہ نے امان اللہ خاں کو مار کر ملک سے نکال دیا اور قدرت نے نادرخاں کی بادشاہی کے لئے رستہ صاف کر دیا ۔ آخر ۹ ۔ مارچ ۱۹۲۹ء کو وہ افغانستان میں داخل ہو کر بچہ سقہ سے برسر پیکار ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اسے شکست دے کر کابل پر قابض ہو گیا ۔ نادرخاں کا بادشاہ بننے کا قطعاً منشا نہ تھا ۔ اُس نے پبلک کو حق دیا کہ وہ اپنا بادشاہ آپ تجویز کرے ۔ لیکن افغانستان کے لوگوں نے اتفاق رائے سے نادرخاں کو ہی اپنا بادشاہ تجویز کیا اور واقعی جس شخص نے ملک کو بچہ سقہ کے ظلم و جور سے نجات دلائی تھی وہی بادشاہت کا حقدار بھی تھا ۔ اب نادرخاں بادشاہ بنتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اُس نے اپنا نام **شاہ نادرخاں** تجویز نہیں کیا جیسا کہ قاعدہ تھا ۔ اور جس کے ماتحت امان اللہ خاں ۔ شاہ امان اللہ خاں کہلاتا تھا نہ کہ امان اللہ شاہ ۔ اُس نے اپنا نام خود ہی نادرشاہ تجویز کیا ۔ یہ قدرت کا ہاتھ تھا کیونکہ پیشگوئی کے الفاظ میں نام نادرشاہ تھا ۔ آخر چار برس کی سلطنت کے بعد ۸ ۔ نومبر ۱۹۳۳ء کو محل دلکشا میں جبکہ طالب علموں میں انعامات تقسیم کرنے کے بعد اُن سے باتیں کر رہا تھا ایک طالبعلم نے اسے پستول کے فیر سے قتل کر دیا ۔ پہرہ دار کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور کوئی بچا نہ سکا اور اس قومی ہیرو کے ماتم پر تمام ملک سے یہ صدا اٹھی کہ "آہ ۔ نادرشاہ کہاں گیا !"

اللہ اللہ ۔ خدا کی باتیں بھی کس قدر عجیب غریب رنگ میں پوری ہوتی ہیں ۔ سالہا سال پہلے ان کے پورا ہونے کے کوئی آثار نہیں ہوتے ۔ بھلا ۱۹۰۵ء میں نادرشاہ کا کیا کوئی وجود دنیا میں تھا ؟ الہام میں "نادرشاہ" آیا تو معمہ نظر آیا ۔ آخر ۲۸ ۔ برس کے بعد وہ الفاظ کس قدر صفائی سے پورے ہوئے کہ ان کی صداقت پر ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور ان کے جبروت سے دل کانپ اُٹھتا ہے ۔

۴- ایران کے متعلق پیشگوئی۔

جاپان کے مشرقی طاقت بننے کے بعد جس ملک نے پولیٹیکل نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا وہ ملک ایران تھا۔ ایران ایک قدیم تاریخی ملک ہے جس کے بادشاہ زمانۂ قدیم سے مشرقی لٹریچر میں کسریٰ کے لقب سے ملقب کئے گئے ہیں۔ حضرت اقدس مرزا صاحب کو جنوری ۱۹۰۶ء میں یہ الہام ہوا کہ "تزلزل در ایوان کسریٰ فتاد" اور اس کے بعد چند سالوں کے اندر ہی مرزا محمد علی قاچار کسرائے ایران کے ایوان میں ایسا تزلزل پڑا کہ فوج کے ایک معمولی سپاہی رضاخاں نے اُس کے ایوان سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اسے ملک بدر ہونا پڑا۔ اس سے قبل ایرانیوں کی بادشاہ پرستی پر نظر ڈالتے ہوئے کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس قدر جلد آناً فاناً میں کسریٰ اپنے تخت سے الگ کر دیا جائے گا۔ اور قدیم شاہی خاندانوں میں جو کسریٰ کے لقب سے ملقب تھا اس طرح ایک خطرناک تزلزل واقع ہوگا اور ہمیشہ کے لئے سلطنت اس کے خاندان سے نکل جائے گی اور کسریٰ کا وجود ہی دنیا سے مٹ جائے گا۔

۵- عرب کے متعلق پیشگوئی۔

حضرت مرزا صاحب کی زندگی میں عرب کا بیشتر حصہ حجاز اور یمن سلطان ٹرکی کے ماتحت تھا۔ اور سلطان ٹرکی کو خادم الحرمین الشریفین ہونے کے لحاظ سے اسلامی دنیا میں بڑا وقار حاصل تھا اور وہ خلیفۃ المسلمین کہلاتا تھا۔ یورپ کی مسیحی طاقتوں کو جو شب و روز ٹرکی کی سلطنت کو کمزور کرنے کی فکر میں تھے۔ یہ بہت ناگوار تھا۔ اسی زمانہ میں حضرت مرزا صاحب نے یہ پیش گوئی شائع فرمائی:-

کہ عرب کو سلطنت ٹرکی سے الگ کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ اس وقت دنیائے اسلام کو جو شغف ٹرکی سے تھا اور ٹرکی جس قدر خدمت حرمین الشریفین اور عرب کی کرتا تھا۔ اس پر نظر ڈالتے ہوئے یہ ناممکن نظر آتا تھا۔ لیکن اس کے بہت عرصہ بعد جنگ عظیم یورپ کے زمانہ میں جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک لڑی گئی۔ انگریزوں نے کرنل لارنس کو اسی خدمت جاسوسی پر مامور کیا اور وہ شب و روز عربوں میں گھس کر یہی کام کرتا رہا کہ عربوں کو ترکوں سے بدظن کیا جائے۔ اور آخر اس جنگ عظیم کے دوران میں جب ٹرکی نے جرمنی کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تو کرنل لارنس کی انگیخت پر عرب اور فلسطین اور شام کے عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور ان کے خلاف انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے

بعد نہ صرف ملک عرب بلکہ تمام عربی ممالک مثلاً شام و فلسطین ترکوں سے الگ کر دیئے گئے ساتھ ہی انگریزوں نے کوشش یہ کی کہ ابن سعود بادشاہ عرب یا بادشاہ مصر کو مسلمان خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیں اور یہ ٹرکی کے وقار کو مسلمانوں کے دلوں سے ملیا میٹ کرنے کی سیاسی چال تھی۔ لیکن مسلمانوں نے ایسے کسی بادشاہ کو جو یورپین طاقتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہو خلیفۃ المسلمین ماننے سے انکار کر دیا۔

۶۔ ترکی کے متعلق پیشگوئیاں۔

سلطان عبدالحمید ثانی سلطان روم یا ترکی کے زمانہ میں مئی ۱۸۹۷ء میں حسین کامی ترکی قونصل متعینہ کراچی لاہور آئے۔ اُن دنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں سے عشق تھا۔ ان کا لاہور میں بڑی دھوم سے استقبال ہوا۔ بڑا جلوس نکلا۔ ڈپٹی برکت علی مرحوم کی کوٹھی پر ٹھیرے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب کے مریدوں کو ان دنوں تبلیغ کا بڑا جوش تھا چنانچہ انہیں جو تبلیغ کی تو وہ قادیان چلنے اور حضرت مرزا صاحب سے ملاقات کرنے پر راضی ہو گئے۔ مگر ان کی غرض سیاسی تھی مذہبی نہ تھی۔ حسین کامی نے قادیان پہنچکر حضرت مرزا صاحب سے تخلیہ میں ملاقات کی۔ جو باتیں ہوئیں ان کا تو کسی کو علم نہیں۔ مگر حضرت اقدس کے اشتہاروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی خاص امر کی طرف آپ کو لانا چاہتا تھا اور اسی کے لئے آپ سے دعا کرنے کی بظاہر درخواست کرتا تھا۔ مگر اس کی وہ باتیں حضرت اقدس کو گوارا نہ تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملاقات سے حسین کامی کو اپنا مدعا حاصل نہ ہوا اور وہ بے نیل مرام واپس لاہور چلا گیا۔ لاہور میں حسین کامی کے قادیان جانے کو اچھی نظروں سے نہ دیکھا گیا تھا۔ اس کی واپسی پر اخبار ناظم الہند کے ایڈیٹر نے ایک رقعہ کے ذریعہ اس سے دریافت کیا کہ آپ کا مرزا غلام احمد قادیانی کی نسبت کیا خیال ہے۔ حسین کامی نے ایک رقعہ کے ذریعہ حضرت مرزا صاحب کے کچھ خلاف لکھا۔ بس پھر کیا تھا ایڈیٹر صاحب نے اپنے اخبار میں اس رقعہ کو بلا اجازت چھاپ کر اسے خوب شہرت دی اور مولویوں نے وہ طوفان اٹھایا کہ الامان۔ اور اس فتوے کو چمکانے کی غرض سے حسین کامی کی پاک باطنی اور دیانت اور امانت کو خوب سراہا گیا اور اسے زبردستی نائب خلیفۃ المسلمین قرار دے کر اس کے فتوے کو ایک آسمانی سند قرار دیدیا۔ پہلے تو حضرت مرزا صاحب نے کوئی امر شائع کرنا مناسب نہ سمجھا مگر جب اخبار ناظم الہند وغیرہ نے افترا پردازی کی حد کر دی تو حضرت اقدس نے ۲۴ مئی ۱۸۹۷ء کو ایک اشتہار شائع فرمایا جس میں اصل حالات سے کچھ پردہ اٹھایا۔ اس اشتہار میں آپ تحریر فرماتے ہیں

"لیکن جب وہ میرے پاس آیا تو اس کی شکل دیکھنے سے ہی میری فراست نے یہ گواہی دی کہ یہ شخص امین اور دیانتدار اور پاک باطن نہیں ہے اور ساتھ ہی میرے خدا نے مجھ کو القا کیا کہ رومی سلطنت انہی لوگوں کی شامت اعمال سے خطرہ میں ہے۔ کیونکہ یہ لوگ کہ جو علیٰ حسب المراتب قرب سلطان سے کچھ حصّہ رکھتے ہیں۔ اور اس سلطنت کی اکثر نازک خدمات پر مامور ہیں۔ یہ اپنی خدمات کو دیانت سے ادا نہیں کرتے اور سلطنت کے سچے خیر خواہ نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی طرح طرح کی خیانتوں سے اس اسلامی سلطنت کو جو حرمین شریفین کی محافظ اور مسلمانوں کیلئے مغتنمات میں سے ہے کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ سو مَیں اس الہام کے بعد محض اللہ اُس کی وجہ سے حسین بک کامی سے سخت بیزار ہو گیا لیکن نہ رومی سلطنت کے بغض کی وجہ سے بلکہ محض اس کی خیر خواہی کی وجہ سے۔"

پھر اسی اشتہار میں آپ نے جو حسین بک کامی کو جواب دیا تھا وہ بھی اس طرح نقل فرمایا۔

"سلطان روم کی سلطنت کی حالت اچھی نہیں ہے اور مَیں کشفی طریق سے اس کے ارکان کی حالت اچھی نہیں دیکھتا اور میرے نزدیک ان حالتوں کے ساتھ انجام اچھا نہیں۔"

پھر آپ اسی اشتہار میں لکھتے ہیں کہ مَیں نے اس تُرک کو نصیحت کی اور اشارہ سے اسے سمجھایا کہ اس کشف کا اوّل نشانہ تم ہو اور تمہارے حالات الہام کے رُو سے اچھے نہیں معلوم ہوتے جو اس طرح ہے کہ "توبہ کرو تا نیک پھل پاؤ" جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تیری یہی حالت رہی تو تجھے اچھا پھل نہیں ملے گا اور تیرا انجام بد ہو گا۔ پھر اسی اشتہار میں آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

" اس کے لئے (یعنی کونسل مذکور کے لئے) بہتر تھا کہ میرے پاس نہ آتا۔ میرے پاس سے ایسی بدگوئی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واپس جانا اس کی سخت بدقسمتی ہے۔"

اس کا مطلب صاف طور پر یہ تھا کہ اس نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی نسبت بدگوئی کر کے در اصل اپنی ذلّت کا سامان پیدا کر دیا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بار بار الہام میں فرمایا تھا کہ "انّی مھینٌ من اراد اھانتك" کہ جو تجھے ذلیل کرنا چاہے گا مَیں اُسے ذلیل کروں گا۔ پھر اسی اشتہار میں حضرت اقدس مرزا صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

" اللہ جلّ شانہٗ جانتا ہے جس پر جھوٹ باندھنا لعنت کا داغ خریدنا ہے کہ اس عالم الغیب نے مجھے پہلے سے اطلاع دیدی تھی کہ اس شخص کی سرشت میں نفاق کی رنگ آمیزی ہے۔"

اس اشتہار کے نکلنے پر لاہور میں آگ لگ گئی اور حسین کامی بک کو ایک فرشتہ قرار دیکر حضرت مرزا صاحب کے خلاف وہ گند بکا گیا کہ الامان اور لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا گیا کہ دراصل مرزا قادیانی نے سلطان روم کی ذات پر حملہ کیا ہے۔ حالانکہ سلطان کی ذات سے اس پیشگوئی کو کوئی تعلق نہ تھا بلکہ بعض اراکین سلطنت اور کارکن لوگوں کی نسبت الہام شائع کیا گیا تھا کہ وہ امین اور دیانتدار نہیں ہیں۔ جن میں حسین کامی بک خصوصیت سے شامل تھا۔ ترکی سلطنت کو حضرت مرزا صاحب نے اس اشتہار میں "حرمین شریفین کی محافظ" اور مسلمانوں کے لئے مغتنمات" میں سے قرار دیا تھا۔ اور اسی سلطنت کی "خیر خواہی" کی وجہ سے ہی حضرت مرزا صاحب حسین کامی سے بیزار ہوئے تھے۔

اسی سلسلہ میں راولپنڈی کے اخبار چودھویں صدی نے بہت ہرزہ سرائی کی تو حضرت مرزا صاحب نے اس کے جواب میں ۲۵۔ جون ۱۸۹۷ء کو ایک اور اشتہار شائع فرمایا جس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آجکل ہمارے مخالفوں کو گالیاں دینے کے لئے یہ نیا بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ انہوں نے ہمارے اشتہار کے اُلٹے معنے کرکے یہ مشہور کر دیا ہے کہ گویا ہم سلطان روم اور اس کی سلطنت اور دولت کے سخت مخالف ہیں اور اس کا زوال چاہتے ہیں اور انگریزوں کی حد سے زیادہ خوشامد کرتے ہیں اور انگریزی سلطنت کی دولت اور اقبال کیلئے دعائیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں بعض پُر افترا اشتہاروں اور اخباروں کے ذریعہ سے یہ خیال بہت پھیلایا گیا ہے۔ اور عوام کو دھوکا دینے کے لئے ہمارے اشتہار کی بعض عبارتیں محرّف اور مبدّل کرکے لکھی گئی ہیں اور اس طرح پر بیوقوفوں کے دلوں کو جوش دلانے اور ابھارنے کے لئے کارروائی کی گئی ہے۔

...... ہر ایک مسلمان عقلمند بھلا مانس نیک فطرت جو اپنی شرافت سے سچی بات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے اس بات کو متوجہ ہو کر سُنے کہ ہم کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کلمہ گو سے بھی کینہ نہیں رکھتے چہ جائیکہ ایسے شخص سے کینہ ہو جس کی ظل حمایت میں کروڑہا اہل قبلہ زندگی بسر کرتے ہیں اور جس کی حفاظت کے نیچے خدا تعالیٰ نے اپنے مقدس مکانوں کو سپرد کر رکھا ہے۔ سلطان کی شخصی حالت اور اس کی ذاتیات کے متعلق نہ ہم نے کبھی کوئی بحث کی اور نہ اب ہے۔

بلکہ اللہ جل شانہ‘ جانتا ہے کہ ہمیں اس موجودہ سلطان کے بارے میں اس کے باپ دادے کی نسبت زیادہ حسن ظن ہے۔ ہاں ہم نے گزشتہ اشتہارات میں ترکی گورنمنٹ پر بلحاظ اس کے بعض عظیم الدخل اورخراب اندرون ارکان اور عمائد اور وزرا کے نہ بلحاظ سلطان کی ذاتیات کے ضرور اس خداداد نور اور فراست اور الہام کی تحریک سے جو ہمیں عطا ہوا ہے چند ایسی باتیں لکھی ہیں کہ خود ان کے مفہوم کے خوفناک اثر سے ہمارے دل پر ایک عجیب رقّت اور درد طاری ہوتی ہے۔ سو ہماری وہ تحریر جیسا کہ گندے خیال والے سمجھتے ہیں کسی نفسانی جوش پر مبنی نہ تھی بلکہ اس روشنی کے چشمہ سے نکلی تھی جو رحمت الٰہی نے ہمیں بخشا ہے۔“

پھر اسی اشتہار میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:۔

”کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جو کچھ میں نے رومی سلطنت کے اندرونی نظام کی نسبت بیان کیا وہ دراصل صحیح ہو اور ترکی گورنمنٹ کے شیرازہ میں ایسے دھاگے ہوں جو وقت پر ٹوٹنے والے اور غدّاری سرشت ظاہر کرنے والے ہوں۔“

اس اشتہار کا اثر لوگوں پر کچھ نہ ہوا۔ اور حضرت مرزا صاحب کا یہ بیان کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم دیا گیا ہے کہ یہ شخص حسین کامی سلطنت ترکی کے ساتھ دیانتدارانہ تعلق نہیں رکھتا اور اس شخص کی سرشت میں نفاق کی رنگ آمیزی ہے لوگوں کیلئے اسقدر اشتعال انگیز ثابت ہوا کہ آپ پر ایک دنیا ٹوٹ پڑی اور آپ کی کوئی وضاحت قابل پذیرائی نہ سمجھی گئی اور حسین کامی کو نہایت درجہ کا فرشتہ سیرت اور متقی اور بزرگ قرار دیکر اخباروں اور اشتہاروں اور ہر مجلس میں اور ہر تحریر و تقریر میں حضرت مرزا صاحب کو برا بھلا کہا گیا اور اتنی گالیاں دی گئیں کہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ آخر خدا کے پاک بندہ مرزا غلام احمد پر رات دن کی طعن و تشنیع نے اپنا اثر دکھایا اور وہ گھڑی آن پہنچی جس میں حسین کامی اور اس کے حامیوں کی پردہ دری اور ذلت مقدر تھی۔ وہ اس طرح کہ ۱۸۹۷ء میں یونان نے جزیرہ کریٹ پر جو ترکوں کے ماتحت تھا قبضہ کر کے اس کے مسلمان باشندوں میں اسقدر قتل و غارت کا بازار گرم کیا کہ تمام اسلامی دنیا چیخ اٹھی۔ چنانچہ وہاں کے مظلوموں کیلئے ہندوستان سے بہت سا چندہ جمع ہوا۔ اور اسی حسین کامی بک کو جو کراچی میں ترکی کونسل کے عہدہ پر ممتاز تھا بھیجا گیا کہ سلطان روم کی خدمت میں پہنچا دیں۔ ایسے دیانتدار ہاتھوں میں بھیجکر مسلمان مطمئن تھے کہ چندہ سلطان روم کو پہنچ گیا ہوگا لیکن ۱۸۹۹ء کا ذکر ہے کہ ایک معزز ترک کی معرفت حضرت مرزا صاحب کو یہ خبر ملی کہ حسین کامی مذکور ایک

ایک مجرمانہ خیانت کی وجہ سے اپنے عہدہ سے موقوف کر دیا گیا ہے اور اس کی املاک ضبط ہو گئی ہے۔ لیکن اس خبر پر جو ایک فرد واحد نے دی تھی پوری طرح اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا کہ اتنے میں اخبار نیر آصفی مدراس مجریہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حسین کامی بک ہندوستان کے مسلمانوں کا چندہ جو مظلومان کریٹ کے لئے تھا بددیانتی سے کھا گیا جس کی پاداش میں وہ ملازمت سے معزول کیا گیا اور اس کی املاک نیلام کرائی گئی۔ پس اس طرح خدا کی باتیں پوری ہوئیں اور وہ جو اُسے کہا گیا تھا کہ "توبہ کرو تا نیک پھل پاؤ" مگر اس نے اس پر عمل نہ کیا تو آخر وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا میں نیر آصفی مجریہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء کی یہ خبر مفصل طور پر مجدّد اعظم حصّہ اوّل میں صفحہ ۵۰۶ پر نقل کر چکا ہوں اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس خبر کے شائع ہونے پر جو کچھ ذلّت اور ندامت ان مولویوں اور ایڈیٹران اخبار کو ہوئی جنہوں نے حسین کامی بک کو آسمان پر چڑھایا ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ سے حضرت مرزا صاحب پر بری طرح برسے تھے وہ بیان سے باہر ہے۔ اور خاکسار مؤلف بھی حیران ہی رہ گیا۔ کیونکہ حسین کامی بک صورت شکل سے تو واقعی ایک مقدس فرشتہ معلوم ہوتا تھا۔ اُسے میں نے خود دیکھا تھا۔ اس کی شکل سے تو کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ واہمہ دل میں نہیں گزرتا تھا کہ اس کی سرشت میں بقول حضرت مرزا صاحب نفاق کی رنگ آمیزی ہو گی اور یہ ایک بددیانت اور خائن آدمی ہے۔ حضرت اقدس کے اشتہار پر خود مجھے بہت تعجب اور دل کو انقباض ہوا تھا لیکن جب مذکورہ بالا خبر اخباروں میں نکلی تو یہی واقعہ ایمان کی زیادتی اور دل کے انشراح کا موجب ہو گیا اور ماننا پڑا کہ واقعی وہ فراست کی روشنی جس سے حضرت مرزا صاحب نے اس کی سرشت کو پہچانا تھا وہ خدا کی طرف سے تھی۔ انسان اپنے قیاس سے اس کی شکل دیکھ کر قطعًا یہ اندازہ لگا نہ سکتا تھا۔ اور دیکھ لو آخر ہزارہا مسلمان اچھے پڑھے لکھے سمجھدار اس کی شکل سے دھوکا کھا گئے۔ مگر وہ شخص جس کی آنکھوں کو خدا نے نور فراست اور دل کو الہام کی روشنی بخشی تھی اس کی نظر خطا نہ گئی اور حسین کامی کے خبث اندرونی کو پہچان لیا اور جو کچھ آپ نے لکھا تھا لفظًا لفظًا پورا ہوا۔ نہ صرف حسین کامی کے متعلق بلکہ ترکی گورنمنٹ کے متعلق بھی ساری باتیں اسی طرح پوری ہوئیں جس طرح آپ نے تحریر فرمائی تھیں۔

ذرا آپ کا یہ فقرہ دوبارہ غور سے پڑھو:۔

"کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جو کچھ میں نے رومی سلطنت کے اندرونی نظام کی نسبت بیان کیا وہ دراصل صحیح ہو اور ترکی گورنمنٹ کے شیرازہ میں ایسے دھاگے بھی ہوں جو وقت پر ٹوٹنے والے اور غداری سرشت ظاہر کرنیوالے ہوں" (اشتہار ۲۵۔ جون ۱۸۹۷ء) پھر اس فقرہ کو پڑھو:۔

"سلطان روم کی سلطنت کی اچھی حالت نہیں ہے۔ اور مَیں کشفی طریق سے اسکے ارکان کی حالت اچھی نہیں دیکھتا۔ اور میرے نزدیک ان حالتوں کے ساتھ اس کا انجام اچھا نہیں (اشتہار ۲۴ مئی ۱۸۹۷ء)

پھر کیا یہی سچ نہیں کہ حضرت اقدس مرزا صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید ثانی کی حکومت کے شیرازہ کے دھاگے کس بُری طرح ٹوٹے اور غداری سرشت رکھنے والے ارکان نے کس طرح حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کر کے قید کر دیا۔ اور اس کا انجام کس قدر بُرا ہوا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ انہی غدار عمّال کی غداری کا نتیجہ تھا۔ آخر حقّی پاشا کی غداری کا ہی یہ سارا کرشمہ تھا۔ حضرت اقدس کے فرمودہ کا ایک ایک لفظ پورا ہوا کاش کہ ٹرکی غور کرنیوالا دل ہو۔

سلطنت ٹرکی کی اس حالت زار سے خود حضرت اقدس مرزا صاحب کو تحت درد اور رقّت ہوتی تھی جیسا کہ وہ سلطنت ٹرکی کے متعلق ۲۵۔جون ۱۸۹۷ء کے اشتہار میں اپنے الہامات لکھ کر تحریر فرماتے ہیں کہ:

"خود ان کے مفہوم کے خوفناک اثر سے ہمارے دل پر ایک عجیب رقّت اور درد طاری ہوتی ہے"۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ سلطنت ٹرکی کو ایک اسلامی سلطنت اور حرمین شریفین کی محافظ اور مسلمانوں کے لئے مغتنمات میں سے" سمجھتے تھے۔ (دیکھو اشتہار ۲۴۔مئی ۱۸۹۷ء) چنانچہ اس سلطنت کی حالت پر جو درد اور رقّت آپ پر طاری ہوئی اس نے آپ سے نہ معلوم کس قدر دعائیں کروائیں جس کے جواب میں جنوری ۱۹۰۴ء میں جناب الٰہی کی طرف سے آپ کو یہ الہام ہوا کہ "غلبت الرّوم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون" کہ روم مغلوب ہو گیا ساتھ کی زمین میں اور وہ اپنے مغلوب ہوئے پیچھے جلدی غالب ہو جائے گا۔ آپ نے اس الہام کو فوراً شائع کر دیا۔ اس الہام میں ۲ (دو) پیشگوئیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک وقت آنے کو ہے جب ٹرکی بکلی مغلوب ہو جائے گا۔ اور دوسری پیشگوئی یہ تھی کہ مغلوبیت کی انتہائی حالت پر پہنچ جانے کے باوجود جب اس کی حالت پر ہر طرف یاس چھا جائے گی ایک اعجازی رنگ میں پھر اُسے غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سلطنت ٹرکی کی حالت دن بدن گرتی گئی۔ یہاں تک کہ جنگ عظیم میں اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی مغلوبیت انتہا کو پہنچ گئی اور خاص اس کے دارالسلطنت استنبول پر دول یورپ کا قبضہ ہو گیا۔ اور ان سب کی صلاح یہ ہوئی کہ باقیماندہ ایشیائی روم کا سارا علاقہ سلطنت یونان کو دیدیا جائے اور اس طرح سلطنت ٹرکی کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ چنانچہ عملی طور پر یونانی تمام علاقہ پر قابض بھی ہو گئے جسے دیکھ کر استنبول میں ساری ترکی قوم نے ایک خاص دن مقرر کر کے اپنی دی ہوئی سلطنت پر نوحہ و ماتم کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس پیشگوئی کے دوسرے حصّہ کا

ظہور ایک عجیب خارق عادت رنگ میں شروع کیا اور وہ اس طرح کہ مصطفےٰ کمال اور ایسے ہی چند مخلصین قوم پرست ترکوں کے دلوں میں ہمت اور حوصلہ پیدا کیا اور وہ خفیہ طور پر استنبول سے نکل کر ایشیائی روم میں آگئے اور انہوں نے یہاں اپنی منتشر افواج کو جمع کر کے یونانیوں پر اس طرح حملے شروع کر دیئے کہ باوجودیکہ ان کی پشت پر اٹلی اور انگلستان اور فرانس تھے مگر ان کو ایسی تابڑ توڑ شکستیں ہوئیں کہ وہ اپنا بوریا بستر سنبھال کر علاقہ خالی کر کے چلتے بنے۔ اور اس کے بعد ترکوں نے یورپ کا سب سے اہم علاقہ استنبول اور ایڈریانوپل اور آبنائے ڈارڈنلز وغیرہ جو تمام سلطنت ٹرکی کے لئے بمنزلہ جان کے تھا واپس لے لیا۔ اور انقرہ دارالسلطنت مقرر کر کے ترکوں نے دوبارہ اپنی سلطنت پہلے سے زیادہ منظم اور محکم قائم کر لی۔ مغلوب ہوئے پیچھے یہ دوبارہ غلبہ محض خدا کے فضل سے تھا۔ اور اس مرد خدا کی دعاؤں کا اثر تھا جس کے دل کے درد نے ان افضال الٰہیہ کو جذب کیا۔ یہ سچ ہے کہ بظاہر نظر سلطنت ٹرکی کی دوبارہ زندگی کا موجب مصطفےٰ کمال پاشا کی جدوجہد ہے اس کا کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہر ایک مسلمان جانتا ہے کہ کوئی کام دنیا میں ظہور پذیر نہیں ہوتا جب تک پہلے اس کا فیصلہ آسمان پر نہ ہو۔ خدا کے فضل کا اس رنگ میں ظاہر ہونا کہ مری ہوئی ترکی سلطنت دوبارہ زندہ ہو گئی۔ یہ درحقیقت مرد کامل امام وقت حضرت مرزا غلام احمد کی دعاؤں کا نتیجہ تھا جو آپ نے اس سلطنت کی تباہی کو دیکھتے ہوئے جناب الٰہی میں کی تھیں اور جس کے متعلق ۱۴ برس پہلے بذریعہ الہام جناب الٰہی نے آپ کو بشارت دی تھی کہ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم بعد غلبھم سیغلبون کہ اگرچہ ٹرکی کی مغلوبیت انتہائی حالت کو پہنچ جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ پھر اُسے جلدی ہی غلبہ دے دیگا اور نئے سرے سے زندگی بخشے گا۔ مصطفےٰ کمال اور اس کے احباب کی جدوجہد بے شک اسباب ظاہری تھے۔ لیکن پس پردہ باطنی و حقیقی اسباب مجدد صد چہاردھم کی دعائیں تھیں جنہوں نے جناب الٰہی کے فضل کو جذب کیا بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم کہ ع دعائیں مرد مومن کی بدل دیتی ہیں تقدیریں"

(۷) یورپ کی عالمگیر جنگ عظیم کے متعلق پیشگوئیاں

جنگ عظیم یورپ جو ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی اور جس کے بعد وہ صلح ہوئی جس کے متعلق رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا ھدنۃ علیٰ ارض کہ ایسی صلح ہوگی جس سے قوموں کے دل ایک دوسرے سے راضی نہ ہوں گے بلکہ وہ دوسری ملحمۃ العظمٰی جنگ عظیم کے لئے پیش خیمہ ہوگی۔ اس جنگ عظیم نے جو زلزلہ عظیمہ تمام اقصائے عالم مشرق و مغرب میں ڈالا اور ابتک ڈال رکھا ہے۔

اور جو دنیا اور اہل دنیا پر تباہی اور ہلاکت اس سے وارد ہوئی ہے اس کے متعلق کئی سال قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس مرزا صاحب کو بذریعہ الہام خبر دی تھی۔ چنانچہ آپ نے اسے بار بار مختلف اشتہارات اور تصنیفات کے ذریعہ شائع فرمایا۔ اور پبلک کو آگاہ کیا کہ خدا کا عذاب بڑا سخت آنے کو ہے جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے عاجز ہے۔ مناسب ہے کہ توبہ و استغفار اور گریہ و زاری اور اعمال صالحہ سے خدا کو راضی کرو تا وہ تقدیر ٹل جائے لیکن غفلت اور جہل کے پردے اس طرح پڑے ہوئے تھے اور لوگوں کو دنیا کے تعیّش و تنعم نے اسقدر ان باتوں سے بے پرواہ کر دیا تھا کہ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور آخر وہ عذاب آیا۔ اور اس طرح آیا کہ دنیا کا کوئی گوشہ اس کی مصیبت سے نہ بچ سکا اور خدا ہی جانتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

حضرت اقدس مرزا صاحب اس عذاب عظیم کی وجہ اس طرح بیان فرماتے ہیں :۔

"افسوس ہے کہ آسمان گواہی دے رہا ہے اور تم نہیں سنتے۔ اور زمین ضرورت بیان کر رہی ہے اور تم نہیں دیکھتے۔ اے بدبخت قوم اُٹھ اور دیکھ کہ اس مصیبت کے وقت جو اسلام پیروں کے نیچے کچلا گیا اور مجرموں کی طرح بے عزت کیا گیا۔ وہ جھوٹوں میں شمار کیا گیا۔ وہ ناپاکوں میں لکھا گیا۔ تو کیا خدا کی غیرت ایسے وقت میں جوش نہ مارتی اب سمجھ کہ آسمان جھکتا چلا آتا ہے اور وہ دن نزدیک ہیں کہ ہر ایک کان کو انا الموجود کی آواز آئے" (الحکم ۲۴۔جنوری ۱۹۰۴ء)

اس عذاب کی خبر جو غیرت الٰہی کا نتیجہ ہے اس طرح آپ دیتے ہیں :۔

"اب میں دیکھتا ہوں کہ وہ وقت بہت قریب آگیا ہے۔ میں نے اس وقت جو آدھی رات کے بعد چار بج چکے ہیں بطور کشف دیکھا ہے کہ دردناک موتوں سے عجیب طرح پر شور قیامت برپا ہے۔ میرے منہ پر یہ الہام الٰہی تھا کہ موتا موتی لگ رہی ہے کہ میں بیدار ہو گیا۔ اور اس وقت جو ابھی کچھ حصہ رات کا باقی ہے میں نے یہ اشتہار لکھنا شروع کیا۔ دوستو اُٹھو اور ہوشیار ہو جاؤ کہ اس زمانہ کی نسل کیلئے نہایت مصیبت کا وقت آگیا ہے اب دریا سے پار ہونے کیلئے بجز تقویٰ کے اور کوئی کشتی نہیں۔ مومن خوف کے وقت خدا کی طرف جھکتا ہے کہ بغیر اس کے کوئی امن نہیں۔ اب دکھ اُٹھا کر اور سوز و گداز اختیار کر کے اپنا کفارہ دو اور راستی میں محو ہو کر اپنی قربانی آپ ادا کرو۔ اور تقویٰ کی راہ میں بڑے زور سے کام لیکر اپنا بوجھ آپ اُٹھاؤ کہ ہمارا خدا بڑا رحیم و کریم ہے کہ رونے والوں پر اس کا غصہ تھم جاتا ہے

مگر وہی جو قبل از وقت ڈرتے ہیں نہ مردوں کی لاشوں کو دیکھ کر۔ وہ خوف کرنیوالوں کے سر پر سے عذاب کی پیش گوئی ٹال سکتا ہے۔ جاہل کہتا ہے کہ یہ پیشگوئی کیوں ٹل گئی لیکن اگر خدا میں یہ عادت نہ ہوتی کہ دعا اور صدقہ اور خیرات اور گریہ اور بکا سے ان بلاؤں کو دُور کر دیتا ہے جن کا اُس نے ارادہ کیا ہے یا جن بلاؤں اور عذابوں کو نبیوں کی معرفت ظاہر کر چکا ہے تو دنیا کبھی کی ہلاک ہو جاتی۔ سو نیکی کرو اور خدا کے رحم کے امیدوار ہو جاؤ (الحکم ۳۰ مئی ۱۹۰۴ء)

اس کے بعد ۸۔ تاریخ اپریل ۱۹۰۵ء کو آنیوالے عذاب عظیم کے بارے میں حضرت اقدس مرزا صاحب نے ایک اشتہار الانذار شائع فرمایا جس میں لکھتے ہیں:۔

"آج رات تین بجے کے قریب خدا تعالیٰ کی پاک وحی مجھ پر نازل ہوئی جو ذیل میں لکھی جاتی ہے۔

تازہ نشان۔ تازہ نشان کا دھکا۔ زلزلۃ الساعۃ۔ قوا انفسکم ان اللّٰہ مع الابرار دنیٰ منك الفضل۔ جاء الحق وزھق الباطل۔ ترجمہ مع شرح۔ یعنی خدا ایک تازہ نشان دکھائے گا۔ مخلوق کو اس نشان کا ایک دھکا لگے گا۔ وہ قیامت کا زلزلہ ہوگا۔ (مجھے علم نہیں دیا گیا کہ زلزلہ سے مراد زلزلہ ہے یا کوئی اور شدید آفت ہے جو دنیا پر آئے گی جس کو قیامت کہہ سکیں گے) اور مجھے علم نہیں دیا گیا کہ ایسا حادثہ کب آئے گا اور مجھے علم نہیں کہ وہ چند دن یا چند ہفتوں تک ظاہر ہوگا یا خدا تعالیٰ اس کو چند مہینوں یا چند سال کے بعد ظاہر فرمائے گا۔ بہرحال وہ حادثہ زلزلہ ہو یا کچھ اور۔ قریب ہو یا بعید ہو پہلے سے بہت خطرناک ہے سخت خطرناک ہے۔ اگر ہمدردی مخلوق مجھے مجبور نہ کرتی تو میں بیان نہ کرتا۔"

اس اشتہار کے آخر میں آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب خدا تعالیٰ اس وحی کے الفاظ میرے پر نازل کر چکا تو ایک رُوح کی آواز میرے کان میں پڑی جو ناپاک رُوح تھی اور میں نے اس کو یہ کہتے سنا کہ "میں سوتے سوتے جہنم میں پڑ گیا" انسان کا کیا حرج ہے اگر وہ فسق و فجور کو چھوڑ دے۔ کونسا اس میں اس کا نقصان ہے اگر وہ مخلوق پرستی نہ کرے۔ آگ لگ چکی ہے اٹھو اور اس آگ کو اپنے آنسوؤں سے بجھاؤ۔"

اس کے بعد آپ نے ۱۳۔ مارچ ۱۹۰۶ء کے پیسہ اخبار میں جو ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہوا تھا قیمت دے کر اپنی ایک نظم شائع فرمائی جس میں نہایت مؤثر الفاظ میں اس پیش گوئی کو شائع فرمایا۔ ابتدا کے اشعار اس طرح ہیں:۔

پھر چلے آتے ہیں یارو زلزلہ آنے کے دن	زلزلہ کیا اس جہاں سے کوچ کر جانے کے دن

تم تو ہو آرام میں پر اپنا قصّہ کیا کہیں
پھرتے ہیں آنکھوں کے آگے سخت گھبرانیکے دن

غیر کیا جانے کہ غیرت اس کی کیا دکھلائیگی
خود بتائے گا انہیں وہ یار بتلانے کے دن

وہ چمک دکھلائیگا اپنے نشاں کی پنج بار[1]
یہ خدا کا قول ہے سمجھو گے سمجھانے کے دن

میرے دل کی آگ نے آخر دکھایا کچھ اثر
آ گئے ہیں اس زمیں پر آگ بھڑکانے کے دن

اے میرے پیارے یہی میری دعا ہے روز و شب
گود میں تیری ہوں ہم اس خون دل کھانیکے دن

کرم خاکی ہوں مرے پیارے نہ آدم زاد ہوں
فضل کا پانی پلا اس آگ برسانے کے دن

اے میرے یار یگانہ اے میری جاں کی پناہ
کر وہ دن اپنے کرم سے دیں کے پھیلانیکے دن

پھر بہار دیں کو دکھلا اے میرے پیارے قدیر
کب تلک دیکھیں گے ہم لوگوں کے بہکانیکے دن

زلزلہ کے متعلق آپ تحریر فرما چکے تھے "مجھے علم نہیں دیا گیا کہ زلزلہ سے مراد زلزلہ ہے یا کوئی اور شدید آفت ہے جو دنیا پر آئے گی جس کو قیامت کہہ سکیں گے" (الانذار) لیکن اس میں کیا شک ہے کہ وہ کوئی ایسی آنیوالی آفت تھی جس میں آسماں سے آگ برسنے کو تھی۔ اور وہ ایسی آگ تھی جو دنیا کے ہر گوشہ میں اور زمین کے ہر طرف بھڑکنے کو تھی جیسا کہ آجکل اس عالمگیر جنگ میں نظر آرہا ہے۔ اسی جنگ کے متعلق ایک اور نظم میں ارشاد فرماتے ہیں :- ؎

ہاتھ سے جاتا ہے دل دیں کی مصیبت دیکھ کر
پر خدا کا ہاتھ اب اس دل کو ٹھہرانے کو ہے

اس لئے اب غیرت اسکی کچھ تمہیں دکھلائے گی
ہر طرف یہ آفت جاں ہاتھ پھیلانے کو ہے

موت کی رہ سے ملیگی اب تو دیں کو کچھ مدد
ورنہ دیں اے دوستو اک روز مرجانے کو ہے۔

اس کے بعد براہین احمدیہ حصہ پنجم میں جو ان دنوں زیر تصنیف تھی آپ نے ایک نظم میں نہایت صاف الفاظ میں اسی زلزلہ کا ایسا نقشہ کھینچا کہ عالمگیر جنگ عظیم یورپ کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جنگ عظیم یا کسی مصیبت عظمیٰ کو زلزلہ کا نام دیدینا معمولی محاورہ کلام الٰہی ہے۔ اشعار میں میں جو نقشہ کھینچا ہوا ہے وہ صاف جنگ عظیم کا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

اک نشاں ہے آنیوالا آج سے کچھ دن کے بعد
جس سے گردش کھائیں گے دیہات و شہر و مرغزار

آئیگا قہر خدا سے خلق پر اک انقلاب
اک برہنہ سے نہ یہ ہوگا کہ تا باندھے ازار

[1] فرماتے ہیں "خدا تعالیٰ کے اصل الفاظ جو مجھ پر نازل ہوئے ہیں یہ ہیں "چمک دکھلاؤں گا تم کو اس نشاں کی پنج بار" یعنی پانچ مرتبہ غیر معمولی طور پر زلزلہ آئے گا جو اپنی شدّت میں نظیر نہ رکھتا ہوگا۔

یک بیک ایک زلزلہ[1] سے سخت جنبش کھائینگے ۔۔۔ کیا بشر اور کیا شجر اور کیا حجر اور کیا بحار

اک جھپک میں یہ زمیں ہو جائے گی زیر و زبر ۔۔۔ نالیاں خوں کی چلیں گی جیسے آبِ رودبار

رات جو رکھتے تھے پوشاکیں برنگِ یاسمن ۔۔۔ صبح کر دے گی اُنہیں مثلِ درختانِ چنار

ہوش اُڑ جائیں گے انساں کے پرندوں کے حواس ۔۔۔ بھولیں گے نغموں کو اپنے سب کبوتر اور ہزار

ہر مسافر پر وہ ساعت سخت ہے اور وہ گھڑی ۔۔۔ راہ کو بھولیں گے ہو کر مست و بیخود راہوار

خون سے مُردوں کے کوہستان کے آبِ رواں ۔۔۔ سرخ ہو جائیں گے جیسے ہو شرابِ انجبار

مضمحل ہو جائیں گے اس خوف سے سب جن و انس ۔۔۔ زار بھی ہوگا تو ہوگا اس گھڑی با حالِ زار

اک نمونہ قہر کا ہوگا وہ ربّانی نشان ۔۔۔ آسماں حملے کرے گا کھینچ کر اپنی کٹار

ہاں نہ کر جلدی سے انکار اے سفیہ ناشناس ۔۔۔ اس پہ ہے میری سچائی کا سبھی دارومدار

وحیِ حق کی بات ہے ہو کر رہے گی بے خطا ۔۔۔ کچھ دنوں کر صبر ہو کر متقی اور بردبار

یہ گماں مت کر کہ یہ سب بدگمانی ہے معاف ۔۔۔ قرض ہے واپس ملے گا تجھ کو یہ سارا اُدھار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۲۰)

آج کون شخص ہے جس نے عالمگیر جنگ عظیم یورپ کا زمانہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کا دیکھا ہو اور پھر وہ انکار کرے اور کہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ عالمگیر جنگ عظیم یورپ کا ٹھیک ٹھیک نقشہ نہیں ہے؟ کس طرح یک بیک ایک جھپک میں یہ آگ تمام یورپ میں پھیل گئی۔ مسٹر ایسکوئیتھ وزیر اعظم انگلستان ہاتھ پاؤں مارتے رہ گئے اور کچھ نہ بنا اور اس خدائی تقدیر کو روک نہ سکے۔ پھر شہروں اور دیہات اور مرغزار پر جو گردش اور تباہی آئی ہے الامان الحفیظ۔ دل بول اُٹھے کہ یہ آسمان ہے جو کٹار کھینچکر زمین پر حملہ آور ہوا ہے۔ بلکہ آسمان سے جو بمباری ہوتی تھی وہ زمین کے حملوں سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک تھی۔ خشکی، تری، ہوا، غرضکہ کوئی جگہ نہ تھی جہاں انسان کا

[1] ”خدا تعالیٰ کی وحی میں زلزلہ کا بار بار لفظ ہے اور فرمایا کہ ایسا زلزلہ ہوگا جو نمونہ قیامت ہوگا بلکہ قیامت کا زلزلہ اس کو کہنا چاہیئے جس کی طرف سورۃ اذا زلزلت الارض زلزالھا اشارہ کرتی ہے لیکن مَیں ابھی تک اس زلزلہ کے لفظ کو قطعی یقین کے ساتھ ظاہر پر جما نہیں سکتا۔ ممکن ہو کہ یہ معمولی زلزلہ نہ ہو بلکہ کوئی اور شدید آفت ہو جو قیامت کا نظارہ دکھلاوے جس کی نظیر کبھی اس زمانہ نے نہ دیکھی ہو اور جانوں اور عمارتوں پر سخت تباہی آوے۔ ہاں اگر ایسا فوق العادت نشان ظاہر نہ ہوا اور لوگ کھلے طور پر اپنی اصلاح بھی نہ کریں تو اس صورت میں مَیں کاذب ٹھیروں گا“ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۲۰)

انسان نے گلا نہ کاٹا ہو اور ایک دوسرے کی ہستی کو مٹانے کی کوشش نہ کی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خون کی نالیاں جس طرح چلی ہیں دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ پھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ جو بمباریاں ہوئیں ان سے شہروں میں امن سے بسنے والوں کی پوشاکیں جو رات کو برنگ یاسمن تھیں کس طرح صبح کو خون سے برنگ درختانِ چنار سرخ ہو گئیں۔ پھر کس طرح اس "آفت جان" جنگ نے ہر طرف ہاتھ پھیلایا جس جھپیٹ سے نہ کوئی جن بچا نہ انس۔ یعنی نہ بڑا بچا نہ چھوٹا۔ نہ سرمایہ دار بچا اور نہ غریب مزدور۔ سب اپنی اپنی جگہ مضمحل ہو گئے۔ نہ گھر کے بسنے والوں کو چین تھا اور نہ مسافر راہ چلتوں کو امان تھا۔ آئے دن مسافروں کے جہاز غرق ہوتے اور گھر والوں میں ماتم و شیون بپا ہوتا۔ اس کے ساتھ حضرت مرزا صاحب کے ایک اور الہام کو پڑھو تو نقشہ اور صاف ہو جاتا ہے۔ وہ الہام یہ تھا کہ "کشتیاں چلتی ہیں تا ہوں کُشتیاں"۔ یہاں کشتیوں سے مراد پہلوانوں کی کشتی نہیں ہے بلکہ قوموں کی جنگ ہے۔ جرمن نے آبدوز کشتیاں نکال کر جس قدر کُشتیاں لی ہیں یعنی جہازوں کو غرق کیا ہے اس کی نظیر بھی تاریخ عالم پیش نہیں کر سکتی۔ غرضکہ اس جنگ میں اس قیامت کی ہلا چلی تھی کہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ پرندوں تک کو امن نہ تھا۔ بمباریوں اور گیس کے حملوں سے پرندوں تک کے حواس مارے گئے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں فنا ہو گئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جیسا کہ حضرت مرزا صاحب نے لکھا تھا کہ "بھولیں گے نغموں کو اپنے سب کبوتر اور ہزار"۔ سو کبوتروں پر ہی سب سے بڑھ کر آفت آئی۔ کیونکہ کبوتروں سے جنگوں میں پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا اس لئے چُن چُن کر کبوتروں کو مارا گیا۔ اسی طرح حضرت اقدس نے جو یہ فرمایا تھا کہ "مضمحل ہو جائیں گے اس خوف سے سب جن وانس + زار بھی ہوگا تو ہوگا اس گھڑی باحالِ زار"۔ خدا کی قدرت کا کتنا عجیب نظارہ نظر آتا ہے کہ دنیا کے بادشاہوں میں سب سے بڑا۔ حد درجہ کا با اقتدار اور کامل مختار اور دینی و دنیوی حیثیتوں سے سارے روس کا مقتدا زار روس سمجھا جاتا تھا۔ سو سب سے زیادہ جس کی حالت زار ہوئی وہ زار روس ہی تھا۔ وہ اور اس کا خاندان قید کیا گیا۔ ذلیل کیا گیا۔ اور آخر کار گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ اور ہمیشہ کے لئے زار کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ غرضکہ دوست دشمن مشرق و مغرب سب کو اعتراف ہے کہ یہ عالمگیر جنگ ایک نمونہ قیامت تھی جس کی نظیر بلکہ عشر عشیر بھی دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اس قیامت صغریٰ نے دنیا میں ایسا حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا کہ ساری دنیا کی تاریخ کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک پری وار ایج (Prewar age.) دوسرا پوسٹ وار ایج (Post-war age.) یعنی ایک زمانہ قبل از جنگ عظیم

اور دوسرا زمانہ "بعد از جنگ عظیم" اسی طرح اس سے جغرافیہ کا سیاسی نقشہ ہی بدل گیا۔ تہذیب و تمدن نے پلٹا کھایا۔ مذہبی نقطۂ نظر بدل گیا۔ یورپ کی عیسائیت سے محبت رخصت ہوئی کیونکہ اُنہوں نے اس مذہب میں قوموں کی آپس کی کشمکش اور تباغض و تحاسد کا کوئی علاج نہ پایا۔ اس جنگ نے مسیحی مذہب کی ناکامی پر مہر لگا دی۔ اب اسلام کی طرف طبائع متوجہ ہونے لگیں اور اس کی عزت دلوں میں گھر کرنے لگی۔ لیکن یہ جھٹکا اس سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کیلئے کافی نہ تھا۔ حضرت مرزا صاحب کے الہام میں پیشگوئی تھی کہ "وہ چمک دکھلائے گا اپنے نشاں کی پنج بار" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زلزلۂ جنگ کے پانچ جھٹکے لگیں گے۔ تب حضرت مرزا صاحب کی دعا کے مطابق ان خدا سے دور افتادہ قوموں کا سر خدا کے آستانہ پر گریگا جیسا کہ آپ ایک دعائیہ نظم میں فرماتے ہیں :- ؎

یک نشاں بنما کہ تا نورت درخشد در جہاں
تا شود ہر منکرِ ملت محامد خوانِ تو

گر زمیں زیر و زبر گردد ندارم ہیچ غم
غم ہمیں دارم کہ گم گردد رہِ رخشانِ تو

گفتگو و بحث در دیں دردسر بسیار ہست
قصہ کوتاہ کن بہ آیاتِ عظیم الشّانِ تو

از زلازل جنبشے دہ فطرتِ اغیار را
تا مگر آیند ترساں سوئے آں ایوانِ تو

چشمۂ رحمت رواں کن در لباسِ زلزلہ
تا بکے سوز و بغم ایں بندۂ گریانِ تو

زلزلہ کا دوسرا جھٹکا چنانچہ اب یہ جو جنگ عظیم دوبارہ ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی ہے یہ بھی انہی پانچ موعودہ زلزلوں کے جھٹکوں میں سے ایک جھٹکا ہے۔ اور یہ ایسا سخت جھٹکا ہے کہ اس کے آگے پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہی تھی گرد ہو کر رہ گئی۔ اور اس کی ہلاکت اور وسعت پہلی جنگ عظیم سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے جس سے نہ یورپ بچا ہوا ہے نہ ایشیا نہ افریقہ اور نہ امریکہ نہ آسٹریلیا اور نہ بحرالکاہل کے جزائر۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اس کا نقشہ کیسے صریح الفاظ میں کھینچا تھا فرماتے ہیں :- ؎

وہ چمک دکھلائیگا اپنے نشاں کی پنج بار
یہ خدا کا قول ہے سمجھو گے سمجھانے کے دن

میرے دل کی آگ نے آخر دکھایا کچھ اثر
آ گئے ہیں اس زمیں پر آگ بھڑکانیکے دن

تم تو ہو آرام میں پر اپنا قصہ کیا کہیں
پھرتے ہیں آنکھوں کے آگے سخت گھبرانیکے دن

دن بہت ہیں سخت اور خوف و خطر در پیش ہے
پر یہی ہیں دوستو اس یار کو پانیکے دن

پھر حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۵۷ پر کس قدر صاف الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں۔ اور اے جزائر کے رہنے

والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ مَیں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں۔ وہ واحد یگانہ ایک مدت تک خاموش رہا اور اس کی آنکھوں کے سامنے مکروہ کام کئے گئے اور وہ چپ رہا مگر اب وہ ہیبت کے ساتھ اپنا چہرہ دکھلائے گا جس کے کان سننے کے ہوں سُنے کہ وہ وقت دُور نہیں۔ مَیں نے کوشش کی کہ خدا کی امان کے نیچے سب کو جمع کروں پر ضرور تھا کہ تقدیر کے نوشتے پورے ہوتے "

اسی عالمگیر جنگ کے متعلق جو ان پانچ زلزلوں میں سے ایک ہے حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۵۶ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"اور اس قدر موت ہوگی کہ خون کی نہریں چلیں گی۔ اس موت سے پرند چرند بھی باہر نہیں ہوں گے اور زمین پر اسقدر سخت تباہی آئے گی کہ اس روز سے کہ انسان پیدا ہوا ایسی تباہی کبھی نہیں آئی ہوگی۔ اور اکثر مقامات زیر و زبر ہو جائیں گے کہ گویا اُن میں کبھی آبادی نہ تھی۔ اور اس کے ساتھ اور بھی آفات زمین اور آسمان میں ہولناک صورت میں پیدا ہوں گی کہ ہر ایک عقلمند کی نظر میں وہ باتیں غیر معمولی ہو جائیں گی۔۔۔۔۔۔ وہ دن نزدیک ہیں بلکہ دروازے پر ہیں کہ دنیا ایک قیامت کا نظارہ دیکھے گی "

کیا یہ ٹھیک ٹھیک نقشہ اس موجودہ جنگِ عظیم کا نہیں؟ کہ اس سے نہ یورپ امن میں ہے نہ ایشیا محفوظ ہے۔ اور جزائر پر جو جاپان کے ہاتھوں آفت آئی ہے وہ کس قدر عجیب ہے۔ کس طرح اس جنگ میں شہروں کے شہر گر کر فنا ہوگئے کہ ان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بڑے بڑے شہروں میں ایک عمارت بھی قائم نہ رہی۔ بھری آبادیاں ویران ہو کر رہ گئیں۔ اور کیا یہ سچ نہیں کہ جب سے کہ انسان پیدا ہوا ہے ایسی عالمگیر تباہی کبھی نہیں آئی۔ آج دنیا ایک قیامت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے ذرا زمانۂ ماضی پر نظر ڈالو۔ آج سے ۳۵ برس پہلے جس وقت یورپ امن کی نیند سوتا تھا اور تہذیب و ترقی کے نشہ میں مست تھا اور تمام دنیا کے ملکوں اور قوموں پر تسلط کرنے کے لئے یہ گوری قومیں کس طرح سر جوڑ کر گھر بیٹھے حصے بخرے کر لیا کرتی تھیں۔ اور مشہور خلائق تھا کہ ٹوپی والے ٹوپی والے سب ایک ہیں۔ اس وقت یہ نقشہ جنگ اور تباہی کا جس نے اپنی قلم سے کھینچ کر رکھ دیا کیا وہ خدا تعالیٰ کے الہام اور کشف کے بغیر ایسا کر سکتا تھا؟ یہ انسانی عقل و فہم کی رسائی اور دماغ کی پرواز سے بہت بالاتر ہے۔ یہ وہ علمِ غیب تھا جو خدا نے اپنے بندہ مرزا غلام احمد پر نازل فرمایا تھا تا انسان کا ایمان خدا پر اور مسلمان کا ایمان اسلام کی فتح و کامیابی پر مستحکم اور پختہ ہو سے

بنگر اے قوم نشانہائے خداوند قدیر　　　چشم بکشا کہ بر چشم نشانیست اسٹ کبیر

صدہا نشانات میں سے مَیں نے بطور نمونہ یہ چند پولٹیکل پیشگوئیاں حضرت اقدس مرزا صاحب کی یہاں درج کردی ہیں جو قرآن اور آنحضرت صلعم کی اتباع کے ثمرات اوران کی صداقت اور اسلام کے زندہ مذہب ہونے پر تازہ نشانات میں سے ہیں۔ اگر در خانہ کس است ہمیں بس است۔

حضرت اقدس مرزا صاحب نے مسلمانوں کے سامنے کیا نصب العین رکھا؟

آج سیاست کا زمانہ ہے۔ ہر ایک قوم اور اس کے افراد کے دل و دماغ میں یہی دھن سمائی ہوئی ہے کہ کیا طریق اختیار کیا جائے جس سے سلطنت حاصل کی جائے یہاں تک کہ مسلمانوں نے بھی اسلام کے غلبہ کو اور سلطنت حاصل کر لینے کو ایک دوسرے کے مترادف سمجھ لیا۔ پس لازمی بات تھی کہ انہیں اس بات سے سخت صدمہ بلکہ بیزاری ہوتی۔ جب حضرت اقدس مرزا صاحب نے یہ اعلان کیا کہ اسلام کا غلبہ ہمیشہ سے دلائل و براہین اور اس کی روحانیت سے ہوتا چلا آیا ہے اور اسی طریق سے آیندہ بھی ہوگا۔ کسی مذہب کا تلوار کے ذریعہ غالب ہونا بالکل ایک بیمعنی بات ہے۔ اور یہ صدمہ اور بیزاری اور بھی زیادہ اس وجہ سے ہوئی کہ جس مسیح و مہدی نے آنا تھا اس کی نسبت مسلمانوں کے دلوں میں یہ غلط خیال بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے تلوار کے زور سے ہی کافروں کو مسلمان کرنا ہے اور مسلمانوں کی سلطنت قائم کرنی ہے۔ یہی حصول سلطنت کا خیال تھا جس کی وجہ سے عام طور پر مسلمانوں نے ایسے مسیح و مہدی کے ماننے میں بظاہر اپنا کچھ فائدہ نہ دیکھا جو تلوار کے ذریعہ انہیں سلطنت دلانے نہیں آیا تھا۔ لہذا اکثر مسلمانوں نے بیک زبان دریافت کیا کہ جب سلطنت حاصل کرنا منشا نہیں تو پھر وہ کیا نصب العین ہے جو مرزا صاحب مسلمانوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اسلئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تھوڑا سا اس امر کے متعلق یہاں عرض کردوں۔

مسیح و مہدی کے بارے میں تاریخ نے اپنے تئیں دہرایا

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ یہی غلط خیال جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ مسیح و مہدی جب آئیں گے تو وہ مسلمانوں کو سلطنت دلائیں گے۔ مسلمانوں کے لئے سچے مسیح و مہدی کی شناخت میں سب سے بڑی ٹھوکر کا باعث ہوا۔ ان کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ مرزا صاحب مسیح و مہدی تھے

تو ہمیں سلطنت کیوں نہ دلائی۔ بعض دفعہ تاریخ ایسے عجیب غریب طریق پر اپنے تئیں دہراتی ہے کہ انسان کو حیرت ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو یہ ٹھوکر بعینہ ویسی ہی لگی جیسی یہودیوں کو مسیح اسرائیلی کے وقت لگی تھی۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ مسیح جب آئے گا تو داؤد کا تخت دلائے گا لیکن جب مسیح ایک فقیرانہ اور صوفیانہ شان میں تشریف لائے تو سلطنت کی خواہاں قوم نے ان کا انکار کر دیا بلکہ جب ان کو صلیب پر چڑھانے کے لئے لیجانے لگے تو استہزاء کے طور پر ان کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر شور مچایا کہ "یسوع ناصری یہودیوں کا بادشاہ"۔ یہی حال یہاں ہؤا۔ مسلمانوں نے جب مسیح محمدی کو فقط دلائل و براہین اور روحانیت سے اسلام کے غلبہ کا وعظ کرتے دیکھا تو انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمیں تو سلطنت چاہیئے۔ اگر مرزا صاحب ہی مسیح و مہدی ہیں تو ہمیں سلطنت کیوں نہیں دلواتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نمونہ

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مصلح خواہ نبی ہو یا مجدّد۔ رسول ہو یا کوئی امام جو خدا کی طرف سے مامور ہو وہ اپنے زمانہ کے حالات حاضرہ اور ماحول سے جدا ہو کر کام نہیں کر سکتا۔ حضرت موسیٰ کو دیکھ لو۔ اپنی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانا بھی ان کا ایک مقصد تھا۔ لیکن انہوں نے فرعون کے مقابلہ میں جہاد کا اعلان نہیں کیا۔ اتنا ہی کہا کہ مجھے اپنی قوم سمیت اس ملک سے ہجرت کر جانے دو۔ اگر وہ اعلان جنگ کرتے تو نہ پاس دولت اور جنگ کا سامان تھا۔ نہ قوم میں شجاعت اور بہادری تھی آخر وہی لوگ تھے جنہیں جب بیابان میں ایک شہر کو فتح کرنے کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے کہ **فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون**۔ کہ اے موسیٰ تو اور تیرا رب جا کے لڑ۔ ہم تو یہ بیٹھے ہیں۔ ہم سے تو ان زبردست لوگوں کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ پس حضرت موسیٰ کے لئے ان حالات میں اور راہ ہی کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی قوم کو لیکر کسی اور ملک میں ہجرت کر جائیں۔ وہ حالات حاضرہ سے الگ ہو کر کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ یہی حال آج ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں وحدت، قوت، دولت، شجاعت ہوتی تو وہ ہندوستان کی سلطنت ہی کیوں کھو دیتے۔ تو کوئی شخص خواہ وہ مسیح و مہدی ہی کیوں نہ ہو انہی آدمیوں کو لیکر دوبارہ سلطنت کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ لوگ دشمن کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہجرت کا بھی کوئی موقعہ نہیں اور نہ کوئی جگہ ہے جہاں کئی کروڑ مسلمان سما سکیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہؤا ہجرت کا تجربہ مسلمانوں کو کیسا تلخ ہؤا کہ سن کر رونا آتا ہے۔ تو پھر ایک مصلح کیلئے یہی راہ عمل رہ جاتی ہے کہ قوم میں سے وہ

نقص اور عیوب دُور کئے جائیں جو سلطنت کے زوال کا موجب ہوئے۔ اور وہ خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں جن سے قومیں سلطنت کی مالک ہو جاتی ہیں ۔یعنی وہ اپنی گری ہوئی قوم کی تعمیر کرے ۔ دنیا عالم اسباب ہے ۔ اسباب سے کام لئے بغیر چارہ نہیں ۔ خدا کے مامور ایک بیج ڈالنے آتے ہیں جس کی اگر آبیاری کی جائے تو وہ بعد میں ایک بڑے درخت کی صورت میں ایک عالم پر سایہ افگن ہو جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نمونہ

اس معاملہ میں حضرت مرزا صاحب کے طرز عمل پر بھی غور کرنے سے قبل ذرا حضرت عیسیٰ کے طرز عمل پر بھی غور کرو جن کی مماثلت کا حضرت مرزا صاحب کو دعویٰ تھا۔ وہ ٹھیک انہی حالات میں مسیح ہو کر آئے تھے جن حالات میں حضرت مرزا صاحب تھے ۔ ان کی قوم بھی رومن گورنمنٹ کے ماتحت ایک رعیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُنہوں نے آتے ہی رومن گورنمنٹ کے خلاف جہاد کا اعلان نہیں کیا ۔بلکہ جو راہ عمل اختیار کی وہ یہی تھی کہ اپنی گری ہوئی قوم کی تعمیر شروع کر دی ۔ مگر قوم کو اپنی گری ہوئی حالت اور گرے ہوئے اخلاق کا احساس نہ تھا۔ ان کے سامنے ایک ہی نصب العین تھا کہ سلطنت حاصل کی جائے ۔ حالانکہ کوئی قوم سلطنت حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس میں وہ لوازمات نہ پائے جائیں جو سلطنت کے حصول کے لئے ضروری ہوتے ہیں مگر انہوں نے جلد بازی کر کے مسیح کا انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دائمی غلامی کی لعنت ان پر پڑ گئی ۔ مَیں کہتا ہوں کیا حضرت مرزا صاحب بھی انہی حالات میں مسیح ہو کر نہیں آئے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے ؟ آج ان کی قوم بھی برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ایک رعیت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ انہوں نے بھی پہلے مسیح کی طرح آتے ہی سیفی جہاد کا اعلان نہیں کر دیا ۔ ہاں تعمیر قومی شروع کر دی لیکن مسلمانوں نے اسی طرح جلد بازی کر کے انکار کر دیا جس طرح یہود نے انکار کر دیا تھا۔

خدا کے رسولوں اور ماموروں کا نصب العین

قومی تعمیر کرنیوالوں کے سامنے ہمیشہ ایک خاص نصب العین ہوا کرتا ہے ۔ دنیا کے پیچھے دوڑنے والے سیاسی لیڈروں کے سامنے سب سے بڑا نصب العین حصول سلطنت ہوا کرتا ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نبیوں اور رسولوں اور مامورین الٰہی اور مصلحین ربانی کے سامنے بھی یہی نصب العین ہوا کرتا ہے یا کوئی اور ؟ مذہبی تاریخ پر غور کرنے والے کیلئے اس بات کو پا لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ خدا کے رسولوں اور ماموروں کا نصب العین ہرگز ہرگز دنیا کی سلطنت نہیں ہوتی ۔بلکہ ان کا یہ نصب العین قرار دینا ان کی ہتک ہے ۔ ان کی لغت میں خدا کے سوا کسی غیر کو نصب العین بنانا شرک اور ان کی تعلیم توحید کے منافی ہے ۔ فقط لا الٰہ الا اللہ یعنی دنیا میں خدا کے نام کو بلند کرنا اور اسکی توحید

کو پھیلانا ان کی زندگی کا مقصود ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ جس بادشاہت کو قائم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے وہ خدا کی بادشاہت ہوتی ہے نہ کہ انسان کی۔ اور یہی وہ سیاست ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی سیاست کہلانے کی مستحق ہے۔

خدا کی بادشاہت انسانی قلوب پر قائم ہوتی ہے

یاد رہے کہ خدا کی بادشاہت انسانی قلوب پر قائم ہوا کرتی ہے۔ زمین پر خدا کی بادشاہت پھیلانا تو ایک تحصیل حاصل امر ہے۔ کیونکہ خدا کی بادشاہت تو آسمانوں اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لہٗ ملک السمٰوات والارض کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔ پس وہ آسمانی بادشاہت جس کے زمین پر آنے کیلئے حضرت مسیح اور ان کے حواری دعا مانگتے رہے۔ اور جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی بےمثل شان کے ساتھ آسمان سے زمین پر آئی۔ وہ درحقیقت خدا کی وہ بادشاہی تھی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کے قلوب پر مستولی ہوئی۔ کیونکہ خدا کی بادشاہی اور اس کے قوانین کی فرمانبرداری جیسی محمد رسول اللہ صلعم کی قوم نے کر کے دکھائی۔ وہ دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ پس یہی وہ خدا کی توحید اور اس کی بادشاہی ہے جو انبیاء ورسل کا نصب العین ہوتی ہے اور جس کی فرمانبرداری کا نام الاسلام ہے اور جسے سامنے رکھ کر وہ اپنی قوم کی تعمیر کرتے ہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلعم کا نمونہ

حضرت مرزا صاحب حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے غلام اور آپ کے خلیفہ تھے وہ اپنے آقا سے جدا اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلعم کا نصب العین کیا تھا؟ میں عرض کر چکا ہوں کہ تمام انبیاء ورسل کا نصب العین سوائے لا الٰہ الا اللہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ دنیا میں خدا کی توحید اور اس کی بادشاہی قائم کرنا چاہتے ہیں تو محمد رسول اللہ صلعم کا نصب العین بھی سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ دشمنان اسلام یا دریوں وغیرہ نے آپ پر یہ الزام لگایا ہے کہ نعوذ باللہ آپ دنیا کی سلطنت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ہر ایک محقق اور تاریخ سے واقف جانتا ہے کہ یہ کس قدر دروغ اور بہتان ہے۔ خود اہل مکہ نے آپ کے سامنے دولت عورت، سلطنت سبھی کچھ تو پیش کیا کہ یہ سب کچھ لے لو اور توحید کا وعظ چھوڑ دو۔ لیکن آپ نے ان سب چیزوں کو نہایت حقارت سے رد کر دیا۔ اور خدا کی توحید اور خدا کی بادشاہت کو قائم کرنے کا نصب العین ایک لمحہ کے لئے بھی ترک نہ کیا۔ اور یہ اتنا بلند نصب العین تھا کہ دنیا کا کوئی نصب العین اس کے پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ دنیا داروں کے نصب العین میں نفس اور اسکی خواہشات کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی فرد کی خواہش نفس ہو یا کسی قوم کی۔ وہ لوگ باوجود دنیا کی سلطنت

کو حاصل کرلینے کے نفس اور شیطان کی غلامی سے آزاد نہیں ہوتے لیکن خدا کی توحید اور اس کی بادشاہی کو نصب العین بنانے میں نفس اور خواہشات کی غلامی سے انسان بکلی آزاد ہو جاتا ہے اور ان حالات میں جو قوم کی تعمیر ہوتی ہے اور اس میں جو قومی کیریکٹر پیدا ہوتا ہے وہ اسقدر بلند اور پاکیزہ ہوتا ہے کہ اس کے کمالات اور خوبیوں کو دنیا کی کوئی قومی تعمیر پا نہیں سکتی۔ اور اس خدائی کلچر اور تہذیب کے سامنے تمام دنیوی اور مادی کلچر اور تہذیب کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ خدا کی بادشاہت کو قائم کرنیوالے اگرچہ دنیا کی سلطنت کے پیچھے نہیں دوڑتے مگر دنیا کی سلطنت ان کے پیچھے دوڑتی ہے اور ان کے قدموں پر اپنا سر رکھتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے لو حضرت محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کی قوم کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے نقطہ خدا کے نام کو دنیا میں بلند کرنا اور اسی کی توحید اور بادشاہی کو انسان کے قلوب میں قائم کرنا چاہا تھا۔ اس نصب العین کو مدنظر رکھ کر جو قوم آپ کی تیار ہوئی اس کا قومی کیریکٹر کس قدر حیرت انگیز ہمیں نظر آتا ہے کہ ایک جاہل اور بت پرست وحشی اور درندہ قوم پرلے درجہ کی مہذب اور باخدا قوم بن گئی۔ اور دنیا کی سلطنتیں اس قوم کے قدموں پر گرتی چلی گئیں۔ اور یہ اس لئے تھا کہ وہ اس بات کا حق رکھتے تھے کہ خدا کی زمین پر خلیفہ بنیں۔ یہی معنے ان الارض یرثھا عبادی الصّٰلحون کے ہیں کہ جب اس طرح ایک قوم بن جاتی ہے اور اس کے قومی کیریکٹر کی اصلاح ہو جاتی ہے تو وہ زمین کے وارث ہونے کی مستحق ہو جاتی ہے۔ پس محمد رسول اللہ صلعم یا آپ کی قوم کا یہ نصب العین قرار دینا کہ ان کا مقصد نقطہ دنیا کی سلطنت کا حصول تھا ان کی صریح ہتک اور دشمنوں کا بہتان ہے۔ ایک خدا پرست مُوحد انسان کا نصب العین اسقدر ادنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس کی نظر میں یہ ایک بُت ہے جس کا انسانی قلب کے بیت اللہ میں ہونا شرک اور بت پرستی ہے۔ اس کا نصب العین نقطہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُسی کی بادشاہی کو انسان کے قلب میں قائم کرنا ہوا کرتا ہے۔ ہاں جب انسان کے قلب میں خدا کی بادشاہی قائم ہو جاتی ہے تو بھر ظاہر میں اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ دنیا کی بادشاہیاں اس کی غلام ہو جاتی ہیں اور وہی قوم ہوتی ہے جس کی بادشاہی کی نسبت یہ کہنا بجا ہوتا ہے کہ یہ خدا کی بادشاہی ہے جو زمین پر قائم ہوئی اور اسی کو صحیح معنوں میں اسلامی بادشاہی کہا جائے گا کیونکہ اس کے حاملین کے قلوب میں خدا کی بادشاہی اور اس کے قوانین کی حرمت ایسی مستحکم ہوتی ہے کہ خدا کے قوانین کی فرمانبرداری کا جذبہ ان کے ہر ایک نفسانی اور مصلحتی اور سیاسی جذبہ پر غالب ہوتا ہے۔ ایک مسلمان بادشاہ کی بادشاہی جب تک وہ دل سے خدا کی بادشاہت کا فرمانبردار نہ ہو اور اس کے قوانین کی حرمت اور عزت کے سامنے ہر ایک اپنی مصلحت اور سیاست اور نفسانی اغراض کو وہ پس پشت نہ ڈال دے صحیح معنوں

میں اسلامی پادشاہی نہیں کہی جا سکتی۔ اسلامی سیاست جس کا ان دنوں اسقدر شہرہ ہے یہی ہے کہ دنیا میں خدا کی پادشاہی قائم کی جائے نہ کہ کسی خاص فرد یا کسی خاص قوم کی پادشاہت۔ کوئی مسلمان فرد یا قوم اگر اپنی پادشاہت میں خدا کی پادشاہت کو قائم کر کے نہیں دکھاتی تو اُسے کسی خاص مسلمان قوم کی پادشاہی بے شک کہہ لو لیکن اسے اسلامی پادشاہی نہیں کہا جا سکتا۔

خدا کی بادشاہی قائم کرنے کا ذریعہ

پس انسان کے قلب میں خدا کی بادشاہی کا قائم کرنا وہ حقیقی نصب العین یا اسلامی سیاست ہے جو تمام انبیاء و رسل اور ہماری سرکار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنظر تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قلوب میں خدا کی بادشاہی کے قائم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ جہاں تک مذہب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور قرآن کریم سے ہمیں سمجھ آتی ہے وہ ذریعہ ہے "خدا پر زندہ ایمان" یعنی انسان کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ خدا ہے اور وہ بندوں کے معاملات میں متصرف بالارادہ ہے اور اسی کی بتائی ہوئی ہدایات اور قوانین پر چلنے سے انسان فلاح پا سکتا ہے اس زندہ ایمان سے انسان میں قوت عمل پیدا ہوتی ہے اور جیسے جیسے خدا کے وعدوں پر ایمان ترقی کرتا ہے انسان میں ایثار اور قربانی کی روح ترقی کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے مسلمانوں کا قومی کیرکٹر یا دوسرے لفظوں میں اسلامی کیرکٹر پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں خدا کی توحید اور اس کی پادشاہی کو جب ایک قوم اپنا نصب العین بنائے گی تو یہ اسقدر بلند نصب العین ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے باہمی جھگڑے اور منافشات ختم ہو کر قوم میں حقیقی اتحاد اور نظام پیدا ہو جانا لابد ہے۔ جو انسان کی دینی ترقیات کے علاوہ دنیوی ترقیات کے لئے بھی بطور جڑ کے ہے۔ کیونکہ جب کسی قوم میں قومی کیریکٹر اور اتحاد و نظام پیدا ہو جاتا ہے تو اس قومی تعمیر کے بعد دنیا کی سلطنت و حکومت اس کے قدموں میں آپڑنے کو اپنی خوش نصیبی اور فخر سمجھا کرتی ہے۔ [1]

---

[1] حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے نصب العین کو واضح کرنے کے لئے میں یہاں قرآن کریم کی چند آیات کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وھو ہذا

حضرت محمد رسول اللہ صلعم جو پیغام خدا کی طرف سے لائے تھے وہ اسلام کا تھا جس کے معنے ہیں خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اس سے اور اس کی مخلوق سے سچی صلح آپ نے دنیا کو صلح امن اور سلامتی کا پیغام دیا اور وہ ہدایتیں پیش کیں جن سے دنیا میں امن اور سلامتی اور سچی صلح قائم ہو سکتی ہے چنانچہ بطور نمونہ دیکھ لو۔ عرب کی قومیں جو دن رات ایک دوسری سے برسرپیکار تھیں اور آپس کی خونریزی ان کا شعار بن گیا تھا جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ واذکروا نعمۃ

حضرت مرزا صاحب نے خدا کی بادشاہت قائم کرنے کیلئے کیا طرز عمل اختیار کیا

اب مَیں دکھانا چاہتا ہوں کہ حضرت مرزا صاحب نے خدا کی بادشاہت کو قائم کرنے کے لئے اپنے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی پیروی کی یا نہیں ؟ اور قومی تعمیر کے مذکورہ بالا ذریعہ کو کہاں تک کام میں لائے ؟

حضرت مرزا صاحب جب منصب مجددیت و مسیحیت پر مامور ہوئے تو مسلمانوں کی حالت

اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً وکنتم علی شفا حفرۃٍ من النّار فانقذکم منہا ط (آل عمران) کہ اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ نے (اسلام کے ذریعہ) تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پھر خدا نے تم کو بچا لیا یعنی قریب تھا کہ اس آپس کی جنگ کی آگ میں تم اپنی ہستیاں ہمیشہ کیلئے بھسم کر دو تو یہ خدا کا فضل تھا کہ اس نے اسلام کے ذریعہ ہمیں اس ہلاکت سے بچا لیا اور تمہارے کینے دور کر کے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا پس اسلام کا تو وہ صلح اور امن اور سلامتی کا پیغام ہے کہ کیسی ہی آپس میں لڑنے والی قومیں ہوں اگر اس پیغام کو قبول کر لیں تو آپس میں بھائی بھائی بن جائیں گے ۔ آج بھی یورپ کی قوموں کی آپس کی عداوتوں اور خونریزیوں کا علاج اسی میں ہے کہ وہ اپنی تمام ازموں یعنی بالشوازم ، نازی ازم ، نیشنل ازم ، وغیرہ کو ترک کر کے اسلام کو قبول کر لیں تو بھائی بھائی بن جائیں گے اور ان خونریزیوں کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ یہ وہ مجرب نسخہ ہے جو ایک دفعہ عرب میں آزمایا جا چکا ہے ۔ لیکن کس قدر ماتم کا مقام ہے کہ خود آنحضرت صلعم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ نے اسلام پھیلانے کے لئے ضروری سمجھا کہ پہلے سلطنت قائم کی جائے تا اس کے ذریعہ حکومت کے رعب اور تلوار کے زور سے اپنے مذہب کو منوایا جائے ۔ اور اس سلطنت کے حصول کیلئے عرب میں جنگ اور خونریزی کا سلسلہ جاری رکھا تا وقتیکہ اپنا مقصود نہیں حاصل کر لیا ۔ پادریوں کی طرف سے تو یہ الزام لگایا ہی جاتا تھا اور ان کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے آریہ تو گندہ دہنی کیا ہی کرتے تھے ۔ لیکن کس قدر رنج کا مقام ہے کہ اکثر سطحی خیالات کے مسلمان علما کا بھی یہی خیال ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور قرآن کے خلاف ہے جو دین میں کسی جبر کو جائز نہیں رکھتا ۔ جیسا کہ فرماتا ہے لا اکراہ فی الدین ۔ البتہ یہ ایک الزام ہے جو دشمنوں نے لگایا تھا اور جس کی نادان دوستوں نے اپنے ہوائے نفس کے ماتحت تائید کی ۔ محض اس لئے کہ ان کی نگاہ میں انسانی ترقی کا منتہائے نظر سلطنت ہے ۔ یہ بھی اسی دجالیت کا اثر ہے جو آج زمانہ

یہ تھی کہ خدا پر زندہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ان میں کوئی قومی کیرکٹر نہ رہا تھا۔ اور خدا کے وعدوں پر ایمان نہ رہنے سے ان پر ایک مایوسی کی حالت طاری تھی جو کسی قوم پر اگر طاری ہو جائے تو اُسے تنزل و ادبار کے گڑھے سے کبھی نکلنے اور اُبھرنے نہیں دیتی اور آخر کار اسے ہلاک کر کے چھوڑتی ہے۔ میں ذرا یہاں تفصیل سے ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

پر مسلط ہے کہ دنیا کی حدود سے نظریں باہر نکل ہی نہیں سکتیں اور یہ واقعات کے بھی خلاف ہے یوں کہ محمد رسول اللہ صلعم نے قطعاً لڑائی کی ابتدا نہیں کی۔ ہاں آپ کی بعثت کے ساتھ ہی آپ کے پیغام توحید و اسلام کو سن کر کفار مکہ نے ضرور آپ سے لڑائی کی ٹھان لی۔ اور آپ کو برابر تیرہ برس مکہ میں طرح طرح سے دکھ اور تکلیف پہنچائی۔ آپ کے پیغام پر نہ خود کان دھرتے نہ کسی کو دھرنے دیتے آپ کے وعظ و تبلیغ میں شور مچا دیتے۔ جو لوگ سننا چاہتے ان کو یہ کہہ کر برگشتہ کر دیتے کہ یہ شخص ساحر ہے یا مجنون ہے۔ باہر کے قبائل آتے اور آپ انہیں تبلیغ کرنا چاہتے تو وہاں بھی جا پہنچتے اور ہر طرح کی روکیں ڈالتے۔ جو اسلام لے آتے انہیں سخت اذیتیں پہنچاتے۔ قتل کر دیتے۔ خود رسول اللہ صلعم کو تین برس ایک گھاٹی میں محصور رکھا۔ آپ سے ہر طرح کا مقاطعہ کیا۔ بھوک سے مار ڈالنا چاہا آپ کو قتل کرنے کی تدبیریں کیں۔ آخر آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ مدینہ تشریف لے گئے تو ایک فوج گراں لیکر چڑھ دوڑے اور برابر پانچ برس جنگ کا سلسلہ قائم رکھا۔ مدینہ میں پہنچ کر مسلمانوں کی جان پر آبنی تو قرآن نے مسلمانوں کو فقط اتنی اجازت دی کہ قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا (البقرہ) کہ اللہ کی راہ میں تم جنگ کرو فقط ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھنا۔ یعنی ان لوگوں سے نہ لڑنا جو تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ گویا جنگ کرنے کی اجازت فقط مدافعانہ رنگ میں اپنی زندگی بچانے کی خاطر دی۔ دوسرے کی زندگی کو خواہ مخواہ ہلاک کرنا محض اپنی سلطنت قائم کرنے کی خاطر یہ اسلام کی ہدایت نہیں بلکہ دنیا پرست قوموں کا طریق ہے۔

کفار کے اس ظلم و ستم اور انفرادی اور جنگوں کی شکل میں اجتماعی حملوں پر اٹھارہ برس گزر چکے تھے کہ حضرت نبی کریم صلعم نے ۶ھ ہجری میں رویا میں دیکھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ میں گئے ہیں اور طواف کیا ہے اور وہاں احرام اتارنے کے لئے کوئی بیٹھا سر منڈا رہا ہے اور کوئی بال کتروا رہا ہے۔ چونکہ نبی کی رویا بھی وحی خفی ہوتی ہے آپ نے عمرہ کا ارادہ کر لیا مکہ کے قریب پہنچے تو کفار مکہ آپ کے مکہ میں داخل ہونے کے مزاحم ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

زندہ خدا پر ایمان سے قومی کیریکٹر کو قائم کیا

پہلے میں قومی کیریکٹر کو لیتا ہوں۔ یاد رہے کہ قومی کیریکٹر کا لفظ جب مَیں مسلمانوں کے لئے استعمال کروں گا تو اس کا مطلب اسلامی کیریکٹر ہوگا۔ وجہ یہ کہ اسلام کسی قوم یا وطن میں محدود نہیں وہ ہر ایک قومیت اور وطنیت کو توڑ کر صرف اپنی ایک قوم بناتا ہے۔ جس کا نام مسلمان رکھتا ہے اور جس کا وطن ساری دنیا ہے۔ پس مسلمان کا "قومی کیریکٹر" اور "اسلامی کیریکٹر"

حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا اور حضرت عثمان کو مکہ والوں کے پاس بھیجا کہ ان کو سمجھا دیں کہ ہم لڑنے نہیں آئے ہیں فقط عمرہ کرنے آئے ہیں۔ ہمیں اس کی اجازت دیدی جائے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پتہ لگا کہ انہوں نے بجائے گفت و شنید کرنے کے حضرت عثمان کو قید کر لیا ہے اس کے یہ معنے ہوئے کہ وہ لڑائی پر آمادہ ہیں اور اب لڑائی کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ اس وقت آپ نے ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جان نثاری کی بیعت لی۔ اور یہ بیعت اس قدر جناب الٰہی میں پسند آئی کہ اس کا نام ہی بیعت رضوان رکھا گیا۔ صحابہ نے جو ۱۴.. کی تعداد میں تھے نہایت شرح صدر کے ساتھ آنحضرت صلعم کے ہاتھ پر جان نثاری کی بیعت کی۔ وہ یہ خوب جانتے تھے کہ ہم دشمن کے گھر میں ہیں اور یہاں لڑنے میں نہایت خطرہ ہے اور کچھ عجب نہیں کہ سب کے سب یہیں مر کر فنا ہو جائیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ جو خدا پر زندہ ایمان ان کے دلوں میں پیدا ہو چکا تھا اس نے ایک منٹ کے لئے بھی ان کے دلوں میں گھبراہٹ یا بزدلی کو آنے نہ دیا۔ اور نہایت سکینت اور طمانینت کے ساتھ انہوں نے بیعت کے ذریعہ اپنی جان اور اپنا سب کچھ جو دنیا میں تھا خدا کی راہ میں قربان کر دینے کا اقرار کیا۔ اس بیعت کے بعد کفار مکہ کو کچھ سمجھ آگئی۔ انہوں نے حضرت عثمان کو نہ صرف چھوڑ دیا بلکہ ان کے ساتھ اپنے ایک نمائندہ سہیل ابن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا تا آنحضرت صلعم کے ساتھ شرائط صلح طے کرے۔ اس نے آکر اس برس کیلئے صلح کرنی چاہی اور ایسی کڑی شرطیں پیش کیں کہ صحابہ کی حمیت و غیرت کبھی ان کو قبول نہ کر سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ:-

۱۔ اس سال بغیر عمرہ کے واپس چلے جائیں اگلے سال عمرہ کیلئے آئیں مگر اس وقت بھی کوئی مسلمان تلوار میان سے نہ نکالے اور تین دن سے زیادہ مکہ میں نہ ٹھہریں۔

۲۔ اگر کوئی مسلمان اسلام سے برگشتہ ہو کر قریش سے جا ملے گا تو وہ واپس نہیں دیں گے اور اگر کوئی قریش کا آدمی مسلمان ہو کر مسلمانوں سے جا ملے گا تو مسلمانوں کو اسے واپس دینا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی اہانت آمیز شرطیں سن کر صحابہ کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ لیکن حضرت نبی کریم صلعم نے

آپس میں مترادف الفاظ ہیں۔ اب اصل حقیقت سنئے وہ یہ کہ حضرت مرزا صاحب جب منصب مجددیت پر مامور ہوئے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں میں قومی کیریکٹر کوئی باقی نہ رہا تھا جس کے بغیر کوئی قوم دین تو دور رہا دنیا میں بھی نہ سلطنت حاصل کر سکتی ہے اور نہ غیر قوموں کی نظروں میں کوئی عزت پا سکتی ہے۔ آج مغرب کی زندہ قوموں میں جو برسر حکومت ہیں یا دنیا میں عزت کی نظروں سے

نتیجہ صلح حدیبیہ

یہ سب شرطیں منظور کر لیں جس سے صحابہ کی بڑی دل شکنی ہوئی۔ آخر حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ ہم حق پر نہیں ہیں"؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "ہاں۔ ہیں" عرض کیا کہ ہم اس طرح دب کر کیوں صلح کریں؟ فرمایا "میں خدا کا رسول ہوں جو کچھ کرتا ہوں خدا کے حکم سے کرتا ہوں"۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ "کیا آپ نے نہ فرمایا تھا کہ ہم خانہ کعبہ جائیں گے اور طواف کریں گے"؟ فرمایا "ہاں کہا تھا لیکن یہ میں نے کب کہا تھا کہ اسی سال یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم یقیناً خانہ کعبہ میں پہنچو گے اور طواف کرو گے"۔ چنانچہ اگلے سال ایسا ہی ہوا۔ غرضیکہ یہ صلح نہایت دب کر کی گئی جس سے صحابہ کی غیرت و حمیت کو بڑی سخت ٹھیس لگی۔ ایک عامی انسان کہہ سکتا ہے کہ اگر مسلمان حق پر تھے اور خدا ان کے ساتھ تھا تو انہیں اس طرح دب کر صلح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ انسان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اور وہ طرح طرح کے وساوس اور بدگمانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن صحابہ کے اندر جو زندہ ایمان پیدا ہو چکا تھا اس نے یہاں بھی ان کے قدم میں لغزش نہ آنے دی۔ انہوں نے خدا کی مصلحتوں اور حکمتوں کے آگے اپنی آرا اور حمیتوں اور غیرتوں سب کو ذبح کر ڈالا اور اپنی صریح توہین پر بھی خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب رسول اللہ صلعم مدینہ کو واپس لوٹے تو رستہ میں سورۃ الفتح نازل ہوئی جس میں صلح حدیبیہ کو ہاں اسی صلح کو جو نہایت دب کر کی گئی تھی فتح مبین کے نام سے یاد کیا۔ ابتدائی آیات میں یہاں نقل کرتا ہوں:-

انا فتحنا لك فتحًا مبينًا ۙ ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراطًا مستقيمًا ۙ وينصرك الله نصرًا عزيزًا ۝ (اے پیغمبر یہ حدیبیہ کی صلح کیا ہوئی) حقیقت میں ہم نے تجھے کھلم کھلا فتح دی ہے۔ تاکہ اللہ اس گناہ سے تیری حفاظت کرے جو تیری طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے اور جو منسوب کیا جائے گا بعد میں اور اپنی نعمت کو تجھ پر پورا کرے اور تجھے سیدھے رستہ پر کامیاب کرے اور اللہ تجھے زبردست نصرت سے مدد دے۔ سب سے پہلے جو بات یہاں بتائی ہے وہ یہ ہے کہ یہ صلح حدیبیہ درحقیقت تیری فتح ہے چنانچہ

دیکھی جاتی ہیں یہ وصف موجود ہے کہ وہ قوم کے نام پر سب کچھ فدا کرنے کو تیار ہیں۔ وہ اپنی قوم کے خلاف کوئی کام کرنے پر آمادہ نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے برعکس ایک ہندوستانی مسلمان کو لیجئے۔ اس کے دین و ایمان کی قیمت زیادہ سے زیادہ چند مربعے زمین کے ہوتے ہیں یا کوئی خطاب یا عہدہ یا جاگیر چند پیسوں کے لئے اپنی قوم کے گلے کٹوانے والے مسلمان آپ جتنے چاہیں ہندوستان کے

تفسیر

حضرت عمرؓ کو جنہوں نے جرأت کر کے اس صلح پر اعتراض کر دیا تھا رسول اللہ صلعم نے بلوا کر یہ سورت سنائی تو انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہی صلح فتح مبین ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اور حق بھی یہی ہے کہ یہ صلح ہی محمد رسول اللہ صلعم کی فتح تھی کیونکہ عرب کے لوگوں کو جنگ کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلعم کے پاس آنے اور آپ کی تعلیم سننے اور آپ کا پاکیزہ نمونہ اور آپ کے اخلاق کو دیکھنے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ اس صلح سے میل جول اور آمد و رفت جو بڑھی تو آپ کی تعلیم اور آپ کے نمونہ نے دلوں کو فتح کر لیا۔ اور یا تو اٹھارہ برس کے لمبے عرصہ میں جب عربوں سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا فقط چودہ سو آدمی مسلمان ہوا تھا آپ کے ساتھ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر موجود تھا اور یا اس صلح کے بعد فقط ڈیڑھ برس میں مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی یعنی جنگ کے اٹھارہ برس میں تو چودہ سو آدمی مسلمان ہوئے اور صلح کے ڈیڑھ برس میں ساڑھے آٹھ ہزار سے زیادہ لوگ مسلمان ہو گئے وجہ یہی کہ صلح ہو جانے کی وجہ سے لوگوں کو ٹھنڈے دل سے اسلام کی تعلیم پر غور کرنے اور محمد رسول اللہ صلعم کو نزدیک سے دیکھنے اور آپ کی راستبازی اور آپ کا پاکیزہ نمونہ اور اخلاق فاضلہ معائنہ کرنے کا موقعہ ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حق دلوں کو فتح کرتا چلا گیا اور اسلام ترقی کرنے لگا۔ اس سے بڑھ کر محمد رسول اللہ صلعم کی فتح کیا ہو سکتی تھی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس صلح کے اندر ہم نے تجھے فتح مبین عطا فرمائی ہے۔ بہت سی غلط باتیں ہوتی ہیں جو کسی روحانی مقتدا اور خدا کے رسول کے متعلق دشمن منسوب کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اسے نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے تو وہ منسوب کردہ گناہ غلط ثابت ہو کر معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہی بات اس آیت میں فرمائی کہ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر تا کہ اللہ تیری حفاظت کرے اُن گناہوں سے جو تیری طرف منسوب کئے جا رہے ہیں۔ پہلے بھی اور بعد میں بھی منسوب کئے جائیں گے۔ یہاں ذنبک سے مراد آپ کے گناہ نہیں ہیں۔ انبیاء تو معصوم ہوتے ہیں اور آنحضرت صلعم کے پاک نمونہ کی تعریف تو خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کہ بیشک

شہر شہر قصبہ قصبہ میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسی قوم کسی آزادی یا حکومت یا عزت کی خواہش کر سکتی ہے۔ ان لوگوں کے لئے آزادی یا حکومت یا عزت کا نام لینا بھی ان پاک چیزوں کی ہتک اور گستاخی ہے۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ہر ہر قدم پر ان کا نفس اسلام پر مقدم ہو رہا ہے مسلم کشی، قوم فروشی ایک عام پیشہ بن گیا ہے۔ اور عزت و دولت کا ذریعہ۔ کیا گزشتہ چند سالوں کے

تفسیر

اللہ کے رسول میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ اور آپ کی تعریف میں فرمایا کہ انک لعلٰی خلق عظیم کہ بے شک تو نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق رکھنے والا ہے۔ بعثت سے پہلے بھی آپ مسلمہ طور قوم میں صادق اور امین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ پس ذنبك میں اضافت تملیکی نہیں بلکہ نسبتی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہابیل کی گفتگو میں آتا ہے باثمی واثمك (المائدہ) یہاں اثمك میں تو قابیل کا گناہ مراد ہے۔ اور اثمی سے مراد ہے وہ گناہ جو میرے بارے میں کرنے لگا ہے۔ اسی طرح سورۃ النحل میں آتا ہے این شرکائی۔ یہاں مراد میرے شریک نہیں بلکہ وہ شریک جو میری طرف تم منسوب کرتے ہو۔ اسی طرح یہاں ذنبك کے معنے وہ گناہ ہے جو تیری طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ زمانۂ ماقبل میں بھی اور زمانۂ مابعد میں بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی صلح سے گناہ سے کس طرح حفاظت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہی ہے کہ اس صلح سے قبل بہت سی باتیں دشمن آپ کی طرف منسوب کرتے تھے جو بہتان اور جھوٹ تھیں اور بہ وجہ جنگ کے لوگوں کو ان کی تحقیقات کا موقعہ نہ تھا۔ صلح ہو جانے سے لوگوں کو آنے جانے اور آنحضرت صلعم کو نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ذنب جو آپ کی طرف منسوب کئے جاتے تھے وہ غلط ثابت ہوئے اور آپ کی ان سے حفاظت ہو گئی۔ کیونکہ وہی حق کے قبول کرنے میں روک بنے ہوئے تھے گویا آپ کو نزدیک سے دیکھنے میں آپ کی فتح تھی۔ یعنی جو شخص آپ کو جتنا نزدیک سے دیکھے گا اتنا ہی آپ کا گرویدہ ہو جائے گا۔ آپ کے صادق اور صاحب اخلاق فاضلہ ہونے کی یہ بڑی زبردست دلیل تھی اسی لئے ابتدا سے دشمنوں کی یہی کوشش رہی کہ لوگ آپ سے ملنے نہ پائیں۔ جنگ میں ان کا یہ مقصد بہ وجہ احسن پورا ہو رہا تھا اب جو صلح ہوئی تو درحقیقت ان کے مقصد کو شکست ہوئی اور محمد رسول اللہ صلعم کی فتح ہو گئی۔ ما تاخر جو گناہ بعد میں منسوب ہونے والا تھا وہ یہی تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم نے تلوار کے زور سے اپنا دین پھیلایا اور آپ نے سلطنت حاصل کرنے کے لئے یہ ساری خونریزیاں کیں تا حکومت کے زور سے

تجربات نے نہیں بتلا دیا کہ جس چیز کا فقدان سب سے بڑھ کر مسلمانوں میں ہے وہ یہی قومی کیریکٹر ہے کیا بڑے بڑے جلیل القدر لوگوں میں سے اکثر جو چند روز کی لیڈری کی شان دکھا گئے بالآخر بددیانت اور خائن اور نفس پرست ثابت نہیں ہوئے؟ اور قومی زندگی کی جو لہر بھی اُٹھتی نظر آئی کیا وہ آخر کار حباب کی طرح بیٹھ نہیں گئی؟ اور جہاں نفسانیت اور قومیت کا تصادم ہُوا کیا وہیں نفسانیت

دین کو پھیلایا جائے۔ آج یہی وہ ذنب ہے جو پادری اور حق کے دشمن آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ صلح حدیبیہ نے اس ذنب سے آپ کی ہمیشہ کے لئے حفاظت کر دی۔ کیونکہ اس صلح کی ایک شرط یہ تھی کہ جو مسلمان کافروں سے جا ملے اُسے واپس نہ کیا جائے گا۔ اور جو کافر مسلمان ہو کر مسلمانوں سے جا ملے گا وہ واپس کیا جائے گا۔ گویا کافروں کا اس شرط میں غلبہ تھا۔ اس کے بعد مسلمان تو کوئی کافر ہو کر کفار میں نہ ملا۔ اگر محمد رسول اللہ صلعم نے زور اور جبر سے لوگوں کو مسلمان کیا تھا تو اب انہیں موقعہ تھا کہ وہ واپس کافروں میں جا ملیں اب کوئی چیز مانع نہ تھی لیکن کوئی مسلمان کفار سے جا کر نہ ملا جس سے معلوم ہُوا کہ جو بھی مسلمان ہُوا تھا سچے دل سے ہُوا تھا جبر سے نہ ہُوا تھا۔ البتہ کافروں میں سے باوجود مسلمانوں کے دبکر صلح کر لینے کے ساڑھے آٹھ ہزار آدمی ڈیڑھ برس کے اندر اسلام میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں کا ان پر کسی قسم کا غلبہ نہ تھا۔ کوئی حکومت کا زور نہ تھا بلکہ تو مسلموں کو اندیشہ تھا کہ مسلمان اس صلح کی شرط کے ماتحت ہمیں واپس کفار میں بھیج دیں گے مگر باایں ہمہ حق دلوں کو فتح کرتا چلا جا رہا تھا۔ گویا صلح کی اس شرط نے اس بہتان کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دیا کہ اسلام تلوار اور حکومت کے زور سے پھیلا تھا اور یہ ذنب جو بعد میں پادریوں اور آریوں اور بعض نادان مولویوں نے آپ کی طرف منسوب کرنا تھا اس سے صلح حدیبیہ کے ذریعہ حفاظت ہو گئی۔

اس صلح حدیبیہ کو جناب الٰہی نے نہ صرف آپ کی فتح قرار دیا۔ بلکہ یتم نعمتہ علیك فرما کے بتلایا کہ اس سے آپ پر اتمام نعمت ہو گی۔ اور وہ یہی تھا کہ لوگ راہ حق کو قبول کر کے آپ کے حلقہ بگوش ہوں۔ اور یہی وہ ہدایت تھی یعنی منزل مقصود پر پہنچانا جس کا ذکر یھدیك صراطًا مستقیمًا میں ہے کیونکہ آپ کی منزل مقصود یہی تھی کہ پہلے ملک عرب اور بعد میں ساری دنیا نور اسلام سے منور ہو جائے۔ اور یہی وہ نصر عزیز یا زبردست نصرت تھی جس کا ذکر ینصرك اللہ نصرًا عزیزًا میں ہے اور جو آپ کو اس صلح کے اندر عطا فرمائی گئی جس کی وجہ سے لوگوں کی گردنیں اسلام

غالب نہیں آگئی؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں سے خدا پر سے ایمان اُٹھ گیا تھا مسلمان قوم کی بنیاد کسی خاص وطن یا قوم کے ساتھ وابستہ نہ تھی بلکہ اس کی بنیاد مذہب پر تھی جو اسلام تھا اور جس کے معنے خدا کی بادشاہی کی فرمانبرداری کے ہیں۔ پس جب خدا پر ایمان کمزور ہو گیا تو مذہب کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی جس سے مسلمانوں کی قومیت کا شیرازہ قائم نہ رہا اور انکی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

کے سامنے جھک گئیں۔ پس آنحضرت صلعم کی فتح اور آپ پر اتمام نعمت اور خدا کی طرف سے ہدایت اور نصرت کا ظہور صلح میں ہے نہ کہ جنگ میں۔ صلح میں آپ کی پاکیزہ اور مکمل تعلیم اور آپ کی راستبازی اور کامل نمونہ دلوں کو فتح کر لیتا ہے اور آپ جس منزل مقصود پر دنیا کو پہنچانا چاہتے ہیں وہ حاصل ہو جاتی ہے اور خدا کی نصرت سے لوگوں کے دل اسلام کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ آج بھی مسیحی پادریوں نے لٹریچر کے ذریعہ محمد رسول اللہ صلعم کی طرف سے تمام یورپین اقوام کو متنفر کر رکھا ہے گویا ایک لٹریری جنگ ہے جو برابر ان پادریوں کی طرف سے چل رہی ہے۔ ان کا علاج یہی ہے کہ لٹریچر کے ہی ذریعہ جواب دیکر اس تنفر کو دور کیا جائے اور محمد رسول اللہ صلعم کی صحیح تصویر ان لوگوں کے سامنے پیش کی جائے تو پھر محمد رسول اللہ صلعم کی فتح یقینی ہے۔ آپ کی کامل و مکمل تعلیم آپ کی راستبازی اور آپکا پاکیزہ نمونہ قلوب کو فتح کر لیتا ہے اور یہی وہ فتح ہوتی ہے جو ایک نبی کے شانِ شایاں ہے۔ نہ کہ کسی ملک پر قبضہ کر لینا جو دنیا داروں کا طریق ہے۔

جناب الٰہی اسی سورۃ الفتح میں محمد رسول اللہ صلعم کی اس فتح کے ذکر کے بعد آپ کی قوم کی فتح کا ذکر فرماتے ہیں جسے یہاں فوز عظیم کے نام سے یاد فرمایا ہے یعنی بڑی بھاری کامیابی۔ فرماتے ہیں ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایماناً مع ایمانھم ؕ وللہ جنود السمٰوات والارض ؕ وکان اللہ علیماً حکیماً ۙ لیدخل المؤمنین والمؤمنٰت جنّٰتٍ تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھا ویکفّر عنھم سیّاٰتھم ؕ وکان ذٰلک عند اللہ فوزاً عظیماً ۙ وہی تو خدا ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت یعنی تسکین نازل فرمائی تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں ترقی کریں اور اللہ کے لئے ہی آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ علم والا حکمت والا ہے تاکہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انہی میں رہیں گے اور اُن سے اُن کی برائیاں دُور کرے اور اللہ کے نزدیک یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔ اس موقعہ پر محمد رسول اللہ صلعم کی قوم کا دوہرا امتحان لیا گیا تھا۔ پہلا امتحان

وحدت واتحاد جاتا رہا۔ اور خدا کی بادشاہی ان کے دلوں سے نکل گئی۔ اور وہ ہر طرف منتشر ہو کر اپنی نفسانی خواہشات اور دنیوی اغراض کے بندے بن کر رہ گئے۔ اور ان کا قومی یا اسلامی کیریکٹر بالکل گر گیا پس ضرورت تھی کہ ان کو پھر اصل بنیاد سے مضبوط کیا جائے اور ان کی تعمیر قومی اسی بنیاد پر کی جائے جس پر مسلمانوں کی اس عظیم الشان قوم کے بانی حضرت محمد رسول اللہ صلعم نے آج سے تیرہ سو برس

تو یہ کہ حدیبیہ کے مقام پر جہاں آپ کی قوم ایک نہایت خطرہ کی حالت میں گھر گئی تھی اور اسلام کے مٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا ان سے جان نثاری کا معاہدہ لیا گیا اور یہ خدا کا فضل اور اس کی طرف سے سکینت کا نزول تھا کہ بغیر کسی بزدلی اور گھبراہٹ کے ساری قوم نے نہایت خوشدلی اور اخلاص کے ساتھ اپنی جان اور اس دنیا کی ہر محبوب چیز قربان کر دینے کا عہد کیا۔ اور دوسرا امتحان یہ کہ اس عہد کے باوجود جب صلح ہوتی ہے تو اس قدر دبکر اور ایسی ذلّت آمیز شرائط پر ہوتی ہے جس کو آپ کی قوم کی حمیت اور غیرت ہرگز برداشت نہ کر سکتی تھی لیکن خدا کے علم اور حکمت پر اسقدر ایمان تھا کہ انہوں نے اپنی ساری خودداری اور عزت نفس اور حمیت و غیرت پر محض خدا کی رضا کے لئے چھری پھیر دی اور دم نہ مارا اور خدا کے علم و حکمت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ یہی سکینت تھی جو خدا نے قوموں کے قلوب پر نازل فرمائی۔ الغرض صحابہ نے پہلے امتحان میں تو دنیا کی زندگی اور اس کی ساری محبوب چیزوں پر فتح پائی اور اس طرح توحید مکمل ہو گئی۔ کیونکہ خدا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ مخلوق بھی اور نفس بھی۔ اور یہ جو کچھ کیا اس ایمان کی بدولت کیا جو ان لوگوں کے قلوب میں تھا۔ قاعدہ ہے کہ جب انسان ایمان کے امتحان میں رکاوٹوں پر فتح پاتا ہے تو ایمان بیش از بیش ترقی کرتا ہے۔ اور جب ان قربانیوں کے بدلہ میں خدا کی طرف سے اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج کا ظہور ہوتا ہے تو نظر آجاتا ہے کہ صرف دنیوی اسباب ہی کام نہیں کرتے بلکہ ان کے پس پردہ خدا کا لشکر یعنی باطنی اسباب بھی کام کرتے ہیں۔ جن کا علم انسان کو نہیں ہوتا۔ پس مبارک ہے وہ جو خدا کے علم و حکمت کے سامنے اپنے علم کو نظر انداز کر دیتا اور اس کے حکم سے راضی رہتا ہے اور اس طرح فوز عظیم کا وارث ہوتا ہے۔ پس محمد رسول اللہ صلعم کی قوم کی فتح یہ تھی کہ نہایت زبردست دُہرے امتحان میں وہ کامیاب ثابت ہوئی۔ اپنی زندگی اور دنیا کی محبوب چیزوں کو اور اپنے عزت نفس کو خدا کے حکم کے آگے قربان کر کے وہ قومی کیریکٹر جو ایک مسلمان میں ہونا چاہیئے اور جیسے اسلامی کیریکٹر کہنا چاہیئے ان میں

پہلے تعمیر قومی کی تھی۔ اور وہ بنیاد یہ تھی کہ زندہ ایمان کے ذریعہ دوبارہ خدا کی بادشاہی کو مسلمانوں کے دلوں میں قائم کیا جائے اور پھر انہیں اسی کلچر اور تہذیب کی طرف لوٹایا جائے جو خدا کی بادشاہی کی فرمانبرداری کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور جس کے ذریعہ وہ قومی کیرکٹر پیدا ہوتا ہے جو اسلام کا امتیاز خصوصی ہے۔ اور ظاہری اور باطنی جسمانی اور روحانی ہر ایک قسم کی اصلاح اور ترقی پر مشتمل ہے۔

اپنی پوری شان میں نشو و نما پا گیا۔ چنانچہ اس کامیابی کے بعد اسی سورت میں پھر انہیں دنیوی فتوحات اور مغانم کثیرہ کی بشارتیں دی گئیں۔ فتح خیبر۔ فتح مکہ۔ ایران، روم، شام و مصر وغیرہ کی فتوحات کا انعام سنایا گیا۔ کیونکہ اسلامی کیریکٹر کے پیدا ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ جدھر رخ کریں۔ اینما تولوا فثم وجه الله کے مطابق خدا کا رخ بھی اسی طرف ہو اور جدھر جاویں ان کے لئے فتوحات ہی فتوحات ہوں۔ لیکن دنیوی فتوحات مسلمان کا اصلی مقصد نہیں۔ یہ تو درمیانی امور ہیں جو اسلامی کیریکٹر کے پیدا ہو جانے کے بعد اکثر خود بخود حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مسلمان کا اصلی مقصد قلوب کی فتح یعنی دینی فتح ہے وہ دنیا میں اپنی بادشاہت نہیں قائم کرنا چاہتا بلکہ خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے جس کا وہ بندہ اور ایک ادنےٰ سپاہی ہے۔ اس لئے اس سورت کے آخر میں یہ خوش خبری دی کہ هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله وکفیٰ بالله شهیدا ٥ کہ وہی خدا ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا خدا اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے اور اللہ اپنے فعل سے اس کی گواہی دے گا۔ گویا محمد رسول اللہ صلعم کے بھیجنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اسلام کے ذریعہ تمام دنیا کے لوگوں کو ہدایت نصیب ہو اور یہ دین حق تمام دینوں پر غالب ہو۔ غرضکہ امت محمدیہ کا نصب العین جو ہو سکتا ہے وہ یہی ہو سکتا ہے جو اس آیت میں مذکور ہے کہ خدا کے دین کا پیغام تمام دنیا میں پہنچ جائے اور دین حق تمام ادیان پر غالب آئے۔ اور یہ فوز عظیم اس امت کو تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب اس کے اندر وہ اسلامی کیریکٹر پیدا ہو جس کا نظارہ ہمیں حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کرام میں نظر آتا ہے اور جس کیریکٹر کے ظہور پر مسلمانوں کو فتوحات اور تمام ادیان پر اسلام کے غلبہ کی خوش خبری دی گئی۔ جب تک یہ اسلامی کیریکٹر پیدا نہ ہو خدا کی نصرت اور فتوحات کا انعام بھی نہیں مل سکتا۔ اصل چیز یہ اسلامی کیریکٹر ہے جو فتوحات کا جاذب ہے

آپ نے بڑا زور اس بات پر دیا کہ خدا ہے اور وہ زندہ خدا ہے یعنی جیسے پہلے زمانہ میں وہ اپنے بندوں سے ہم کلام ہو کر اپنی ہستی کا اور نشانات آسمانی سے اپنے متصرف بالارادہ ہونے کا ثبوت دیتا تھا۔ آج بھی اسی طرح وہ بولتا ہے اور نشانات سماوی کے ذریعہ اپنے متصرف بالارادہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ اور بتایا کہ میں اس معاملہ میں صاحب تجربہ اور صاحب حال ہوں۔ اور میں ہر ایک

تقریر شیخ [illegible]

اور اسی راہ پر حضرت مرزا صاحب نے مسلمانوں کو ڈالنا چاہا۔ ان کو بھی جب جماعت بنانے کا خدا کی طرف سے حکم ہوا تو یہی آیت الہام ہوئی جو حدیبیہ کے مقام پر آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی تھی کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ؕ کہ جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ مطلب یہ کہ آج بھی اسلام اسی طرح کفار کے نرغہ میں ہے جس طرح حدیبیہ کے مقام پر نرغہ میں آ گیا تھا۔ آج بھی ضرورت ہے کہ اسلام کی خاطر مسلمان اپنا تن من دھن سب قربان کرنے کا عہد کریں۔ اگر آج محمد رسول اللہ صلعم ہم میں نہیں تو آپ کا ایک نائب مجدد وقت امام الزمان موجود ہے اس کے ہاتھ پر اسی معاہدہ کی تجدید کرو جس کی صحابہ نے کی تھی۔ اور یہ بیعت اس زندہ ایمان کو چاہتی تھی جو صحابہ کے اندر ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ بیعت مسلمانوں کے اندر اس اسلامی کیریکٹر کے پیدا ہونے کا موجب ہو سکتی تھی جس کے پیدا ہونے کے بغیر ہی اسلامی فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ کثیر حصہ نے اس طرف توجہ نہ کی۔ دنیا کی چکا چوند ان کے دل کو سوائے دنیوی سلطنت کے اور کسی امر سے راضی نہیں ہونے دیتی۔ اسلامی کیریکٹر کی انکی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جس قوم سے اسلامی کیریکٹر مفقود ہو جائے وہ کوئی اسلامی سلطنت قائم نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی سلطنت قائم بھی کرلے گی تو وہ اسلامی نہ ہوگی۔ اسلامی کیریکٹر سے اسلامی سلطنت خود بخود بن جاتی ہے۔ سلطنت سے اسلامی کیریکٹر نہیں بنتا بلکہ سلطنت آ جانے سے اکثر اسلامی کیریکٹر رخصت ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں میں سلطنت آئی تو اس کے ساتھ ساتھ اسلامی کیریکٹر رخصت ہوتا چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے کیا سچ فرمایا کہ بلینا بالضرآء فصبرنا وبلینا بالسرآء فلم نصبر۔ ہمیں تنگی اور دکھ سے آزمایا گیا ہم ثابت قدم رہے۔ جب ہمیں سکھ اور خوشحالی سے آزمایا گیا تو ہم ثابت قدم نہ رہے۔ پس یہ خیال غلط ہے کہ سلطنت اسلامی کیریکٹر کو پیدا کیا کرتی ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے کہ اسلامی کیریکٹر اسلامی سلطنت کو پیدا کرتا ہے۔ اور سلطنت آ جانے کے بعد سوائے

طالب حق کو خوشخبری دیتا ہوں کہ وہ میرے پاس آکر آزمائش کرلے اور زندہ خدا سے تعلق پیدا کرکے اپنے ایمان کو تازہ اور اپنی زندگی کو مثمر بہ ثمرات کرلے۔ چنانچہ جس قوم نے آپ کی اس آواز پر لبیک کہا اور آپ کے دامن سے لگی اُن کے قلوب میں وہ زندہ خدا بس گیا اور اس کی بادشاہی نے ان میں سے بہتوں کے قلوب پر ایسا قبضہ کیا کہ وہ اس کے فرمانبردار ہوکر اس کے بندوں میں داخل ہوگئے اور ان سے وہ اعمال صالحہ اور قربانیاں سرزد ہوئیں جو آج مسلمانوں کے اندر عنقا کا حکم رکھتی ہیں اور جو سلف صالحین کی یاد کو تازہ کرتی ہیں۔ اور یہی وہ زندہ ایمان ہے جو باوجود اس جماعت کے قلیل التعداد ہونے اور کثرت مخالفت کے اس کے پائے ثبات میں تزلزل نہیں آنے دیتا بلکہ ہر قدم جو خدا کی راہ میں اُٹھتا ہے وہ ماشاءاللہ ولا قوۃ الا باللہ آگے ہی اُٹھتا ہے پیچھے نہیں پڑتا۔

اس میں کیا شک ہے کہ جب زندہ ایمان قلوب کے اندر پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اعمال صالحہ کی تحریک اور قربانی کی رُوح بھی اس میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس بات کو پختہ کرنے کے لئے حضرت مرزا صاحب نے ہر ایک اپنے مرید سے یہ عہد بھی لیا کہ میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا جس کا مطلب یہ تھا کہ جہاں اپنی ذاتی اغراض اور نفس کا اسلامی مفاد سے تصادم ہو وہاں اسلامی مفاد پر اپنی ہر ایک چیز قربان کر دی جائے۔ یہی وہ قربانی کی رُوح ہے جس سے قومیں بنتی ہیں اور زندہ رہتی ہیں۔ جس کے بغیر قومی تعمیر ریت کے تودے پر عمارت بنانے سے بڑھ کر نہیں جو گرنے کے لئے ایک ہوا کے جھونکے کی منتظر رہتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھ لو۔ جرمن قوم جنگ عظیم کے بعد ایسی گری تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پھر وہ اُٹھنے کے قابل نہ ہوگی۔ لیکن ابھی چند سال ہی گزرے ہیں کہ وہی قوم آج پھر دوسری ہم چشم قوموں کے برابر ہے بلکہ ان سے بھی بعض میدانوں میں گوئے سبقت

بقیہ صفحہ گزشتہ

معدودے چند کے عام طور پر اسلامی کیریکٹر رخصت ہو جاتا ہے۔ دنیا کے عیش و تنعم اور حکومت اور طاقت کا غرور خدا کو بھلا دیتا ہے۔ پس ضرورت ہے کہ پہلے اسلامی کیریکٹر پیدا کیا جائے اور یہ زندہ ایمان سے پیدا ہوتا ہے جو بغیر کسی روحانی امام کے نصیب نہیں ہوا کرتا۔ اس مادہ پرستی کے زمانہ میں اگر کمی ہے تو اسی کی ہے۔ اسی کے متعلق آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا جائے گا تو ابنائے فارس میں سے ایک شخص اس ایمان کو واپس لے آئے گا۔ آج وہ رجل من ابنائے فارس مرزا غلام احمد ہم میں آیا وہ تمام دیگر ادیان پر اسلام کی فتح اور غلبہ کی بشارت اور خدا پر زندہ ایمان کو واپس لایا مگر تھوڑے تھے جنہوں نے اسے قبول کیا اور فائدہ اٹھایا۔

لے گئی ہے وجہ یہ ہے کہ ان میں وہ جڑا موجود رہی جس سے کہ قومیں بنتی ہیں یعنی قومی کیریکٹر۔ چنانچہ آجکل جرمن قوم کا مقولہ یہ ہے کہ قومی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دو۔ یہی ایک فقرہ ہے جسے حکومت جرمنی اپنے تمام مردوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور بچّوں کے دل و دماغ میں جاگزیں کرانا چاہتی ہے حکومت کے ہر شعبہ میں زور دیا جاتا ہے کہ انفرادی حیثیت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ قومی اور اجتماعی مفاد کو ہر حالت میں مقدم کرنا چاہیئے۔ اور انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی پر قربان کر دینا چاہیئے۔ غرضنکہ جرمن قوم کی زندگی اور جرمن حکومت کی قوت کا راز اس ایک فقرہ میں مضمر ہے تو پھر جیسا کہ میں بتا آیا ہوں کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ان کے دین پر ہے اور ان کی انفرادی زندگی یعنی ان کی نفسانیت ان کی دنیا ہے تو مسلمان قوم میں اس کے حسب حال جو قومی کیریکٹر پیدا کیا جا سکتا ہے وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دین کو دنیا پر مقدم رکھے اور خدا کی بادشاہی کو ایسا اپنے قلوب پر حاوی کرے کہ اس کی فرمانبرداری کے لئے اپنے تمام نفسانی خواہشات اور دنیوی اغراض کو وہ پس پشت پھینکنے کو ہمہ وقت تیار رہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے دین کیلئے دنیا کو قربان کرنے میں اسے ذرا بھی تامل نہ ہو۔ چنانچہ یہی وہ عہد تھا جو حضرت اقدس مرزا صاحب نے اپنے مریدوں سے لیا اور یہی عہد وہ تمام مسلمانوں سے لینا چاہتے تھے اور اسی ایک فقرہ کو وہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور بچّوں کے دل و دماغ میں جاگزین کر دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ان کا وہ کھویا ہوا قومی یا اسلامی کیریکٹر ان میں پھر دوبارہ پیدا ہو جس سے قومیں بنتی اور دین و دنیا میں عروج پکڑتی ہیں۔ کاشکہ مسلمان اس سچے آسمانی لیڈر کی آواز پر لبیک کہتے اور آپ کے ہاتھ پر اس عہد کو پورا کرنے کا اقرار کرتے تو دنیا دیکھ لیتی کہ مسلمان قوم کے اندر کتنا عظیم الشان قومی کیریکٹر پیدا ہو جاتا اور دنوں میں وہ دنیا میں عزت اور حکومت کے وارث ہو جاتے۔ اسلامی کیریکٹر تو وہ چیز تھا کہ اگر مسلمان اس کی طرف توجہ کرتے اور اسے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ تو یہ بات سچ ہے کہ پھر اس کا مقابلہ نہ برطانیہ کا بحری بیڑا کر سکتا ہے اور نہ ہوائی۔ اور نہ کانگرس اس کا بال بینکا کر سکتی ہے نہ ہندو مہاسبھا گاندھی جی نے تو کہا تھا کہ کھدر پہنو میں سوراج کا ٹھیکہ لیتا ہوں۔ لیکن حضرت مرزا صاحب نے اس سے زیادہ جامع اور مانع اور مسلمانوں کے حسب حال دستور العمل پیش کیا تھا کہ اسلامی کیریکٹر اپنے اندر پیدا کرو۔ اسلام کو اپنے نفس اور ذات پر مقدم کر کے خدا کی بادشاہت کو اپنے اوپر کلی قبول کر لو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سچے مسلمان بن جاؤ تو عزت اور سلطنت تمہارا

خیر مقدم کرے گی۔ جیسا کہ آپ کو خدا کی طرف سے الہام بھی ہوا تھا کہ ؎

چو دورِ خسروی آغاز کردند — مسلماں را مسلماں باز کردند

لیکن افسوس کہ کثرت سے مسلمانوں نے اس آواز پر کان نہ دھرا۔ انہوں نے کوٹھے پر چڑھنا چاہا مگر بغیر زینہ کے۔ انہوں نے سلطنت مانگی مگر اس کے حصول کے ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے نہ سمجھا کہ جو سلطنت قومی کیریکٹر کے ذریعہ بنتی ہے۔ وہ دنیا کے لئے رحمت اور موجب برکت اور پائدار ہوتی ہے اور جو سلطنت محض ڈنڈے کے زور سے بنتی ہے وہ ناپائدار اور دنیا کے لئے ایک آفت اور مصیبت ہوتی ہے محض سلطنت کوئی چیز نہیں جب تک کہ وہ اچھی سلطنت اور نافع نہ ہو۔

مسلمانوں کے سیاسی انحطاط اور تنزل کے زمانہ میں ان کے ایمان کو زندہ کرکے انہیں اسلام کی ترقی اور روحانی غلبہ کی بشارت دی

حضرت مرزا صاحب کی بعثت سے قبل مسلمانوں کی سیاسی حالت انتہائی تنزل پر جا پہنچی تھی۔ ان کی سلطنتیں یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھوں سے نکل چکی تھیں اور نکل رہی تھیں۔ ادھر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اُدھر مصر انگریزوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ سوڈان پر مہدی سوڈانی کو شہید کرکے انگریز مسلط ہو چکے تھے۔ فرانس نے شمالی افریقہ کا اکثر حصہ یعنی الجیریا اور ٹیونس اور کچھ حصہ مراکش کا اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ مراکش پر اسپین نے اور طرابلس پر اٹلی نے قبضہ کر لیا تھا۔ زنجبار کی ساری اسلامی مملکت انگریزوں اور جرمنوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ترکستان کو روس نگل چکا تھا۔ اور ایران اس کے ہاتھوں میں ایک مغلوب شکار کی طرح دم توڑ رہا تھا۔ افغانستان کی حیثیت ایک ریاست بن کر رہ گئی تھی جو انگریزوں کے بکلی زیر اثر تھی۔ عرب میں کوئی جان باقی نہ تھی۔ مسلمانوں کی مایہ ناز ٹرکی کی سلطنت جسے خادم الحرمین الشریفین ہونے کا فخر حاصل تھا ایک مردِ بیمار کی طرح سسک رہی تھی۔ اور روس کے آئے دن کے حملوں اور یورپ کی سیاسی چالبازیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ماہرین سیاست کا یہ فتویٰ لگ چکا تھا کہ یہ مرد بیمار اب چند روز کا مہمان ہے۔ لے دے کے دکن میں میسور کی ایک اسلامی سلطنت باقی تھی۔ اور سلطان ٹیپو اس نازک حالت میں انگریزوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے شہید ہو جانے اور میسور کے انگریزوں اور ہندوؤں کے قبضہ میں چلے جانے نے مسلمانوں کے سیاسی تنزل پر مہر لگا دی۔ یہاں تک کہ ایک انگریز نے ان الفاظ میں اس واقعہ کا ذکر کیا کہ "سلطان ٹیپو کی موت نے مسلمانوں کی خلافت کا عملی طور پر دنیا سے خاتمہ کر دیا۔" اور ٹیپو سلطان علیہ الرحمۃ کے مزار کا کتبہ لکھنے والے نے درحقیقت عالم اسلامی کے خیالات کی ترجمانی کی۔

جب اس نے یہ لکھا کہ "آج روم و ہند کی عظمت کا خاتمہ ہوگیا" الغرض یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی سیاسی حالت انتہائی تنزل کو پہنچ چکی تھی اور تمام عالم اسلام پر ایک یاس کی حالت طاری تھی۔ مسلمانوں کا بدقسمتی سے یہ خیال ہوگیا تھا کہ مذہب کے قیام کے لئے مادی طاقت اوّلین چیز ہے۔ اگر آج مادی طاقت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے تو اب کوئی صورت نہیں کہ دوبارہ اسلام دنیا میں غالب آسکے۔ اس وقت کے مسلمان علما اور لیڈروں کے خطبات کو پڑھئے، کتابوں کو دیکھئے نثر و نظم کو ملاحظہ فرمایئے۔ ہر جگہ آپ کو مایوسی ہی مایوسی نظر آئے گی۔ دنیا نے یہی سمجھا کہ اسلام نے آخری کوشش ٹیپو سلطان کی شکل میں کی تھی۔ لیکن جب وہ کوشش بھی بارور نہ ہوئی تو اب کوئی صورت ہمارے بقا کے لئے باقی نہیں رہی۔ مسلمانوں کی اسی یاس انگیز حالت سے متاثر ہوکر مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے وہ مرثیہ قوم لکھا جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے جس میں مسلمانوں کے زوال کا ایسا دردناک نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھ کر آنکھیں آنسوؤں سے تر اور قلوب غم و الم اور حسرت و یاس سے بھر جاتے ہیں۔ اس میں سے فقط دو بند میں یہاں عرض کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب | چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہی تم پر عیاں سب | بگڑنے کو تیار بیٹھے ہیں یاں سب

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کہ گرا ہے
ستوں مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے

یہ جو کچھ ہوا ایک شمہ ہے اس کا | کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانہ نے اونچے سے جس کو گرایا | وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

غرضکہ مسلمانوں کو ایسا نظر آیا کہ وہ اب یہود کی طرح ہمیشہ کے لئے ایک مغلوب اور مخذول قوم بن گئے۔ اور وہ یہ دیکھ کر کہ نہ صرف دنیا ہی ان کی مخالف ہے بلکہ آسمان سے بھی ان کی مدد کے لئے نازل نہیں ہوتا۔ مذہب سے بھی بدظن ہونے لگے۔ اور یہ مایوسی جو عالم اسلامی پر اس دور میں چھائی تھی اس کی نظیر نہ بنو امیہ کی تباہی میں نظر آتی ہے نہ عباسیہ کی بربادی میں اور نہ ہی اسپین میں اسلامی شوکت کے زوال کے وقت۔ یہ مایوسی کی لہر ایک عالمگیر حیثیت رکھتی تھی۔ اور

جیسا کہ ہر ایک دانا جانتا ہے اس قسم کی مایوسی ایسی خطرناک چیز ہے کہ جب یہ کسی فرد یا قوم کے قلوب پر تسلط جما لیتی ہے تو پھر دل بجھ جاتے ہیں اور انسان کے اندر سے قوت عمل زائل ہو جاتی ہے اور جدوجہد کی امنگ جاتی رہتی ہے اور ترقی و سعی کا مادہ سلب ہو جاتا ہے اور ایسے شخص یا قوم کو کسی چیز کا انتظار نہیں باقی رہتا سوائے اپنی موت کے۔ پس ایسے نازک موقعہ پر اس امر کی بڑی سخت ضرورت تھی کہ کوئی ایسا شخص اس زمانہ میں پیدا ہو جو مسلمانوں کے دلوں سے اس مایوسی کی لہر کو بالکل مٹانے اور قوم کو پھر اس امید اور یقین اور ایمان و عرفان کا درس دے جس کی بدولت وہ عرب کے صحرا سے نکل کر اسپین سے لیکر چین تک اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے پہنچ گئے تھے۔ اس وقت ایسے آسمانی مصلح یا مسیح کی ضرورت تھی جو مسلمانوں کی بیماریوں کی صحیح تشخیص کر کے ان کا بہترین علاج پیش کرے اور اپنے نفوس قدسیہ کی برکت سے مردہ دلوں میں پھر زندگی پیدا کرے۔ الغرض اس عالمگیر یاس اور اشد ضرورت کے وقت خدا نے اسلام کے متعلق اپنے وعدہ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہٗ لحافظون کو (کہ ہم نے ہی یہ ذکر اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) یاد کیا اور حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الرحمۃ کو چودھویں صدی کے سر پر مجدد بنا کر بھیجا انہوں نے آتے ہی اس مایوس قوم کو بشارت دی کہ سنو۔ اسلام کا خدا زندہ خدا ہے وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے بلکہ ہمیشہ سے موجود ہے۔ اور وہ وہی خدا ہے جس نے قرآن نازل فرمایا تھا اور اسلام کو اپنا ابدی دین قرار دیا تھا۔ اسی خدا نے مجھے بھیجا ہے تا میں لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ خدائی وعدہ کے ماتحت اس دین کو کل ادیان پر غالب کر کے دکھاؤں۔ اگرچہ اسلام کا ظاہری سیاسی غلبہ اس وقت مٹ چکا ہے مگر اسلام کے روحانی غلبہ کا وقت آ گیا ہے۔ اور لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ کا خدائی وعدہ پورا ہونے کا یہی وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو تمام دیگر ادیان پر غلبہ دے گا خواہ وہ ادیان یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں اور آریوں اور سکھوں اور بدھوں وغیرہ کے مذاہب ہوں۔ اور خواہ وہ مادہ پرستی بالشویزم، فیسی ازم، نازی ازم وغیرہ کی شکل میں دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کرنیوالے ادارے ہوں۔ ذرا یہ ایمان افروز تحریر حضرت اقدس مرزا صاحب کی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:-

"یقیناً سمجھو کہ اس لڑائی میں اسلام کو مغلوب اور عاجز دشمن کی طرح صلح جوئی کی حاجت نہیں بلکہ اب زمانہ اسلام کی روحانی تلوار کا ہے جیسا کہ کسی وقت وہ اپنی طاقت دکھلا چکا ہے۔ یہ پیشگوئی یاد رکھو کہ عنقریب اس لڑائی میں دشمن ذلت کے ساتھ

پسپا ہوگا اور اسلام فتح پائے گا۔ حال کے علوم جدیدہ کیسے ہی زور آور حملے کریں۔ کیسے ہی نئے ہتھیاروں کے ساتھ چڑھ چڑھ کر آئیں مگر انجام کار ان کے لئے ہزیمت ہے۔ میں شکر نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ اسلام کی اعلیٰ طاقتوں کا مجھ کو علم دیا گیا ہے جس علم کے رُو سے میں کہتا ہوں کہ اسلام نہ صرف فلسفہ جدیدہ کے حملے سے اپنے تئیں بچائے گا بلکہ حال کے علوم مخالفہ کی جہالتیں ثابت کرے گا...... اس کشتی کا ناخدا خداوند تعالیٰ ہے..... وہ ہمیشہ اس کو طوفان اور باد مخالف سے بچاتا رہے گا جیسا کہ فرماتا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون" (آئینہ کمالات اسلام)۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا نور الدین نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور تو اسلام کی اشاعت یورپ اور امریکہ میں کرنا چاہتے ہیں اور وہاں کے لوگ مذہب کے نام سے متنفر ہو رہے ہیں" فرمایا "اچھا ہے تختی صاف ہو رہی ہے نقش اچھا جمیگا۔ مریم کے بیٹے مسیح کی خدائی کا بُت دلوں سے مٹنے دو تا اسلام کے لئے جگہ خالی ہو" پھر فرمایا "مولوی صاحب! پہلی رات کا چاند صرف تیز نظر انسان دیکھتا ہے ہر ایک کو نظر نہیں آتا۔ جب چودھویں رات کا چاند بن کر چمکتا ہے تو ایک عالم دیکھتا ہے۔ اسی طرح میری آنکھوں نے اسلام کے روحانی غلبہ کا ہلال دیکھ لیا ہے انشاء اللہ وقت آئے گا کہ یہ بدر بن کر چمکے گا تب سارا عالم دیکھے گا۔"

غرضکہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے قرآنی ارشاد انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین کے ماتحت کہ تم غالب رہو گے اگر تم ایمان والے ہو گے۔ زندہ خدا پر ایمان کو مسلمانوں کے قلوب میں دوبارہ قائم کیا تا خدائی وعدہ غلبہ کا ان کے ساتھ پورا ہو اور اس کی نصرت اور حفاظت کے وعدوں کے پورا ہونے کی خوش خبری سنا کر اس مایوسی کی لہر کو مٹا دیا جو مسلمانوں کے قلوب پر مسلط ہو چکی تھی جس سے ان کے اندر کام کرنے کی قوت دوبارہ جاگ اٹھی۔ پھر اتنا ہی نہیں کیا آپ نے ایمان کو عملی رنگ اور قربانی کی شکل میں بدلنے کے لئے "دین کو دنیا پر مقدم رکھنے" کا عہد لیا تا ان میں وہ قومی کیریکٹر پیدا ہو جس سے قومیں بنتی اور زندہ ہوتی ہیں اور اتحاد عمل کے لئے تمام مسلمانوں کو دعوت دی کہ دشمنان اسلام کے مقابلہ میں بلالحاظ فرقہ و جماعت کلمہ طیبہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ اور اپنے قدیم نصب العین کو جو ان ایام میں دنیا کی طرف گر چکا تھا بلند کر کے پھر اس کے اصلی مقام پر لے آؤ یعنی دنیا میں خدا کی بادشاہی کو قائم کرنے کے لئے جہاد کرنے کو اپنا نصب العین بناؤ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ یہ نصب العین آج تلوار سے حاصل نہیں ہو سکتا

بلکہ اس تلوار کی جنگ کے ماوراء ایک اور جنگ ہے جس کی طرف تمہاری نظر ابھی نہیں گئی۔ مگر مجھے وہ صاف نظر آرہی ہے۔ وہ ہے جنگ قرآن اور مغربی مادی فلسفہ کی۔ اسلامی اور مغربی مادی تہذیب کی۔ اسلامی اور غیر اسلامی ثقافت یعنی کلچر کی۔ مغرب اس بات پر تلا ہوا ہے کہ وہ اپنے تمام دیرینہ زخموں کے بدلے دل کھول کر لے۔ وہ جس طرح اسلامی سلطنتوں کو قریباً مٹا چکا ہے اسی طرح اب وہ اسلام کے مذہب اسلام کی تہذیب و کلچر کو بھی دنیا سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ پس اب وقت ہے کہ اس مادیت کا مقابلہ اسلام کی روحانیت سے کرو یعنی قرآن کی تلوار ہاتھ میں لیکر جہاد کبیر کرو جیسا کہ قرآن کریم میں حکم ہے کہ جاھدھم بہٖ جھاداً کبیراً کہ اس قرآن کو ہاتھ میں لیکر جہاد کبیر کرو۔ موجودہ زمانہ مسلمانوں کے لئے مکی زمانہ ہے۔ جبکہ مسلمان اگرچہ ظاہر طور پر کفار کے ماتحت تھے مگر اسلام کی روحانی تلوار اپنا کام کر رہی تھی۔ پس اس مکی زمانہ میں چاہیئے کہ مسلمان پھر اسی طرح صبر اور صلح و آشتی دعا اور سعی کے ساتھ اسلام کا پیغام کفار تک پہنچا کر دعوت و تبلیغ کا حق ادا کرتے جائیں جیسا کہ ابتدائی مسلمانوں نے کیا تھا۔ انشاء اللہ تعالیٰ وقت آتا ہے کہ اس مکی زمانہ کے بعد اسلام کے لئے پھر مدنی زمانہ بھی آجائے۔ اور روحانی غلبہ اسلام کے ظاہری غلبہ کو بھی ساتھ لے آئے۔ غرضیکہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے مسلمانوں کے دلوں سے وہ مایوسی کی لہر مٹا دی جو مسلمانوں کو روز بروز تنزل اور انحطاط کی انتہائی پستی کی طرف لے جا رہی تھی۔ آپ کی تحریروں اور تقریروں اور معرکۃ الآراء تصانیف نے اسلام کا ایسا خوبصورت چہرہ اہل عالم کو دکھایا کہ مسلمانوں کے قلوب میں پھر اس امید کو زندہ کر دیا جو مر چکی تھی کہ اسلام پھر دنیا میں غالب آئے گا اور خود یورپ بول اٹھا کہ یورپ کی موجودہ مادی تہذیب بھی تبھی سلامت رہ سکتی ہے جب وہ اسلام کی روحانی تہذیب سے مل کر اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرلے۔ دیکھو کتاب (*Whither Islam*)

قصہ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں اُمت مسلمہ کے زوال کے بعد اسلام کے غلبہ کے لئے ایک نئے دَور کا افتتاح کیا۔ اور اس کی ابتدا اس معالج رُوحانی کے ذریعہ ہوئی جس نے اس مایوسی کے دَور کو امید اور یقین سے بدل دیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے حضرت

سلہ تعجب ہے کہ ابھی حال ہی میں عیسائیوں کے مشہور رسالہ مسلم ورلڈ میں ایک مبصر زمانہ انگریز کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں مسلمانانِ عالم کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "اب ابتدائی مکی حالات اسلام میں عام ہو چکے ہیں"۔ اصل انگریزی الفاظ یہ ہیں۔ "*The early Maccan attitude has now become general in Islam.*" (مؤلف)

مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اُن کے قلوب غلبۂ اسلام کے بارے میں اس قدر اُمید اور یقین و عرفان سے بھر گئے کہ وہ اس مقصد کے لئے شب و روز ہر طرح کے دکھ اور تکلیفیں اٹھانا اپنے لئے راحت سمجھتے اور ہر طرح کی قربانی مالی وحالی کرنے میں ایک روحانی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اسلام کا پیغام دنیا میں پہنچانے میں کتنے بھی مشکلات کے پہاڑ سامنے آکھڑے ہوں۔ مگر وہ یقین اور ایمان جو خدا نے مجدد وقت کے ذریعہ عطا فرمایا ہے انہیں تھکنے اور ہمت ہارنے نہیں دیتا۔ اور ہر قدم پر اس معاملہ میں خدا کی نصرتوں کا ظہور ماشاء اللہ ایسا خارق عادت طور پر ہوتا رہتا ہے جو اس ایمان اور یقین کو ہر دم بڑھاتا رہتا ہے اور جن لوگوں نے آپ سے تعلق نہیں پیدا کیا ان کے دلوں سے بھی مایوسی جاتی رہی۔ یعنی صرف یہی نہیں ہوا کہ حضرت مرزا صاحب نے وہ عظیم الشان لٹریچر پیدا کیا جس نے اسلام کو تمام ادیان عالم اور فلاسفہ و ملاحدہ پر غالب کر دیا اور بذریعہ کتب رسالہ جات اور اخبارات و اشتہارات تمام مشرق و مغرب میں شائع ہوتا رہا بلکہ یہ بھی ہوا کہ اس مردِ خدا کی دعاؤں اور توجہ کے اثر سے اسلام کے دوبارہ غلبہ کا خیال ایک بجلی کی رَو کی طرح تمام دنیا کے مسلمانوں کے قلوب میں سرایت کر گیا اور اس مامور ربانی اور امام یزدانی کی فیض روحانی کی ہوا تمام عالم میں تبشیرًا بین یدی رحمتہ بن کر پھیل گئی جس نے مسلمانوں کے دلوں میں اُمید کی لہر دوڑا دی۔ اور یہ جو مسلمانوں میں آپ اب حرکت اور جدّ و جہد کے آثار دیکھتے ہیں یہ اسی امید کا نتیجہ ہے جو دوبارہ ان کے دلوں میں پیدا ہوئی ہے۔ کیا یہ تھوڑا سا کام تھا جو حضرت مرزا صاحب نے کر کے دکھایا۔ کیا گرتی ہوئی قوم کو ترقی کے راستہ پر ڈال دینا (جیسا کہ آپ کے الہام نے بھی آپ کی بعثت کا مقصد یہی بتلایا تھا "بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں برمنار بلند تر محکم افتاد") کوئی ایسا کام نہیں جس کے آگے عقلمندوں کے قلوب عقیدت سے جھک جائیں۔ خدا تعالیٰ نے تو قرآن کریم میں اس امر کو خلافت محمدیہ کا نشان خصوصی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ آیت استخلاف میں مسلمانوں کو خلافت کا وعدہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنًا کہ خلافت کے قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا مسلمانوں کے دین کو جو انہیں پسند ہے متمکن کر دیگا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا پس دین کو متمکن کرنا اور خوف کو امن سے بدلنا اگر خلافت محمدیہ کا نشان خصوصی ہے تو پھر یا تو ابتدائے اسلام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بہ ہدایت الٰہی یہ نشان خلافت ظاہر ہوا تھا یا آج اس آخری زمانہ میں حضرت مرزا غلام احمد علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں یہ نشان خلافت

نہایت صفائی سے ظاہر ہوا۔ پس بایں ہمہ اگر حضرت مرزا غلام احمد صاحب خلیفہ محمدی نہیں ہیں تو پھر اور کون ہو سکتا ہے حقیقت سے آنکھیں بند کر لینا اور بات ہے ورنہ اس نشان خلافت کے نمایاں اور ظاہر ہونے میں تو کوئی کسر نہیں رہی۔

مسلمانوں کا نصب العین بلند کر دینے سے قوم میں اتحاد پیدا کیا

قوم کو حکومت اور عزت حاصل کرنے کیلئے تعمیر قومی اور اس کے اندر امید و یقین پیدا کرنے کے ساتھ ہی جس چیز کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ اس کے افراد کا باہمی اتحاد اور نظام ہے۔ حضرت مرزا صاحب نے مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ایک مسلمان کا نصب العین فقط لا الٰہ الا اللہ یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کے ذریعہ خدا کی بادشاہی اور اس کے جلال کو قائم کرنا ہے۔ ان کے نصب العین کو اس قدر بلند کر دیا کہ اگر اس پر ان کا عمل ہو جائے تو آپس کے تمام فروعی جھگڑے اور مناقشات ختم ہو کر آج قوم میں وحدت و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ دشمنان اسلام کے مقابلہ میں کالبنیان المرصوص کی طرح دوش بدوش کھڑے ہو کر جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جن مسلمانوں نے حضرت مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ان کا نصب العین جب خدا کی بادشاہی کو قائم کرنے کے لئے دعوت و تبلیغ کے رنگ میں جہاد ہو گیا تو آپس کے تمام فروعی جھگڑے ان میں یک قلم موقوف ہو گئے۔ ان کے اندر نہ شیعہ وسنی کا جھگڑا باقی رہا۔ نہ مقلد و غیر مقلد کا تنازعہ۔ سب آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ ایک حقیقی طبیب روحانی کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ وہ مرض کی تشخیص صحیح طور پر کر کے ایسا حتمی علاج تجویز کرتا ہے جو خدا کے فضل سے خالی نہیں جاتا۔

یہ نصب العین کا بدل دینا ایک ایسا کارگر علاج ہے کہ اگر ساری مسلمان قوم اس پر عامل ہو جائے تو تمام تفرقے مٹ کر ساری قوم ایک ہو سکتی ہے۔ ان کو سمجھ آ سکتی ہے کہ ہم کن لغو جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اصل مقصد تو ایک مسلمان کی زندگی کا یہ ہے کہ وہ خدا کے جلال اور اس کی بادشاہی کو قائم کرے۔ یہ اختلاف آراء جب تک دنیا قائم ہے باقی رہے گا پس چاہئے کہ اختلاف آراء کی عزت کی جائے۔ اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کو کافر اور برا نہ کہا جائے۔ بلکہ آپس میں محبت اور پیار سے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی غلط فہمی کو مٹایا جائے اور چاہئے کہ سب آپس میں متحد و متفق ہو کر دشمنان اسلام کا مقابلہ کریں تا اسلام کا بول بالا ہو۔ اس طرح یہ فرقہ بندی کی لعنت جو آپس میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے ہمہ وقت تیار رکھتی ہے نہایت آسانی سے مٹ سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کا نصب العین اصل جگہ سے گر کر بہت نیچے ہو گیا ہے۔ وہ بجائے خدا کا جلال ظاہر کرنے

اور اس کے نام کو دنیا میں بلند کرنے کے اپنے نفس کی اس قدر پوجا کرنے لگے ہیں کہ جو ان سے ذرا بھی اختلاف رائے رکھے اُسے فوراً کافر بنا کر دم لیتے ہیں۔ جب خدا ایک۔ قرآن ایک۔ رسول ایک، قبلہ ایک تو وحدت واتحاد کے لئے اتنی زبردست اور محکم بنیادیں ہوتے ہوئے اختلاف آراء پر ایک دوسرے کو کافر کہنا مسلمانوں کی کس قدر بدقسمتی ہے اور مسلمانوں کے باہمی تفرقوں اور تشتت وافتراق کا یہی واحد سبب ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو کسی مومن کو کافر کہتا ہے تو کفر لوٹ کر اسی پر پڑتا ہے۔ یہ سزا اسی لئے تجویز فرمائی تھی تا مسلمانوں میں تکفیر بازی کی لعنت نہ پیدا ہو جس سے قوم میں افتراق وانشقاق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے آنحضرت صلعم کے اس ارشاد پر عمل نہ کیا اور اس کا خمیازہ بھگتا حضرت مرزا صاحب نے جب قوم میں پھر اتحاد و نظام پیدا کرنا چاہا تو نصب العین کے بلند کرنے کے ساتھ ہی اس حدیث پر عمل کو بھی زندہ کیا اور ان مکفرین کے مقاطعہ کا حکم دے دیا جو کسی کلمہ گو اہل قبلہ کو کافر کہتے ہیں یعنی ان سے تعلقات اسلام منقطع کر لئے جائیں جب تک کہ وہ اپنے تکفیر بازی کے مشغلہ سے باز نہ آجائیں۔ حضرت مرزا صاحب نے تو امام ابوحنیفہ کی طرح یہ فرما کر فرقہ بندی کی جڑ پر کلہاڑا رکھ دیا کہ جس میں ننانوے وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ اسلام کی ہو اسے بھی کافر نہ کہو۔ اسلام میں سے فرقہ بندی کے مرض کو دور کرنے کا یہی ایک ہی علاج تھا جو حضرت مرزا صاحب نے نہایت عقلمندی کے ساتھ تجویز کیا تھا۔ اگر مسلمان مستعدی سے اس پر عمل کرتے تو آج نہ یہ تکفیر بازی ہوتی اور نہ افتراق وانشقاق۔

جماعت کے بنانے کی اصل وجہ

شاید کسی کو یہ وسوسہ گزرے کہ پھر حضرت مرزا صاحب نے خود کیوں جماعت بنائی۔ میں کہتا ہوں کہ اس جماعت کے بنانے کا موجب وہی جہاد کبیر ہے جس کا میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں اور جس کی طرف حضرت مرزا صاحب نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو دعوت دی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ آؤ اس ایک نصب العین کیلئے ہم سب ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر دشمنان اسلام کا مقابلہ کریں (دیکھو آپ کی تصنیف فریاد درد) کیا اس جہاد کے لئے جماعت کی ضرورت نہ تھی۔ کونسا جہاد ہے جو بغیر جماعت اور امام کے ممکن ہے۔ جہاد تلوار کا ہو یا قلم کا۔ ظاہری غلبہ کیلئے ہو یا روحانی غلبہ کیلئے جماعت کا ہونا ضروری ہے بغیر فوج کے کسی قسم کی بھی جنگ کرنی ممکن نہیں۔ پس اگر حضرت مرزا صاحب نے اس جہاد کیلئے ایک جماعت بنائی تو اس میں کونسی فرقہ بندی ہو گئی۔ غیر از جماعت مسلمانوں کو آپ کی جماعت اگر الگ کوئی فرقہ نظر آتا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے

کہ ان کے علما نے انہیں کافر قرار نہ رکھا ہے۔ اگر کافر نہ سمجھو تو کوئی بھی الگ فرقہ نہیں۔ وہی مسلمان اہل سنت و الجماعت ہیں۔ جیسا کہ خود حضرت مرزا صاحب بار بار اعلان کرتے رہے گویا یہ معترض کی اپنی ہی آنکھ کا قصور ہے جس پر تعصب کی عینک چڑھی ہوئی ہے جو حضرت مرزا صاحب کی جماعت اسے کوئی الگ فرقہ نظر آتی ہے۔ ہاں علم کلام کے ان تمام نئے اسلحہ سے اس جماعت کے مجاہدین مسلح ہیں جو آج اس رُوحانی اور قلمی اور کلچر کی جنگ کیلئے ضروری ہیں۔ اس پر ناراض ہونا ایسا ہی ہے جیسے جہاد بالسیف کی ضرورت آپڑے اور مسلمانوں کی کوئی فوج توپ اور بندوق اور ہوائی جہاز اور ٹینک وغیرہ کا استعمال کرے تو علما ان لوگوں کو اسلام سے خارج کردیں کہ ان کے پاس وہی پرانی تلواریں اور ڈھالیں اور تیر اور برچھے کیوں نہیں جن کا استعمال سلف صالحین کیا کرتے تھے۔ کسی مجاہدین کی جماعت پر جو شخص فرقہ بندی کا الزام لگاتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ وہ خود تو اس فوج میں شامل ہوکر جہاد جیسے اہم فریضہ کو بجا نہیں لاتا اُلٹا شامل ہونیوالوں کو ملامت کرتا ہے۔ مثل ہے کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ کونسا جہاد ہے خواہ وہ اسلام کے ظاہری غلبہ کے لئے ہو یا رُوحانی غلبہ کے لئے جو بغیر کسی فوج کے کیا جا سکتا ہے اور کونسا تبلیغی کام ہے جو بغیر کسی جماعت کے جاری رہ سکتا ہے۔ خدا خود قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ ولتکن منکم امّۃٌ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکرؕ واولٰئک ھم المفلحون (آل عمران) مسلمانو! چاہئے کہ تم میں ایک جماعت موجود رہے جو خیر یعنی اسلام کی طرف لوگوں کو بلائے اور نیک کام کرنے کا حکم کرے اور بُری باتوں سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانیوالے اور کامیاب ہونیوالے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو اس آیت میں صریح طور پر جماعت احمدیہ کے لئے پیشگوئی ہے۔ کیونکہ صحابہ اور سلف صالحین کی جماعت تو کنتم خیر امّۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ (آل عمران) (کہ تم سب کے سب بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) کی مصداق تھی۔ کیونکہ اس جماعت کا ایک ایک آدمی بجائے خود مبلغ تھا جس ملک میں بھی گیا اپنا تبلیغ کا کام ساتھ لیتا گیا۔ افریقہ کے انتہائے مغرب سے لیکر ایشیا کے انتہائے مشرق تک اس پاک جماعت کا جو فرد جہاں بھی گیا وہ اشاعت اسلام کا مرکز بن گیا۔ وہ تو ساری کی ساری جماعت مبلّغوں کی تھی۔ پس یہ آیت ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر الخ

جس میں مسلمانوں میں سے ایک جماعت کو تبلیغ کے کام کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ہے اس آخری زمانہ کے لئے معلوم ہوتی ہے جبکہ مسلمان من حیث القوم تبلیغ اسلام کا کام بھلا بیٹھے۔ بلکہ اس زمانہ میں تو دعوت و تبلیغ ایسا کام سمجھا جانے لگا تھا جس کا عقلمندوں کی مجلس میں نام تک لینا بھی مضحکہ خیز تھا۔ اس لامذہبی کے زمانہ میں جب مذہب سے تغافل انتہا کو پہنچ گیا اور کسی کو اپنا مذہب بدلنے کے لئے کہنا پرلے درجہ کی بد تہذیبی سمجھا جانے لگا۔ اور پادریوں اور آریوں کے اعتراضوں سے متاثر ہو کر خود مسلمان اسلام کو پیش کرنا تو دور رہا اپنے آپ کو مسلمان کہتے بھی شرمانے لگے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب نے محض تبلیغ اسلام کی خاطر ایک جماعت بنا کر اس آیت کے حکم کو زندہ کیا۔ گویا اس آیت میں پیشگوئی کے رنگ میں قبل از وقت یہ حکم تھا کہ جب مسلمانوں کی حالت اس درجہ زبون ہو جائے کہ وہ اسلام سے غافل ہو جائیں اور تبلیغ کے کام کو بھول جائیں اس وقت ایک جماعت بنائی چاہئیے جو تبلیغ اسلام کا کام کرے اور پھر قبل از وقت اس جماعت کے لئے یہ بھی خوشخبری دے دی کہ اولٰئک ھم المفلحون کہ وہ ضرور کامیاب ہونے والے ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

اب دیکھنا تو یہ ہے کہ جماعت احمدیہ نے جو حضرت مرزا صاحب نے بنائی آیا تبلیغ اسلام کا کچھ کام کیا بھی یا خدمت اسلامی اور جہاد بالقرآن کا دعویٰ یونہی زبانی باتیں ہیں۔ سو واضح ہو کہ اسلام تو خدا کا دین ہے اور خدا خود اس کا محافظ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحٰفظون۔ کہ ہم نے اس ذکر کو اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ خدائی وعدہ کے مطابق اسلام تمام دنیا میں پھیل کر اور غالب ہو کر رہے گا۔ اگر ہم اس کی تبلیغ میں حصہ نہ لیں گے تو خدا کوئی اور قوم اس کام کے لئے لے آئے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ محمدؐ میں فرماتا ہے۔ وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم کہ اگر تم روگردانی کروگے تو خدا تمہارے سوا دوسری قوم لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔ تو مسلمانوں کی بدقسمتی پر کس قدر افسوس ہے کہ ناحق کے تعصب اور غلط فہمیوں کی بنا پر مسلمانوں میں سے بہت تھوڑوں نے اس امام وقت کی آواز پر جس کے ماننے کے لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر تاکید فرمائی تھی لبیک کہا اور مجاہد جماعت میں شامل ہو کر اس اہم فریضۂ اسلامی یعنی جہاد بالقرآن کی طرف توجہ کی۔ اور ایک بہت بڑا حصہ اس امت کا بجائے مجاہدین کے قاعدین بن کر اس سب سے ضروری خدمت اسلامی سے محروم رہ گیا۔ اور یہ بھی نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مجاہدین یعنی جماعت احمدیہ کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں میاں محمود احمد صاحب

کے غالیانہ عقائد اور ان کی خلافت کی تمنا نے اس جماعت کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دیا۔ اور ایک بڑا حصہ اس جماعت کا جو قادیانی فریق کہلاتا ہے غلو اور دنیا کی سیاست میں مبتلا ہو کر خدمت اسلامی سے محروم ہوگیا۔ اس کا مقصد اپنے غالیانہ عقائد کے ماتحت ایک نئی نبوت اور قادیان میں میاں محمود احمد صاحب کی خلافت اور ریاست قائم کرنا رہ گیا اور اشاعت و تبلیغ اسلام کے بجائے خود مسلمانوں کو کافر بنانے کا گمراہ کن شعار انہوں نے اختیار کر کے جماعت کے کام کو سخت نقصان پہنچایا۔ احمدی جماعت کا دوسرا حصہ جو تعداد میں قلیل رہ گیا اور لاہوری فریق کہلاتا ہے بدستور اپنے امام حضرت مرزا غلام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح عقائد پر قائم اور آپ کی ہدایات کے ماتحت خدمت دین کر رہا ہے۔ اور نہ صرف غیر مسلموں میں اشاعت و تبلیغ کے دشوار کام میں لگا ہوا ہے بلکہ قادیانی فریق کے غالیانہ عقائد کے ابطال اور تردید کا کام بھی اسے کرنا پڑ گیا جس سے بہت سا وقت اور قوت اس طرف ضائع ہو رہی ہے۔ لیکن اس فتنہ کا استیصال اور حضرت مرزا صاحب کی بریت بھی بیحد ضروری کام تھا تا ان غلط فہمیوں سے جو دوست دشمن دونوں کی طرف سے پھیلائی جا رہی ہیں حضرت مجدد وقت کا دامن پاک ثابت ہو اور مسلمانوں کو دین کی خدمت کے کام میں اس چھوٹی سی جماعت کا ہاتھ بٹانے کی توفیق ملے لیکن باایں ہمہ مشکلات خدمت دین کرنے والوں کے لئے خدائی وعدہ اولئک ھم المفلحون برابر کام کر رہا ہے اور کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ (کہ بہت دفعہ ہوتا ہے کہ قلیل جماعت اللہ کے حکم سے کثیر جماعت پر غالب آجاتی ہے) کا نظارہ ہمیں اس قلیل جماعت کے کارناموں میں ماشاء اللہ نظر آتا ہے۔ اس جماعت کا مرکز اس وقت احمدیہ بلڈنگس لاہور ہے۔ اور ایک انجمن کی جس کا نام احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور ہے اور جس کے صدر مولانا محمد علی صاحب ہیں۔ قیادت میں جماعت اپنا کام کر رہی ہے۔ اس چھوٹی سی جماعت نے خدا کے حکم جاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ کے ماتحت جس طرح جانی اور مالی قربانی کی ہے وہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں کہیں نظر نہیں آتی۔ باوجود عیسائیوں اور آریوں اور سب سے بڑھ کر خود غیر احمدی مسلمانوں اور قادیانی احمدیوں کی سر توڑ مخالفت کے اس چھوٹی سی جماعت کے قدم میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ اور خدا کی راہ میں جہاد کا قدم ماشاء اللہ ترقی ہی کرتا گیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ خدا کی راہ میں جانوں کی قربانی آج کل یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی زندگی کو خدمت دین کے لئے وقف کر دیا جائے۔ سو حضرت اقدس

مرزا صاحب کے زمانہ میں تو ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی جو صدہا روپے کی آمدنی ترک کر کے فقیر بن کر حضرت اقدس کی خدمت میں آن بیٹھے۔ حضرت مولانا نورالدین مرحوم حضرت مولانا سید محمد احسن مرحوم، حضرت مولانا عبدالکریم مرحوم وغیرہ بہت مشہور و معروف انسان ہیں جو اپنے ہر قسم کے دنیوی مفاد کو ترک کر کے قادیان میں دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ حضرت مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی تھے پریکٹس وکالت کی کرتے تو اُن جیسے دل و دماغ کے آدمی کے لئے روپے کی کمی نہ تھی۔ ای اے سی کے مقابلہ کے امتحان کے لئے ان کا نام جا چکا تھا۔ آج سیشن جج یا جج ہائیکورٹ ہوتے لیکن خدا کے لئے سب کچھ ترک کر کے حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں قادیان ایک قلیل مشاہرہ پر جو گزارہ کے لئے بھی ناکافی تھا آن بیٹھے۔ مولوی صدرالدین صاحب، مولوی محمد یعقوب خاں صاحب معقول ملازمتیں ترک کر کے خدا کے دین کی خدمت کے لئے وقف ہو گئے۔ خواجہ کمال الدین مرحوم اپنی ہزار روپے ماہوار کی وکالت چھوڑ کر انگلستان خدا کے دین کی خدمت کے لئے جا بیٹھے۔ غرضیکہ یہ ایک لمبی فہرست ہے جس کو سنا کر میں سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ مشتے نمونہ از خروارے عرض کر دیا گیا۔ آج بھی خدا کے دین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے والوں کی کمی نہیں جس کا دل چاہے جماعت میں اس رُخ پر نظر ڈال کر دیکھ لے۔

مالی قربانی کا یہ عالم ہے کہ جماعت کا ہر ایک فرد باقاعدہ ماہوار چندہ ادا کرتا ہے۔ زکوٰۃ الگ دیتے ہیں جو انجمن کے بیت المال میں جمع ہوتی ہے۔ یہ ماہوار چندہ **مالی جہاد** ہے جو زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ پھر یہاں دو آنے والا ممبر کوئی نہیں۔ اکثر افراد جماعت ایک آنہ فی روپیہ اپنی ماہوار آمدنی کا دیتے ہیں۔ بعض اپنی آمدنی کا دسواں حصہ دیتے ہیں۔ کوئی کوئی اپنی آمدنی کا پانچواں حصہ بھی دیتا ہے۔ اس باقاعدہ ماہوار چندہ کے علاوہ اور کئی قسم کی تحریکیں ہوتی رہتی ہیں۔ کہیں مسجد برلن کے لئے چندہ ہو رہا ہے جو ڈیڑھ لاکھ روپے کے خرچ سے تعمیر ہوئی کہیں ووکنگ مشن کے لئے چندہ جمع ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ کی طباعت اور پھر اس کی مفت اشاعت کیلئے اس چھوٹی سی جماعت نے ہزارہا روپیہ چندہ دیا۔ قرآن کریم کے جرمن ترجمہ کی طباعت و اشاعت کیلئے ہزارہا روپیہ چندہ جمع ہوا۔ مسلم ہائی اسکول لاہور کی تعمیر کے لئے ہزارہا روپیہ چندہ اکٹھا ہوا۔ کہیں لٹریچر کی مفت اشاعت کے لئے ہزارہا روپیہ چندہ ہو رہا ہے۔ جوبلی فنڈ میں ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ قوم نے اکٹھا کر دیا۔ غرضیکہ ہر سال یہ چھوٹی سی جماعت اپنے ماہوار چندوں کے علاوہ ہزارہا روپیہ اشاعت و حفاظت اسلام کی تحریک پر قربان کرتی رہتی ہے

اور محض رضائے الٰہی کے لئے خدا کے دین کی خاطر یہ قربانی کرتی ہے۔ کسی انسان یا پیر کو خوش کرنے کیلئے نہیں کہ اُس سے ہمیں کوئی دنیوی نفع پہنچے گا یا وہ ہمارے مفاد کے لئے وقت پر دعا کرے گا یا قیامت میں ہمیں بخشوائیگا بلکہ بغیر کسی دنیوی یا اخروی لالچ کے خدا کے دین کی محبت کی وجہ سے یہ قربانیاں کرتی ہے اور یہی اصل توحید ہے جس میں نفس کا کوئی شائبہ نہیں۔ چھوٹے بڑے امیر غریب عورتیں بچے سب ملا کر پانچ ہزار نفوس سے زیادہ نہیں مگر کام دیکھو تو ماشاء اللہ اتنا ہو رہا ہے کہ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد رکھنے والے مسلمانوں میں اس کا شائبہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ جب ملکانہ راجپوتوں میں آریوں نے اشدھی کی تحریک شروع کی تو جماعت احمدیہ لاہور کے مبلغین بھی وہاں کام کرتے رہے۔ ان کا کام اور کام کی قابلیت دیکھ کر ملکانوں میں ایک قابل وکیل نذیر احمد مرحوم بہت متاثر ہوئے وہ جماعت کا مرکز دیکھنے کے شوق میں لاہور آئے۔ لاہور کی مسجد احمدیہ بلڈنگس میں جماعت لاہور کو دیکھا تو بہت تھوڑی سی نظر آئی۔ حیران ہو گئے۔ خاکسار مؤلف سے کہنے لگے کہ مرکز میں بس اتنی سی ہی جماعت ہے۔ میں نے کہا ہاں اتنی سی ہی جماعت ہے کہنے لگے "باہر آپ لوگوں کی تبلیغ کی شان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پشت پر لاکھوں آدمی بیٹھے ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا "لاکھوں آدمیوں کی بجائے فقط ایک خدا کافی ہے۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل"۔ بہت متاثر ہوئے کہنے لگے "یہ خدا کا فضل اور اس کی نصرت کا ہاتھ اس جماعت پر ہے۔ ورنہ کفار پر یہ رعب سوائے خدائی نصرت کے حاصل نہیں ہو سکتا"۔ ابھی حال ہی میں چین کے مسلم فیڈریشن کے نمائندہ ڈاکٹر عثمان ڈو لاہور تشریف لائے تو جب ہمارے بعض احباب اُن سے ملنے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ لاہور کے ساتھ احمدیہ بلڈنگس مجھے برابر یاد تھی اور پختہ ارادہ تھا کہ لاہور گیا تو احمدیہ بلڈنگس ضرور جاؤں گا۔ یہاں آکر دریافت کیا تو کسی نے اس طرف رہنمائی نہ کی۔ لیکن اب میں ضرور چلوں گا۔ جب سُنا کہ مولوی محمد علی صاحب ڈلہوزی میں ہیں تو بہت مغموم ہوئے کہنے لگے میں نے اُن سے تو ضرور ملنا تھا۔ ہمارے ملک چین میں تو فقط دو محمد علی مشہور ہیں۔ ایک سیاسی محمد علی۔ اور ایک مذہبی محمد علی۔ پس میں تو مذہبی محمد علی سے ملے بغیر رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ ان کو شام کے کھانے کی دعوت دی گئی۔ اور ڈلہوزی مولوی محمد علی صاحب کو تار دی گئی۔ مولوی صاحب فوراً لاہور پہنچے جس وقت ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر عثمان ڈو جس محبت اور گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے وہ قابل دید تھی۔ رات کو اور دوسرے دن صبح دو گھنٹے مذہبی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔ بابو منظور الٰہی صاحب مرحوم کے زمانہ سے جماعت نے چینی مسلمانوں کو بھیجے ہوئے

خطوط کی فائل نکالی تو اُن میں ڈاکٹر عثمان ڈو کے خطوط بھی نکلے۔ اور بہت سے چینی زبان کے رسالے بھی نکالے تو ڈاکٹر ڈو نے پڑھ کر بتلایا کہ اکثر ان میں سے احمدیہ جماعت لاہور کے ٹریکٹوں کے چینی زبان میں ترجمے ہیں۔ کہنے لگے چینی مسلمانوں کی ایک انجمن تھی جو پیکن میں تھی اور جو احمدیہ اسلامی لٹریچر وہاں جاتا تھا انہیں چینی زبان میں ترجمہ کر کے وہ شائع کرتے تھے۔ آپ کا لائٹ اخبار وہاں باقاعدہ آتا تھا اور بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ہم نے تو جو دین سیکھا وہ آپ کے انگریزی ترجمہ قرآن سے سیکھا"

اس کے بعد آپ سے دریافت کیا کہ آپ کے خیال میں ہندوستان میں اور کوئی اسلامی انجمن ہے جو اس قدر خدمت دین کر رہی ہو۔ فرمانے لگے "ہندوستان کیا تمام دنیا میں کوئی مسلمانوں کی انجمن یا جماعت ایسی نہیں جو تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام اس کا عشر عشیر بھی کر رہی ہو"

مسلم اکابر کی آرا یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر بعض اکابر مسلمانوں کی جو احمدی جماعت میں شامل نہیں ہیں آرا نقل کر دوں تاکہ اس جماعت کے کاموں کا کسی قدر اندازہ قارئین کرام لگا سکیں۔

اعلیحضرت نواب صاحب مانگرول محمد جہانگیر میاں۔ مراسلہ مورخہ ۹۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کی انجمن نے جو اسلامی تبلیغی خدمات انگلینڈ و جرمنی وغیرہ ممالک میں انجام دی ہیں اور دیتی رہتی ہے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ان کے نتائج محتاج بیان و تعریف نہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک خاص صفت تو صرف آپ ہی کی انجمن کے ممبروں کے لئے قدرت نے عطا فرمائی ہے کہ آپ کی انجمن کے جو افراد ہیں وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ایسے مستعد اور مستقل ہوتے ہیں کہ شاید یہ بات ہند کی کسی دوسری انجمن کو کم حاصل ہوگی۔ بہرحال میری رائے تو یہ ہے کہ تبلیغ و اشاعت اسلام کی خدمات آپ کی انجمن جس تن دہی، محنت جانفشانی اور عمدہ طریق پر انجام دے رہی ہے وہ ہر مسلمان کیلئے باعث شکر و مبارکباد ہیں"

شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ سکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ میں دلی مسرت سے آپ کی انجمن کو ان کارناموں کے لئے جو اس نے دیگر ممالک اور خصوصاً یورپ میں اشاعت و تبلیغ اسلام کے دائرہ میں دکھائے ہیں مبارکباد کہتا ہوں۔ اس میدان میں انجمن موصوف نے جو نیک مثال پیش کی ہے اس کی جملہ اہل اسلام کو

خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر تقلید لازم ہے۔ زمانہ حال میں اشاعت اسلام کے لئے جو سرگرمی ایثار اور قربانی احمدیہ جماعت کا دستور العمل رہا ہے وہ دوسرے تمام فرقوں کے لئے سبق آموز ہے۔ میں ذاتی طور پر ہر اس فرد اور جماعت کا مداح ہوں جو بنی نوع انسان کی کچھ بھی قابل قدر خدمت ادا کرے۔ اور میرا یقین ہے کہ دین اسلام کی ترغیب اور اس کی اشاعت میں بنی نوع انسان کی ایک نہایت بیش بہا اور حقیقی خدمت ہے اور ان دنوں میں اس معیار پر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے سوا دیگر بہت کم جماعتیں پوری اُترتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی جماعت کو اشاعت اسلام کی اس سچی خدمت کے لئے مزید توفیق بخشے اور جزائے خیر و احسن عطا فرمائے"۔ (دسمبر ۱۹۳۴ء)

از جناب ڈاکٹر ابو الحسن منصور صاحب۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

"میں نے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی کارروائی برلن میں دیکھی ہے اور ایک حد تک لاہور میں بھی اس سے وابستہ ہوں۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ جو کوشش اور ہمت اس انجمن نے اشاعت اسلام کے متعلق صرف کی ہے اس کی نظیر آج کل دنیائے اسلام کی کوئی انجمن پیش نہیں کر سکتی۔ تمام مسلمانان ہند و دیگر ممالک اسلامیہ کیلئے میرا یہ مشورہ ہے کہ اشاعت اسلام کے بارے میں اس انجمن کی تقلید و تائید کریں۔ (دسمبر ۱۹۳۴ء)

از جناب مولانا غلام رسول صاحب مہر ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور۔

"احمدیہ جماعت سے بعض خاص امور میں اختلاف کے باوجود میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی وسیع دینی و ملی خدمات کا ہمیشہ معترف و مداح رہا ہوں۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت۔ غیر مسلم ممالک کے مراکز میں مستقل تبلیغی ادارات کا قیام۔ مختلف حلقوں کی ضروریات کے مطابق موزوں و مناسب مبلغین کی تیاری۔ ان میں سے ہر کام اتنا اہم۔ اتنا ضروری اور اس درجہ لازم ہے کہ ہر دردمند مسلمان کو اس کی بجا آوری پر زیادہ سے زیادہ خوش ہونا چاہئے۔ خواہ ایسے کام انجام دینے والی جماعت سے بعض دوسرے امور میں کتنا ہی اختلاف ہو۔ اور احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور تو یہ سب کام بیک وقت انجام دے رہی ہے۔ علاوہ بریں انجمن نے پندرہ سولہ ملکی و غیر ملکی زبانوں میں مفید اسلامی لٹریچر کا بیش قیمت ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ قرآن حکیم احادیث سیرت حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔ سیرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور اصول اسلام کے متعلق انجمن کی تحریری خدمات قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ تعلیم اور اصلاح معاشرت کے دائرے بھی خالی نہیں رہے۔ انجمن کے زیر اہتمام دو ہائی اسکول چل رہے ہیں۔ نیز دیہاتی آبادی

میں مسرفانہ و غیر شرعی رسوم کو روکنے اور غریب مسلمانوں کو سود خواروں کی گرفت سے بچانے کی طرف بھی توجہ مبذول ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ انجمن کی ان مفید مذہبی و ملی خدمات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو جائے اور تمام اسلامی انجمنیں اور جماعتیں اسی استقلال اور سرگرمی سے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی اور دین کی حفاظت و اشاعت کو اپنا شعار بنالیں"۔ (دسمبر ۱۹۳۲ء)

از جناب مولانا عبد المجید صاحب قرشی مدیر اخبار "ایمان" پٹی۔

"حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ آپ کا عمل ہے۔ اصول وضع کرنے بڑے آسان ہیں اور کتابیں لکھنا بھی آسان ہے باتیں کرنا اور وعظ کہنا بھی آسان ہے کسی تعمیری کام کی تحقیر کرنا اور اس پر مضحکہ اڑانا بھی آسان ہے لیکن کوئی زندہ اور پائدار تعمیری عمل اور تنظیمی اقدام بڑا مشکل ہے میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے کام کا چنداں مداح نہ تھا۔ اب میں چار سال سے تحریک یوم النبیؐ کے کام میں مصروف ہوں۔ اور چار سال کی شبانہ روز کوششوں اور محنتوں کے باوجود حالت یہ ہے کہ ابھی اس تعمیری کام کا پہلا قدم بھی نہیں اٹھ سکا۔ اس ذاتی تجربہ کے بعد پہلی دفعہ اس حقیقت کا احساس کر سکا ہوں کہ انجمن مذکور کا کام کس قدر اہم اور عظیم الشان ہے۔ بیشک احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی تبلیغی کارگزاری عظیم الشان ہے۔ انجمن کی کامیاب کوششوں نے کائنات عالم کی تاریخ میں اپنے لئے ایک زریں ورق حاصل کر لیا ہے۔ انجمن نے برلن مسجد کی تعمیر، ووکنگ کی آبادی، اور انگریزی اور جرمن ترجمۃ القرآن کی صورت میں ملت اسلامیہ کیلئے ایک اتنی بڑی دولت پیدا کر دی ہے جس پر ہماری آئندہ نسلیں فخر کریں گی اور فخر کے ساتھ اس دولت کی حفاظت کریں گی...... بعض مذہبی اور سیاسی مسائل میں ہمارا اختلاف احمدیہ جماعت سے بالکل واضح ہے لیکن اس جماعت کے نظام کی وسعت اور باقاعدگی، اس کے کارکنوں کی گرمجوشیاں، اس کے مبلغوں کی عالمگیر حرکت، اس کی مطبوعات کی اشاعت اور ہمہ رسی، ہر سال دو لاکھ روپے کی باقاعدہ آمد۔ اور دو لاکھ روپے کا باقاعدہ خرچ ایسی چیزیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر زبان انکار کرے تو دل انکار نہیں کر سکتا۔ انجمن کا کامیاب تبلیغی پروگرام، اس کا باقاعدہ نفاذ۔ اس کی مستقل سیر و حرکت اور مسلسل اقدام۔ ہندوستان کے سات کروڑ منتشر مسلمانوں کیلئے درس عبرت ہے۔ سات ہزار احمدیوں کا اتحاد و اجتماع تبلیغی میدان میں جو کچھ کر رہا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ہم سات کروڑ حنفیوں وہابیوں شیعوں کو میسر ہے؟

میری موجودہ جدوجہد کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم نیکی اور خیرات و حسنات کے کاموں میں "انجمن احمدیہ" کا زبردست مقابلہ کریں ہم زبان کو چھوٹا کریں اور اعمال کو بڑھائیں۔ ایک لکیر "انجمن" نے کھینچی ہے۔ ہم اس کے پاس ایک بڑی لکیر کھینچ دیں تا "انجمن" کی لکیر چھوٹی ہو جائے۔ مجھے اپنی ملت کے علماء پر حسرت ہے وہ چاہتے ہیں کہ

اعمال کو دلائل اور الفاظ سے شکست دیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ منہ کی پھونکوں اور ہاتھوں کی تالیوں سے ایک فولادی قلعہ کو توڑ دیں۔ یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ احمدی ہوں یا نہ ہوں مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ احمدیہ انجمن کی کامیاب اور عظیم الشان مثال ایک دن تمام اُمت کیلئے بیداری کا پیغام ثابت ہوگی۔ اگر ایک دیا سلائی لکڑی کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو آگ لگا کر فنا بھی ہو جائے تو اس کو یہ فنا نہایت مبارک ہے۔ خدا تعالیٰ ہم سب کو نیکی خلوص خدمت دین اور اعلائے کلمۃ الحق کی توفیق دے (دسمبر ۱۹۳۲ء)

جناب مولانا عبد المجید صاحب قریشی مدیر اخبار "ایمان" پٹی کی ایک اور تحریر بھی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے کارنامے مجھ ناچیز کی تعریف و توصیف سے بالاتر ہیں۔ واقعہ میں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں انجمن کی تبلیغی اور تعمیری خدمات کی تعریف و توصیف سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ مجھے تحریک احمدیت کے سیاسی اور مذہبی مسائل سے پانچ فیصدی اختلاف ہوگا۔ مگر انجمن کی تبلیغی روح سے سو فیصدی اتفاق ہے۔ انجمن نہایت مفید، اہم، قابل تعریف ضروری اور عظیم الشان خدمات انجام دے رہی ہے۔ قرآن کریم کے ڈچ، انگریزی اور جرمنی زبانوں میں تراجم شائع کرنا قلب یورپ میں مساجد اللہ کی تعمیر، سیرت نبوی کی اشاعت۔ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پیغام اسلام کی علمبرداری۔ اور ان مقاصد عظمیٰ کے لئے ہر سال دو لاکھ روپیہ جمع کرنا اور پھر اسے نہایت احتیاط۔ حفاظت و ذمہ داری کے ساتھ صرف کرنا ایسے کام ہیں جو کسی صورت میں اعجاز سے کم نہیں ہیں۔ انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قادیانی جماعت کے غلو کی مخالفت کی۔ اور تمام دنیائے اسلام کے ساتھ شامل رہ کر ختم نبوت کے علم کی حفاظت فرمائی۔ قادیانی جماعت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالمقابل قادیان میں ایک نئے دین اور نئی نبوت کے قیام کا راستہ صاف کر رہی تھی۔ اگر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور اس کا راستہ نہ روکتی تو یہ فتنہ اب تک بہت ہی زیادہ پھیل چکا ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انجمن کی یہ خدمت تمام اُمت کیلئے صد ہزار تحسین و آفرین کی مستحق ہے۔ انجمن کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فتنہ تکفیر کا مقابلہ کیا۔ اور کفر سازی کی مشین گنوں کی قوت کو توڑ دیا۔ میری تہ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انجمن کے کاموں میں برکت دے اور زیادہ سے زیادہ استحکام بخشے" (دسمبر ۱۹۳۳ء)

جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب بیرسٹر لاہور تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اس انجمن (یعنی احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور۔ ناقل) کی کارگزاری سے کئی سالوں سے واقف ہوں اور اب میں نے اس ٹریکٹ کو بھی دیکھا ہے جو دفتر پیغام صلح سے میرے پاس بھیجا گیا اور جس میں انجمن کے عقائد اور اس کی خدمات بیان کی درج ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ اس انجمن کے ارکان اور عامۃ المسلمین کے درمیان

توحید و رسالت کے متعلق کوئی فرق نہیں۔ اور یہ چیز چونکہ میرے نزدیک اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے میں اس کو بہت اہمیت دیتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ جو تبلیغی کام اس عقیدہ کے ماتحت کیا جائیگا۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی پر منتج ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس انجمن کی کارگزاریوں میں برکت دے۔" (دسمبر ۱۹۳۳ء)

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی ایڈیٹر اخبار "سچ" یا "صدق" لکھنؤ تحریر فرماتے ہیں:۔

"پیام حقیقی تو بس ایک تھا جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل دنیا کو مل چکا "پیام سچا" اس پیام کا لانیوالا سچا۔ اب ہمارے اور آپکے سب کے فخر و شرف کا منتہیٰ بس یہی ہے کہ اس سچے اور اچھے پیام کی سچائیوں کے ماننے، جاننے، برتنے اور پھیلانے میں اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق اپنی عمریں صرف کردیں۔ ولادت مسیح، وفات مسیح، ظہور مسیح موعود وغیرہ مسائل میں ہمارا آپکا اختلاف ہے وہ واضح ظاہر ہے۔ لیکن جو عام خدمات اسلامی آپ کی جماعت ہمت و سرگرمی جوش و انہماک کے ساتھ سرانجام دے رہی ہے انکی ناقدری ظلم ہے۔ اور وہ کیا معنی مجھے تو بار بار رشک آچکا ہے۔ یورپ امریکہ میں تبلیغ اسلام کی کوشش آپ کے امیر کا انگریزی ترجمہ قرآن، اُردو تفسیر قرآن، سیرت خیر البشر، تاریخ خلافت راشدہ، مقام حدیث وغیرہ متعدد انگریزی و اُردو تصانیف۔ نیز خواجہ صاحب کا اسلامک ریویو ان سب کے ذریعہ سے انگریزی خوانوں تک جو روشنی پہنچ رہی ہے اس کے فیض سے کوئی واقف کار کیسے انکار کرسکتا ہے اللہ ہم کو آپ کو سب کو اپنے دین کا سیدھا رستہ دکھائے اور اسکی بیش از بیش توفیق مرحمت فرمائے۔" والسلام (دسمبر ۱۹۳۳ء)

جناب مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور تحریر فرماتے ہیں:۔

"احمدیہ انجمن اشاعت اسلام نے ممالک غیر میں بیس اکیس سال سے اسلام کے حقائق نیرہ کی اشاعت کیلئے جو عظیم الشان کام جاری کر رکھا ہے اسکے نتائج نہایت حوصلہ افزا ہیں لیکن میرے نزدیک اس انجمن کی کامیابیوں کا اندازہ اس امر سے نہ کرنا چاہیئے کہ اسکے قائم کردہ مراکز نے آجتک کتنے غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام بنایا ہے بلکہ اس انجمن کی سب سے زیادہ جلیل القدر خدمت یہی ہے کہ اسکے وجود اور اسکی سرگرمیوں نے یورپ اور امریکہ کے متعصبین مدبران جو انکی ان شرمناک غلط بیانیوں کا کماحقہ سدباب کردیا ہے جو وہ آئے دن اسلام اور شارع اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے اس انجمن کے مرکزوں کے قیام سے پہلے اسلام کے خلاف لٹریچر کی اشاعت بہت زوروں پر تھی لیکن اب یہ حالت ہے کہ اگر بلاد مغرب کے کسی گوشے سے کوئی بدبخت انسان اسلام اور اس کے شارع علیہ السلام کے خلاف ایک فقرہ بھی شائع کرتا ہے تو اس انجمن کے سرگرم مبلغین اسکی تردید اور آیندہ کیلئے ایسے حملوں کے سدباب کیلئے اپنی پوری قوتیں صرف کردیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب مقدس اسلام کی ساکھ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ میرے نزدیک یہی ایک خدمت ایسی عظیم الشان ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو اس انجمن کی امداد میں پورا حصہ لینا چاہیئے" (دسمبر ۱۹۳۳ء)

جناب ڈاکٹر رشید الدین خاں صاحب (رامداس) پی-ایچ-ڈی نومسلم تحریر فرماتے ہیں :-

(انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے)

" میرے خیال میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور دورِ حاضرہ میں صرف ایک ہی منظم جماعت ہے جو کہ اسلامی تعلیمات کو صحیح طریق پر پیش کرنے میں سرگرم کار ہے - میں مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمۃ القرآن - لائف آف دی ہولی پرافٹ اور انگریزی خلافت راشدہ کا خاص طور پر ذکر کروں گا - کیونکہ یہ اس زمانہ کی علمی تاریخی - تنقیدی اور ذہنی دیانتداری کی بہترین تصانیف ہیں - ان سے صرف مولانا ممدوح کے استقلال اور محنت ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ عمیق اور صحیح فیصلہ اور جدت طبع بھی ظاہر ہوتی ہے - یہ تصانیف اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں - حدیث نبوی کے مطابق جہاد اکبر ایک عالم کا جہاد ہے - اس کی روشنائی شہید کے خون کے قطروں سے زیادہ پاک ہے - آپ کی انجمن کا جہاد کسی کھوئی ہوئی حکومت یا سلطنت کے حصول کے لئے نہیں ہے - بلکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق صحیح جہاد ہے - انسانی آزادی - انسانی ترقی - انسانی اخوت اور حق کی اشاعت - بدی غلطی ناانصافی اور توہم پرستی کے خلاف جنگ - خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم کرنا تاکہ اس ذات باری کی حکومت ہو آپ کا جہاد ہے - میں آپ کی انجمن کا جو اشاعت اسلام کے لئے بہترین کام کر رہی ہے دل سے مداح ہوں " (دسمبر ۱۹۳۳ء)

جناب کرنل ڈاکٹر حسان سہروردی وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی تحریر فرماتے ہیں :-

" احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی دینی خدمات کا میں عرصہ سے معترف ہوں اگرچہ چند متعصب ملانوں کے کفر کے فتوے سننے میں آتے رہے - گذشتہ سال مجھے انجمن کے سالانہ جلسہ میں بھی شرکت کا موقعہ ملا - اور حضرت مولانا محمد علی صاحب سے ملاقات کی اور ان کی تقریریں سنیں میرے خیال میں انجمن نے جو خدمات اسلامی انجام دی ہیں اور جو کام کر رہی ہے وہ نہایت ہی قابل قدر ہیں - میں دل سے اس انجمن کی قدر کرتا ہوں " (دسمبر ۱۹۳۳ء)

ملک عبد القیوم صاحب بی - اے بیرسٹر ایٹ لاء پروفیسر لاء کالج لاہور تحریر فرماتے ہیں :-

" ان حالات کے ماتحت مسلمان ہندوستان کیلئے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا وجود ایک قابلِ فخر وجود ہے - کیونکہ اس ..... کی ابتدا ایک ایسے ملک میں ہوئی جو سیاسی حیثیت سے آزاد خطہ نہیں - مگر اسکے داعیوں نے گذشتہ نصف صدی میں نہتم بالشان جدوجہد کا ثبوت دیا - اور دنیا کے تقریباً ہر ایک حصہ میں اپنے مبلغ بھیجے - ان کے سلسلہ اشاعت و تبلیغ سے صاف نمایاں ہوتا ہے کہ اس وقت عالم اسلام

میں یہی ایک ادارہ ایسا ہے جس کی کوششوں اور حوصلوں میں ابتدا سے لیکر آج تک کوئی تنزل واقع نہیں ہوا اور اسکا سلسلہ اشاعت اسلام اب اسلامی تبلیغ کے ہر ایک محاذ پر سرفروشانہ کارکردگی کر رہا ہے۔ ہم مسلمانوں کو اس واحد اسلامی مشن کا ہاتھ بٹانا چاہیئے اور عملاً اس امر کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیئے کہ ہمارے دلوں میں صداقت اسلام کی حرارت کم نہیں ہوئی۔ بلکہ میں عرض کروں گا کہ یہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پیروی ہے۔ اور کوئی مسلمان مکمل مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں جس نے یا تو اس ارفع مقصد کے لئے خود اقدام نہ کیا ہو یا بصورت دیگر کسی انجمن اشاعت اسلام کی کوشش میں معاون نہ ہوا ہو۔" (دسمبر ۱۹۳۴ء)

جناب خان بہادر حاجی بدرالدین احمد صاحب سینئر اسسٹنٹ رجسٹرار ہائیکورٹ کلکتہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور جو کوشش دنیا میں اسلام کی روشنی پھیلانے کی کر رہی ہے اس کی نظیر سارے عالم اسلام میں شاید ہی کوئی اور جماعت پیش کر سکتی ہو۔ ہندوستان کے مسلمانوں سے کچھ اور خدمت اسلام کی نہ ہو سکتی ہو تو کم سے کم اتنا ہی کریں کہ دامے درمے سخنے جس طرح ہو سکے اس مبارک انجمن کی اعانت کرے۔ میری حقیر رائے میں ایک ایسی انجمن کی زندگی ایک نکمی اور نام نہاد اسلامی ریاست یا سلطنت کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور میری دلی دعا ہے کہ خداوند تعالےٰ اس انجمن اور اسکے مخلص خادموں پر ہمیشہ اپنی برکتیں نازل فرماوے آمین۔" (دسمبر ۱۹۳۳ء)

جناب شمس العلماء مولانا کمال الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی دینی خدمات اظہر من الشمس ہیں خصوصاً مولانا محمد علی صاحب کا ترجمۃ القرآن انگریزی اور اُردو میں اور نیز دیگر کتب کی وجہ سے انسان کے دل میں اسلام کی عزت اور توقیر قائم ہوتی چلی جاتی ہے۔ مجھے خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم سے ووکنگ مشن اور دیگر مقامات میں ملاقات کا موقعہ ملا۔ اس انجمن کے جملہ ممبر جس قدر مالی اور جانی قربانی کرتے ہیں وہ مسلمانانِ عالم کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ اشاعت اسلام کے کاموں میں شرکت کرنا ہر ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک ہر ایک کلمہ گو مسلمان ہے چاہے وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو۔۔۔۔ میری واقفیت میں مسلمانانِ عالم میں غالباً یہی ایک جماعت ہے جو خدمتِ اسلام کے لئے ہر وقت سینہ سپر رہتی ہے اور ایک حد تک کامیابی کیساتھ کام کر رہی ہے۔" (دسمبر ۱۹۳۳ء)

جناب مولانا عبدالکریم صاحب ایم۔ ایل سی بنگال تحریر فرماتے ہیں:۔

"احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور تبلیغ اسلام میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہے اسلامی

ادبیات میں خواجہ کمال الدین مرحوم کی کتاب (آئی ڈیل پرافٹ)۔ لائٹ آف ہولی پرافٹ اور مولانا محمد علی صاحب کا انگریزی ترجمۃ القرآن شاہکار ہیں۔ لائٹ اور اسلامک ریویو وغیرہ رسائل اور اخبارات شائع کئے جا رہے ہیں۔ یورپ اور دیگر ممالک میں مشن کھولے گئے ہیں اسلام کی تبلیغ میں اس انجمن نے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ اور دنیا کی آواز جو اسلام کیلئے اٹھی ہے اسکی ضرورت کو پورا کیا ہے" (۱۹۳۳ء)

جناب نواب زادہ حاجی ولی الاسلام صاحب کلکتہ سے تحریر فرماتے ہیں:۔

" احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور بلاد غربیہ میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں عظیم الشان کام کر رہی ہے ہندوستان میں بھی اس کا کام احسن اور نمایاں ہے۔ میرے علم القرآن کا منبع حضرت مولانا محمد علی صاحب بالقابہ امیر جماعت احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا انگریزی ترجمۃ القرآن ہے۔" (۱۹۳۳ء)

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

" احمدیہ جماعت لاہور کی خدماتِ اسلام کا مجھے عرصہ دراز سے اعتراف ہے۔ اگرچہ میں اس جماعت کے ان عقاید کو تسلیم نہیں کرتا جو میرے عقاید قدیم کے خلاف ہوں تاہم اشاعت اسلام اور تبلیغ اسلام وغیرہ خدمات جو احمدیہ جماعت لاہور انجام دیتی ہے اور دیتی رہی ہے وہ بے حد تعریف کے قابل ہے۔ ...... خبر کوئی کچھ ہی کہے میں احمدیہ جماعت لاہور کی نسبت آزادی سے یہ خیال ظاہر کرتا ہوں کہ اس کا کام اشاعت اسلام اور حفاظت اسلام اور تبلیغ اسلام کی حد تک بہت پسندیدہ ہے اور بہت اعلیٰ ہے اور بہت مخلصانہ ہے۔ جب میں قرآن کریم کا ہندی ترجمہ کر رہا تھا اور مشکلات پیش آ رہی تھیں تو احمدیہ جماعت لاہور نے دو آدمی بلا معاوضہ میری امداد کے لئے بھیجے تھے۔ جنہوں نے میرے آدمیوں کو بہت امداد دی تھی۔ جن میں ایک مولانا عصمت اللہ صاحب مرحوم تھے اور دوسرے صاحب کا نام یاد نہیں رہا۔ میں ۶ مترجموں کو ساٹھ ساٹھ روپے ماہوار دیا کرتا تھا اور ۶ سال سے یہ کام ہو رہا تھا۔ مگر احمدیہ جماعت کے آدمیوں نے ایک پیسہ بھی مجھ سے نہیں لیا۔

اب مجھے فرق بھی بیان کرنا چاہئے کہ تنخواہ دار ترجمہ کرنیوالوں میں میرے مرید بھی تھے اور دیوبندی بھی تھے اور صوفی بھی تھے۔ اور پیرزادے بھی تھے۔ اور ہندو بھی تھے۔ مگر معقول معاوضہ لینے کے بعد اپنے فرائض کو صرف ایک دیوبندی نو مسلم عالم نے ادا کیا۔ باقی اور سب نے کچھ نہ کچھ کوتاہی کی، اور بنارس کے ہندو برہمن نے بد معاملگی بھی کی۔ مولوی عصمت اللہ صاحب وغیرہ احمدیہ جماعت والوں نے جتنے دن کام کیا بہت محنت اور خلوص اور درد کے ساتھ کیا اور مجھے ان کے کام میں نظر ثانی کی دقت نہیں ہوئی۔ باقی سب کے کام کو یا تو ردّی کرنا پڑا یا بہت بدلنا پڑا اور کئی برس تک مجھے محنت کرنی پڑی۔ پس اس معیار سے

احمدیہ جماعت لاہور کی تعریف کر سکتا ہوں کہ اس نے کیسے ایماندار آدمی تیار کئے ہیں لہذا انصاف کرنے والوں کے ساتھ بھی انصاف کرنا چاہیئے۔" (دسمبر ۱۹۳۴ء)

سید عبدالقادر صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابتدا سے صلیب اور ہلال کے درمیان آویزش چلی آتی ہے۔ عیسائی دنیا نہ صرف اپنی تلوار کو مسلمانوں کے برخلاف آزادانہ طور پر استعمال کرتی چلی آئی ہے۔ بلکہ اس نے اپنی زبان اور قلم سے بھی اسلام اور اس کے شیدائیوں کو بدنام کرنے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔ جن لوگوں کو قرونِ وسطیٰ کی عیسائی دنیا کے لٹریچر پر ذرا سا بھی عبور حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دنیا کا کوئی کذب اور کوئی بہتان نہیں جو عیسائی مصنفین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذاتِ اقدس سے منسوب نہیں کیا۔ اگر مسلمانوں کو ان افترا پردازیوں کا تھوڑا سا علم بھی ہو جائے تو وہ غم و غصہ کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مصنفین کے مقابلہ میں راج پال نتھو رام اور رپالال کی ناپاک ہستیاں مکتب کے بچوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اور فی الحقیقت وہ عیسائی مصنفین کے ادنیٰ سے خوشہ چین ہیں۔ احمدی مسلمان ہیں یا نا مسلمان مجھے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جماعت احمدیہ لاہور نے عیسائی مبلغین کے کذب و بہتان کے تار و پود کو بکھیرنے میں جو سعی بلیغ کی ہے وہ لائق صد ہزار تحسین ہے۔ اس جماعت کے لٹریچر کی وجہ سے نہ صرف اسلام کے چہرہ سے کذب و افترا کے بادل چھٹ گئے ہیں بلکہ اس کی تجلی مغرب کے ظلمتکدوں کو بھی اپنی نورانی اور مقدس شعاعوں سے منور کرنے لگی ہے۔ اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس نیک کام کو مستقل طور پر جاری رکھا جائے تاکہ کسی وقت اہلِ مغرب تاتاریوں کی طرح اسلام کے سینہ سپر ہو جائیں۔ عام مسلمان اعدائے اسلام کی طاغوتی طاقتوں سے بالکل بے خبر کافر گری میں مصروف ہیں۔ لیکن حالات کی ناموافقت کے باوجود جماعت احمدیہ کو اطمینان کے ساتھ تصنیف و تالیف اور اشاعت اسلام سے مفید کام میں مصروف رہنا چاہیئے اور خدا تعالےٰ کی ذات کے سوا کسی دنیوی طاقت سے صلہ اور انعام کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔" (دسمبر ۱۹۳۴ء)

جناب بیگم شاہنواز صاحبہ تحریر فرماتی ہیں:۔

"احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کی خدمات مذہب و قوم کی جو قدر میرے دل میں ہے وہ قلمبند ہو نہیں سکتی جس طرح اس انجمن نے کئی ایک مغربی ممالک میں اسلام کی تعلیم کا علم بلند کیا ہے اس کو کئی جگہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ اس وقت جبکہ سائنس کی نئی روشنی نے مغرب والوں کے دلوں میں مذہب کی طرف سے ہزاروں شکوک پیدا کر دئے ہیں ایک ایسی انجمن کا سچے اور سادہ طریق پر مذہب

اسلام کے آسان اور عام فہم عقاید کو ان ممالک میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا ایک بے مثل خدمتِ اسلام ہے۔" (دسمبر ۱۹۳۴ء)

جناب بیگم قلندر علی خاں صاحبہ تحریر فرماتی ہیں:۔

" احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے کارہائے نمایاں سب پر اظہر من الشمس ہیں۔ اس انجمن کے ہر فرد میں قومی جذبہ۔ سچا ایثار اور بلند ہمتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انجمن اپنے ہر کام میں دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی خدمت حقیقی معنوں میں ہو رہی ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ خدمت اسلام کا بول بالا دنیا کے ہر گوشہ میں کر کے رہے گی۔" (دسمبر ۱۹۳۴ء)

جناب سید کشفی شاہ صاحب نظامی ایک صوفی بزرگ احمدیہ جماعت لاہور کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

" یہ پیغام ہے جو تم کو دیا جاتا ہے۔ تو اس پر عامل ہو جا مسلمان اس وقت سو رہے ہیں۔ وہ اس پیغام کو بھول گئے ہیں جو ان کو دیا گیا تھا کہ کفر کے قلعوں پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا علم بلند کرو۔ اور ان کی کفر کی آندھیوں کو دور کر کے توحید کی روشنی پھیلاؤ۔ مغربی دنیا پر کفر کی آندھیاں چھائی ہوئی ہیں۔ تو لاہور کے مرکز سے اٹھی اور مغربی دنیا کے مرکزوں تک پہنچ کر کے تو نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا پیغام سنا دیا۔ تو نے ان ہستیوں کو جو کفر کے باعث تڑپ رہی تھیں پیغامِ حیات ان کو سنا دیا۔ تو نے ان کی سرزمین میں اسلام کا بیج بو دیا جو کہ اب نشو و نما پا رہا ہے۔ مگر بیج بو کر اس کو چھوڑ دینا اور اس کی پرورش نہ کرنا دوبارہ نیند کی غفلت میں سو جانا ہے۔ تو اس سے زیادہ قربانی کے لئے تیار ہو جا۔ تو اس سے زیادہ جاں نثاری دکھا۔ تو اس سے زیادہ مبلغوں کی جماعت تیار کر جو صرف مغربی دنیا کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے قریہ قریہ میں پھیل جائیں اور توحید کا پیغام غافل ہستیوں تک پہنچا دے۔ تو اپنے میں ایسی قوت اور جذبہ پیدا کر جس سے کفر کی آندھیاں دور ہو جائیں۔ تو یہ مت دیکھ کہ دوسرے مسلمان کیا کر رہے ہیں تو اپنا فرض ادا کر۔ اور اس سے زیادہ کر جواب تک کیا گیا ہے۔ قدرت ربانی تیرے کاموں کو دیکھ رہی ہے۔ وہی تیری معاون و مددگار ہے۔ اس کے بھروسہ پر کفر کے لشکر میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا نغمہ سنا دے۔"

جماعت احمدیہ لاہور کے کاموں کو مختصراً عرض کروں تو اسے تین حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا:۔

(۱) تبلیغ اسلامی کے مشن قائم کرنا۔ (۲) اشاعت اسلام کیلئے مبلغین تیار کرنا۔ (۳) اسلامی لٹریچر پیدا کرنا۔

تبلیغ اسلامی کے مشن قائم کرنا۔

(۱) ووکنگ مشن تبلیغ اسلام میں سب سے پہلے احمدیت کا رُخ یورپ کی طرف ہوا۔ اور یہ کسی خاص تیار کردہ اسکیم کے ماتحت نہیں ہوا بلکہ جیسا کہ گذشتہ صفحات سے ظاہر ہے بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے دل میں شروع سے ہی یہ خیال من جانب اللہ ڈالا گیا تھا کہ یورپ میں تبلیغ اسلام کے لئے ایک نہایت عمدہ میدان ہے۔ گو بظاہر یورپ کے لوگ دین سے بکلی غافل اور اسلام سے سخت متنفر تھے۔ مگر حضرت مرزا صاحب کو اس بارے میں کشوف بھی ہوئے اور خوابیں بھی آئیں کہ یورپ کے بڑے بڑے لوگ اسلام میں داخل ہونگے۔ جیسا کہ اپنے اشعار میں بھی آپ نے ایک جگہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:- ؎

"آسماں پر دعوت حق کیلئے ایک جوش ہے	ہو رہا ہے نیک طبعوں پر فرشتوں کا اتار
آ رہا ہے اسطرف احرار یورپ کا مزاج	نبض پھر چلنے لگی مُردوں کی ناگاہ زندہ وار
کہتے ہیں تثلیث کو اب اہلِ دانش الوداع	پھر ہوئے ہیں چشمۂ توحید پر از جان نثار
باغ میں ملّت کے ہے کوئی گلِ رعنا کھلا	آئی ہے بادِ صبا گلزار سے مستانہ وار
آ رہی ہے اب تو خوشبو میرے یوسف کی مجھے	گو کہو دیوانہ لیکن میں کرتا ہوں اس کا انتظار

یہاں یوسف سے مراد ترقی و اشاعت اسلام ہے جس کے لئے آپ مثل یعقوب بیقرار تھے۔

اس جگہ آپ کا ایک کشف بھی نقل کر دوں تو مناسب ہوگا۔ حدیث میں جو قرب قیامت کی نشانی مغرب سے طلوع آفتاب کا ذکر ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"طلوع شمس کا جو مغرب کی طرف سے ہوگا ہم اس پر بہرحال ایمان لاتے ہیں۔ لیکن اس عاجز پر جو ایک رویا میں ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ ہے جو مغرب کی طرف سے آفتاب کا چڑھنا یہ معنے رکھتا ہے کہ ممالک مغربی جو قدیم سے ظلمتِ کفر و ضلالت میں ہیں آفتاب صداقت سے منور کئے جائیں گے اور ان کو اسلام سے حصہ ملے گا۔" (ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۵)۔ پھر لکھتے ہیں:-

"میں نے دیکھا کہ میں شہر لندن میں ایک منبر پر کھڑا ہوں۔ اور انگریزی زبان میں ایک نہایت مدلّل بیان سے اسلام کی صداقت ظاہر کر رہا ہوں۔ بعد اس کے میں نے بہت سے پرندے پکڑے جو چھوٹے چھوٹے درختوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے رنگ سفید تھے اور شاید تیتر کے جسم کے موافق ان کا جسم ہوگا۔ سو میں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ اگرچہ میں نہیں مگر میری تحریریں ان لوگوں میں پھیلیں گی اور بہت سے راستباز انگریز صداقت کا شکار ہو جائیں گے۔" (ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۵، ۵۱۶)

انگریزوں کو پرندوں کی شکل میں کشف میں دکھانے کی وجہ یہ ہے کہ پرندے انسان سے بہت

بھڑکتے ہیں اور اسلام کے متعلق یورپ میں اس قدر بدگمانیاں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ اسلام سے اس قدر بھڑکتے تھے کہ انہیں مسلمان بنانا بھڑکنے والے پرندوں کو پکڑنے کے مترادف ہے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت مرزا صاحب مسیحی قوموں میں یعنی یورپ میں اشاعت و تبلیغ اسلام کو اپنا اصلی مشن سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔ ؎

چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند   مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند

اور شروع سے آپ کے دل میں یہ جوش تھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ انگریزی زبان میں کر کے اسے انگلستان وغیرہ ممالک میں بھجوایا جائے۔ ۱۹۰۲ء کی ابتدا سے رسالہ ریویو آف ریلیجنز انگریزی زبان میں اسی غرض سے نکالا گیا کہ انگریزی جاننے والے ممالک میں تبلیغ اسلام ہو۔ یہ گویا لٹریچر کے ذریعہ تبلیغ اسلام کی بنیاد تھی۔ اسی سلسلہ میں ۱۹۰۹ء میں آپ کی وفات کے بعد مولانا محمدؐ علی صاحب کو انگریزی میں ترجمہ قرآن شریف کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور بانی سلسلہ کے اس مشہور و معروف لیکچر کا جو ۱۸۹۶ء میں لاہور کے جلسہ تحقیق مذاہب میں پڑھا گیا تھا مولوی محمدؐ علی صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو ٹیچنگز آف اسلام کے نام سے مشہور ہے اس کتاب کو یورپ میں تقسیم کروانے کے لئے انتظام کیا گیا۔ مگر یورپ میں تبلیغ اسلام کی اصلی بنیاد ووکنگ مشن کی صورت میں ۱۹۱۲ء میں رکھی گئی۔ ووکنگ مشن بھی کسی تیار کردہ اسکیم کا نتیجہ نہ تھا۔ خواجہ کمال الدین صاحب کو ایک مقدمہ میں وکالت کا کام سرانجام دینے کیلئے انگلستان جانا پڑا۔ مگر دراصل ان کی نیت یہ تھی کہ وہاں اشاعت اسلام کے کام کی بنیاد ڈالیں۔ اپنی وکالت کا فرض ادا کر کے انھوں نے وہیں تبلیغ اسلام کرنے کا ارادہ ٹھان لیا اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں نے مایوسی کا اظہار کیا کہ یورپ کی فضا اس قدر اسلام کے خلاف ہے کہ کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ لیکن خواجہ صاحب مایوس نہیں ہوئے۔ ایک لطیفہ بھی نقل کر دوں وہ یہ کہ ایک انگریز کرنل جو ہندوستان میں رہ چکا تھا اور انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کے احساس کمتری سے خوب واقف تھا، خواجہ صاحب کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا تم یہاں انگلستان میں اشاعت اسلام کرنے آئے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں کہنے لگا۔ اگر ایسا کرو گے تو میں تم کو مار مار کے فرش کر دوں گا! خواجہ صاحب نے کہا کہ "مارو گے تو مار کھاؤ گے بھی"۔ اس پر وہ کرنل برافروختہ ہوگیا اور کوٹ اتار کر اور آستینیں چڑھا کر لڑنے کو آمادہ ہوگیا۔ خواجہ صاحب بھی کوٹ اتار کر آستینیں چڑھا کر لڑنے کو مقابلہ پر آ گئے۔ تب وہ کرنل ہنس پڑا بس تم اب کامیاب ہو جاؤ گے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں انگریزوں کے مقابلہ میں احساس کمتری تو نہیں؟ معلوم ہوا کہ نہیں۔ تم انگریزوں سے مرعوب نہیں ہو۔ اس لئے تم جرأت کے ساتھ اس قوم میں تبلیغ کر سکو گے اور

امید ہے کہ کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ اس قوم میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو ان سے مرعوب نہ ہو۔"
غرضیکہ اس ناسازگار فضا میں خواجہ صاحب نے محض خدا کے وعدوں پر ایمان رکھتے ہوئے تبلیغ اسلام کا کام شروع کر دیا۔ احمدی جماعت نے ان کی اس آواز پر اس قدر جوش سے لبیک کہا کہ جو کچھ کسی کو انھوں نے لکھا وہی حاضر کر دیا اور لندن میں تبلیغ اسلام کی بنیاد رکھی گئی اور اس غرض کے لئے فروری ۱۹۱۳ء میں ایک رسالہ بنام اسلامک ریویو جاری کر دیا۔ لندن سے کوئی پچیس میل کے فاصلہ پر ووکنگ میں پروفیسر لائیٹنر (سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) نے ایک مسجد بیگم صاحبہ بھوپال کے خرچ سے بنوائی تھی مگر یہ جب سے بنی تھی مقفل پڑی تھی۔ خواجہ صاحب نے کوشش کر کے اس مسجد کو کھلوایا۔ اور ٹرسٹیان مسجد کی اجازت سے نومبر ۱۹۱۳ء میں مشن کو لندن سے یہاں منتقل کیا۔ انہی ایام میں ۱۸ نومبر ۱۹۱۳ء کو لارڈ ہیڈلے کی شہرت کا انسان اسلام میں داخل ہو گیا۔ جس سے مشن کی شہرت انگلستان اور ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔

لارڈ ہیڈلے کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ اس وقت اسلام کا اعلان کرنا کس قدر مشکل تھا۔ لارڈ ہیڈلے کے دل پر جب اسلام کی صداقت روشن ہو گئی تو انھوں نے خواجہ صاحب کے سامنے بذریعہ تحریر اسلام کا اعلان تو کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ لکھا کہ میری ایک بوڑھی چچی ہے جس کی محبت اور عزت میرے دل میں بہت ہے وہ نہایت متعصب پرانے خیال کی عیسائی ہے۔ اُسے اگر میرے مسلمان ہو جانے کا پتہ لگا تو اس بوڑھی کا دل ٹوٹ جائیگا اسلئے آپ اس کا بھی اعلان نہ کریں۔ اور مخفی رکھیں۔ انھوں نے اقرار کر لیا۔ دوسرے دن کسی اسلامی تقریب پر انگلستان کے ہندوستانی مسلمانوں نے لندن میں ایک جلسہ کیا جو کسی ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ وہاں کسی مسلمان نے تقریر کی کہ "بغداد کی تباہی کے بعد جب اسلام پر سیاسی زوال وقوع پذیر ہوا تو تاتاری قوم کے قلوب پر جو فاتح بغداد تھی اسلام نے فتح حاصل کر لی۔ اور وہ قوم مسلمان ہو کر اسلام کو پھر عروج حاصل ہوا۔" یہ تقریر سن کر خواجہ صاحب سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ آج بھی وہ یورپ کی فاتح اقوام کے قلوب کو فتح کر سکتا ہے۔ چنانچہ میری جیب میں اس وقت لارڈ ہیڈلے کا خط ہے جس میں انہوں نے اعلان اسلام کیا ہے۔" جب جلسہ ختم ہوا تو ایک اخبار کا نامہ نگار ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ کیا لارڈ ہیڈلے کا وہ خط میں دیکھ سکتا ہوں جس میں انہوں نے اعلان اسلام کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو کنفیڈنشل (یعنی مخفی) خط ہے میں دکھا نہیں سکتا۔" اُس نے کہا اگر مخفی رکھنا تھا تو جلسہ میں اعلان آپ نے کیوں کیا۔ وہ خبر تو آپ کے حوالہ سے اخباروں میں بھی چھپ گئی۔" خواجہ صاحب بہت گھبرائے۔ باہر نکلے تو سامنے

(باقی بر صفحہ آئندہ)

تاریخ اسلام میں یورپ کے اندر تبلیغ اسلام کا یہ پہلا باقاعدہ مشن تھا جس طرح ریویو آف ریلیجنز مجریہ ۱۹۰۲ء
پہلا انگریزی رسالہ تھا جس کے ساتھ یورپ میں تبلیغ اسلام کی بنیاد بذریعہ لٹریچر رکھی گئی۔ اور یہ احمدیت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۸

ایک شخص اخبار بیچتا ملا۔ اس سے اخبار لیا تو پہلے ہی صفحہ پر "لارڈ ہیڈ لے کا قبول اسلام" کا عنوان نظر پڑا۔ اور مضمون میں خواجہ صاحب کا حوالہ موجود تھا۔ انگلستان میں کسی کا راز افشا کر دینا قانوناً جرم ہے۔ لارڈ ہیڈ لے کا یہ راز تھا جو خواجہ صاحب نے بلا ارادہ افشا کر دیا۔ پردیس میں اس طرح قانونی مجرم بن جانا بڑی تشویش کا موجب بن گیا۔ ووکنگ واپس آئے تو شیخ نور احمد صاحب سے جو ووکنگ کی مسجد میں اذان دیا کرتے تھے ذکر کیا اور دعا کیلئے کہا اور خود بھی تمام رات دعا کرتے رہے کہ اللہ معاملات کو رو بہ اصلاح کر دے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ "لارڈ ہیڈ لے نے تار دیکر بلایا ہے" صبح کو واقعی لارڈ ہیڈ لے کی تار آگئی جس میں خواجہ صاحب کو لندن بلایا تھا۔ خواجہ صاحب کو اس رویا کے پورا ہو جانے سے کسی قدر تسلی ہوئی۔ الغرض خواجہ صاحب لندن پہنچے تو لارڈ ہیڈ لے کے ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر جا بیٹھے اور حیران تھے کہ لارڈ ہیڈ لے جب آئے گا اور پوچھے گا کہ تم نے یہ راز کیوں افشا کر دیا تو میں کیا جواب دوں گا؟ یہ سوچ ہی رہے تھے تو ایک طرف کا دروازہ کھلا اور ایک شاہی خاندان کی لیڈی جو ڈچس تھی داخل ہوئی اور بالمقابل سامنے کا دروازہ کھلا جس سے لارڈ ہیڈ لے داخل ہوا دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس لیڈی نے بڑے جوش سے لارڈ ہیڈ لے کو مبارکباد دی اور اسے کہا کہ تو واقعی مرد ہے۔ کس قدر بہادری سے تو نے اسلام کا اعلان کیا ہے کہ دل سے صدائے آفرین و تحسین بلند ہوتی ہے۔ میں آج کئی سال سے مسلمان ہوں اور میں نے اپنا نام زینب رکھا ہوا ہے مگر جرأت نہ ہوئی کہ کسی پر ظاہر کروں۔ مگر تو نے نہایت جوانمردی سے اپنے اسلام کا اظہار کر دیا۔ پس آج سے میں بھی اپنے اسلام کا اظہار کرتی ہوں۔ اور میرے چار بیٹے ہیں جنہیں میں اسلام کے طریق پر پرورش کر رہی ہوں"۔ ایک لیڈی کی زبان سے یہ صدائے آفرین سُن کر لارڈ ہیڈ لے خواجہ صاحب کو کس طرح ملامت کر سکتے تھے کہ تم نے یہ راز کیوں افشا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ ہیڈ لے کھلم کھلا مسلمان ہو گئے اور ان کے پاس جو بیشمار خطوط دریافت حال کے لئے آ رہے تھے۔ سب کو انہوں نے لکھ دیا کہ میں مسلمان ہوں۔ بلکہ انہیں تبلیغ اسلام بھی شروع کر دی۔ انہی دنوں ایک شاہی ضیافت پر ڈنر کے بعد جو لارڈ ہیڈ لے نے تقریر کی اس میں بھی انھوں نے اسلام کو پیش کیا۔

(مؤلف)

کا طرۂ امتیاز تھا کہ اس نے اس کام کی طرف توجہ کی جس سے اس وقت تک مسلمان باوجود اس امر کے کہ وہ مدت تک یورپ میں حکومت کرتے رہے غافل رہے تھے۔ اس سے پیشتر انگلستان اور یورپ میں صدیوں سے اسلام اور محمد رسول اللہ صلعم کی تصویر نہایت بدنما کھینچی جاتی تھی اور اسے ایک وحشت اور خونخواری کا مذہب سمجھا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اسلام جہاں کہیں پھیلا تلوار کے زور سے ہی پھیلا۔ مسیحی پادریوں نے بالخصوص تمام یورپین قوموں کو اسلام سے سخت متنفر کر رکھا تھا۔ اب جو انہوں نے اپنے اندر ایک اسلامی مبلغ کو دیکھا تو انکی آنکھیں کھلیں اور اوپر کے اور درمیانی طبقہ کے لوگ ایک ایک دو دو کر کے اعلان اسلام کرنے لگے[۲] یہاں تک کہ اب تک ایک ہزار سے زیادہ انگریز مرد عورت اسلام قبول کر چکے ہیں جن میں لارڈ ہیڈ لے اور شاہی خاندان کے ممبر اور بڑے بڑے فلسفی اور اہل علم طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔

حاشیہ ۱۔ اسلام کے متعلق جو غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی اس کی ایک مثال یہاں عرض کرتا ہوں۔ انگلستان میں مشہور تھا کہ مسلمان محمد رسول اللہ صلعم کے بت کی پوجا کرتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلعم شجر کی یا سورج کی پوجا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز مسٹر ٹمس ([illegible]) ووکنگ مسجد میں مسلمانوں کا طریق عبادت دیکھنے آیا کہ یہ کس طرح سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ جب وہاں ایسا کچھ نہ پایا تو بہت حیران ہوا۔ خواجہ صاحب سے ملاقات سے بات چیت ہوئی تو اسے اپنی غلط فہمی محسوس ہوئی۔ اسلامی لٹریچر پڑھا تو اسلام قبول کر لیا۔ خواجہ صاحب نے اس کا نام اس لحاظ سے کہ مسلمانوں کو سورج کی پرستش کرتے دیکھنے آیا تھا شمس الدین رکھ دیا۔ (مؤلف)

حاشیہ ۲۔ انگلستان میں مسلمانوں کو شہوت پرست قوم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی تبلیغ و دعوت کے کام کو نقصان پہنچانے کیلئے جہاں عیسائیوں کی طرف سے بہت سی کوششیں شروع ہوئیں۔ وہاں یہ بھی کوشش ہوئی کہ مختلف حسینہ جمیلہ عورتوں نے اپنے زلف گرہگیر میں انہیں پھنسانے کی کوشش کی کہ اس طرح ان کے مشن کو بدنام کر کے اس کے تقدس کو کھو دیا جائے۔ لیکن خواجہ صاحب کے زہد و اتقا نے ان کا یہ وار خالی دیا۔ اور مبلغ اسلام کے اس نمونہ کا اثر اتنا عمدہ پڑھا کہ شرفاء کو اپنی لڑکیاں مسجد میں بھیجنے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔ ایک دفعہ ایک انگریز لڑکی نے مسلمان ہونا چاہا۔ اس کا باپ دہریہ تھا۔ خواجہ صاحب نے کہا اپنے باپ سے اجازت لے لو اس نے کہا میں آزاد ہوں مجھے اپنا مذہب بدلنے کا اختیار ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا یہ درست ہے مگر اسلام باپ کا ادب سکھاتا ہے۔ اس لئے اجازت لینا ادب کا تقاضا ہے۔ لڑکی (باقی برصفحہ ۳۳۱)

۱۹۱۴ء میں حضرت مولوی نورالدین صاحب کی وفات کے بعد جماعت احمدیہ میں اختلاف رونما ہوا اور لاہور میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام قائم ہوئی جس کے ساتھ ووکنگ مشن کا تعلق قائم ہوا کیونکہ خواجہ کمال الدین صاحب احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے ایک ممبر تھے۔ ووکنگ مشن کو اللہ تعالے نے اتنا فروغ دیا کہ وہ تمام مسلمانان انگلستان کا مرکز بن گیا جہاں عیدین پر تمام مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے اور جہاں سے دُور دُور دنیا کے کناروں تک اسلامی لٹریچر پہنچتا ہے۔ اور انگلستان میں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۴۰)

نے باپ سے اجازت طلب کی تو وہ بہت حیران ہوا کہ انگلستان کی آزاد منشی کے یہ بالکل خلاف تھا۔ اس نے کہا اجازت طلب کرنے کے لئے تمہیں کس نے مشورہ دیا۔ لڑکی نے کہا میرے روحانی مقتدا نے۔ وہ بہت متاثر ہوا۔ خواجہ صاحب نے پھر کہلا بھیجا کہ لڑکی کے مسلمان ہونے کے وقت باپ بھی ضرور موجود ہو چنانچہ باپ جب مسجد میں آیا تو نماز کی جماعت کھڑی تھی۔ نماز میں مقتدیوں کا ادب اور خشوع وخضوع دیکھکر وہ دہریہ انگریز اتنا متاثر ہوا کہ خود بھی جماعت میں شامل ہوگیا۔ اگرچہ نماز نہ جانتا تھا مگر ارکان نماز جماعت کے ساتھ ساتھ بجالاتا رہا۔ نماز کے بعد لڑکی مسلمان ہوئی مگر گھر جاکر لڑکی باپ پر خفا ہوئی کہ تم نے دہریہ ہوکر ہماری نماز میں اپنی شمولیت سے ہماری نماز کو بھی خراب کیا۔ ہمارا روحانی مقتدا بہت شریف آدمی ہے اس نے اپنی شرافت ومروت سے کچھ نہ کہا۔ دوسرا کوئی آدمی ہوتا۔ تو سخت ناراض ہوتا۔ باپ نے خواجہ صاحب کے پاس آکر معافی مانگی۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ معافی کیسی۔ آپ روز نماز میں شامل ہوا کریں۔ اور ساتھ ہی کھانے کی دعوت دی۔ کہا کہ تمہاری لڑکی میری لڑکی ہے۔ اس کے اسلام لانے کی خوشی میں میں نے دعوت دی ہے آپ بمعہ اہل وعیال اس میں شامل ہوں۔ وہ آیا تو کھانے میں زردہ بھی تھا جو اس کے لئے ایک نیا کھانا تھا۔ بہت تعریف کی۔ خواجہ صاحب نے چلتے ہوئے چار زردہ کی رکابیاں اس کے ساتھ کردیں۔ وہ اس اسلامی مہمان نوازی پر حیران رہ گیا جو یورپ میں مفقود ہے۔ چنانچہ اسے شوق ہوا کہ وہ اسلام کی نسبت تحقیقات کرے اور آخر رفتہ رفتہ وہ سارا کنبہ مسلمان ہوگیا۔ اسی طرح ایک دفعہ ایک دہریہ مسجد میں مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھنے آیا نماز کا طریق دل پر اثر کر گیا۔ ساتھ کھڑا ہوگیا۔ شیخ نور احمد صاحب ساتھ کھڑے تھے انہیں جو رقت ہوئی تو ساتھ اسکو بھی رقت ہوگئی۔ نماز کے بعد کہنے لگا تم لوگ جادوگر ہو جو مجھ دہریہ کو نماز میں رُلا دیا۔" خواجہ صاحب نے کہا یہ جادو نہیں حق ہے۔ جو تم پر اثر کر گیا۔" غرضیکہ اس ملاقات کے بعد گفتگو جاری رہی۔ آخر رفتہ رفتہ وہ مسلمان ہوگیا۔ (مؤلف)

جہاں کہیں بھی کوئی مذہبی جلسہ ہوتا ہے تو اسلام پر روشنی ڈالنے کیلئے مبلغ ووکنگ سے طلب کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دہریوں اور لامذہبوں کے جلسوں میں بھی ووکنگ سے مبلغ جاتے ہیں اور اسلام پر تقریریں کرتے ہیں۔

ایک دفعہ خواجہ کمال الدین مرحوم کو دہریوں کی ایک مجلس میں اسلام پر لیکچر دینے کے لئے کہا گیا۔ اس جلسہ میں تمام دہریہ اور لامذہب جمع تھے خواجہ صاحب نے اسلام پر جو لیکچر دیا اس میں جنت و دوزخ کا بھی فلسفہ بیان کیا۔ لیکچر کی معقولیت کا بڑا اثر ہوا۔ لیکن ایک دہریہ نے اُٹھ کر کہا کہ آپ نے جنت کا فلسفہ تو بہت معقول بیان کیا لیکن یہ "حور" کیا ہے۔ سوال جواب کیلئے پانچ پانچ منٹ تھے، اعتراض کے لیئے پانچ منٹ تو بہت ہیں مگر جواب کیلئے وہ بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب نے فوراً برجستہ جواب دیا کہ کیا کوئی سوسائٹی بغیر خواتین کی موجودگی کے مہذب ہو سکتی ہے؟ جہاں صرف مرد جمع ہوتے ہیں وہاں ہر قسم کی بیہودگی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک بھی لیڈی آجائے تو سب اپنی اپنی جگہ محتاط اور مہذب ہو جاتے ہیں پس جنت میں بھی تہذیب اور شرافت کیلئے ضروری ہے کہ خواتین کا وجود ہو۔ اس پر جس قدر لیڈیز وہاں موجود تھیں انھوں نے بڑے پُر زور دستی اور جلسہ کی پریزیڈنٹ نے جو ایک لیڈی تھی خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔

خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دہریوں اور فلسفیوں کے جلسوں میں مجھ پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا جسکا جواب میں نے حضرت اقدس مرزا صاحب کی تصنیفات میں پہلے سے پڑھا نہ تھا اسلیئے انکا جواب دینے میں مجھے کبھی تامل نہ ہوا۔

ایک دفعہ پیرس میں ایک عالمگیر مذہبی کانفرنس ہوئی جس میں تمام دنیا کے مفکرین اور علما اور فلسفی اکٹھے ہوکر اس امر پر سوچ بچار کرنے لگے کہ تمام دنیا کے مذاہب کو اگر ایک نقطہ پر جمع کر دیا جائے تو مذہب کی وجہ سے جو لوگوں میں آپس میں تفرقہ اور نفرت و بیزاری ہے وہ مٹ کر اخوت و مودت پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے کئی دن متواتر تقریریں ہوتی رہیں۔ آخر اس امر پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ ایک ایسا مذہب بنانا چاہیئے۔ جس میں خدا کا تخیل یہ ہو کہ وہ ایک ہے اور سارے جہان کا رب ہے۔ اور ہر قوم میں رسول وہ بھیجتا رہا اور تمام قومیں آپس میں بھائی بھائی ہیں گورے کو کالے پر کوئی امتیاز نہیں وغیرہ وغیرہ آخر میں خواجہ صاحب کو بڑی مشکل سے ۲ منٹ تقریر کے لئے ملے۔ آپ نے فرمایا کہ مذہب کی بنیاد وحی یا الہام پر ہوتی ہے اسی لئے اس کا اثر قلوب پر پڑتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ادارہ مذہب نہیں بن سکتا۔ چاہیئے کہ کوئی مذہب ایسا تلاش کرو جس میں یہ عالمگیر اصول ہوں جو تم نے تجویز کئے ہیں۔ پس میں تمہیں ایسے مذہب کی خبر دیتا ہوں اور وہ اسلام ہے۔ اسلام نے خدا کا تخیل جو پیش کیا ہے (باقی بر صفحہ ۳۱۲)

جرمن مشن و برلن مسجد | انگلستان میں تبلیغ اسلام کا قدم گو بڑی بھاری اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ کچھ سہولتیں بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہاں ایک بنی بنائی مسجد مل گئی۔ پھر سب سے بڑی سہولت زبان کے معاملہ میں تھی۔ انگریزی زبان ہندوستان میں عام ہے۔ برطانیہ کے سوائے اور کئی ممالک میں مادری زبان کے طور پر بولی جاتی ہے اور بہت سے مسلمان اور غیر مسلم ملکوں میں جہاں انگریزی حکومت کا اقتدار ہے یہ زبان مروج ہو چکی ہے۔ پس انگریزی زبان میں تبلیغ نسبتاً ایک سہل بات تھی۔ انگریزی خواں مبلغ بھی نسبتاً زیادہ سہولت سے مل سکتے یا تیار ہو سکتے تھے۔ انگریزی لٹریچر ہندوستان اور

وہ یہ ہے کہ وہ ایک ہے اور تمام جہانوں کا رب ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کو شروع ہی الحمد للہ رب العالمین سے کیا ہے۔ اُس نے بڑے زور سے اعلان کیا ہے کہ تمام نوع انسان ایک جوڑے سے پیدا ہوا اور قبائل اور اقوام کا وجود محض تعارف اور شناخت کے لئے ہے۔ شرافت ان چیزوں پر منحصر نہیں بلکہ تقوے پر اس کا انحصار ہے۔ اور تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ اور ہر قوم میں خدا نے رسول بھیجا جیسا کہ لکل امۃ رسول سے ظاہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرضکہ قرآن کریم کی آیتیں پڑھتے گئے اور عالمگیر مذہب کے وہ اصول جو اس کانفرنس نے تجویز کئے تھے ان لوگوں کے سامنے رکھتے گئے۔ اور بتایا کہ جب ایک مذہب جو مبنی بر وحی و الہام ہے۔ عالمگیر مذہب کے ان تمام اصول کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے تو اپنی طرف سے ایک مذہب تجویز کر کے ایجاد کرنا کیا معنے رکھتا ہے؟ کیوں نہ اسی عالمگیر مذہب کو قبول کیا جائے"۔ اس پر [illegible] کانفرنس حیران رہ گئے۔ دوسرے روز پیرس سے باہر ایک دیہاتی محل میں ایک بڑے امیر کی طرف سے تمام [illegible] کانفرنس مدعو تھے وہاں خواجہ صاحب کے لیکچر ہی کا چرچا تھا۔ آتو خواجہ صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے جو یہ اصول پیش کئے ہیں تو اسلام کے کس ادارہ کی طرف سے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کسی ادارہ کی طرف سے پیش نہیں کئے۔ بلکہ ٹھیٹھ اسلام کے اصول پیش کئے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ میں نے ہر اصول کو قرآن کریم کی نص صریح سے پیش کیا ہے تو کسی خاص ادارہ کے ذکر کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے"۔ اس سے وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ ان میں سے دو بہت بڑے عالم جو جرمنی کے رہنے والے تھے اور سفید ریش تھے خواجہ صاحب سے ملنے ہوٹل میں آئے۔ اور ان سے اسلام کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ وہ دونوں اثنائے گفتگو میں اس قدر متاثر ہوئے کہ کرسیوں سے اتر کر دو زانو خواجہ صاحب کے سامنے فرش پر بیٹھ گئے اور نہایت مؤدبانہ طریق پر انکے ارشادات سنتے رہے اور بہت محظوظ اور متاثر ہو کر واپس گئے (مولف)

(پیغام صلح ۱۲/ فروری ۱۹۳۴ء)

دیگر ممالک میں پھیل کر مشن کی قوت کا باعث ہو سکتا تھا مگر تبلیغ اسلام میں مشکلات کا مقابلہ کرنا احمدیت کے جوش کا خاص امتیاز ہے ۱۹۲۲ء میں یعنے انگلستان میں مشن کی بنیاد رکھا جانے کے پورے دس سال بعد جرمنی میں ایک مشن کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے ساتھ برلن دارالخلافہ جرمنی میں ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد بھی ڈالدی گئی۔ جرمنی یورپ کا مرکز ہے اور مذاق علمی رکھتا ہے۔ جو تحریک یہاں قائم ہو وہ سارے یورپ پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے۔ مگر یہاں زبان کی مشکلات بہت زیادہ تھیں۔ اس مشن کے لئے مبلغوں کا حاصل کرنا اور تیار کرنا بہت مشکلات رکھتا ہے جرمن زبان یورپ کی سب زبانوں سے زیادہ مشکل ہے اور اس کے حاصل کرنے میں دیگر زبانوں کے حاصل کرنے سے بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ مگر ان تمام مشکلات کی پروا نہ کرتے ہوئے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے وہاں ایک مسجد اور مشن کی بنیاد رکھدی۔ مسجد نہایت شاندار اور خوبصورت ہے ۷۴ فیٹ لمبی اور ۷۴ فیٹ چوڑی ہے اور اس کے ساتھ مبلغ کے رہنے کا بھی مکان ہے۔ اس کے علاوہ ایک سہ ماہی رسالہ مسلمش ریویو بھی جرمنی زبان میں جاری کیا گیا جو مفت تقسیم ہوتا ہے کئی ایک ٹریکٹ بھی جرمن زبان میں شائع کئے گئے۔ قرآن شریعت کا جرمن ترجمہ شائع کیا گیا۔ اس مشن کے اثر سے کئی سو جرمن جو اعلٰے طبقہ کے لوگ ہیں داخل اسلام ہو چکے ہیں جن میں ڈاکٹر حمید مارقوس پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مشہور جرمن فلاسفر اور بیرن عمر رولف ایرنفلز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۳- ہالینڈ میں مشن ۱۹۳۹ء میں ہالینڈ میں ایک اسلامی مشن کی بنیاد رکھی گئی۔ مرزا ولی احمد بیگ جو جاوا میں رہ کر ڈچ زبان سے خوب واقف ہو چکے ہیں اور ڈچ زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں جو دراصل مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ کا ڈچ ایڈیشن ہے خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے ہالینڈ چلے گئے اور وہاں کام شروع کر دیا۔ وہاں لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت بڑی کامیابی کی امید نظر آنے لگی مگر جنگ کے چھڑ جانے سے کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہاں کس قدر کامیابی ہوئی۔ ریڈ کراس سوسائٹی کے ذریعہ اتنا پتہ ضرور لگ گیا ہے کہ مرزا صاحب موصوف بخیریت ہیں۔

۴- آسٹریا میں مشن آسٹریا کے دارالسلطنت وی آنا میں بھی مشن کھولا گیا تھا جس کے مبلغ بیرن عمر ایرنفلز تھے۔ لیکن جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے بیرن صاحب ہندوستان چلے آئے اور کام عارضی طور پر بند کرنا پڑا۔

۵- اسپین میں مشن اسپین میں مشن کھولنے کا احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور مصمم ارادہ کر چکی تھی

اس کے لئے چندہ بھی کسی قدر جمع ہو چکا تھا۔ لیکن جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے اس ارادہ کو بالفعل تا اختتام جنگ ملتوی کرنا پڑا۔

۶۔ جاوا میں مشن جس سال جرمنی میں مشن کی بنیاد رکھی گئی اس کے دو سال بعد جاوا میں بھی جہاں ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے ایک مشن کی بنیاد رکھی۔ یہاں عیسائیت اگر ایک طرف وہاں کے بت پرستوں کو اپنے اندر لے رہی تھی تو دوسری طرف اسلام پر بھی اس کا حملہ بڑے زور سے تھا۔ کیونکہ یہاں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی آبادی کی ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے ۱۹۲۴ء میں جاوا مشن کی بنیاد رکھی۔ جس نے خدمت اسلام کا عظیم الشان کام کیا۔ اور مسلمانوں کے اندر ایسی مذہبی بیداری پیدا کی جو انہیں عیسائیت سے بچانے میں بڑی معاون ثابت ہوئی اور بہت سا لٹریچر نہ صرف جاوا کی زبان میں بلکہ اس کے علاوہ وہاں کی سرکاری زبان یعنے ڈچ میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔ اس مشن میں مرزا ولی احمد بیگ صاحب نے نہایت شاندار کام کیا۔ انہوں نے قرآن شریف اور سوانح عمری محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اور اصول اسلام کی فلاسفی اور حقیقۃ المسیح اور ولادت مسیح وغیرہ کا ترجمہ ڈچ زبان میں شائع کیا اور آخر کار جاوا میں وہیں کے مسلمانوں میں سے اپنی جماعت کی ایک زبردست انجمن بنا کر مشن کا کام اس کے سپرد کیا جو نہایت کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔

سیام میں مشن احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے سیام کے شہر پٹنی میں بھی ایک مشن قائم کیا جہاں کے مسلمانوں کے حالات جاوا کے مسلمانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ڈاکٹر اے ڈبلیو خاں نے اپنے والد بزرگوار کی یاد میں قصبہ پٹنی واقعہ جنوبی سیام میں ایک اسلامی مشن کی بنیاد رکھی تھی ۱۹۳۰ء میں جب ڈاکٹر صاحب موصوف معہ اپنی زوجہ کے سالانہ جلسہ پر لاہور تشریف لائے اور ہماری جماعت میں داخل ہوئے تو واپسی پر انجمن نے اشاعت اسلام میں آپ کی امداد کے لئے مسٹر محمد عرفان ولن کو جو ملک جاوا کے رہنے والے تھے اور ہمارے اشاعت اسلام کالج کے فارغ التحصیل طالب علم تھے آپ کے ساتھ روانہ کر دیا۔ چنانچہ مسٹر عرفان نے سیام (پٹنی) مشن کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بعد ازاں انہیں پایہ تخت سیام میں سیامی زبان سیکھنے کے لئے بھیجا گیا جہاں مولانا عبدالکریم صاحب مسعود امام مسجد شاہی نے انکا نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مولانا موصوف نے بجائے انگریزی رسالہ Back to Quran

(رجوع الی القرآن) کو سیامی زبان میں ترجمہ کر کے ہماری جماعت اور اس کے کاروبار سے عام پبلک کو روشناس کیا۔ چنانچہ دونوں صاحب کام نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے جو موجودہ جنگ نے ہمیں اُن سے بے خبر کر دیا۔

جزائر فجی میں مشن جزائر فجی میں جو آسٹریلیا سے بھی آگے ہیں ایک اسلامی مشن قائم کیا گیا۔ ابتداء میں تو مولوی عبداللہ صاحب وہاں گئے تھے۔ مگر بعد میں مرزا مظفر بیگ صاحب کو وہاں بھیجا گیا۔ جنہوں نے وہاں سے عیسائیت اور آریہ سماج کے اثر کو مٹانے میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی اور وہاں کے مسلمانوں ہی میں سے اپنی جماعت کی ایک زبردست انجمن بنا کر مشن کا کام اس کے سپرد کیا جو نہایت کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔

ٹرینیڈاڈ میں مشن احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے ایک مشن ٹرینیڈاڈ جزائر غرب الہند امریکہ میں بھی قائم کیا۔ دو سال وہ مشن وہاں کام کرتا رہا جس سے عیسائیت کا غلبہ وہاں سے جاتا رہا۔ اور اسلام کو فروغ ہوا اب وہیں کا ایک نوجوان امیر علی نامی احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور میں چار سال دینی تعلیم حاصل کر کے ٹرینیڈاڈ میں تبلیغ اسلام کر رہا ہے۔

ہندوستان میں تبلیغی مشن خود ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے لئے کئی مشن قائم کئے گئے۔ ضلع فیروز پور میں ایک مشن احمدیہ جماعت لاہور کی طرف سے کچھ عرصہ کام کرتا رہا جس نے وہاں بہت سے اچھوت داخلِ اسلام کئے۔ ضلع مظفر گڑھ میں کئی سال سے ایک مشن قائم ہے۔ جہاں تین ہزار کے قریب چوہڑے داخل اسلام ہو چکے ہیں۔ ایک مشن ضلع ڈیرہ غازی خاں میں کام کر رہا ہے جہاں راجن پور اور اس کے ارد گرد کے دیہات میں ایک ہزار کے قریب چوہڑے مسلمان ہو چکے ہیں۔ ملتان اور منٹگمری اور لاہور کے اضلاع کے کئی دیہات میں بہت سے سانسی انجمن کے مبلغین کے اثر سے داخل اسلام ہو چکے ہیں۔ ایک مشن شلانگ (آسام) میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے قائم کیا جہاں خاصیہ قوم کے بہت سے لوگ داخل ہوئے۔ دو سال تک احمدیہ جماعت لاہور اس کے اخراجات کی متکفل رہی اب انتظام ایک مقامی بورڈ کے سپرد ہے۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے مبلغین نے ملکانوں کے علاقہ میں شدھی کی تحریک میں بڑا زبردست کام شدھی کو روکنے کیلئے کیا جس کے دوست دشمن سب معترف ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں اچھوتوں کو مسلمان کرنے میں احمدیہ جماعت لاہور بہت بڑا کام کرتی رہی۔

مبلغین کا تیار کرنا دوسرا کام احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا یہ ہے کہ وہ مرکز میں ایسے مبلغین اسلام تیار کرے جنہیں تبلیغ و دعوت اسلام کے لئے ہندوستان یا ہندوستان سے باہر غیر ممالک میں بھیجا جائے۔ اس مقصد کیلئے علاوہ دو ہائی اسکولوں کے جو لاہور احمدیہ بلڈنگس اور بدوملہی ضلع سیالکوٹ میں نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں جن میں دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکوں کو ضروری دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ دینیات کی تعلیم کے لئے علیحدہ انتظام بھی ہے۔ شروع میں تو اشاعت اسلام کالج لاہور کے نام سے یہ مدرسہ چلتا رہا جس میں دینیات کے طلبا کو لیا جاتا تھا۔ بعد میں اس نام کو ہٹا کر صرف ان طلبا کیلئے تعلیم دینیات کا انتظام کیا گیا جو اپنے آپ کو تبلیغ دین کے لئے وقف کریں۔ چنانچہ انہی میں سے مولوی عبدالحق صاحب ودیارتھی جیسا فاضل علامہ پیدا ہوا جو جو عبرانی اور سنسکرت کے فاضل اور بائیبل اور ویدوں اور ژند اوستا کے بہت بڑے عالم ہیں اور جنہوں نے یجروید کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اور ایک دفعہ تو بڈلڈے میں سناتن دھرم اور آریوں کے مباحثہ میں ویدوں کی تفسیر کرنے میں فیصلہ کیلئے انہیں پنچ بنایا گیا۔ اور بڑے بڑے پنڈتوں کو ان کے تبحر علمی کو دیکھ کر اپنے دلوں کو یوں تسلی دینی پڑی کہ یہ پچھلے جنم میں کوئی بڑے وِدوان پنڈت یا رشی ہو گزرے ہیں۔ آریہ سماج سے جب مسلمانوں کا مباحثہ ہوتا ہے تو اس میں مولانا عبدالحق صاحب سے بحث کرتے آریہ پنڈتوں کی جان جاتی ہے۔ اسی طرح سید اختر حسین صاحب گیلانی اور مرزا مظفر بیگ صاحب ساطع جن کے مناظرے اور تقریریں قبول عام کا سند حاصل کر چکے ہیں۔ مولوی دوست محمد صاحب سابق ایڈیٹر اخبار پیغام صلح۔ اور شیخ محمد یوسف صاحب گرنتھی وغیرہ اسی مدرسہ کی پیداوار ہیں۔ علاوہ مرکز میں تعلیم دینیات کے یہ بھی طریق ہے کہ قوم کے نوجوانوں کو قرآن کریم حدیث اور اسلامی تاریخ سے ایک کورس مقرر کر دیا جاتا ہے جسے وہ از خود مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ان کا مرکز سے امتحان لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح گھر بیٹھے یہ سلسلہ تعلیم و تعلم کا جاری رہتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ باہر سے مثلاً جاوا و سماٹرا اور البانیا اور ٹرینیڈاڈ سے طلبا لاہور آئے اور یہاں سے دینی تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن کو تبلیغ کے لئے واپس گئے۔ ان میں سے ٹرینیڈاڈ کے امیر علی اور جاوا کے مسٹر عرفان دھلن اور البانیا کے محمد ایوب۔ محمد خلیل اور شریعت پتر اخاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسلامی لٹریچر پیدا کرنا احمدیت کا سب سے بڑا کام وہ مذہبی لٹریچر ہے جو اس نے پیدا کیا ہے حضرت اقدس مرزا صاحب کی تصنیفات چھوٹی بڑی ملا کر سو تک پہنچی ہیں اور ان میں علاوہ

اسلام کے دنیا کے دیگر تمام بڑے بڑے مذاہب پر بحث ہے۔ اسلامی تعلیمات کو آپ نے ایسے دلکش اور معقول و پُرحکمت پیرایہ میں بیان کیا ہے جس نے بڑے بڑے فلاسفروں سے بلکہ دشمنوں تک سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ آپ کا مشہور مضمون اسلام اور اس کی فلاسفی جو جلسۂ اعظم مذاہب لاہور میں ۱۸۹۶ء میں پڑھا گیا اور جس کا ترجمہ ہو کر ٹیچنگز آف اسلام کے نام سے شائع ہوا اس پر نہ صرف اس کے پڑھا جانے کے وقت کُل کا کُل جلسہ محو حیرت تھا بلکہ اس نے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں سب سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اور جس طالب حق انگریز نے اسے پڑھا اس کا سر اس کے سامنے جھک گیا۔ چنانچہ انگلستان اور دیگر انگریزی خوان ممالک میں بہت سے غیر مسلموں کے اسلام لانے کا موجب وہ کتاب ہوئی۔ فلسفۂ اصول اسلام کی بحث کتاب براہین احمدیہ۔ آئینہ کمالات اسلام۔ برکات الدعا۔ ٹیچنگز آف اسلام۔ چشمۂ معرفت و براہین احمدیہ حصہ پنجم۔ نور القرآن وغیرہ میں ہے۔ آریہ سماج پر کتاب براہین احمدیہ۔ سرمہ چشم آریہ۔ شحنۂ حق۔ آریہ دھرم۔ چشمۂ معرفت۔ نسیم دعوت میں بحث ہے۔ سکھ مذہب پر ست بچن میں بحث ہے۔ عیسائیت پر براہین احمدیہ۔ ایک عیسائی کے تین سوالوں کا جواب۔ سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب۔ جنگ مقدس۔ نور الحق۔ انجام آتھم۔ ضمیمہ انجام آتھم چشمۂ مسیحی اور دیگر بہت سی کتب میں بحث ہے۔ ہندو سناتن دھرم۔ بدھ مذہب۔ یہودی مذہب اور دیگر مذاہب پر متفرق کتابوں میں بحث ہے۔ اپنے دعاوی پر بالخصوص ازالہ اوہام۔ توضیح مرام حمامۃ البشریٰ۔ سراج منیر۔ ایام الصلح۔ وغیرہ میں بحث ہے۔ کوئی مذہب نہیں جس پر آپ نے اتمام حجت نہ کیا ہو۔ اصول اسلام کا کوئی پہلو نہیں جس پر آپ نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جملہ مذاہب پر اس قدر لکھنے والا تاریخ اسلام میں پہلے کوئی بزرگ نظر نہیں آتا۔ اس کا اعتراف آپ کے دشمنوں تک کو ہے۔ گویا تحریری رنگ میں اصول اسلام پر روشنی ڈال کر اور دیگر مذاہب پر اتمام حجت کر کے جس قدر خدمت اسلام کی آپ نے کی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے اور صرف اسی پہلو پر اگر غور کیا جائے تو آپ اس امت کے مجدد اعظم کہلانے کے مستحق ہیں۔ پھر اس لحاظ سے بھی آپ کو ان خدام اسلام پر فضیلت ہے جنہوں نے اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر کی ہے کہ آپ نے تین زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ اردو۔ فارسی اور عربی جو اس وقت اسلامی ممالک کی سب سے زیادہ بولی یا سمجھی جانے والی زبانیں تھیں۔

آپ کی زندگی میں ہی آپ کے زیر اثر آپ کی جماعت کے کئی افراد نے تبلیغ اسلام پر ضخیم

قیمتی لٹریچر پیدا کیا جس میں سب سے زیادہ جامع کتابیں حضرت مولوی نورالدین صاحب کی ہیں۔ فصل الخطاب اور تصدیق براہین احمدیہ جو ابتدا میں لکھی گئیں اور کتاب نورالدین جو آخر میں لکھی گئی عیسائیت اور آریہ سماج کے اُس وقت کے جملہ اعتراضات کے ایسے فاضلانہ اور مسکت جواب اپنے اندر رکھتی ہیں کہ مذہبی لٹریچر میں بلند ترین مقام پر رکھا جانے کے قابل ہیں حضرت اقدس مرزا صاحب کی زندگی میں ہی آپ کی ہدایت سے ماہوار رسالہ ریویو آف ریلیجنز انگریزی اور اردو میں جاری ہوا جس کی ادارت اس کی ابتدا سے لیکر اس وقت تک جب کہ وہ انگریزی ترجمۃ القرآن کے کام پر لگ گئے مولانا محمد علی صاحب کے ہاتھ میں رہی۔ ان ایام میں اس رسالہ میں تعلیم اسلامی اور جملہ مذاہب عالم پر سیر کن بحث جاری رہی اور اس قدر معقول اور تسلی بخش پیرایہ میں مختلف مسائل و... اسلامی زیر بحث آتے تھے کہ تمام علمی طبقہ مسلم و غیر مسلم سے اس نے خراج تحسین وصول کیا۔ انگریزی رسالہ یورپ و امریکہ میں بڑی کثرت سے مفت تقسیم کیا جاتا تھا اور یورپ میں تبلیغ اسلام کا یہ پہلا قدم تھا۔ دیگر مصنفین جو حضرت اقدس مرزا صاحب کے زمانہ میں کام کرتے رہے ان میں بالخصوص قابل ذکر مولانا عبدالکریم مرحوم ہیں جن کی زبردست تصنیف خلافت راشدہ اہل تشیع پر حجت ہے اور سیرت مسیح موعود حضرت مرزا صاحب کی سیرت پر روشنی ڈالتی ہے۔ حضرت مولانا سید محمد احسن مرحوم کی تحریرات کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر وہ سب کی سب حضرت مرزا صاحب کے دعاوی کی تائید میں ہیں۔ ان کی کتاب خاتم النبیین میں ختم نبوت پر تمام احادیث جمع ہیں اور یہ قادیانیوں پر حجت تمام کرنے کے لئے آپ نے لکھی تھی۔ مرزا خدا بخش صاحب نے عسل مصفیٰ لکھ کر احمدیت کے جملہ مسائل پر قرآن و حدیث سے اخذ کر کے ایک انسائیکلوپیڈیا لکھدی ہے۔ حضرت اقدس مرزا صاحب کی وفات کے بعد احمدیت کے لٹریچر کا دروازہ اور بھی وسیع ہو گیا اور اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کا سہرا مولانا محمد علی صاحب کے سر پر ہے۔ یہ انہی کی شبانہ روز محنتوں کا نتیجہ ہے کہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور اس قدر کثیر تعداد میں اسلام پر لٹریچر پیدا کر سکی۔ دوسروں کا اس میں بہت کم حصہ ہے۔ مولانا محمد علی صاحب کو قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ اور تفسیر پر ۱۹۰۹ء میں لگایا گیا جو سات برس کی لگاتار محنت کے بعد ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا۔ اسکا پہلا ایڈیشن دس ہزار کی تعداد میں نکلا۔ جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن قریباً گیارہ ہزار کی تعداد میں ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ اردو میں بھی مولانا محمد علی صاحب نے تفسیر لکھی جس کا نام

نوٹ:- اس انگریزی ترجمۃ القرآن پر چند انگریزی اخباروں کی آراء یہاں نقل کرتا ہوں:- (باقی بر صفحہ ۳۴۰)

بیان القرآن ہے۔ بیان القرآن کی جلد اوّل ۱۹۲۲ئہ میں جلد دوم ۱۹۲۳ئہ میں اور جلد سوم ۱۹۲۴ئہ میں شائع ہوئی۔ انگریزی ترجمہ قرآن شریف بلا متن ۱۹۲۸ئہ میں شائع ہوا۔ مولانا محمد علی صاحب نے آنحضرت صلعم کی سیرت پر اُردو میں کتاب سیرت خیر البشر ۱۹۱۷ئہ میں اور سیرت محمد مصطفیٰ ۱۹۲۸ئہ میں لکھی اور انگریزی میں محمدؐ دی پرافٹ ۱۹۲۴ئہ میں اور پرافٹ آف اسلام ۱۹۲۸ئہ میں لکھی۔ اس کے علاوہ مولانا محمد علی صاحب نے کثرت سے کتابیں تصنیف کیں۔ عیسائیت پر محمدؐ اینڈ کرائسٹ ۱۹۲۲ئہ میں اور تاریخ اسلام پر تاریخ خلافتِ راشدہ ۱۹۲۵ئہ میں لکھی۔ اصول اسلام پر اسلام دی ریلیجن آف ہیومینٹی کوئی چالیس ہزار کی تعداد میں مختلف اوقات میں شائع کیا جس کا بیشتر حصہ مفت تقسیم ہوچکا ہے اور گیارہ زبانوں میں شائع ہوچکا ہے۔ اور قرآن پر جمع قرآن۔ اور ہستی باری تعالیٰ آپ کی معرکتہ الآرا تصنیف ہیں۔ اوّل الذکر میں آپ نے جمع قرآن کو نہایت صاف کیا ہے اور مؤخر الذکر میں ہستی باری تعالیٰ پر قرآن کریم سے اچھوتے دلائل دئیے ہیں۔ اور حدیث پر مقام حدیث ۱۹۱۷ئہ میں شائع کی اور صحیح بخاری کا ترجمہ بمعہ حواشی ابھی حال میں ہی نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے مولانا محمد علی صاحب نے ۱۹۳۶ئہ میں اسلام پر ایک مبسوط کتاب دی ریلیجن آف اسلام انگریزی میں لکھی ہے جس کی جامعیت اور معقولیت کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔ مسٹر مارمیڈیوک پکتھال مرحوم ایک مشہور نومسلم انگریز جو اسلام پر نظر بڑی وسیع رکھتے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۳۹

(۱) یہ تفسیر القرآن (انگریزی) انسان کی پیدا کردہ علمی تصنیفات میں سب سے بلند اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ (یونائیٹڈ انڈیا) (۲) دیباچہ کا علمی مواد اور تفسیری نوٹ بہت مؤثر ہیں۔ (ہندو) (۳) کاغذ۔ چھپائی اور مضامین کے لحاظ سے ایک کارنامہ ہے (شملہ ٹائمز) (۴) قرآن کریم کے بہت کم تراجم اتنی بلند شان حاصل کرسکے ہیں (مدراس میل) (۵) یہ ایسا کارنامہ ہے جس پر اسکا مصنف جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ مرکویسٹ Quest) (۶) جب کوئی شخص اس خزانۂ علم اور روشنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو مصنف کا ایک گونہ احسانمند پاتا ہے گویا وہ دنیا کی مذہبی زندگی میں ایک نئے باب کا پتہ لگا لیتا ہے۔ (ایس۔ ایچ۔ لیڈر) (۷) بہت صاف اور واضح نوٹ ہیں ..... اور انگریزی دان غیر مسلم لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں (ٹریبون) (۸) تفسیر ہر قسم کی فرقہ دارانہ آلودگیوں سے منزہ ہے اور مذہب اسلام کی مستند معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے (ڈیلی اخبار)۔ اس ترجمہ کی قبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب مولانا صدر الدین صاحب اٹلی گئے اور عارف بے ترکی سفیر جنوا کو یہ ترجمہ پیش کرنا چاہا تو انہوں نے اپنی میز پر یہ ترجمہ رکھا ہوا دکھا دیا اور فرمایا کہ مولوی محمد علی صاحب کا یہ بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم سفر

حیدر آباد دکن میں بھی آئے اور ریاست کے اہتمام کے ماتحت انہوں نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ بھی کیا وہ اس کتاب دی ریلیجن آف اسلام کے متعلق اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ایک ریویو لکھتے ہیں جس کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

" غالباً کوئی دوسرا زندہ انسان ایسا نہیں جس نے اسلام کی تجدید کے لئے مولانا محمد علی ساکن لاہور سے زیادہ قیمتی اور طویل خدمات انجام دی ہوں...... ہماری رائے ہیں یہ کتاب اُن کی بہترین تصنیف ہے...... یہ اسلام کی تصویر ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جو قرآن اور سنت سے پورا پورا واقف ہے۔ جس کے دل میں مسلمانوں کے گذشتہ پانچ صدیوں کے زوال کے احساس کے ساتھ ساتھ اسلام کے نئے دَور کی امیدیں موجود ہیں جس کے نشان اب ہر طرف دیکھے جا سکتے ہیں۔ عبادت اور مذہبی فرائض کے بارے میں اسلامی روایات سے ایک بال برابر بھی ادھر ادھر ہونے کے بغیر مصنف ایک وسیع میدان پیش کرتا ہے جن میں تبدیلیاں جائز ہیں اور پسندیدہ ہوں گی کیونکہ ان معاملات میں قوانین اور عمل قرآن کے کسی حکم یا نبی کریم صلعم کے کسی ارشاد پر مبنی ہیں اور جب وہ قوم کی ضروریات کو پورا نہ کریں تو ان میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اس قسم کی کتاب کی اس زمانہ میں بڑی بھاری ضرورت ہے۔ جب بہت سے مسلمان ممالک میں ہم ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو اسلام کی تجدید اور اصلاح کا اشتیاق رکھتے ہوئے اس صحیح علم کے نہ ہونے کی وجہ سے غلطیاں کر رہے ہیں"۔ اور..." ہم فروعی امور میں ہر بات میں مولانا محمد علی کے نتائج کے ساتھ متفق نہیں.... مگر ان کی بنیادیں ہمیشہ مضبوط ہوتی ہیں۔ ہم ہر حال میں ان کے گہرے اخلاص کو محسوس کرتے ہیں۔ اور قرآن کریم کے لئے جو عظمت کا مقام اُن کے دل میں ہے وہ تمام اہم مسائل میں ان کے کام کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے۔ بلاشبہ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ان کے عام نتائج کے ساتھ اتفاق نہ رکھتے ہوں لیکن یہ ایسے لوگ نہ ہوں گے جن سے اسلام اپنے مستقبل میں کسی بھلائی کی توقع رکھ سکتا ہے۔"

مسٹر ڈبلیو۔ جے ملبرن ایک امریکن مصنف ہیں جنہوں نے حال میں ہی دنیا کے مذاہب پر ایک کتاب تیار کی ہے۔ "ریلیجنس آف ایوری لینڈ" (ہر ملک کے مذاہب) اس میں اسلام پر جو مبسوط

بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۴۰

یورپ سے واپس آئے تو فرمانے لگے ایک مصری فاضل مجھے ملا اس نے کہا کہ "عربی زبان تو ہماری ہے مگر قرآن ہم نے مولوی محمد علی کی تفسیر سے سیکھا" سینکڑوں انگریزوں اور مغرب زدہ مسلمانوں کی جو اسلام سے برگشتہ تھے یہ ترجمہ ہدایت کا موجب ہوا۔ (مؤلف)

بحث ہے اس میں مولانا محمد علی صاحب کے ایک رسالہ "اسلام دی ریلیجن آف ہیومینیٹی" کو درج کیا ہے اس کے علاوہ کچھ مضامین مولانا محمد علی صاحب کی اسی تصنیف "دی ریلیجن آف اسلام" سے بھی لئے ہیں۔ اس مصنف نے مولانا محمد علی صاحب کے ترجمۃ القرآن اور اس کتاب دی ریلیجن آف اسلام کے متعلق ذیل کے الفاظ لکھے ہیں:۔

"شاید کسی مسلمان نے زندہ ہو یا فوت ہو چکا ہو اسلام کے محاسن دکھانے میں لوگوں کی اس سے زیادہ رہنمائی نہیں کی جو مولانا محمد علی نے کی ہے اور یقیناً کوئی اور دو کتابیں ایسی نہ ہوں گی جنھوں نے اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ لوگوں کے سامنے بانی اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا ہو جس صفائی سے ان کی قابل یادگار کتابوں انگریزی ترجمۃ القرآن اور ریلیجن آف اسلام نے کیا ہے ...... اوّل الذکر کتاب چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں پورا عربی متن، دیباچہ اور تفسیر اور انڈکس موجود ہیں مؤخر الذکر کتاب نہایت دلچسپ پیرایہ میں بانی مذہب کی تعلیمات کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہے یہ اپنی جگہ پر ایک انسائیکلوپیڈیا ہے اور توجہ سے مطالعہ کرنے والے کے دل پر یہ اسلام کی ایک صاف تصویر نقش کر دیتی ہے ..... ان دو کتابوں کے ہوتے ہوئے کسی مذاہب عالم کے مطالعہ کرنے والے کے لئے کوئی عذر نہیں رہ جاتا کہ وہ اسلام کی صحیح تعلیم کے سمجھنے میں قاصر رہ گیا۔"

سلسلہ احمدیہ، النبوۃ فی الاسلام، مسیح موعود اور تحریک احمدیت اور احمدیہ موومنٹ ایکی نہایت قابل قدر تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ کثیر تعداد میں رسائل ہیں اور مفت اشاعت کے ٹریکٹ ایک ایک وقت میں دس دس بیس بیس پچاس پچاس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب تک ستر لاکھ صفحات سے زیادہ ٹریکٹوں کی صورت میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور شائع کر چکی ہے اور یہ تقریباً سب کے سب مولانا محمد علی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا محمد علی صاحب کی تصانیف میں سے انگریزی سیرت نبوی کی کئی ہزار جلدیں یورپ اور امریکہ کی لائبریریوں۔ جہازوں کی لائبریریوں اور ہندوستان اور دوسرے ممالک میں طالبان حق کو مفت تقسیم کی جا چکی ہیں۔ قرآن شریف کے انگریزی ترجمہ کی بھی سینکڑوں کاپیاں مفت تقسیم ہوئی ہیں اور سب سے بڑی بات جو بتا رہی ہے کہ احمدیہ لٹریچر اسلامی دنیا میں کس قدر اثر ڈال رہا ہے اور اسلامی دنیا نے اسے اپنی کتنی بڑی ضرورت سمجھا ہے یہ ہے کہ احمدیہ لٹریچر جس کا ابھی ذکر ہو چکا اس وقت تک دنیا کی پچیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جس میں سے دس ہندوستان کی زبانیں ہیں۔ اردو۔ گورمکھی۔ ہندی۔ سندھی۔ بنگالی۔ تامل۔ تلیگو۔ ملیالم۔ گجراتی۔ کھسیہ۔ اور

پندرہ غیر ممالک کی زبانیں ہیں۔ انگریزی۔ جرمن۔ سنگھیرین۔ ڈچ۔ البانوی۔ اطالوی۔ ترکی عربی فارسی۔ چینی۔ ملائی۔ جاوی۔ سیامی۔ سواحلی۔ پولش۔

خواجہ کمال الدین صاحب کی تصنیفات۔ انگریزی و اردو دونوں قریباً پچپن ہیں۔ ان میں خصوصیت سے قابل ذکر اردو میں اسوۂ حسنہ۔ اور نبوت کا ظہور اتم۔ سیرت نبویؐ پر ہیں۔ ینابیع المسیحیت میں دکھایا گیا ہے کہ عیسائی مذہب کے عقائد آفتاب پرستوں سے لئے گئے ہیں۔ یہ خواجہ صاحب کی بڑی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ جہد للبقا سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ ہستی باری تعالیٰ بہت لطیف کتاب دہریت کے رد میں ہے۔ ام الالسنہ میں ثابت کیا ہے کہ عربی ہی سب زبانوں کی ماں ہے۔ حیات بعد الموت میں مسئلہ تناسخ پر بحث ہے۔ ایسا ہی انگریزی میں ان سب مضامین پر کتابیں موجود ہیں بالخصوص قابل ذکر سورسز آف کرسچینٹی ہے جو ینابیع المسیحیت کا انگریزی ایڈیشن ہے اور آئی ڈیل پرافٹ ہے۔ جو سیرت نبویؐ پر ایک بینظیر تصنیف ہے۔ تھریشولڈ آف ٹروتھ ... نور ڈوبس اسلام۔ اسلام پر بہت عمدہ کتاب ہے۔ اسلام اینڈ زوراسٹریانزم میں اسلام اور مذہب زرتشت پر بحث ہے۔ ان کا انگریزی رسالہ اسلامک ریویو اور ان کا اردو ایڈیشن" رسالہ اشاعت اسلام" ماہوار رسالے ہیں جن کا تعلق ووکنگ مشن سے ہے۔ اور ان کے ایڈیٹر آج کل مولوی آفتاب الدین احمد صاحب ہیں۔

مرزا ولی احمد بیگ صاحب نے جو مبلغ جاوا مشن تھے۔ انگریزی ترجمۃ القرآن مؤلفہ مولانا محمد علی صاحب کا ڈچ زبان میں ترجمہ کیا اور قرآن کریم کا ڈچ ترجمہ بڑی شان سے جاوا سے شائع کیا اسی طرح انہوں نے مولانا محمد علی صاحب کے رسالہ اسلام دی ریلیجن آف ہیومینٹی اور مختلف تصانیف کا ڈچ زبان میں ترجمہ کرکے جاوا سے شائع کیا۔

مولانا صدر الدین صاحب نے قرآن کریم کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ قرآن کے جرمن ترجمہ کے علاوہ انھوں نے انگریزی زبان میں ایک کتاب شائع کی جس کے نام کا ترجمہ ہے کہ کیا موجودہ اناجیل الہامی ہیں؟ برلن مشن کی طرف سے جرمن زبان میں ایک سہ ماہی رسالہ مسلمش ریویو بھی نکلتا رہا ہے۔

مولانا عبد الحق صاحب ودیارتھی نے اردو میں آریہ سماج کی تردید میں سرگذشت وید اور دید و کا بہشت بڑی دلچسپ تصانیف شائع کیں۔ اور یجروید کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا۔ اور ایک بڑی معرکۃ الآرا تصنیف میثاق النبیین شائع کی جس میں اس بات کو تمام دنیا کی الہامی کتابوں سے پایہ ثبوت کو پہنچا دیا کہ ہر ایک نبی نے حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی پیشگوئی کی ہے۔ اور اپنی اپنی امت کو اس آخری موعود نبی پر ایمان لانے کے لئے تاکید کی ہے۔

خاکسار مؤلف کتاب ہذا نے انوار القرآن دو جلدوں میں لکھی۔ ایک میں قرآن کریم کے پارہ ۳۰ کی تفسیر ہے۔ اور دوسری میں پارہ ۲۷ کی تفسیر ہے۔ ایک کتاب الروح لکھی جس میں روح انسانی کی ماہیت اور کیفیت پر بحث ہے۔ ایک کتاب تناسخ پر شائع کی جس میں تناسخ پر نئی تحقیقات کے ماتحت بحث ہے۔ ایک کتاب قرآن کریم کا عالمگیر پیغام حریت لکھی جس میں اس اعتراض کی کہ اسلام غلامی کا حامی اور کنیزوں کو بلا نکاح تصرف میں لانا جائز سمجھتا ہے۔ قرآن کریم کی آیات سے تردید کی ہے۔ حضرت مرزا غلام احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری مجدد اعظم لکھی اور قادیانی فریق کے غالیانہ عقائد کے رد میں متعدد رسالے لکھے۔ ایک کتاب ولادت مسیح لکھی جس میں مسیح کی بن باپ ولادت پر بحث ہے۔ اور جس کا ترجمہ انگریزی اور ڈچ زبان میں بھی ہو چکا ہے۔

جماعت احمدیہ لاہور کی طرف سے اور بھی متعدد کتب ہیں شائع ہوئیں اور ہو رہی ہیں جن کی فہرست بہت طویل ہے، یہ بطور نمونہ عرض کر دیا گیا۔ انجمن کے دو اخبار نکلتے ہیں۔ ایک اُردو میں پیغام صلح اور دوسرا انگریزی میں دی لائٹ۔ دونوں میں نہایت مفید اور کارآمد مذہبی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک پرائیویٹ رسالہ انگریزی اُردو میں ینگ اسلام نامی بھی نکلتا ہے۔

احمدیہ لٹریچر کا اثر ممالک یورپ وغیرہ پر کیا پڑا

احمدیہ جماعت لاہور کی طرف سے جو مختلف ممالک میں مشن کھولے گئے اور کثیر تعداد میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان اور جرمنی اور مختلف ممالک میں کثیر تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اور اسلام قبول کرنے والا وہ طبقہ ہے جو شرفاء اور معززز اور تعلیم یافتہ لوگوں کا ہے۔ مطلب یہ کہ کسی دنیوی لالچ یا سیاسی اغراض پر ان کا قبول اسلام مبنی نہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی شان ان چیزوں سے بہت بلند و برتر تھی۔ اسلام کی صداقت نے ان کے دلوں کو موہ لیا۔ اور حاکم قوم میں سے ہو کر ایک محکوم اور مفلس قوم کے پیش کردہ مذہب کو قبول کرنے کے لئے طلب حق نے انہیں مجبور کر دیا۔

انگلستان میں تو نومسلموں کی تعداد ہزار سے بھی اوپر گزر چکی ہے۔ اور جرمنی میں بھی کئی سو تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ انگلستان میں سے چند کے نام یہاں درج کرتا ہوں:۔

۱۔ رائٹ آنریبل جارلس مارک النسون لارڈ ہیڈلے شیخ رحمت اللہ الفاروق۔ بی اے ایم۔ آئی بی۔ آئی۔ ای۔ ایف۔ ایس۔ ڈی وغیرہ یہ اپنی زندگی بھر برٹش مسلم سوسائٹی انگلستان کے

پریذیڈنٹ رہے۔ واضح ہو کہ انگلستان میں جب انگریز نومسلموں کی تعداد خدا کے فضل سے بہت ترقی کر گئی۔ تو انہوں نے اپنی ایک سوسائٹی بنالی جو برٹش مسلم سوسائٹی کہلاتی ہے۔ لارڈ ہیڈلے نے ۱۹۱۳ء میں اسلام قبول کیا۔ اب فوت ہو چکے ہیں۔

(۲) سرعبداللہ آرچیبالڈ ہملٹن یہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ۱۹۲۳ء میں اسلام قبول کیا۔

(۳) سرعمر ہیوبرٹ رنکن ۱۹۲۹ء میں مسلمان ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں جلسہ میلاد النبی منعقدہ لندن کے میزبان آپ ہی تھے۔ آپ کی اس موقعہ پر تقریر اس محبت کی خبر دیتی ہے جو رسول اللہ صلعم سے آپ کو ہے۔

(۴) مولوی ولیم بشیر پکرڈ۔ باپ کی طرف سے انگریز اور ماں کی طرف سے فرانسیسی ہیں۔ یہ بڑے پایہ کے آدمی ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں اسلام قبول کیا۔ ۱۹۳۲ء میں عید اضحیٰ کے موقعہ پر انہوں نے مسجد ووکنگ میں خطبہ پڑھا اور امامت کرائی۔

(۵) مسٹر حبیب اللہ لوگرو۔ یہ لنڈن کے ایک مشہور تاجر ہیں اور برٹش مسلم سوسائٹی کے سکرٹری ہیں۔

(۶) لیڈی ہملٹن۔ ایک بڑی قابل اور امیر خاتون ہیں اور نہایت اخلاص رکھتی ہیں۔

اس وقت ووکنگ مشن تمام انگلستان کے مسلمانوں کا مرکز ہے اور عیدین کی نمازیں وہیں بڑی شان و شوکت سے ادا کی جاتی ہیں اور امام مسجد ووکنگ اس وقت برٹش گورنمنٹ کے نزدیک تمام مسلمانان انگلستان کا امام سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں جب کوئی مسلمان ہندوستانی یا انگریز جنگ میں سے زخمی ہو کر انگلستان میں آتا اور قریب المرگ ہوتا تو گورنمنٹ کی طرف سے امام مسجد ووکنگ کو بذریعہ تار وہاں بلایا جاتا۔ اور آخری وقت کی تلقین اس کے سپرد ہوتی۔ اور اگر وہ مسلمان سپاہی یا نومسلم مرجاتا تو اس کی تدفین کا انتظام بھی امام مسجد ووکنگ کے سپرد ہوتا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک قطعہ زمین کا اسلامی قبرستان کے لئے ووکنگ میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے عطا کیا گیا۔ جہاں اسلامی طریق پر مسلمانوں کی تدفین ہوتی ہے۔

جرمنی میں جو لوگ مسلمان ہوئے نہایت اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں۔ جن میں بیرن عمر ولف ایرنفلز خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ خاص علمی مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر حمید مارکوس پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں جو جرمن مسلم سوسائٹی کے پریزیڈنٹ ہیں۔ واضح ہو کہ جرمن نومسلمین نے بھی اپنی ایک سوسائٹی بنالی ہے جو جرمن مسلم سوسائٹی کہلاتی ہے۔

ڈاکٹر حمید مارقوس بہت بڑے فلاسفر اور اہل علم ہیں۔ آپ نے ایک عید میلاد کے موقعہ پر نہایت فاضلانہ انداز تحریر میں ایک ٹریکٹ بہ عنوان "یورپ کے نام محمدؐ رسول اللہ کا پیغام" جرمنی زبان میں لکھا۔ جسے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے چھاپ کر کثیر تعداد میں جرمنی اور اور آسٹریا میں مفت تقسیم کیا۔ پھر اسے انگریزی میں ترجمہ کر کے پانچ ہزار کی تعداد میں انگریزی دان طبقہ میں مفت تقسیم کیا۔

آج جرمنی میں بھی امام مسجد برلن جرمن نومسلموں کا نمائندہ اور اسلام کے لئے بطور سند تسلیم کیا جاتا ہے۔

انگلستان اور جرمنی میں تو اسلامی مشن بھی ہیں۔ لیکن دیگر ممالک میں جہاں مشن بھی نہیں ہیں خدا کے فضل سے احمدیہ لٹریچر اپنا کام کر رہا ہے۔ بطور نمونہ چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

(۱) مسٹر سعید فیلکس ولائی ملک ہنگری میں ایک نامی قائد اور جریدہ ریویو پولیٹک انٹرنیشنل کے ایڈیٹر ہونے کے علاوہ مختلف کتب مثل یورپ ان ایشیا مائنز وغیرہ کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی اس کتاب نے تمام یورپ میں سنسنی پیدا کر دی اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کتاب نے ترکی کے خلاف مغربی آرا کو بہت حد تک بدل دیا۔ ۱۹۱۸ء میں آپ نے اسلام قبول کیا۔

(۲) ایم محمد توفیق کلنگر ملک ہنگری کے رہنے والے ہیں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے ہیں جرنیل بھی رہ چکے ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۹ء علی الاعلان اسلام قبول کیا۔ اور جنگ عظیم میں ترکوں کی طرف سے ہو کر لڑتے رہے۔

(۳) مسٹر گائڈو کپائی ریویلی۔ پولینڈ میں جہازوں کی ایک اطالوی کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ یہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کا وسیع مطالعہ کر چکے ہیں۔ پولینڈ کے کئی دوسرے مسلمان بھی حاجی وسن گرج مشہور مصنف و مفکر کے توسل سے ہماری جماعت احمدیہ لاہور سے وابستہ ہیں۔

(۴) مسٹر حبیب الرحمٰن جومالون۔ جزائر فلپائن کے رہنے والے ہیں۔ آپ کیتھولک فرقہ کے عیسائی تھے۔ مگر جب ایم۔ زین صاحب ساکن منیلا (دار الخلافہ فلپائن) سے آپ نے ہمارا لٹریچر لے کر پڑھا تو اسلام قبول کر لیا۔ ۱۹۲۴ء سے جزائر فلپائن کے مسلمانوں کے ساتھ ہماری جماعت کے تعلقات قائم چلے آتے ہیں۔ چنانچہ ان جزائر میں ہماری جماعت نے بڑے وسیع پیمانہ پر اسلامی لٹریچر مفت تقسیم کیا۔

(۵) مسٹر رشید طاہر کنگ۔ جنوبی افریقہ میں عیسائی مشنری تھے۔ بلحاظ حسب و نسب حبشی ہیں۔ مگر تمام مشرق و مغرب کی سیاحت کر چکے ہیں۔ جب خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم جنوبی افریقہ گئے اور اسلامی صداقت پر وہاں تقریریں کیں تو یہ صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اور اپنی بیوی سمیت اسلام قبول کر لیا۔ آپ کا اسلامی نام رشید طاہر رکھا گیا۔ اسلام قبول کرتے ہی آپ کو بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ یکہ و تنہا ملکی اقوام میں تبلیغ اسلام کا کام سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء سے جنوبی افریقہ کے مسلمانوں سے منجملہ جن کے رشید طاہر کنگ بھی ہیں ہماری جماعت کے تعلقات قائم ہیں۔ اور ہماری انجمن انہیں وقتاً فوقتاً تبلیغ اسلام میں ہر ممکن سہولت مہیا کرتی رہتی ہے۔

(۶) مسٹر سلیمان بابی جو کواڈیمی۔ مغربی افریقہ میں ایک مشہور و معروف تاجر اور فوٹوگرافر ہیں ہمارے لٹریچر کے ذریعہ مسلمان ہوئے۔ اور قصبہ بنین ملک نائیجیریا میں آپ نے ایک سوسائٹی بنام مسلم برادرہڈ (اخوت مسلمین) کی بنیاد رکھی۔ اور اسلام اور مسلمین نائیجیریا کی بہت قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کی مساعی سے وہاں ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے ہماری جماعت کی طرف سے مسٹر سلیمان صاحب اور دیگر علاقہ جات مغربی افریقہ بالخصوص سیرالیون۔ گولڈ کوسٹ۔ نائیجیریا اور لائبیریا وغیرہ کے مسلمانوں کے ساتھ باقاعدہ طور پر سلسلہ خط و کتابت جاری ہے۔ اور ان کو ہر طرح کا اسلامی لٹریچر بھیجا جاتا ہے۔

(۷) ایک اطالوی گھرانہ جنوبی افریقہ میں رہتا ہے۔ ہمارے لٹریچر سے متاثر ہو کر سنہ ۱۹۲۷ء میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ خاندان کے کل ممبر ۱۱ عدد ہیں۔ غلام محمد پطرس۔ ابراہیم پطرس حوا پطرس۔ امینہ پطرس۔ عائشہ پطرس۔ خدیجہ پطرس۔ کلثوم پطرس۔ مریم پطرس۔ فاطمہ پطرس۔ شریفہ پطرس۔ زینب پطرس۔

(۸) امریکہ میں پی۔ کے۔ ڈی پولینز المعروف بہ احمد ناجی جمہوریہ امریکہ کی بحری افواج میں افسر ہیں۔ ہمارے لٹریچر کے مطالعہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے اور ہم سے متواتر لٹریچر منگوا کر اپنے ملک میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

ممبران مرچنگ اکاڈیمی۔ پیپنگ چین۔ یہ پیپنگ (چین) میں مسلم نوجوانان چین کی ایک

انجمن ہے جس میں سی۔ سی یوگ۔ او۔ پی۔ لائی۔ ایل لیو وینگ۔ چہ جان۔ لیو وین میاں وینگ چہ جنگ۔ نامنگ ٹاؤ۔ وینگ چہ یاؤ۔ فینگ چنگ کن۔ لیو این چنگ۔ چنگ کاؤ چنگ۔ وینگ چہ یوجے ماعثمان وددو غیرھم۔ بہت جوشیلے نوجوان ہیں۔ یہ نوجوان ملک چین میں ہمارے اسلامی لٹریچر کو چینی زبان میں ترجمہ کرکے نوجوان مسلمانوں میں خوب بیداری پیدا کر رہے اور غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کر رہے ہیں۔ ان نوجوانوں کے علاوہ الحاج سعید الیاس ساکن ٹینٹن۔ عبداللہ صدیق چاؤ پین ساکن پیپنگ۔ ایم اسمٰعیل ساکن فنتش۔ ابوبکر چان ساکن کوانگسی۔ اور شانوچن المعروف بہ محمد ابراہیم ساکن یونانفو وغیرہ احباب بھی اسلام کے لئے بہت کارنمایاں کر رہے ہیں۔ ہماری جماعت ۱۹۲۴ء میں چینی مسلمانوں سے متعارف ہوئی۔ چنانچہ کچھ چینی نوجوان ہماری جماعت میں شامل ہو گئے۔ ان کی کوششوں سے ہمارا اسلامی لٹریچر بہت کثرت سے اس ملک میں تقسیم ہونے اور وہاں کی زبان میں ترجمہ ہونے لگا ہے۔ اور تبلیغ اسلام خوب زوروں سے جاری ہو گئی۔

(۱۰) **جماعت ایران**۔ ایران میں صادق خاں جواہری۔ منوچہر خاں بزرگ مہر۔ اسمٰعیل خاں طبا طبائی دیبہ۔ عاصم خاں خوشنود۔ محمد خاں گوہرین۔ آغا سید محمد طبا طبائی۔ وہ نوجوان ہیں جنہوں نے امریکن مشن کالج میں تعلیم حاصل کی اور مسلمانوں پر عیسائیت کے اثر کو دیکھ کر تڑپ اُٹھے۔ خدا کے فضل سے ہمارے اسلامی لٹریچر کو پڑھ کر ہماری جماعت سے وابستہ ہو گئے۔ اور عیسائیت کی تردید میں ہمارے لٹریچر کو وہاں تقسیم کرتے رہے۔ بعض لٹریچر کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرکے وہاں مفت تقسیم کیا۔ ایران میں انہوں نے ہماری کتابوں کی ایجنسی بھی کھول رکھی ہے جس کا منافع ان مسلمانوں کے فائدہ اور ان میں تبلیغ کرنے کے لئے وقف ہے جو عیسائیوں کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بعض ایرانی طلبا کو بھی ہماری انجمن نے وظیفے دیکر تعلیم دلائی ہے۔

علاوہ ازیں خدا کے فضل سے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور تمام دنیا کے لئے ایک ایسا مرکز بنی ہوئی ہے جس کی طرف ہر ایک قسم کی مذہبی مشکل اور دینی اعتراض کے حل کرنے کے لئے بے اختیار طوعاً و کرہاً مسلمانوں کی آنکھیں اُٹھ جاتی ہیں۔ اور اشاعت اسلام کے کام کے لئے تو ہر ایک نگاہ اسی مرکز کی طرف دیکھتی ہے۔ اور غیر مذاہب کے بڑے بڑے مناظروں اور

مباحثوں میں مختلف دیار و امصار کے افراد اور انجمنیں ہمارے ہی مبلغین کو بذریعہ تار بلاتی رہتی ہیں۔ اور جب کسی غیر مسلم کو کوئی اسلامی لٹریچر دینا ہوتا ہے تو ہمارے ہی لٹریچر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ آج یورپ اور امریکہ کی رائے اسلام کے متعلق قطعاً بدل چکی ہے۔ یورپ اور امریکہ اور دیگر ممالک سے برابر خطوط آتے رہتے ہیں کہ ہم نے فلاں لائبریری میں آپ کا لٹریچر پڑھا اور ہم اسلام قبول کرتے ہیں۔ آج یہ رفتار ہلکی ہے لیکن کچھ شک نہیں کہ خدا نے چاہا تو وہ وقت بھی دور نہیں کہ یدخلون فی دین اللہ افواجًا کا نظارہ نظر آجائے۔ وہ یورپ جو آج سے پچاس سال پیشتر اسلام کی سیاہ تصویر کھینچنے کے سوائے کچھ نہ جانتا تھا آج وہ اس امر کا معترف ہے کہ یورپ کی نجات کے لئے اسلام کی امداد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان کے اندر وہ لوگ موجود ہیں اور وہ بلند پایہ مفکر و مصنف ہیں جن میں ایک برنارڈ شا ہے جس نے حال ہی میں اپنی ایک تصنیف میں یہاں تک لکھ دیا کہ ایک صدی تک یورپ کا غالب مذہب اسلام ہوگا۔ وہ جب ہندوستان اپنی سیاحت کے دوران میں آیا تو بمبئی میں ہمارے ایک نمائندہ نے اس سے انٹرویو کیا تو اس نے کہا کہ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اتنا ہی نہیں بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ "کاش محمد عربی اس زمانہ کا ڈکٹیٹر ہوتا تو اس زمانہ کی ساری مشکلات اور فسادات کا خاتمہ ہوجاتا"۔ اور یہ سچ ہے جس طرح عرب کی مختلف قومیں جو شب و روز برسرپیکار اور ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی تھیں۔ محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت کی ڈکٹیٹر شپ کے نیچے بھائی بھائی بن گئیں۔ اسی طرح یورپ کی برسرپیکار قوموں کو بھی آج کوئی بھائی بھائی بنا سکتا ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلعم ہی کا امن و صلح کا پیغام ہے۔ یہی وہ اسلام ہے جس نے ایک زمانہ میں تمام عربستان کی آگ کو ٹھنڈا کر کے قوموں کے درمیان سکون و اطمینان پیدا کر دیا۔ اسی طرح آج بھی یورپ کے فتنہ و فساد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے والا اور قوموں کے تنافر و تباغض کو دُور کر کے انہیں باہم بھائی بھائی بنا دینے والا یہی اسلام ہو سکتا ہے۔

اس جماعت کے کاموں اور اسلام کے متعلق جو کچھ جدید مصنفین نے ان چند سالوں کے اندر لکھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اگرچہ ہمارے ہندوستان کے مسلمان اس چھوٹی سی جماعت کو کتنا بھی حقارت کی نظر سے دیکھیں مگر یورپ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ اور اسلام کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بدل رہا ہے۔ میں جدید مصنفین کی تصنیفات میں سے چند آراء بطور نمونہ یہاں درج کرتا ہوں:۔

"اس وقت احمدی جماعت دنیا میں سب سے زیادہ اشاعت اسلام کرنے والی قوم ہے"۔ (انڈین اسلام صفحہ ۲۱۷)

"احمدیت اس بات کا فیصلہ کر چکی ہے کہ پیغمبر کے کیریکٹر کو ہر ایک الزام سے پاک ثابت کرے" (انفلوئنس آف اسلام صفحہ ۱۰۹)

"یہاں ہم عیسائیت کے خلاف نئے سے نیا اور جارحانہ پروپاگنڈا پاتے ہیں جو کبھی دنیا میں پیدا ہوا ہو۔ اور یہاں سے ایک عالمگیر نظام بیرونی مشنوں کا قائم کیا گیا ہے" (انڈین اسلام صفحہ ۲۳۹)

"تحریک احمدیت حقیقتاً ایک اشاعت کی سوسائٹی بن گئی ہے اگرچہ پرانے خیال کے علما اب تک اسے شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ (وہٹ اسلام صفحہ ۳۵۳)

"مسلمانوں میں فرقی جھگڑوں کی رنج جو عام طور پر سرایت کر گئی ہے اس میں ایک دلچسپ استثنا احمدی ہیں۔ وہ صرف مذہبی اشاعت پر سارا زور صرف کرتے ہیں اور سیاسیات سے الگ رہتے ہیں[1] ...... اس بارے میں موجودہ اسلام میں یہ ایک قابل گروہ ہے جس کے مقاصد محض تبلیغی ہیں ...... ان کی توجہ زیادہ تر اس بات میں مرکوز ہے کہ اسلام ہی صرف ایک مذہب ہے جو عقل اور فطرت کے مطابق ہے۔ یورپ میں عیسائیت کی نازک حالت سے انہیں بہت سا ایسا سامان مل جاتا ہے جس سے وہ اس مذہب کی عیب چینی کرتے اور اسلام کی بہت تعریف کرتے ہیں"

(مسلم ورلڈ جلد ۱۲ صفحہ ۱۷۰)

"اسے (یعنی احمدیہ جماعت کو ناقل) یقین ہے کہ یہ (یعنی اسلام۔ ناقل) مغربی اقوام کو اپیل کر سکتا ہے۔ ایسی اپیل جو اس وقت بھی ایک حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ کامیابی کوئی بڑی نہیں تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خود ہندوستان میں بھی جہاں اب مسلمان قوم اس کثرت سے ہے کہ دوسرے کسی ملک میں اتنی نہیں۔ اشاعت اسلام کی ابتدا نہایت آہستہ ہوئی تھی" (اسلام ایٹ دی کراس روڈز صفحہ ۱۰۸)

"احمدیت دو حصوں پر تقسیم ہو گئی ...... لاہور کی جماعت جو زیادہ کام کرنے والی ہے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ مغربی دنیا میں اسلام پیش کرنے میں کہاں تک کامیابی ہو سکتی ہے۔ ...... ترجمہ قرآن کا انگریزی ایڈیشن جو ۱۹۱۹ء

---

[1] افسوس ہے کہ قادیانی جماعت نے ان دونوں خصوصیات کو جواب دیدیا (مؤلف)

میں شائع ہوا ایک نئی روشنی کے آدمی کی تصنیف ہے جو اب تک قاعدہ متعصّب (پرانے عقائد کا پابند) ہے ...... اس احمدیہ ترجمہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مقامات جن پر اعتراض ہوتا ہے انہیں صاف کیا جائے ...... دوم مترجم نے یہ ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگایا ہے کہ اسلام ایک بلند مذہب ہے تیسرے وہ مسیح کے مذہب کو ناقص ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔" (انفلوئنس آف اسلام صفحہ ۱۰۹)

"لاہور کی جماعت جو اصل قوم سے الگ ہو گئی ہے اس وجہ پر کہ وہ بانیٔ سلسلہ کو محض مجدّد تسلیم کرتے ہیں نہ کہ نبی۔ وہ اسلامی رائے عامہ کو زیادہ پسند ہیں۔ ...... ان کا اثر اس سے بہت زیادہ وسیع ہے جو ان کی تعداد سے قیاس ہو سکتا ہے۔ ان کی اسلام کی دفاعی خدمات اور اس کی حفاظت کو بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان قبول کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ یہی ایک صورت ہے جس میں وہ عملی رنگ میں اسلام کے وفادار رہ سکتے ہیں۔" (مسلم ورلڈ جلد ۱۲)

گب نے جو ایک مشہور مصنف ہے اپنی کتاب وہدر اسلام (اسلام کدھر جا رہا ہے) کے آخر میں جو کچھ اسلام کے متعلق لکھا ہے اسے مَیں یہاں درج کرتا ہوں:۔

"مغربی تہذیب کے اس توازن کو جو اس کی یک طرفہ یعنی صرف مادی ترقی کی وجہ سے جاتا رہا ہے بحال کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اسلامی سوسائٹی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔"

"اپنی علمی اور اخلاقی زندگی کی تکمیل کے لئے یورپ ان طاقتوں اور استعدادوں کے بغیر نہیں رہ سکتا جو اسلامی سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں۔"

"اسلام کے سامنے نسل انسانی کی خدمت کا ایک بڑا بھاری کام ہے ...... اس کے اندر وہ عظیم الشان روایات ہیں جو قوموں میں باہمی سمجھوتہ اور تعاون پیدا کر سکتی ہیں۔ نسل انسانی کی مختلف اور متعدد قوموں کے اندر اتحاد پیدا کرنے میں جو کامیابی اسلام کو حاصل ہوئی ہے اس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی۔ ...... ہاں اسلام میں اب بھی یہ طاقت ہے کہ وہ قومیت اور روایات کے ایسے پراگندہ اجزا کو جو باہم ملنے کے قابل نظر نہیں آتے اکٹھا کر دے۔ اگر مشرق اور مغرب کی عظیم الشان قوموں کا مقابلہ کبھی تعاون میں تبدیل ہو سکتا ہے تو یہ صرف اسلام کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔"

مذکورہ بالا تحریر بتلاتی ہے کہ اسلام کے ذریعہ مشرق و مغرب آپس میں مل سکتا ہے۔ مغربی اقوام۔ ان کی باہمی بغض و عداوت اور ایک دوسرے کو برباد کرنے کی ذہنیت اگر کبھی محبت و اخوت میں تبدیل ہو سکتی ہے تو یہ صرف اسلام کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔

خلاصہ

احمدیت علمی رنگ میں

(۱) اسلام ایک زندہ مذہب ہے جس کے کامل پیروؤں کو اللہ تعالیٰ اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا ہے۔

(۲) اسلام کامل وحدت کا مذہب ہے جس کے پیرو سب بھائی بھائی ہیں۔ اور کوئی شخص کسی اختلاف کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل ہے۔

(۳) اسلام کامل وسعت کا مذہب ہے جو تمام نسل انسانی کی وحدت کو اور ہر قوم کے اندر نبیوں کے آنے کو تسلیم کرتا ہے۔

(۴) اسلام ایک فاتح مذہب ہے جو تمام مذاہب پر غالب آئے گا اور جس کے اصول عام طور پر دنیا میں قبولیت حاصل کرتے جاتے ہیں۔

(۵) اسلام ایک علمی مذہب ہے اور اس کے اصول اور فروع علم اور عقل کے مطابق ہیں۔

(۶) اسلام میں اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے اور جو نئی ضروریات مسلمانوں کو پیش آئیں ان کا حل بذریعۂ اجتہاد ہوتا رہے گا۔

(۷) قرآن شریف شریعت اسلامی کا اصل اور غیر متبدل ماخذ ہے اور مسلمانوں کی زندگی کا اصل سرچشمہ ہے۔ اور سب سے بلند تر مقام رکھتا ہے۔ حدیث قرآن کے ماتحت ہے۔ اور فقہ یا اجتہاد ائمہ قرآن و حدیث کے ماتحت ہے۔

(۸) قرآن شریف قیامت تک نسل انسانی کی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس کی کوئی آیت نہ پہلے کبھی منسوخ ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔

(۹) قرآن شریف عظیم الشان رُوحانی طاقت اپنے اندر رکھتا ہے اور اپنی رُوحانی طاقت سے قلوب کو فتح کرتا ہے۔ اپنی فتوحات کے لئے تلوار کا نہ یہ کبھی پہلے محتاج ہُوا اور نہ آئندہ ہو گا۔

(۱۰) قرآن شریف تمام مذہبی صداقتوں کا جامع ہے۔ تمام مذہبی مسائل پر اعلیٰ درجہ کی روشنی ڈالتا ہے۔ مذہبی مسائل پر نہ صرف تمام دعاوی کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے بلکہ ہر دعوے کے دلائل بھی پیش کرتا ہے۔

(۱۱) محمد رسول اللہ صلعم تمام انبیاء کے کمالات کو اپنے اندر جمع رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ امت کسی دوسرے نبی کی محتاج نہ پہلے ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔

(۱۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔ اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا نہ نیا نہ پرانا۔ مجدد ہر صدی کے سر پر آتے رہیں گے تاکہ غلطیوں کو دُور کر کے مسلمانوں کو سیدھی راہ پر ڈالیں اور محدث اور اولیاء ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوگا۔

احمدیت عملی رنگ میں

(۱) دنیا کی تمام قوموں کے مذہبی پیشواؤں اور کتب مقدسہ کا احترام کیا جائے۔

(۲) تمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام ائمہ (خواہ وہ کسی فرقہ کے ہوں) تمام اولیاء۔ تمام مجددین کا احترام کیا جائے۔

(۳) تمام اسلامی فرقوں کو ایک درخت کی مختلف شاخیں سمجھا جائے۔ قرآن اور رسولؐ پر سب کا اجتماع ہے خواہ فروع میں کتنے بھی اختلاف ہوں۔

(۴) احکام شریعت کی تابعداری اور شعار اسلامی کا احترام کیا جائے۔ اور قرآن شریف کی حکومت کو کلی طور پر قبول کر کے ہر ایک رسم و رواج سے اجتناب کیا جائے۔

(۵) تمام بنی نوع انسان سے ہمدردی رکھی جائے خواہ کسی مذہب کسی ملک کسی قوم کے لوگ ہوں۔

(۶) ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھ کر بجد طاقت اس کی مدد کی جائے۔

(۷) خدمت دین امام وقت اور مجدد کے ساتھ ہو کر اس کے حکم کے مطابق کی جائے۔

قوم کے اندر سے ہر ایک غلطی کی اصلاح کے لئے ایمانی جرأت سے کام لیا جائے

(۸) اسلام۔ اسلام کی کتاب۔ اسلام کے پیغمبر پر جو حملے ہوں ان کا دفاع کیا جائے۔ اور اپنے آپ کو اسلام کی محافظ فوج کی حیثیت دی جائے۔

(۹) تبلیغ اسلام میں اپنے آپ کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ سمجھا جائے اور خدا کے کلام کو اور پیغام اسلام کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچایا جائے۔

(۱۰) اپنے وقت اور اپنے اموال کا کم سے کم ایک حصہ دین کی حفاظت اور اشاعت کے لئے وقف کیا جائے۔

(۱۱) خدا کے دین کے لئے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اور ذلت کو خوش دلی سے برداشت کیا جائے۔

(۱۲) دین کو دنیا پر مقدم کیا جائے۔ خدا اور رسولِ خدا کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہو۔ دین اسلام کے لئے غیرت تمام غیرتوں پر فائق ہو۔ اُمت محمدیہ کی خیر خواہی تمام خیر خواہیوں سے بڑھ کر ہو۔

حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب کے عقائد ان کے اپنے قلم سے

حضرت اقدس مرزا صاحب کے عقائد ان کے اپنے قلم سے یہاں درج کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) "ہمارے مذہب کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (ازالۂ اوہام صفحہ ۱۳۷)

(۲) ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے۔ اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور نہ کم ہو سکتا ہے" (ازالہ اوہام صفحہ ۱۳۷)

(۳) میں نہ نبوت کا مدعی ہوں اور نہ معجزات اور ملائکہ اور لیلۃ القدر وغیرہ سے منکر۔

بلکہ میں ان تمام امور کا قائل ہوں جو اسلامی عقائد میں داخل ہیں اور جیسا کہ سنت جماعت کا عقیدہ ہے۔ ان سب باتوں کو مانتا ہوں جو قرآن وحدیث کے رُو سے مسلم الثبوت ہیں۔ اور سیدنا و مولنا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے مدعیٔ نبوت اور رسالت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں"۔ (اعلان مورخہ ۲۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء)

(۴) "اس بات پر محکم ایمان رکھتا ہوں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیا ہیں۔ اور آنجناب کے بعد اس اُمت کے لئے کوئی نبی نہیں آئے گا نیا ہو یا پرانا۔ اور قرآن کریم کا ایک شعشہ یا ایک نقطہ منسوخ نہیں ہوگا۔ ہاں محدث آئیں گے جو اللہ جل شانہٗ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اور نبوت تامہ کی بعض صفات ظلی طور پر اپنے اندر رکھتے ہیں۔ (نشان آسمانی صفحہ ۲۸)

(۵) "ہم بھی مدعیٔ نبوت پر لعنت بھیجتے ہیں"۔ (مجموعہ اشتہارات صفحہ ۲۲۴)

(۶) "میں نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ میں نے انہیں کہا ہے کہ میں نبی ہوں۔ لیکن ان لوگوں نے جلدی کی اور میرے قول کے سمجھنے میں غلطی کی ہے"۔ (ترجمہ حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹)

(۷) "آنیوالے مسیح موعود کا نام جو زبان مقدس نبویؐ سے نبی اللہ نکلا ہے وہ انہی مجازی معنوں کے رُو سے ہے جو صوفیائے کرام کی کتابوں میں مسلم ہے ورنہ خاتم الانبیاء کے بعد نبی کیسا"۔ (انجام آتھم)

(۸) "ہیچ دینے ندارم بجز دین اسلام و ہیچ کتابے ندارم بجز قرآن شریف و ہیچ پیغمبرے ندارم بجز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ خاتم الانبیا ست"۔ (انجام آتھم صفحہ ۱۴۳)

(۹) "اس شریعت میں نبی کے قائم مقام محدث رکھے گئے ہیں"۔ (شہادت القرآن طبع ثانی ص۲۷)

(۱۰) "ابتدا سے میرا مذہب یہی ہے کہ میرے دعوے کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجال نہیں ہوسکتا"۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۳۰)

(۱۱) "میں کسی کلمہ گو کا نام کافر نہیں رکھتا"۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۳۰)

(۱۲) "یہ کس قدر خیانت ہے کہ کافر تو ٹھیراویں آپ اور پھر ہم پر یہ الزام لگاویں کہ گویا ہم نے تمام مسلمانوں کو کافر ٹھیرایا ہے"۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۰)

(۱۳) "ہم اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ جو راستباز اور کامل لوگ شرف صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو کر تکمیل منازل سلوک کر چکے ہیں ان کے کمالات کی نسبت بھی ہمارے کمالات اگر ہمیں حاصل ہوں بطور ظل کے واقع ہیں اور اُن میں بعض

ایسے جزئی فضائل ہیں جو اب ہمیں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے" (ازالہ اوہام صفحہ ۱۳۸)

(۱۴) اور ہم اپنی جماعت کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ سچے دل سے اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھیں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور اسی پر مریں۔ اور تمام انبیاء اور تمام کتابیں جن کی سچائی قرآن شریف سے ثابت ہے اُن سب پر ایمان لاویں اور صوم اور صلوٰۃ اور زکوٰۃ اور حج اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ تمام فرائض کو فرائض سمجھ کر اور تمام منہیات کو منہیات سمجھ کر ٹھیک ٹھیک اسلام پر کار بند ہوں۔ غرض وہ تمام امور جو اہل سنت کی اجماعی رائے سے اسلام کہلاتے ہیں ان سب کا ماننا فرض ہے۔ اور ہم آسمان اور زمین کو اس بات پر گواہ کرتے ہیں کہ یہی ہمارا مذہب ہے۔ اور جو شخص مخالف اس مذہب کے کوئی اور الزام ہم پر لگاتا ہے وہ تقویٰ اور دیانت کو چھوڑ کر ہم پر افترا کرتا ہے۔ اور قیامت میں ہمارا اس پر یہ دعویٰ ہے کہ کب اس نے ہمارا سینہ چاک کر کے دیکھا کہ ہم باوجود ہمارے اس قول کے دل سے ان اقوال کے مخالف ہیں الا ان لعنۃ اللہ علی الکاذبین المفترین" (ایام الصلح صفحہ ۸۷)

غلو سے بچنے کی تاکید بھی حضرت اقدس مرزا صاحب کی اپنے قلم سے ہی سن لو۔ کس قدر صریح طور پر تنبیہ اہل غلو کو فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

(۱) "جو شخص انکار میں حد سے گزر جاتا ہے جس طرح کہ وہ ایک خطرناک حالت میں ہے اسی طرح وہ جو شیعوں کی طرح اعتقاد میں حد سے گزرتا ہے" (حضرت اقدس کا ایک خط منقول از الحکم جلد ۳ صفحہ ۲۹)

(۲) "عیسائیوں کی طرح نادان دوست نہ بنیں اور ناجائز صفات اپنے پیشوا کی طرف منسوب نہ کریں" (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۵)

بیعت کی ضرورت

میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے یہ جماعت ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولٰئک ھم المفلحون۔ (آل عمران) (مسلمانو چاہئے کہ تم میں ایک جماعت موجود رہے جو خیر یعنی اسلام کی طرف لوگوں کو بلائے اور نیک کام کرنے کا حکم کرے اور بُری باتوں سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں)

کے حکم کے ماتحت دعوت و تبلیغ اسلام اور دشمنان دین سے اس کی حفاظت کے لئے بنائی تھی قاعدہ ہے کہ جب کوئی فوج کسی مقصد کے لئے بنائی جائے گی خواہ حفاظت ظاہری مقصود خاطر ہو یا حفاظت باطنی تو اس کے لئے ہر ایک فرد سے ایک باقاعدہ معاہدہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے اسی کو اصطلاح اسلام میں بیعت کہتے ہیں۔ ہر ایک سپاہی اپنے افسر فوج یا امام وقت کے ہاتھ پر معاہدہ یا بیعت کر کے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اس مقصد کے پورا کرنے میں جس کے لئے وہ فوج کھڑی ہوئی ہے اپنی جان تک لڑا دے گا اور مال اور جان کو قربان کر دینے میں قطعًا دریغ نہ کرے گا۔ خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ایک واقعہ بطور نمونہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت نبی کریم ۶ سنہ ہجری میں عمرہ کی غرض سے عازم مکہ ہوئے تو مکہ معظمہ کے متصل حدیبیہ کے مقام پر آپ کو پتہ لگا کہ کفار مکہ جنگ کے لئے آمادہ ہیں۔ آپ تو اس غرض کے لئے تشریف لائے نہ تھے۔ اس لئے آپ نے حضرت عثمان رضؓ کو مکہ یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں فقط عمرہ کر کے واپس چلے جائیں گے مگر اس کے بعد ہی یہ خبر اڑی کہ کفار نے حضرت عثمان کو قید کر لیا ہے۔ اس خبر کے سچا ہونے کی صورت میں بلاشبہ یہ کفار کی طرف سے اعلان جنگ تھا۔ اور حالت یہ تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ لڑنے کی غرض سے نہ آئے تھے۔ اس لئے اچانک اس لڑائی کے پیش آجانے سے مسلمان دشمنوں کے نرغہ میں آگئے۔ اسلام پر یہ بہت نازک وقت تھا۔ حدیبیہ دشمن کا اپنا گھر تھا اور وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے چاروں طرف سے گھر کر آنے کو تھے اور یہاں اس کے مقابلہ کی سکت نہ تھی۔ جان نثاری اور قربانی کا یہ بڑا امتحان تھا۔ چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے صحابہ سے دین کی خاطر جان نثاری کی بیعت لی۔ اور صحابہ نے بڑی خوشی اور مستعدی سے اسلام کے لئے قربان ہو جانے کی بیعت کی۔ یہ بیعت اس قدر ضروری سمجھی گئی کہ حضرت نبی کریم صلعم نے حضرت عثمان کو اس بیعت سے محروم نہ رکھنا چاہا اور ان کی طرف سے خود اپنا ہاتھ اپنے ہاتھ پر رکھا اور حضرت عثمان کی طرف سے بیعت کی۔ یہ بیعت جناب الٰہی میں بے حد مقبول ہوئی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس بیعت پر خوشنودیٔ مزاج کی سند نازل ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ (الفتح) بے شک اللہ راضی ہو گیا ان مومنوں سے جو تیری بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے۔

آج ہمارے زمانہ میں بھی اسلام سخت نرغہ میں تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے دین کو دشمنان اسلام عیسائی، آریہ، دہریہ وغیرہ کچل ڈالنا اور ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ گویا حدیبیہ کی نازک حالت پھر ایک رنگ میں اسلام پر وارد ہوگئی تھی اور اب تک ہے۔ اس لئے مشیت الٰہی نے یہی چاہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر ایک جماعت مجاہدین اور اسلام کے فدائیوں کی ایسی بنائی جائے جس سے وہی عہد لیا جائے جو صحابہ کرام سے حدیبیہ کے موقعہ پر لیا گیا تھا۔ چونکہ آج حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خود تو دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے جناب الٰہی نے آپ کے ظل اور نائب کو جو مجدد وقت تھا مسلمانوں سے وہی بیعت جان نثاری لینے کے لئے اُسی آیت کو الہام کیا جو آنحضرت صلعم پر حدیبیہ کے مقام پر نازل ہوئی تھی اور وہ آیت یہ تھی کہ انّ الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ کہ جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں بے شک وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اقدس مرزا صاحب نے اسی آیت کے حکم کے ماتحت مسلمانوں سے بیعت لینی شروع کی اور دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا ان سے عہد لیا۔ مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں ہمیں بیعت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس سے فرقہ بندی پیدا ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا صحابہ مسلمان نہ تھے۔ کیا وہ پہلے ہی تن من دھن سے اسلام پر فدا نہ تھے۔ پھر اُن سے حدیبیہ کے موقعہ پر بیعت لینے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ اس لئے کہ کسی جان جوکھوں کے موقعہ پر تجدید عہد جان نثاری کی روح کو تازہ کر دیتا ہے اور غفلت اور مردگی کو دور کر دیتا ہے۔ فرقہ بندی تو وہ پیدا کرتے ہیں جو آج اس قسم کا عہد کرنیوالوں کو کافر قرار دے کر انہیں اسلام سے خارج کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ کُل کے کُل مسلمان اس مجاہدین کی جماعت میں منسلک ہو کر امام وقت کے ہاتھ پر اسلام کے لئے جان نثاری کا عہد کرتے یا کم سے کم عہد کرنیوالوں کو نظر استحسان سے دیکھتے اور اسلام کے ان فدائیوں کی قدر کرتے الٹے اُن کے دشمن بن کر اور ناحق اسے فرقہ بندی قرار دیکر اسے مسترد کرنے کو تیار ہو گئے۔ فرمایئے اسے تعصب اور بے انصافی نہ سمجھا جائے تو اور کیا سمجھا جائے۔ آج خاکساروں کی جماعت کو سب سر آنکھوں پر بٹھاتے پھرتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں کہتا کہ یہ علیحدہ جماعت بنانا فرقہ بندی ہے۔ غالباً وہاں چونکہ سیاست مدنظر ہے اس لئے وہ جماعت پیاری لگتی ہے۔ آجکل ہر چیز میں سیاست کا رنگ محبوب ہے مذہب غریب کو کون پوچھتا ہے

حضرت اقدس مرزا صاحب نے کیسے دردناک الفاظ میں اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس کے چند شعر یہاں نقل کرتا ہوں:۔ ؎

بیکسے شد دینِ احمدؐ ہیچ خویش و یار نیست
ہر کسے در کارِ خود با دینِ احمد کار نیست

ہر کسے غمخوارئ اہل و اقارب میکند
اے دریغ ایں بیکسے را ہیچکس غمخوار نیست

خون دیں بینم رواں چوں کشتگانِ کربلا
اے عجب ایں مردماں را ہمرآں لدار نیست

اندریں وقتِ مصیبت چارۂ ما بیکساں
جز دعائے بامداد و گریۂ اسحار نیست

اے خدا ہرگز مکن شاد آں دلِ تاریک را
آنکہ او را فکر دینِ احمدِ مختار نیست

مَیں یہاں حضرت اقدس مرزا صاحب کی بیعت کی شرائط نقل کر دیتا ہوں اور اہل انصاف سے اپیل کرتا ہوں کہ آخر ان میں کیا ہے جس سے اس قدر لوگ بھڑکتے ہیں۔ وہ ہو بہو:۔

(۱) بیعت کنندہ سچے دل سے اس بات کا عہد کرے کہ آئندہ اس وقت تک کہ قبر میں داخل ہو جائے شرک سے مجتنب رہے گا۔

(۲) یہ کہ جھوٹ اور زنا اور بدنظری اور ہر ایک فسق و فجور اور ظلم اور خیانت اور فساد اور بغاوت کے طریقوں سے بچتا رہے گا۔ اور نفسانی جوشوں کے وقت ان کا مغلوب نہیں ہو گا اگرچہ کیسا ہی جذبہ پیش آئے۔

(۳) یہ کہ بلا ناغہ پنج وقت نماز موافق حکم خدا اور رسول صلعم کے ادا کرتا رہے گا اور حتی الوسع نماز تہجد کے پڑھنے اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور استغفار کرنے میں مداومت اختیار کرے گا اور دلی محبت سے اللہ تعالیٰ کے احسانوں کو یاد کر کے اس کی حمد اور تعریف کو ہر روز اپنا ورد بنائے گا۔

(۴) یہ کہ عام خلق اللہ کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنے نفسانی جوشوں سے کسی نوع کی ناجائز تکلیف نہیں دے گا۔ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ کسی اور طرح سے۔

(۵) یہ کہ ہر حال رنج اور راحت اور عسر اور یسر اور نعمت اور بلا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کرے گا اور بہر حالت راضی بقضا ہو گا۔ اور ہر ایک ذلت اور دکھ کے قبول کرنے کے لئے اس کی راہ میں طیار رہے گا۔ اور کسی مصیبت کے وارد ہونے پر اس سے منہ نہیں پھیرے گا بلکہ قدم آگے بڑھائے گا۔

(۶) یہ کہ اتباع رسم اور متابعت ہوا و ہوس سے باز آ جائے گا۔ اور قرآن شریف کی حکومت

کو بکلی اپنے پر قبول کرے گا۔ اور قال اللہ اور قال الرسولؐ کو اپنی ہر ایک راہ میں دستور العمل قرار دے گا۔

(۷) یہ کہ تکبر اور نخوت کو بکلی چھوڑ دے گا اور فروتنی اور عاجزی اور خوش خلقی اور حلیمی اور مسکینی سے زندگی بسر کرے گا۔

(۸) یہ کہ دین اور دین کی عزت اور ہمدردیٔ اسلام کو اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی عزت اور اپنی اولاد اور اپنے ہر ایک عزیز سے زیادہ عزیز سمجھے گا۔

(۹) یہ کہ عام خلق اللہ کی ہمدردی میں محض للہ مشغول رہے گا۔ اور جہاں تک بس چل سکتا ہے اپنی خداداد طاقتوں اور نعمتوں سے بنی نوع کو فائدہ پہنچائے گا۔

(۱۰) اس عاجز (یعنی حضرت مرزا غلام احمد صاحب۔ ناقل) سے عقد اخوت محض للہ باقرار طاعت در معروف باندھ کر اس پر تا وقت مرگ قائم رہے گا اور اس عقد اخوت میں ایسا اعلیٰ درجہ کا ہوگا کہ اس کی نظیر دنیوی رشتوں اور تعلقوں اور تمام خادمانہ حالتوں میں پائی نہ جاتی ہو۔"

کون درد دل رکھنے والا مسلمان ہے جو ان شرائط کو تسلیم نہ کرے گا اور ان پر عامل ہو کر دین کو دنیا پر مقدم نہ کرے گا اور خدمت دین کے بجا لانے میں حصّہ نہ لے گا؟

اللّٰھم انصر من نصر دین محمّدٍ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ واجعلنا منھم

اللّٰھمّ اخذل من خذل دین محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ ربّ العالمین والصّلوٰۃ والسّلام علٰے

سیّدنا محمّدٍ المصطفٰے خاتم النّبیّین